تذکرۂ سلیمان

غلام محمد

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ○

سلسلۂ مطبوعات (۴)

از سُلیماں گیر اخلاصِ عمل
داں تو ندوی را مُنزّہ از دغل

(مرشد تھانویؒ)

تذکرۂ سُلیمانؒ

حضرت علّامہ سیّد سُلیمان ندویؒ کے ادوارِ زندگی کا جائزہ ان میں انکے رُوحانی ارتقا اور اوج کی تفصیل، اُن کے چند خصوصی کمالات اور اُصولِ تربیت کا ذکر اور آخر میں طریقِ تربیت کا کامل مُرقّع؛

از

حضرت مولانا ڈاکٹر غلام محمّد صاحب مدظلہ

خلیفۂ مجاز حضرت اقدس علّامہ سیّد سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ

طبع ثانی ---------- ۱۹۸۴ء
کتابت ---------- ناصر حسین
پریس احمد برادرس پریس۔ ناظم آباد، کراچی
تعداد اشاعت ------

قیمت مجلد

ناشر

ادارۂ نشر المعارف
۸۳۔ ایس۔ بلاک نمبر ۲ پی۔ ای سی ایچ سوسائٹی
کراچی ۲۹

فہرست مضامین

※ ※ ※

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تجدیدِ تشکّر

تذکرۂ سلیمان جو سلیمانی ذوقِ اخلاص کے ساتھ، اشتہاری رسمیات سے بچتے ہوئے، سادگی و عاجزی سے ہدیۂ ناظرین ہوا تھا، خدا کا بے پایاں شکر ہے کہ مولفِ ناچیز کے تصور سے زیادہ صوری اور معنوی اعتبار سے مقبولِ خاص و عام ہوا۔ پاک و ہند کے حدود سے گزر کر اردو دنیا کے دور دراز گوشوں تک اس کا نفوذ پہنچ گیا۔ ایک طرف ہند و پاک کے علمی ماہناموں اور جریدوں نے کھُل کر اس کی داد و تحسین دی دوسری طرف اللہ والوں نے اپنے قلبی تاثر اور منامی اور معاملہ و معانیہ والی بشارتوں سے اس تالیف کی عند اللہ قبولیت کے مژدے سنائے، ایک بزرگ نے حضورِ نبویؐ تک میں اس کی پسندیدگی کی خبرِ جانفزا سُنائی، ع کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گُل۔

یہ بشارتیں ان مبشرات کے علاوہ رہیں جو خود اس بے استحقاق کو تذکرہ کے دورانِ تحریر اور تکمیل پر ملتی رہی، فالحمد للہ۔ یہ سب حضرت مرشدی نور اللہ مرقدہٗ کی محبوبیت کا اثر ہے۔

تذکرہ کی افادیت کے تین رُخ قدرت نے دکھائے، ایک یہ کہ اہل قلم معاصر نے اسی چربہ پر اپنے اپنے شیوخ کے تذکرے مرتب فرمائے دوسرے یہ کہ اس کے مطالعہ کرنے والوں میں دینی انقلاب کی خوشخبریاں ملنے لگیں اور خاص کر کتاب کا دوسرا حصہ یعنی "منہاجِ سلیمانی" بڑا انقلاب آفریں ثابت ہوا، تیسرے یہ کہ اچھے اچھے سالکینِ طریقت کے لئے یہ تالیف روحانی عقدوں کی گرہ کُشا اور ان کے منازلِ تحیر میں رہبر و رہنما ثابت ہوئی اور مستفید ہونے والوں نے جذبۂ احسان مندی سے اس کی اطلاعیں راقم الحروف کو دیں ——— یاد آیا کہ گرامی قدر جناب بشیر احمد صدیقی مرحوم سابق پرنسپل شبلی کالج اعظم گڈھ نے جو غالباً قطب آفاق حضرت

شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہٗ کے کسی خلیفہ سے بیعت اور راہِ طریقت کے صاحب استقامت سالک تھے، کئی مرتبہ اس عاجز سے تذکرہ سے نفع اندوزی کا ذکر فرمایا اور جب ان کی آخری علالت میں مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا تو بیٹھتے ہی فرمانے لگے:

"دیکھئے سب کتابیں ہٹا دیں، صرف تذکرہ سلیمانؒ ہے جو سرہانے رکھا ہے کیا بتاؤں کہ حضرت سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات سے کیسی عقدہ کشائی ہوتی ہے، اور کس قدر طمانیت قلبی حاصل ہوتی ہے[1]۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے بڑا احسان فرمایا"۔

الحمدللہ کہ جس طرح حضرت والا رحؒ کی ذات تمام سلاسلِ تصوف کے مشائخ میں محبوب تھی ان کا تذکرہ بھی سب کی نگاہ میں معتبر رہا اور خود سلسلۂ امدادیہ کے اکابر عصر نے بھی مؤلف کی بڑی ہمت افزائی فرمائی۔ آج سے کوئی آٹھ دس برس پہلے اسی شہر کراچی میں جب مجھ ہیچمداں کو شیخ المشائخ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نوراللہ مرقدہٗ سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا اور حضرت سے مصافحہ کی سعادت پاتے ہوئے جب میں نے اپنا نام لیا تو حضرت نے ہاتھ کی گرفت کو مضبوط فرما کر نظر بھر کے دیکھا اور متبسم ہو کر فرمانے لگے:

"میں نے تذکرۂ سلیمانؒ کو لفظاً لفظاً دو مرتبہ پڑھا ہے اور اس کے حوالے اپنی کتاب[2] میں دیے ہیں"۔

یہ میرے لئے بڑا انعام ہے، ورنہ ؎

کہاں ان کی بزم طرب کے تھا قابل　　　یہ شوریدہ سر، تلخ کامِ محبت

اس سے قبل اپنے دو ایسے بزرگوں سے بھی شاباشیاں مل چکی تھیں، جن کے تاثرِ خاطر کا انتظار

---

[1] اس پہلو پر اب ایک مبسوط کتاب بعنوان "سلوکِ سلیمانی یا شاہراہِ معرفت" لکھی جا چکی ہے، اس کے مؤلف ہیں ہمارے خواجہ تاش مولانا محمد اشرف خاں صاحب زاد فیضہٗ۔

[2] ملاحظہ ہو شیخ کی تصنیف "تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات"۔

خود اپنے قلبِ حزیں کو بھی تھا، یعنی عرفائے ربّانی حضرت اقدس مفتی محمد حسن اور حضرت مولانا عبد الباری ندوی رحمہما اللہ ______ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے وصولی کتاب کی اطلاع کے ساتھ اپنے مرید رشید و خلیفہ الحاج نور محمد بٹ مرحوم کی زبانی احقر کو مطلع اور مطمئن فرمایا کہ

"کتاب کو جگہ جگہ سے مطالعہ کیا، قبولیت کا اثر محسوس ہوتا ہے"۔

پھر حضرت گرامی مولانا عبد الباری ندوی نور اللہ مرقدہٗ کے بڑے والہانہ مکتوبات ملتے رہے، (۲۱، ستمبر ۱۹۶۰ء) ایک مکتوب کا متعلقہ جزو یہ ہے:۔

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ مرا بایں گیاہ ضعیف ایں گماں نبود۔ یہ کتاب آپ نے نہیں لکھی، لکھائی گئی ہے اور جس نے لکھائی ہے اس کے سامنے تو کوہ بھی کاہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ حضرت مرحوم کے اس حق کو کوئی دوسرا آپ کے پاسنگ بھر بھی شاید ادا کر پاتا۔ جزاک اللہ و بارک اللہ۔"

(۵، ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ)

حضرت سلیمانؒ کی نسبتِ عالی نے اس مورِ ناتواں کے تعارف کا دائرہ چونکہ بہت وسیع کر دیا تھا، اس لئے قدر اور ہمّت افزائیوں کا ایک دفتر کا دفتر فراہم ہو گیا، پھر بھی اربابِ قلم و رقم جانتے ہیں کہ اپنی تحریر وقت گذرنے پر خود اپنی نظر سے گر جاتی ہے اور اس میں ردّ و بدل ناگزیر محسوس ہونے لگتا ہے، مگر تذکرہ کی طبعِ حاضر میں طبیعت اور قلم دونوں اس پر آمادہ نہیں اور یہ اس لئے نہیں کہ اپنی تحریر نگاہ میں کھپ گئی ہے بلکہ احساس و ایقان یہ ہے کہ جس کیفیت و تاثر میں اس کا لفظ لفظ لکھوایا گیا تھا، وہ ذاتِ حق کی نامکرر عنایت تھی، جس کا احترام واجب ہے، حضرت محترم پیر ہاشم جان سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی تصدیق میرے بھانجے رفیع الزماں سلّمہٗ، جن کے ذریعہ تذکرہ کا نسخہ ان کی خدمت میں ہدیہ ہوا تھا، یوں فرمائی:

"آپ کا خط پہنچا اور غلام محمد صاحب کی بھیجی ہوئی کتاب "تذکرۂ سلیمان" بھی ملی

ایک عرصہ سے حضرت سید صاحبؒ کے حالات کا اشتیاق تھا، اللہ سبحانہٗ تعالیٰ بھائی غلام محمد صاحب کو اجرِ خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے اپنے شیخ کی خدمت کی ہے اور جذب کی حالت میں یہ کتاب لکھی ہے۔ یہی وہ چیز ہے کہ جس سے ایک سالک برسوں کی راہ لمحوں میں طے کر جاتا ہے ؎

سیرِ زاہد ہر مہے یک روزہ راہ
سیرِ عارف ہر دمے تا تختِ شاہ"

(۱۳ ربیع الاول ۱۳۸۰ھ)

بہرکیف تذکرۂ سلیمان کی اشاعت کے بعد اس سلسلہ کی دو اہم کتابیں منظرِ عام پر آئیں ایک تو مولانا دریابادیؒ کی مرتبہ "مکتوباتِ سلیمانی" (۲ جلدوں میں) اور دوسری دار المصنفین اعظم گڈھ کی "سیرتِ سلیمانی" ان دونوں کتابوں سے اس نئے ایڈیشن میں خال خال اضافہ یا ترمیم کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کسی معتبر گوشہ سے کوئی قابلِ ذکر بات ملی ہے تو اس کو بھی حوالہ کے ساتھ نقل کر دیا گیا ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے شذرات جو انھوں نے حضرت والاؒ کی رحلت پر معارف میں تحریر فرمائے تھے اور جو گیرائی، گہرائی اور پُر تاثیری میں ان کی مؤلفہ سیرت سلیمانی سے ممتاز ہیں جزوِ کتاب بنا لئے گئے ہیں۔ سب سے نادر اور قیمتی اضافہ حضرتِ والاؒ کی ایک سندِ حدیث کا آ گیا ہے جو انہوں نے شیخ الاسلام الشیخ عبدالقادر توفیق الحنفی المدنی قدس سرہٗ سے حاصل فرمائی تھی، اس اظہار کا شرف قدرت نے اس خادمِ خاص کے حصہ میں رکھا تھا۔ فالحمد للہ۔ اس کے علاوہ نظرِ ثانی میں سندِ سلسلۂ چشتیہ صابریہ امدادیہ کے ہر بزرگ کے معتبر ترین سِنِ وفات اور جائے وفات کو امکانی کاوش سے دریافت کر کے درج کر دیا گیا ہے، نیز حضرتِ والاؒ کی رحلت کے بعد ان کی یادگار کے طور پر دو مرتبہ علمی و تعلیمی، تحقیقاتی و تصنیفی ادارے کے قیام کے جو خاکے بنے مگر روبہ عمل نہ آ سکے، ان کا باوثوق ذکر پہلی مرتبہ اس طبع جدید میں زیرِ نظر آئے گا ـــــ اس کے علاوہ بھی بعض قابلِ قدر اضافہ ملیں گے، ـــــ ولادت کی عیسوی تاریخ

ضمیمہ کے طور پر کتاب کے آخر میں چند اکابرِ عصر کے مکاتیب ملاحظہ میں آئیں گے جو تذکرہ پر ان کے تاثر کا آئینہ ہیں۔ ماہناموں اور جریدوں کے تبصروں کو شامل کیا جاتا تو کتاب کا توازن بگڑ جاتا، ویسے بھی روایتی تبصروں سے زیادہ تاثرات کی پُرخلوص عکاسی نجی مکتوبات ہی میں دیکھی جا سکتی ہے، اس لئے بھی اسی پر اکتفا کیا ہے!

تذکرہ کی تحریر کے وقت راقم عاجز کے جو نہایت شفیق اور مہربان بزرگ زندہ تھے اور جن کا ذکر اس تالیف میں موقع بہ موقع آیا ہے، آج وہ سب تاریخ ابرار و اخیار کا حصّہ بن چکے ہیں۔ آہ! کیا ہستیاں تھیں، حضرت مولانا ابوالحسنات سیّد عبداللہ حیدرآبادی، حضرت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری، حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامیلپوری، حضرت مولانا عبدالباری ندوی لکھنوی، حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی، حضرت پیر ہاشم جان سرہندی وغیرہم سب گنج ہائے گراں مایہ زیرِ زمیں ہو چکے اعلی اللہ مقاہم۔ ان حضرات کے اسمائے گرامی کے ساتھ جہاں مدظلہٗ کا لفظ آجائے تو قارئین تمکین اب دل کی گہرائی سے رحمۃ اللہ علیہ کہہ لیں اور مجھ سے خاکپائے اصفیاء کے حق میں دُعا فرمائیں کہ آخرت میں انہی پاکانِ حق کے ساتھ الحاق میسّر آجائے اور اُس وقت فرطِ مسرت اور وفورِ شوق سے یہ حضرات کہہ اٹھیں، ع غلام آیا محمدؐ کا غلام آیا محمدؐ کا[1]

آخر میں اس تہی مایہ کی دلی دعا ہے کہ جن مخلص و بے ریا احباب کی مستعدی اور ایثارِ زر سے تذکرہ کی طبع نو اس معیار سے ہو سکی ان سب کو اور خصوصاً عزیز قلبی حافظ محمد یحییٰ صاحب کو جو اس مہم کے سرخیل رہے اور محب قدیم محمد یوسف صاحب (مالک یونین پیپر مارٹ) کو جو ایثارِ مالی میں سنا ہے سب پر فائق رہے، ربِّ رحیم دارین کی کامرانیاں عطا فرمائے۔ والسّلام۔

پُرامیدِ رحمت: غلام محمد کان اللہ لہٗ ۲۹ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ ۲۴ فروری ۱۹۸۲ء

---

[1] ایک مرتبہ یہ خادم خدمتِ سلیمانی میں حاضر ہوا، سیرت نگار نبویؐ کی روح اس وقت شاید روحِ پاکِ محمدیؐ کے قربِ خاص سے متلذذ تھی، ــــــ سلام عرض کیا تو نظر اٹھا کر جوابی سلام کے ساتھ ہی فرمایا "ایک مسلمان کا مقصد اسکے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے کہ وہ غلام محمدؐ بن جائے"۔ اور پھر دیر تک مستغرق رہے۔

ع ایں چنیں اسرار را شرح و بیان دیگر است

حصّہ اوّل

تہدیہ

لِمَنْ ــــــــــــــــــــ اسکی خدمت میں

كَانَ لَهٗ قَلْبٌ ــــــــــ جو دلِ آگاہ رکھتا ہو

اَوْ ــــــــــــــــــــ یا (کم از کم)

اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ۔ کان دھر کر متوجہ ہو کر سُنے!

تحدیث نعمت

اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر کس زبان سے ادا کروں اس نے ایک مورِ ناتواں کو سلیمان ذی شان (قدس سرہٗ العزیز) کی خدمت میں پہنچایا، ان کا قرب بخشا، ان سے اتنا نزدیک کردیا کہ تکلف کا کوئی حجاب حائل نہ رہا، میں نے اپنا سب کچھ ان پر ظاہر کردیا اور اپنی ہر الجھن میں ان کے مشورہ کو سرمایہ تسکین اور سراسر خیر وبرکت پایا، اُن سے عقیدت محبت میں بدلی اور یہ محبت بڑھتی ہی چلی گئی بلکہ آج تک اس میں ترقی محسوس ہوتی ہے اور "المرء مع من احب" کے نبوی مژدہ کو سُن کر اس محبت کو اپنا بہترین توشۂ آخرت سمجھتا ہوں۔

اِدھر یہ ہوا اور اُدھر سے الطاف وعنایات کی فراوانی کچھ ایسی رہی کہ حضرت والا نے اس بے استحقاق کو اپنے اعتماد کا اہل سمجھا، اپنے خاص احوال سنائے، اپنے مذاق سے آگاہ فرمایا، اپنے مزاج میں دخیل فرمالیا، یہاں تک کہ نجی معاملات بھی چھپے نہ رہے اظہارِ اعتماد اس درجہ بڑھا کہ حضرت والا کے جن جن دست گرفتوں سے میری واقفیت تھی ان کی باطنی حالت وکیفیت کبھی مجھ سے دریافت فرماتے اور کبھی خود سنا کر اس میں مشورہ طلب فرماتے، پھر جو کچھ اپنی بصیرتِ خام کے مطابق عرض کیا جاتا اس کی تصدیق اور کبھی کبھی اس میں ترمیم واصلاح فرما دیتے تھے۔

یوں تو روزِ اوّل ہی سے حضرت شیخ کی خصوصی توجہات میرے شاملِ حال رہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ انہی کی مقناطیسی توجہ نے اس ذرّۂ آہن کو اپنی طرف کھینچا تھا، مگر کراچی کا سہ سالہ قرب تو میری زندگی کا سب سے قیمتی حصّہ تھا، اس پوری مدّت میں حضرت والا نے مجھے ہمیشہ اپنے دامن سے چمٹائے رکھا، گو میں ان کی کفش برداری کے لائق بھی نہ تھا، خلوت میں جلوت، سفر وحضر میں حتیٰ کہ جمعہ وعیدین ہی میں نہیں بلکہ تراویح کی نماز اور فریضۂ قربانی کی ادائی تک میں ہمیشہ اپنے اس خادم کو

اپنے ساتھ ہی رکھا، یہ اُن کے کرم کی انتہا تھی اور میری خوش بختی کا اوج، اور انشاءاللہ آخرت کی دائمی رفاقت کی طمانیت بھی!!

حضرت والا کی مہربانیاں مجھ سے گذر کر میرے اہل وعیال، میرے والدین اور میرے بہن بھائیوں تک پھیل گئیں اور ان کے اس اندازِ کرم سے خانوادۂ سلیمانی کا بچہ بچہ ہمارا محسن بن گیا اور آج بھی ان سب کے اشفاق شفقتِ سلیمانی کی یادگار ہیں والحمدُ للہِ علیٰ ذالک۔

حضرتِ اقدسؒ کی جامع کمالات ہستی سے نزدیکی اور شیفتگی نے میرے اندر ایک تشویش پیدا کر دی ہیں یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ جانشینِ شبلیؒ بھی ہیں اور مسند نشینِ اشرف بھی، مگر اُن کے فیض یافتوں میں نہ صرف یہ کہ علم وتقویٰ کی ایسی جامعیّت عنقا ہے بلکہ اس جامعیت کبریٰ کی خاطر خواہ ان میں قدر بھی نہیں۔ میں ڈر رہا تھا کہ حضرت والاؒ کے بعد جو حضرات بھی ان کی سوانح نگاری کا بیڑہ اٹھائیں گے، ان کا قلم پیکرِ جامعیّت کی سچّی تصویر کھینچ نہ سکے گا، اسی اندرونی خلش اور اضطراب سے مجبور ہو کر ۲ر اگست ۱۹۵۰ء کو ایک عریضہ خدمت شیخ میں پیش کر دیا، جو یہ تھا:-

"سیّدی ومرشدی ومولائی دامت برکاتکم وفیوضکم"

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ،

گذشتہ ہفتہ سے یہ خیال قائم ہے اور زور پکڑتا جا رہا ہے کہ جس طرح خواجہ صاحبؒ نے حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے سوانح حیات قلمبند فرمائے تھے[1]، حضرت والا مدظلہٗ کی نگرانی میں احقر بھی اسی نوع کی اجازت چاہے۔ گو علماً وعملاً مجھ میں کوئی صلاحیت موجود نہیں ہے، لیکن اندرونی جذبہ سے مجبور ہو کر عرض کی جسارت کی ہے، اگر توفیقِ ایزدی

---

[1] یعنی "اشرف السوانح" مؤلفہ خواجہ عزیز الحسن صاحب۔ مجذوب رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

شاملِ حال رہی اور حضرت والا مدظلہٗ نے اپنی گرانقدر ہدایات سے سرفراز رکھا تو شاید یہ مشکل سہل ہو جائے حضرت والا کی آمادگی و اجازت کا منتظر ہوں!

اس سلسلہ میں یہ بھی عرضِ خدمت ہے کہ اگر نفسِ خیال سے حضرتِ والا کو اتفاق ہے اور حضرت والا اس ہیچمدان کو اس خدمت کا اہل تصوّر نہ فرماتے ہوں تو کسی اور اہل استعداد خادم سے بھی یہ خدمت لی جاسکتی ہے اور احقر کا مقصد حاصل ہے۔ فقط ننگِ خدام غلام محمد "

اللہ اللہ! اس عریضہ کا جواب کیا عطا فرمایا اپنا دل نکال کر صفحۂ قرطاس پر رکھ دیا اہل نظر دیکھ سکتے ہیں کہ تنہا یہی مکتوب حضرت والا کے مقامِ عبدیت کی شہادت کے لئے بہت کافی ہے ——— ملاحظہ ہو:۔

"حبیبِ مخلص و عزیز خالص زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کے حسنِ ظن کی قدر کرنے کے باوجود آپ کی اس تجویز سے مجھے بڑی شرمندگی ہوئی، کہاں میں اور کہاں میری زندگی کی یہ اہلیت کہ اس کے سوانح کوئی قلمبند کرے، آپ میں لکھنے کی سب کچھ صلاحیت ہے، لیکن میری زندگی میں لکھے جانے کی اصلا صلاحیت نہیں ہے!

ظاہری حال تو آپ جانتے ہیں مگر باطن کا حال تو علّام الغیوب ہی کو معلوم ہے، میرے سوانح حیات موجب بصیرت تو کیا ہونگے، ہاں موجبِ عبرت ہو سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور حسنِ خاتمہ کی دعا ہے اور آپ بھی آمین کہیں، ع من کہ باشم کہ دراں خاطرِ عاطر گذرم"

بات بظاہر آئی گئی ہوگئی، مگر نہیں، اخلاص کا ہر شائبہ بارگاہِ ذرّہ نوازتیں مقبول اور نتیجہ خیز ہے۔ حضرت اقدس اپنے وقت موعود پر وداع ہو گئے، اب اس کو امر اتفاقی سمجھئے یا کوئی الہامی حقیقت کہ اس سانحہ کے کچھ ہی عرصہ بعد محترم و مکرّم حضرت مولانا دریابادی مدظلہٗ نے حضرت والاؒ کی سوانح نگاری کے لئے اسی گمنام کے نام کا پُر زور اعلان فرمایا۔ اس پر دوسروں کو جو بھی تعجب ہوا ہو مگر میں خود بھی غرقِ حیرت ہو گیا کہ یا الٰہی میرا قلم اور سیرت سلیمانی کی مصوّری؟ میری محدود حاضری، قاصر نظر، ناقص فہم اور ان کے گوناگوں علمی وفکری تاریخی وادبی، قرآنی وحدیثی اور فقہی واحسانی کمالات کا احاطہ؟ آخر میرے نام اور اس عظیم الشان کام میں کوئی نسبت بھی ہے؟ ــــــ کاش میں اس قابل ہوتا، مگر اب تو ہمت صاف جواب دے رہی ہے، دست وبازو شل ہو رہے ہیں کہ

ع برنتابد کوہ را ایک برگِ کاہ!

سچ مانیے کہ عرصہ تک یہی حیرانی وحرمانی رہی، مگر الحمد للہ کہ پھر

ع حلّ این نکتہ ہم از روئے نگار آخر شد

معارف کے سلیمان نمبر میں میرا ایک مضمون نکلا جس کو پڑھ کر سراپا شفقت وکرم مولانا گیلانی (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً) نے ایک الطاف نامہ سے سرفراز کیا، اس میں سامانِ ہمت بھی تھے اور تلقینِ وصیّت بھی، اسی بابرکت وصیت کو پڑھ کر میری مشکل حل ہو گئی، وہ عبارت یہ ہے:۔

"آپ کا مضمون سلیمان نمبر معارف میں بھی اسی طرح ممتاز ہے جیسے ریاض میں آپ نے سید صاحب مرحوم کا حق ادا فرمایا تھا، سچی بات تو یہ ہے کہ زندگی کے آخری سالوں میں وہ جس راہ میں تیزی کے ساتھ رواں دواں تھے ان دنوں میں جو لوگ ان کے آس پاس تھے، ان بےچاروں میں صلاحیت

ہی نہیں تھی کہ سیّد صاحب جو کچھ ہو رہے ہیں، ان کو وہ پا سکیں، یہ آپ کی خوش قسمتی تھی کہ ان حالات کے جاننے کے لئے جس ذوق کی ضرورت تھی اسی ذوق کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کی زندگی کی یہ آخری منزل وہی ان کی زندگی کا خلاصہ تھا، اور اب سمجھ میں آتا ہے کہ ان کی سوانح نگاری کا مسئلہ جب چھڑا تھا تو مولانا دریابادی نے آپ کے نام نامی کو کیوں پیش کیا تھا...............

السیّد العلامۃ المرحوم کے سوانح حیات کی ترتیب آپ کی زندگی کا بڑا اہم فریضہ ہے، خدا کرے اس کی طرف سے آپ کی طبیعت نہ ہٹی ہو، دین و دنیا کا یہ سودا ہے، اپنی علمی وتحریری کوششوں میں چاہیئے کہ اسی کو سب سے زیادہ اہم دا قدم قرار دیجئے! ....

اس کے بعد میں نے تائیدِ الٰہی کی دعا کے ساتھ قلم اٹھایا اور اپنے امکان بھر حزم و احتیاط کے ساتھ حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات صرف باطنی اور روحانی نقطۂ نظر سے مرتّب کر دیئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کوشش کو حضرتِ شیخ قدس سرہٗ کی خوشنودی کا سبب اور میرے لئے وجہ سعادت بنائے۔

حضرتِ والا کے کمالاتِ احسانی اور شانِ ارشاد کے اظہار کا سب سے مستند اور بہترین ذخیرہ جو میرے پاس محفوظ تھا وہ میری حضرت شیخ سے دس سالہ مراسلت تھی، یہ مربوط مراسلت فیض سلیمانی کا چشمہ جاریہ بھی ہے اور ایک ایسا آئینہ بھی جس میں دورِ حاضر کے ایک سالک طریق کے آثارِ سفر یعنی تزکیۂ نفس کا عزم، اس کے نفس کی شرارتیں اور باطن کے پیچ وخم اور پھر ان کی تادیب اور سلجھاؤ کی کوشش اور اس کے حسبِ صلاحیت طےِ منازل یا نتائج وثمرات کا عکس اُتر آیا ہے۔ جو اس جیسے ہزاروں تعلیمِ نو کے آفریدوں اور عقلیت کے ماروں کے لئے سرمایۂ ہدایت اور وجہ تقویتِ ایمان ہے اس گنجِ سلیمانی

کو وقفِ عام کرنے کا اصرار بعض مخلصوں اور بزرگوں کی طرف سے ہوا اور پھر خود اپنا جی بھی اس کو چاہا تاکہ شیخ عالی مقامؒ کے بقائے فیض کی ایک صورت ہو سکے، لیکن اس معاملہ میں اہلِ ارشاد کی اجازت ضروری تھی، ویسے تو خود حضرت والاؒ نے اسکی مشروط اجازت بہت پہلے عطا فرما دی تھی کہ :-

"بغرضِ افادہ نقل کئے جاسکتے ہیں نہ کہ ریا اور استکبار کی راہ سے" (مکتوب ۱۸)

مگر بعد کو کبھی مکرر پوچھنے کا خیال نہ آیا اور اب میرے لئے یہ محال تھا کہ اپنے نفس کا اعتبار کر جاتا۔ "وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ" کا پیغمبرانہ اقرار بار بار یاد آتا رہا اور خیال کو ارادہ تک بڑھنے ہی نہ دیتا تھا، بالآخر اس کا فیصلہ شیخ عالی مرتبت حضرت مولانا محمد حسن صاحب دام ظلہٗ کے سپرد کر دیا جو حضرت مرشدی (نور اللہ مرقدہ) کی رحلت کے بعد میرے رہبر شفیق ہیں اور میرے معائب و تقصیرات سے واقف بھی، حضرت موصوف نے تحریراً بھی اور پھر بالمشافہ واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا کہ :-

"یہ مکتوبات آپ ضرور شائع کیجئے، اس سے نفع ہوگا، آخر خواجہ صاحبؒ کے احوال "اشرف السوانح" میں اظہارِ نام کے ساتھ موجود ہیں۔"

صاحبِ ارشاد مدظلہٗ کے اس قولِ فیصل کے بعد تامل، تکلفِ بے جا تھا ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دیں
خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

چنانچہ یہ گنجینۂ فیض اس کتاب کا جزوِ اہم ہے، جس کے مطالعہ کے بغیر حضرتِ والا کی عنداللہ مقبولیت اور ان کا امتیازی مقام رشد و ہدایت واضح طور پر معلوم نہیں ہو سکتا اور جس کے دورانِ مطالعہ کئی باخدا ہستیوں کا تعارف اور ان کے اخلاص کا تذکرہ متعدد آیات و احادیث کی صحیح تعبیرات اور بہت سے نازک "مسائل احسانی" سے آگاہی نصیب ہوگی اور خدا نے چاہا تو نظر میں نور اور قلب میں سرور پیدا ہوگا۔

یہ جو کچھ ہوسکا وہ محض اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل ہے ، اس کام میں جتنی دیر لگ گئی اور اس کے باوجود جو نقص رہ گیا ہو وہ اس بندۂ عاجز کا قصور ہے اور جس درجہ میں بھی حُسن وخوبی آگئی ہو وہ حسنِ ازل کی کرشمہ سامانی ہے جو ایک بے بضاعت وبے ہُنر کے ہاتھوں ظاہر ہوگئی ہے ، جس پر ہزار شکر کے ساتھ ساتھ عارف رومی کی زبان میں یہ اقرار ہے کہ ؎

اینکہ شکرِ نعمتِ تو می کنم
ایں ہم از تو نعمتے شد مغتنم
شکر ایں شکر از کجا آرم بجا
من کیم از نست توفیق اے خدا

طالبِ رحمت
غلام محمد

کراچی ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ
نومبر ۱۹۵۸ء

اعتراف

تذکرہ سلیمان کی ترتیب میں میں اپنے شیخ عالی مقام کے محب و محبوب حضرت محترم ڈاکٹر محمد عبد الحی صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ ان کے کمال لطف سے کئی باتیں جن کا تعلق حضرتِ والاؒ اور مرشد تھانویؒ کے باہمی ربط سے تھا، میرے علم میں آئیں۔

حضرت مفتی محمد حسن صاحب دام فیوضہ کا رہین منّت ہوں کہ حضرت کی زبانِ صدق سے بہت سی معلومات کی توثیق ہوئی اور بعض نادر باتوں کا ان میں اضافہ ہوا۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا دل سے مشکور ہوں کہ مولانا کی کرم ارزانی سے مجھ کو حضرت والاؒ اور مرشد تھانوی کی ابتدائی مراسلت مل سکی۔[1]

حضرت والا کے رفقائے قدیم حضرت گیلانی خلد آشیانی مولانا دریابادی اور مولانا عبد الباری ندوی مدظلہم کے لطف و کرم کا شمار ہی کیا ہے کہ انھی حضرات کے حسنِ ظن، تحریک، تاکید اور حوصلہ افزائی نے اس خدمت کے لئے میری ہمت بندھائی اور ان ہی کی دعائیں دشواری راہ کو آسان کر گئیں۔

ان خاص کرم فرماؤں کے علاوہ ان سب حضرات کا تہ دل سے ممنون ہوں جن کی زبان و قلم سے کمالات سلیمانی آشکارا ہوئے اور مجھ کو ان سے استفادہ کا موقع ملا۔ ؎ تمتع زہر گوشۂ یافتم
زہر خرمنے خوشۂ یافتم

---

[1] مولانائے مکرم نے کرم بالائے کرم یہ کیا کہ حضرت مرشدی کی ساری مراسلت میرے سپرد فرما دی جس سے بڑی رہبری ملی۔

اعتذار

اس تالیف میں جو واقعات بھی آگئے ہیں، جابجا اُن کے مآخذ کا حوالہ درج کر دیا گیا ہے، ناظرین دیکھ سکتے ہیں کہ واقعہ کی نوعیت کے اعتبار سے مستند ترین مآخذ ہی کو قبول کیا گیا ہے، البتہ ایک بات عام صوفیانہ مذاق کے تذکروں سے ہٹی ہوئی ملے گی اور وہ یہ ہے کہ سوانح نگاری میں کسی خاص رعایت کو بہر طور ملحوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے اور نہ واقعات کو کسی انفرادی مذاق کے تابع کیا گیا ہے بلکہ ان کو ٹھیک اسی انداز میں پیش کر دیا گیا ہے جس نہج سے وہ ظہور پذیر ہوئے تھے، اس لئے ممکن ہے کہ حبّ طبعی سے مغلوب اصحاب کو (خواہ وہ حکیم الامت قدس سرہٗ کے راست منتسبین ہوں یا خود صاحب سوانح رحمہ اللہ کے وابستۂ دامن) کسی کسی مقام پر سوئے ادب یا حُسنِ عقیدت کی کمی کا گمان گذرے ــــــــ حاشا وکلّا ایسا نہیں ہے! بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ خود حضرت والاؒ کی تاکید تھی کہ واقعہ نگاری میں قلم کو غیر جانبدار ہونا چاہیئے تاکہ بیان کی تاریخیت اور صداقت مشتبہ نہ ہوا اور وہ کسی انفرادی تاثر کے بجائے ایک ایسا مؤثر بنا رہے جس سے ہر اثر پذیر طبیعت اپنی استعداد اور ذوق کے مطابق اثر قبول کر سکے۔

بس اسی "امر" کو "فوق الادب" جان کر امکانی حزم و احتیاط کے ساتھ اس کی تعمیل کی کوشش کی گئی ہے ــــــــ اگر یہ بات کسی اور کے مذاق پر گراں ہے تو میں معذرت خواہ اور مستحق عفو ہوں کہ ؎

من بہ سر منزلِ عنقا نہ بخود بردم راہ
قطع ایں مرحلہ با مرغِ سلیماں کردم

توضیحِ اختصار

حکیم الامت، حضرت تھانوی / عارف تھانوی، مرشد تھانوی	قطب الارشاد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ
مولانا گیلانی ـــــــــ	حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ
مولانا دریا بادی ـــــــــ	حضرت مولانا عبد الماجد دریا بادی مدظلہٗ صاحبِ "صدق"
حضرت مفتی صاحب ـــــــــ	حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہٗ (لاہور) خلیفۂ مجاز حضرت حکیم الامتؒ
ڈاکٹر صاحب ـــــــــ	حضرت محترم ڈاکٹر عبد الحی صاحب مدظلہٗ (کراچی) خلیفۂ مجاز حضرت حکیم الامتؒ
سلیمان نمبر، معارف ـــــــــ	خصوصی نمبر ماہنامہ معارف اعظم گڈھ (ہند) بابت مئی ۱۹۵۵ء
سلیمان نمبر، ریاض ـــــــــ	خصوصی نمبر ماہنامہ ریاض (کراچی) بابت مارچ ۱۹۵۴ء

مناجات سلیمان بہ درگاہِ رحمٰن

صدق احساس کی دولت مرے مولیٰ دیدے — غمِ امروز بھلا دے غمِ فردا دیدے
دھن کچھ ایسی ہو فراموش ہو اپنی ہستی — دلِ دیوانہ وسودائی وشیدا دیدے
اپنے میخانہ سے اور دستِ کرم سے اپنے — دونوں ہاتھوں میں مرے ساغر و مینا دیدے
کھول دے میرے لئے علمِ حقیقت کے در — دلِ دانا دلِ بینا دلِ شنوا دیدے
قول میں رنگِ عمل بھر کے بنا دے رنگین — لبِ خاموش بنا کر دلِ گویا دیدے
دل بے تاب ملے دیدۂ پُر آب ملے — تپ آتش مجھے دیدے نمِ دریا دیدے

دردِ دل سینہ میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دیدے

(۲۵؍ اکتوبر ۱۹۴۲ء)

عرضِ ندویؒ بحضورِ نبویؐ

آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے
مکّی، مدنی ہاشمی و مطلبی ہے

پاکیزہ تر از عرش و سما، جنّت و فردوس
آرام گہِ پاکِ رسولِ عربی ہے

آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست صدا ہو
خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربی ہے

اے زائرِ بیتِ نبوی یاد رہے یہ
بیقاعدہ یاں جنبشِ لب بے ادبی ہے

کیا شان ہے اللہ رے محبوبِ نبی کی
محبوب خدا ہے وہ جو محبوب نبی ہے

بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابرِ کرم آج
جو آگ مرے سینہ میں مدّت سے دبی ہے

(مدینہ منورہ۔ محرم ۱۳۶۹ھ)

مقامِ سلیمانی

اہل اللہ کی بزم اقدس میں جہاں تک اپنی نظر ڈھونڈھ سکی تین ہی طرح کی ہستیاں پائی گئیں۔

ایک وہ جن کی حیات تمام تر جذب وعشق اور معرفت الٰہی کا آئینہ ہے، جیسے بایزید بسطامیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، مجدد الف ثانی وغیرہ، (رحمہم اللہ تعالیٰ)

دوسری وہ جن کی سیرت گو ہمیشہ بے داغ رہی لیکن اُن کا جوہر عرفانی ایک عرصہ بعد کھُلا ہے مثلاً شیخ فریدالدین عطار، عارف رومی، امام غزالی وغیرہ (رحمہم اللہ تعالیٰ)

تیسری وہ جن کی زندگی کبھی تو عام معیارِ اخلاق سے بھی پست تر تھی مگر جب انقلاب آیا تو رشک تقویٰ اور معیارِ معرفت قرار پاگئی، جیسے فضیل بن عیاض، بشر حافی، ______ وغیرہ (رحمہم اللہ تعالیٰ)

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کا مقام وسطانی زمرہ میں نظر آیا۔

وَاللّٰہُ تَعَالیٰ اَعْلَمُ وَعِلْمُہٗ اَتَمّ۔

ولادت سے شباب تک

۱۸۸۴ء تا ۱۹۰۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نسب | حضرت والاؒ سلسلۂ سادات کی ایک مشہور کڑی سے منسلک تھے، آپ کا ننہال زیدی اور ددھیال حسینی تھا، حضرت والاؒ کی ایک قلمی بیاض میں جدی بزرگوں کا تسلسل[1] اس طرح درج ہے کہ :-

سیّد سلیمان (ندوی) ولد سید ابو الحسن ولد سید محمدی (حکیم محمدی) ولد سید عظمت علی ولد سیّد وجیہ الدین ولد سیّد رجب علی ولد سیّد محمد شبیر ولد سید صدر الدین ولد سید سلیمان ولد سیّد عثمان ولد سیّد حسن ولد سیّد شمس الدین ولد سیّد خلیل ولد سیّد عرب ثانی ولد سید مالک ولد سیّد میر ولد سید محمد ولد سید شمس الدین ولد سید معین محمد ولد سید میر محمد ولد سید عرب اول ولد سیّد امیر سیّد برہان ولد سیّد احمد ولد سیّد محمد ولد سید یوسف ولد سید اسحاق ولد سیّد یعقوب ولد سیّد حسن ولد امام علی موسیٰ رضا ولد امام موسیٰ کاظم ولد امام جعفر صادق ولد امام محمد باقر ولد امام زین العابدین ولد امام حسین ولد علی مرتضیٰ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)

خاندان اور وطن | دو سو برس کی بات ہے کہ حضرت والاؒ کے اجداد جزیرۃ العرب سے نکل کر سندھ کے ساحل پر آ پہنچے اور یہاں سے اجمیر شریف[2] کے راستے صوبہ متحدہ (یوپی) سے گذر کر بہار کو اپنا مسکن بنایا[3] چنانچہ عظیم آباد پٹنہ کے نواح میں آج بھی سادات کی بارہ

---

[1] اموی شجرہ نسب بھی محفوظ ہے مگر میں نے اسکو یہاں نقل نہیں کیا ہے [2] حضرت فرماتے تھے کہ حضرت میراں خنگ سوار شہیدؒ جو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہٗ کے خسر سید وجیہہ الدین مشہدی کے بھتیجے تھے اور اجمیر شریف کی ایک پہاڑی پر مدفون ہیں حضرت کے اجداد میں سے تھے، اسی تعلق کے سبب جب ایک مرتبہ حضرت والاؒ انکے مزار مبارک پر حاضر ہوئے تو متولی حضرات گھبرا گئے کہ کہیں انکی تولیت نہ چھن جائے۔ [3] یہ روایت میں نے خود حضرت والاؒ کی زبان سے سنی ہے۔

بستیاں، جو عام زبان میں بارہ گاواں کہلاتی ہیں موجود ہیں[ؔ]۔

حضرت والاؒ کا وطن دیسنہ، بہار شریف (ضلع پٹنہ) سے شمال مشرق آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور سادات بہار کی برادری میں بہت ممتاز ہے۔ چنانچہ مولانا گیلانی بھی تصدیق فرماتے ہیں کہ:۔

"علامہ سید سلیمان ندویؒ غفر اللہ لہٗ صوبہ بہار کے مشہور و معروف قریۃ السادات والملوک دسنہ میں پیدا ہوئے، جو سادات کرام کے موطن و مسکن ہونے کے بعد اطراف و نواح کی ممتاز بستیوں میں شمار ہوتا رہا عموماً اہل علم اور صاحب دل بزرگوں کو ہر زمانہ میں اسی بستی میں ہم پاتے ہیں[1]"۔

حضرت والا کے جد امجد جن کا اسم گرامی تو دراصل سید محمدی تھا لیکن معروف حکیم محمدی ہی کے نام سے رہے، اپنے وقت کے مشہور طبیب اور صاحب دل صوفی تھے، تصوف میں ایک تالیف "نور محمدیہ" کے نام سے ان کی یادگار ہے، جس میں سہروردیہ سلسلہ کے بزرگوں کے کچھ احوال ہیں، اسی طرح فن طب میں "قرابادین محمدی" اور "مخزن الحکمت العلیاء" کے دو قلمی ترکے ہیں[2]۔

حضرت کے والد ماجد مولانا حکیم سید ابوالحسنؒ (ف ۱۳۴۰ھ) اپنے خاندانی کمالات میں اور بھی ممتاز تھے، وہ ایک سنجیدہ عالم دین، ریاست اسلام پور کے شاہی طبیب اور نقشبندی ابوالعلائی سلسلہ کے شیخ کامل تھے۔ نفاست و نظافت ان کی طبیعت کا خمیر تھا۔ ان کا ظاہر باوقار اور ان کا باطن کمال تقوی کا آئینہ دار تھا، میں نے حضرت والاؒ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ:۔

ؔ مضمون "سید سلیمان ندوی مرحوم" از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم۔ ماہنامہ چراغ راہ (کراچی) بابتہ اپریل ۵۴ء

[1] مضمون مولانا گیلانی بعنوان "سید الملت کی مکتبی زندگی" شائع شدہ سلیمان نمبر ریاض

[2] مضمون سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب شائع شدہ سلیمان نمبر معارف۔

"میں نے اپنے والد ماجدؒ اور حضرت مولانا تھانویؒ سے زیادہ باہمہ و بے ہمہ ہستیاں اپنی عمر میں نہیں دیکھیں، بے ہمہ تو ایسے تھے کہ اپنے ذاتی معاملہ میں ان کو کسی سے کوئی تعلق نہ تھا اور باہمہ ایسے کہ دُور دُور کے عزیز و اقارب کے ادنیٰ سے ادنیٰ حق کی ادائیگی پر بھی نظر رہتی تھی اور اس میں تاخیر گوارا نہ فرماتے تھے۔"

حضرتِ والاؒ کی والدہ ماجدہ بھی ایک عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں اور عشق نبوی سے ان کو خاص حصّہ ملا تھا، اُن کے حُبِّ نبوی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے جب وہ زیارت حرمین سے مشرف ہوئیں تو دیارِ حبیب کی محبّت ان پر اس درجہ غالب آگئی کہ اپنا ہندوستانی لباس ترک کر کے قریب قریب وہی لباس اختیار فرما لیا جو اس زمانہ میں عرب خواتین پہنتی تھیں، بقول مولانا گیلانیؒ "عجمی عربی کے وطن پہنچ کر ہندیہ مستعربہ بن گئی تھیں[1]۔

حضرتِ والاؒ کے حقیقی بڑے بھائی مولانا سیّد ابو حبیبؒ (ف ۱۳۴۶ھ) جو حضرت سے عمر میں ۱۸ برس بڑے تھے دیسنہ کے مشہور طبیب، جید عالم اور قطبِ وقت شاہ ابو احمد بھوپالی قدس سرہٗ سے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں اجازت بیعت رکھتے تھے، مولانا گیلانی کا بیان ہے:۔

"نقشبندی سلسلہ کے مجاہدات و ریاضات میں جو محنتیں انھوں نے برداشت کیں ہم تو شاید ان کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے، ان کا یہ ایک معمولی مجاہدہ تھا کہ جہاز سے اُترنے کے بعد حج و زیارت کا سارا سفر پیادہ پا پورا فرمایا تھا، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے تو عاشق زار تھے، ایک دفعہ فرمانے لگے کہ "مکاتیب طیبہ" کے خاص

---

[1] مضمون مولانا گیلانی بحوالہ سابق۔

پہلوؤں پر میں نے کچھ لکھا ہے[1]! لیکن افسوس کہ وہ شائع نہ ہو سکا"[2] ______ خود حضرتِ والا فرماتے تھے کہ" ہمارے بھائی صاحب" حافظ مکتوبات" مشہور تھے، بدعات سے ان کو سخت نفرت تھی اور سنّت سے اس قدر شغف تھا کہ شاہ ابو احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب تک بھوپال جا کر اس نقطۂ نظر سے خوب دیکھ اور پرکھ نہیں لیا اس وقت تک اپنی ارادت کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں نہیں دیا اور بعد ارادت بھی اپنے شیخ کی تعریف میں یہی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت کے عمل کو دیکھ کر سنّت مطہرّہ کی جزئیات تک نظروں کے سامنے آجاتی ہیں"۔

درویش عالم حافظ تجمل حسین صاحبؒ جو قطب آفاق شاہ فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ رشید اور خود صاحبِ حال بزرگ تھے۔ حضرت والاؒ کے رشتہ کے چچا تھے۔ حافظ صاحبؒ نے گنج رحمانی اور فضل رحمانی کے زیرِ عنوان اپنے شیخ عالی مقام کے ملفوظات قلمبند فرمائے ہیں جو تقسیم ہند سے پہلے عام طور پر ملتے تھے، اپنے

---

[1] مضمون مولانا گیلانی بحوالہ سابق

[2] میرے علم میں مولانا ابو حبیب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اور قلمی متروکہ بھی ہے، مولانا نے اپنے سلسلۂ نسب کے افراد کی پوری تاریخ فارسی زبان میں تحریر فرمائی تھی اور اپنے جدامجد کے حالات تک اس کو پہنچا سکے تھے بعد میں ہمارے حضرت والاؒ نے اسی زبان میں اس کی تکمیل فرمائی ۱۹۵۲ء میں حضرتِ والاؒ نے اس کا صاف شدہ مسودہ مجھے عنایت فرمایا تھا کہ میں اس کا اردو ترجمہ کروں، مگر بعض مصروفیات کی وجہ سے جو حضرت والا سے مخفی نہ تھیں میں اس ارشاد کی تعمیل سے معذور رہا اور اس عرض کے ساتھ کہ وقت نکل آنے پر اس خدمت کو اپنی سعادت سمجھوں گا اس مسودہ کو حضرتِ والا ہی کے حوالہ کر دیا، مگر پھر تو جو وقت نکل گیا سو نکل گیا بہرحال ترتیب سوانح کی سعادت جس کسی کے حصہ میں بھی آئے اس مستند مآخذ سے استفادہ اس کے لئے ضروری ہے۔ (غ۔م)

دور کے علماء میں حافظ صاحب کی شخصیت خاصی معلوم و معروف تھی اور ان کے لطائف و ظرائف عام تھے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے ملفوظات میں بھی حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ملتا ہے۔

ولادت | جن بیدار مغز اور روشن ضمیر بزرگوں کا اجمالی تذکرہ اوپر کیا گیا، ان کے برکاتِ ظاہری اور انوار باطنی سے معمور فضا میں جمعہ کے مبارک دن ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ (م ۱۲ دسمبر ۱۸۸۴ء) کی صبح کو حکیم سید ابوالحسن دیسنوی کے گھر ایک پیکرِ جمال نمودار ہوا، دیدہ ور جدامجد (حکیم محمدی رحمۃ اللہ علیہ) کی نظریں نوزائیدہ پوتے پر پڑیں تو پیشانی کی چمک میں تاپیدا مستقبل کی رفعتیں دیکھ گئیں، نام انیس الحسن اور کنیت ابونجیب رکھی اور فرطِ خوشی میں یہ قطعہ موزوں فرمایا ؎

قطعہ

سعیدِ حسن ہست فرزند من	شدہ بوالحسن نام نیکو خصال[1]
خدایش عطا کرد نورِ بصر	کہ یعنی پسر شد بہ حسن و جمال
بشہر صفر چوں شدہ بود سنہ	جواں بخت آمد چو ماہ ھلال
بروزِ آدینہ[ع] بوقتِ سعید	بیامد مثالِ گلِ نونہال
ز آزار و آشوبِ چشم بدش	نگہدارش آن ایزدِ لایزال
بدولت قوی باد و عمرش دراز	کند شادمانی بہ ہر ماہ و سال
بہ اقبال و دولت کند سروری	سر دشمنانش شود پائمال
نہادیم نامش انیس الحسن	بود حافظش حضرتِ ذوالجلال

---

[1] یعنی حضرت والا کے پدر بزرگوار حکیم سید ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ۔

[2] یہ قطعہ حضرت حکیم محمدیؒ کی بیاض سے نقل کیا گیا ہے۔ [ع] یعنی جمعہ۔

چو جستیم تاریخ او از خرو یکایک سروشے ز تاریخ و سال
بگفتا کہ بے داد شد مصرعہ
شدہ مہر تاباں ز برج کمال

سنہ ۱۳۰۲ھ

سلیمان کی وجہ تسمیہ رکھنے کو تو روشن ضمیر دادا نے اپنے پوتے کا نام انیس الحسن رکھا اور بعد میں دنیا نے بھی دیکھا کہ حسنی صلح جوئی، ان کا نمایاں خلق تھا، اسی طرح نسبی شرافت کے اعتبار سے ابو نجیب کی کنیت بھی ہر طرح ہی موزوں تھی مگر چشم قدرت کچھ اور دیکھ رہی تھی اور اس کے تقاضے اور ہی تھے وہ ایک ایسا نام چاہتی تھی جو نو مولود کے آئندہ اوج و کمال کا ترجمان ہو۔ چنانچہ ایک ادنیٰ بہانے سے قدرت کا چاہا پورا ہو گیا۔

ہوا یہ کہ عین اسی زمانے میں ایک رنگونی تاجر سلیمان[1] ناخدا کا ایک جہاز بیرونی سامانِ تجارت سے لدا ہوا خلیج بنگال میں داخل ہوا اور اس کی آمد سے مشرقی ہندوستان میں ایک دھوم مچ گئی، گھر گھر ہر ایک کی زبان پر سلیمان کا نام آنے لگا، حکیم محمدی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں بھی اس کا چرچا ہوا۔ گھر والوں نے محبت سے ابو نجیب کو پکارا کہ ہمارا سلیمان تو یہ ہے اور ایک دن اس کا شہرہ بھی گھر گھر ہو جائے گا ——— یہ دراصل اتفاقی نہیں بلکہ ایک القائی چیز تھی، غیر شعوری طور پر انیس الحسن اور ابو نجیب کے الفاظ ذہنوں سے محو ہو گئے اور جو نام اللہ تبارک و تعالیٰ کو پسند تھا وہی باقی رہا، مقبول ہوا، شہرت پا گیا، پھر جب سلیمان شعور کو پہنچے تو انہوں نے اپنا نام سید سلیمان لکھا[2]

---

[1] جس نے کلکتہ کی مشہور مسجد ناخدا تعمیر کروائی تھی۔ [2] یہ وجہ تسمیہ میں نے خود حضرت والا سے سنی تھی اور بعد رحلت اسکی مزید توثیق حضرت کے صاحبزادے جناب سید سلمان سلمہٗ اور برادر زادہ جناب سید ابو عاصم صاحب سے حاصل کر لی ہے۔ مولانا ابو ظفر ندوی نے جو حضرت والا کے برادر زادہ ہی ہیں جو وجہ تسمیہ اپنے مضمون (شائع شدہ سلیمان نمبر معارف) میں لکھی ہے وہ صحیح نہیں ہے موصوف کو تسامح ہو گیا ہے۔

پھر دنیا کو ماننا پڑا کہ وہ سلیمانِ علم و عرفان تھے اور ان کے خزینۂ علمی و عرفانی سے ملّتِ اسلامیہ مالامال ہوگئی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

لفظ ندوی جزوِ نام کیوں بنا؟ سیّد سلیمان ایک پورا نام تھا، ہر سابقہ اور لاحقہ سے بے نیاز اور یوں بھی حضرت والا کے ذوق لطیف پر زوائد بہت گراں تھے مگر جو چیز غیب سے بن آئے اور مقدّر ہو جائے اس کو نہ تو کوئی روک سکتا ہے، نہ اس میں کوئی ناگواری باقی رہ جاتی ہے کیونکہ وہ ایک طرح کی شانِ مقبولیت لئے ہوئے آتی ہے!

مشیّتِ الٰہی کو یوں ہی منظور ہوا کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۶ء کے درمیان پانچ سلیمان پیدا ہوئے اور ان پانچوں کو عزّت وعظمت کے لئے چن لیا گیا۔ عمر کے تفاوت کے باوجود ایک ہی وقت میں سب کی شہرت عام ہوگئی، کوئی پختگی کی عمر کو پہنچ کر نمایاں ہوا تو کوئی نوعمری ہی میں چمک اٹھا، غرض آسمانِ شہرت پر آئے تو کہکشاں بن کر۔ مشہور عالم واعظ اور صوفی شاہ سلیمان پھلواروی کو اولیت اور سید سلیمان دسنوی کو خاتمیت کا شرف ملا درمیان میں قاضی سلیمان منصورپوری (مصنّف رحمۃ للعالمین) مولانا سلیمانؒ اشرف بہاری (سابق صدر شعبۂ دینیات علی گڑھ یونیورسٹی) اور سر شاہ سلیمان (وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی) آئے۔ اس اجتماع کی وجہ سے تخصیصِ اسمی کی غایت یعنی امتیاز و تعارف فوت ہوگئی تھی۔ ایک کا اسمِ گرامی سُن کر دوسرے کی شخصیت کا ذہن میں آجانا بعید نہ تھا۔ [۱]

---

[۱] چنانچہ ایک لطیفہ سننے کے قابل ہے، علامہ موصوف اپنی شہرت کے شباب کے زمانہ میں کسی تقریب سے حیدرآباد تشریف لے گئے، اتفاق سے اس وقت دربھنگہ والے استاد وہاں موجود تھے انہوں نے اخبار میں پڑھا کہ مولانا سید سلیمان صاحب تشریف لائے ہیں اور فلاں جگہ مقیم ہیں تو وہ شاہ سلیمان پھلواروی کو سمجھ کر ان سے ملنے آئے مگر ان کے بجائے ایک دوسرے ہی سلیمان کو پایا۔ (سلیمان نمبر معارف ص ۵۰)۔

حضرتِ والا نے اس ضرورت کے ماتحت اپنے نام کے ساتھ دیسنوی کے لفظ کا اضافہ فرمایا۔ چنانچہ ابتداء میں جو مضامین معارف میں چھپے ہیں ان میں سید سلیمان دیسنوی ہی لکھا ہے[1] لیکن یہ خاکی نسبت نہ تو سلیمان کو زیب دیتی تھی، نہ چل سکی، قدرت نے اس کو بہت جلد علمی نسبت سے بدل دیا، جس نسبت کو مجبوراً گوارا فرمالیا گیا تھا اس سے دل اُتر گیا، دیسنوی کی بجائے ندوی لکھنے لگے۔ یہ نسبت معلوم ہوتا ہے قضا و قدر کی مجوزہ تھی، اس قدر مقبول ہوئی اور نام سے کچھ اس قدر میل کھا گئی کہ خود نام ہی کا جزو بن گئی، اب نام سید سلیمان نہیں رہا بلکہ سید سلیمان ندوی ہو گیا اور آج علامہ ندوی یا مولانا ندوی کے الفاظ کے ساتھ ہر ذہن میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی تصویر اسی طرح بلا تکلف کھنچ آتی ہے جیسے مولانا روم کہتے ہی جلال الدین رومی (قدس سرہٗ) کا خیال، یا امام غزالی کی صدا پر امام محمد غزالی کا تصور قائم ہو جاتا ہے!

لڑکپن ہی میں تخمِ معرفت کی کاشت

جس دور میں شعورِ سلیمانی نے پرورش پائی، اس میں یوں بھی علم و عمل اور ظاہر و باطن کی دوئی ایک بے معنی بات تھی۔ "گر عمل در تو نیست نادانی" والا معیار ابھی قائم و برقرار تھا، پھر خصوصیت سے سلیمانی گرد و پیش تو آپ دیکھ ہی چکے کہ برکات روحانی اور انوارِ علمی سے جگمگا رہا تھا، ایسی صورت میں نونہالِ سلیمان کو تعلیم و تربیت کے لئے گھر سے

---

[1] سچ یہ ہے کہ ندوی صرف وہی کہلانے کے مستحق تھے، انہی کی ذاتِ اقدس تحریک ندوہ کی ترجمان تھی، انہوں نے اپنی علمی جامعیت اور اخلاقی فضیلت سے علمائے قدیم اور نو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا، ایک کو افادے کے ڈھنگ سکھائے دوسرے کو ضرورت استفادہ کا احساس دلایا ان کا احسان ملت کے ہر فرد پر یکساں ہے اور وہ بلاشبہ سید الملت ہیں۔ خود ان کے معاصر شہیر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی علانیہ اعتراف فرمایا کہ "آپ علماء اور تعلیم یافتوں کے درمیان ایک سفیر و متوسط کی حیثیت رکھتے ہیں"۔ (دیکھئے یادِ رفتگان ص ۴۴۵)

باہر قدم نکالنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اپنے برادرِ بزرگ مولانا ابو حبیبؒ مجددی ہی سے اکتساب کا آغاز ہوا، بحیثیت استاد وہ حضرتِ والاؒ کو میزان و منشعب پڑھاتے تھے اور بحیثیت پیر طریقت اپنے حلقۂ توجہ میں بٹھا لیتے تھے، خود حضرت والا کا ارشاد ہے کہ:۔

"میں اپنے بھائی صاحب کے فیضِ صحبت سے اپنے قلب میں پاکی محسوس کرتا تھا۔"

اس واقعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قلب سلیمانی میں تخم معرفت کی کاشت لڑکپن ہی میں ہو چکی تھی، البتہ اس کی آبیاری مرشد تھانوی قدس سرہٗ کے ہاتھوں انجام پائی!

توحیدِ خالص کی تلقین

یہ حضرت ابو حبیب قدس سرہٗ کی فراستِ ایمانی کا کھلا ثبوت ہے کہ لڑکپن ہی میں انہوں نے اپنے سعادت آثار بھائی کے مزاج و رجحان کو سمجھ لیا تھا اور تربیت ایسے نہج سے فرمائی تھی کہ جو نقوش قلبِ سلیمانی پر مرتسم ہوئے وہ مدت دراز تک قائم رہے اور آخر عمر میں وہی گہرے ہو کر لافانی ہو گئے۔

مولانا ابو حبیبؒ کو گاؤں کی مسلمان خواتین کے دینی اصلاح کی دھن تھی اور غالباً اس دوربینی کی وجہ سے تھی کہ ایک عورت کی اصلاح دراصل ایک گھر کا بناؤ ہے اس کے لئے مولانا نے ہفتہ وار مجالس وعظ کا سلسلہ جاری فرما رکھا تھا، اور باوجودیکہ خود ایک عالم تھے وعظ کی صورت یہ اختیار فرمائی تھی کہ جب خواتین جمع ہو جاتیں تو مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویت الایمان" کتاب۔ اپنے زیر تربیت بھائی کے ہاتھ میں دے کر ان کو پردہ میں خواتین کے سامنے بٹھا دیتے تھے، اب ہمارے حضرت والاؒ اپنی معصومانہ زبان سے اس کو پڑھتے جاتے اور خود شاہ ابو حبیبؒ صاحب پسِ پردہ اس کی وضاحت فرماتے جاتے تھے۔ یہ عجیب طریقہ وعظ و تلقین کا پیش فرمایا گیا تھا، جس میں وعظ کا

عالمانہ فخر ملیامیٹ ہوجاتا ہے، بزرگوں کے اقوال اور ان میں پوشیدہ فیوض سے بہرہ یابی ہوتی ہے۔ پردہ دار سننے والیوں کی توجہ ایک محسوس واسطہ کی طرف متوجہ رہتی ہے اور خود جس کو آلۂ تبلیغ بنایا گیا ہے وہ تو لامحالہ واسطۂ فیض بن کر سب سے زیادہ مستفیض بھی ہوتا ہے ــــــ کوئی عجب نہیں کہ صاحبِ دل مربی کی نیت اس میں اپنے چہیتے بھائی کی خصوصی تربیت کی ہی رہی ہو، نتیجہ اور اثر تو اسی گمان کو یقین تک پہنچا رہا ہے ــــــ حضرت والاؒ خود فرماتے ہیں :۔

"جو وہ فرماتے میرے دل میں بیٹھتا جاتا تھا ــــــ یہ (تقویت الایمان) پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دینِ حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں اور کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی و ابنِ رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گذرے مگر اسمٰعیل شہیدؒ کی تلقین بہرحال اپنی جگہ قائم رہی۔"[1]

یہ بھی سلوکِ نبوت کے راہی مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی اسی کتاب لاجواب کا اثر ہوگا کہ طریق باطن میں حضرتِ والاؒ کو سلوک ولایت سے کبھی مناسبت نہیں ہوئی، وجد و حال یا خلوت گزینی کی طرف کبھی رجحان نہ ہوا اور سکر و شطح اور تشبیہ سے حضرت کا حال و قال ہمیشہ محفوظ رہا۔[2]

ابتدائی تعلیمی دور | مولانا ابو حبیبؒ سے ابتدائی تعلیم اور بنیادی تربیت پا کر

---

[1] ملاحظہ ہو حضرت والاؒ کا مضمون مشمولہ "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" مرتبہ مولانا محمد عمران خان ندوی۔

[2] سلوک نبوت اور سلوک ولایت کا فرق سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہو "مبادی تصوف" از حضرت مولانا تھانویؒ۔

حضرت والا اپنے والد ماجد کے پاس اسلام پور پہنچے، وہاں کچھ کتابیں ختم کی تھیں کہ ۱۸۹۹ء میں پھلواروی شریف (پٹنہ) بھیج دیئے گئے۔ یہاں ایک برس خانقاہ مجیبی میں رہ کر مولانا محی الدینؒ (سجادہ نشین خانقاہ پھلواری شریف) سے کچھ اور کتابوں کی تکمیل فرمائی مگر خانقاہ کے مبتدعانہ رسوم اور ہفتہ وار قوالی وغیرہ سے بالکل مجتنب رہے، راقم سے ایکبار فرمایا کہ "جو رنگ بھائی صاحب کی مجالس میں چڑھ چکا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ طبیعت کو یہاں کے رسوم سے ذرا بھی مناسبت نہ ہوسکی"۔

پھلواری کے بعد حضرت والا مدرسہ امدادیہ دربھنگہ بھیج دیئے گئے اور یہاں بھی ایک سال رہ کر درس نظامیہ کی بعض اور کتابیں ختم فرمائیں۔ اس وقت حضرتِ والاؒ نے عمر کی سترہ منزلیں طے فرمائی تھیں۔

اس دور کی متانت

مولانا گیلانیؒ نے حضرت والا کے ایک ہم درس مولوی سید حنیف صاحب کی روایت نقل کی ہے کہ:۔ "ایامِ طفلی ہی سے فطرۃً سید صاحب کچھ خاموش رہنے کے عادی تھے، بچوں کی عام شرارتوں سے ان کی طبیعت کو جبلتہً کسی قسم کی مناسبت نہیں تھی، اس لئے شرارت وغیرہ کے قصوں میں سید الملت تنبیہ کے بہت کم محتاج تھے"۔[1]

ایک اور ہم درس اور بے تکلف ساتھی مولوی جواد علی خاں صاحب عالی کی شہادت بھی سنئے، لکھتے ہیں:۔

> "اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے کبھی سخت کلام یا لب و لہجہ سخت نہ ہوتا، درسی کتابوں کی تکرار میں لب و لہجہ البتہ زوردار ہوتا اور بیان کی قوت و روانی سے شرکاء کے دل پر متکلم کا رعب بیٹھ جاتا"۔

---

[1] سلیمان نمبر" ریاض"۔

متانت ہر انداز پر غالب رہتی، کبھی ٹھٹا مار کر ہنستے نہ تھے، بے تکلفی میں ظرافت سے باز نہ آتے، اس میں بھی متانت قائم رہتی، اگر کوئی ناگواری ہوتی تو اس کی غمازی چشم و ابرو ضرور کرتے مگر زبان پر قابو رہتا[۱]

اسی طرح حضرت والا کے برادر زادہ مولانا ابوظفر ندوی، جو حضرت سے چار ہی برس چھوٹے ہیں رقمطراز ہیں :۔

"علامہ موصوف بچپن سے کم سخن اور خاموش طبیعت کے انسان تھے اُن کے اساتذان کو غبی اور کند ذہن سمجھتے تھے اور ان کے تیز زبان ساتھیوں کو ذہین اور صاحبِ ذوق سمجھ کر ان کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے"۔

پھر آگے چل کر لکھا ہے کہ "جب ان کا فضل و کمال ظاہر ہوا تو مکتب کے اساتذہ کو حیرت در حیرت ہوئی۔ شاگرد کے کمال پر بھی اور اپنے اندازے کی غلطی پر بھی!!"[۲]

اس سنجیدگی اور متانت کا باعث افتادِ طبع تو ہے ہی جو قدرت کا بے طلب عطیہ ہے، لیکن تربیت کے ہاتھ اس کو اور بھی صیقل کر دیتے ہیں، چنانچہ شاہ ابوجیب[رح] صاحب کی خصوصی تربیت کے ساتھ ساتھ خود حضرت والا کے والد بزرگوار کی توجہات کا حال مولانا گیلانی نے یہ تحریر فرمایا ہے :۔

"تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت پر بقول مولوی حنیف صاحب سیّد الملت کے والد ماجد ہی کی کافی توجہ تھی، نشست برخواست، گفتار رفتار ہر مسئلہ میں دیکھتے رہتے تھے کہ کوئی نامناسب بات بچوں سے سرزد

---

[۱] سلیمان معارف نمبر، سیرت سلیمانی کا امتیازی اور خاص وصف ہے جو ہر دور میں نمایاں رہا [۲] سلیمان نمبر معارف ص۵

نہ ہو، اس باب میں ان کی نزاکتِ احساس کا حال یہ تھا کہ دسترخوان
پر ایک دن جب سید الملت بھی اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ کھانے میں
مشغول تھے، چباتے ہوئے ہلکی سی آواز بھی پیدا ہوئی، دیکھا گیا کہ بے ساختہ
ایک چپت رسید کی گئی۔ سید صاحب کے والد ماجد کہتے جاتے تھے کہ آدمی
کے بچوں کو آدمی کے بچوں کی طرح کھانا کھانا چاہیئے۔ کھاتے ہوئے مُنھ سے
آواز تو کُتّے نکالتے ہیں ... ...

سچ تو یہ ہے کہ عادات و اخلاق کے جس شریفانہ معیار کو سید صاحب کی زندگی
پیش کرتی رہی اس معیار کو قائم کرنے میں مکتبی زندگی کی ان کڑی نگرانیوں کو بھی غالباً
دخل تھا۔[1]

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی خدمت میں حاضری طالب علمی کے زمانہ میں

حضرتِ والاؒ ایک مرتبہ حضرت مولانا سید محمد علی کانپوری ثم مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی
خدمت میں حاضر ہوئے جو قطب آفاق حضرت شاہ فضلِ رحمٰن گنج مراد آبادیؒ کے
خلیفۂ اجل تھے۔ اس زمانہ میں حضرتِ والاؒ کو معقولات کی کتابوں سے غیر معمولی دلچسپی
تھی۔ جب حاضر ہوئے تو مولانا مونگیریؒ نے پوچھا کہ مولوی سلیمان آج کل کون سی
کتابیں زیرِ درس ہیں؟ جواب میں حضرتِ والاؒ نے سارے نام معقولات کی
کتابوں کے گنوائے تو ارشاد فرمایا، ان کتابوں کو پڑھ کر کیا فائدہ ہوگا؟ حضرت نے
فوراً عرض کیا کہ ان کو دین کی خدمت کے لئے استعمال کروں گا! شیخ عارف نے فرمایا کہ
دین تو بس قرآن و حدیث میں ہے اور وہ ان کتابوں پر منحصر نہیں مگر افسوس کہ جس
کو "دینی نصاب" کہا جاتا ہے اس میں تمام تر معقولات اور فلسفہ ہی پڑھایا جاتا ہے

[1] سلیمان نمبر۔ ریاض۔

اور قرآن وحدیث برائے نام! [1]

حضرت مولانا مونگیری رح کا یہ انتباہ آئندہ زندگی میں سلیمانی علمی خدمات کا طغرائے امتیاز بن گیا اور خود اپنی بات کو بھی کہ معقولات کو خدمت دین میں صرف کروں گا، حضرت نے ایسا سچ کر دکھایا کہ وہ جامع معقول ومنقول علماء کے لئے دینی علمی خدمات کا ایک قابل اتباع نہج بن گیا۔ سیرت النبیؐ کی آخری چار مجلدات سیرۃ عائشہ اور خطبات مدراس کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ قرآن و حدیث پر بنیاد رکھتے ہوئے معقولات کو کس طرح دینی تفہیم واستدلال میں برتا گیا ہے!

ندوہ میں داخلہ مدرسۂ امدادیہ دربھنگہ کے ایک سالہ قیام کے بعد ۱۹۰۱ء میں حضرت والا رح ذہن وفکر کی آخری تربیت گاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل کرائے گئے اور پانچ سال رہ کر ۱۹۰۶ء میں سند فراغ حاصل کی۔

ندوہ پہنچ کر حضرت والا کو علامہ شبلی جیسے بے مثل ادیب ومورخ، فلسفی ومتکلم

---

[1] یہ روایت راقم الحروف نے حضرت مونگیری نور اللہ مرقدہٗ کے پوتے اور خلیفہ، محدث جلیل حضرت مولانا سید فضل اللہ الجیلانی مدظلہٗ (صاحب فضل اللہ الصمد فی توضیح الادب المفرد) سے سنی حضرت ممدوح میرے شیخ حضرت علامہ ندوی کی علمی فضیلت اور روحانی مرتبت کے بڑے معترف اور شاذ اسی نسبت سے راقم عاجز پر خاص نگاہِ لطف قیام حیدرآبادہی سے فرماتے رہتے پچھلی مرتبہ جب کراچی تشریف فرما تھے تو، صفر المظفر ۱۳۹۱ھ م ۱۴ اپریل ۱۹۷۱ء صبح کے وقت از خود احقر کے غریب خانہ پر تشریف لائے، اور بلا طلب کیا معنی بالکل بے سان وگمان احقر کو وضو کرنے کا حکم دیا۔ وضو کرکے حاضر ہوا تو احقر کا داہنا ہاتھ اپنے دونوں دستِ مبارک میں پکڑ کر احقر کو سلسلۂ نقشبندیہ اور قادریہ میں خلافت سے سرفراز فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ "میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں اس لئے میرا جی چاہتا تھا کہ یہ کام آپ کے سپرد کردوں"۔ پھر جب کراچی سے ہندوستان مراجعت کا وقت آیا تو تحریری سند بھی (بہ زبان عربی) عطا فرمادی، اور بشارتوں سے سرفراز فرمایا ؎ بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو ؛ بے غرض جو دیا، دیا "اس" نے

محقق و مفکر کی آغوشِ تربیت میسر آئی جس میں خداداد صلاحیتیں خوب نشو و نما پا گئیں، لیکن جس جامعیت علمی کے وہ حامل تھے اس میں دارالعلوم کے اور اساتذہ کا بھی ناقابلِ نظر انداز حصہ ہے۔ مثلاً حضرت والا نے پورے تین سال تک امام معقولات مولانا محمد فاروق چریاکوٹی رح سے منطق، فلسفہ اور عربی ادب کی تحصیل فرمائی جو خود مولانا شبلیؒ کے بھی استاذ تھے[1]۔ علم حدیث اور ہیئت کی تکمیل مولانا حفیظ اللہؒ مدرس دارالعلوم ندوہ سے فرمائی جو مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے خاص شاگردوں کی آخری یادگار تھے۔ اسی طرح علم فقہ میں دست رس فقیہ کامل مولانا مفتی عبداللطیفؒ کے زیر تربیت بہم پہنچائی البتہ کلام، تاریخ، اردو ادب میں تمام تر علامہ شبلی سے مستفیض رہے اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف کا اعلیٰ مذاق یہیں سے پایا۔ ان بلند پایہ اساتذہ کی توجہات کے علاوہ مہتمم مدرسہ شاہ سلیمان پھلواروی رح کی حوصلہ افزائیاں بھی حضرت والا رح کی علمی ترقی میں معاون رہیں[2] چنانچہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں خود حضرت والا کے قلم سے اس سلسلہ کا ایک واقعہ زیر تحریر آگیا ہے جو یہ ہے :-

طالب علمانہ امتیاز

"یاد ہے کہ اسی زمانہ میں نواب محسن الملک مرحوم دارالعلوم ندوہ کے معائنہ کے لئے تشریف لائے تھے شاہ صاحب نے مجھے اور میرے ہمدرس مولانا ظہور احمد صاحب وحشی شاہ جہانپوری کو امتحاناً پیش فرمایا تھا، میں نے نواب صاحب کے خیر مقدم میں عربی میں ایک

---

[1] حضرت تھانوی رح نے بھی مولانا چریاکوٹیؒ کا اعتراف ان الفاظ میں فرمایا ہے :- "بڑے فاضل تھے، خصوصاً ادب و معقول میں بہت مشہور تھے۔" (ملاحظہ ہو وعظ خیر الحیات وخیر الممات)

[2] یہ تفصیل میں نے حیات شبلی اور یادِ رفتگان کے اوراق سے اور سید صباح الدین صاحب کے مضمون محولہ سابق سے حاصل کی ہے!

قصیدہ لکھا تھا، شاہ صاحب نے یہ کہہ کر مجھے پیش کیا کہ یہ میرے عزیز ہیں اور آپ کو قصیدہ سنائیں گے۔ نواب صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ یہ جب آپ کے عزیز ہیں تو میں امتحان نہیں لوں گا کہ امتحان سے پہلے ہی ان پر ایمان لاچکا، شاہ صاحب نے فرمایا یہ میرے ہم نام بھی ہیں، نواب صاحب نے فرمایا تو اور بھی یہ امتحان سے بالاتر ہیں

میں نے اپنا قصیدہ پڑھا تو نواب صاحب نے فرمایا کہ میں تو اس پُرانی ادب دانی کا قائل نہیں، عربی کا کوئی اخبار منگوائیے اس کو یہ پڑھیں تو البتہ!۔ اس زمانہ میں اللّواء اور المؤید عربی کے مشہور اخبار تھے، وہ منگوائے گئے، میں نے ان کو پڑھا اور صحیح ترجمہ کیا تو بے حد خوش ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بے حد محظوظ ہوئے اور اس زمانہ کے اخبارات وکیل، وطن اور کرزن گزٹ میں نواب صاحب کے اس معائنہ کی جو کیفیت چھپوائی، اس میں میرا ذکر خاص طور سے فرمایا، یہ اخبارات میں میرا پہلا ذکر تھا، ان کی (یعنی شاہ صاحب کی) اس تحریر میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ ملک و ملت کی خدمت کے لئے انشاءاللہ صوبۂ بہار ہر دَور میں ایک سلیمان پیش کرتا رہے گا۔"[1]

عطائے سند اور آغاز شہرت

سند پانے کو تو سیکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں سند پاتے ہی رہتے ہیں مگر حضرت والا کا سند پانا کچھ اور ہی مجد و شرف کی شان لئے ہوئے تھا وہی ساعت جس میں وہ فارغ التحصیل ہونے کی سند پا رہے تھے قدرت ان کے سر پر شہرت و عظمت کا تاج رکھ رہی تھی، یہ مستقبل کے سلیمانی شکوہ کی طرف چشم قدرت کا اشارہ تھا حضرت نے "اُس حیات شبلی" میں جس کی تصنیف مرشد تھانوی قدس سرہٗ سے فیضیابی کے بعد ہوئی ہے عطائے سند کے واقعہ کو اس وجد آفریں فٹ نوٹ کے ساتھ تحریر فرمایا ہے:۔

"یہ میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، اس لئے بے اختیار نوک قلم پہ

---

[1] ملاحظہ ہو یاد رفتگاں ص۱۸۳

پر آگیا اگر ناظرین کو اس سے خود ستائی کی بُو آتی ہو تو چشم پوشی فرمائیں"۔

اب اصل تفصیل سنیئے:۔

"دارالعلوم ندوہ کو کھلے ہوئے نو دس برس گذر چکے تھے مگر ابھی تک اس کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا کوئی جلسہ جس کا رواج ہندوستان کے عام مدرسوں میں ہے نہیں ہوا تھا۔ اسی غرض سے مارچ ۱۹۰۷ء مطابق محرم ۱۳۲۴ھ میں رفاہِ عام لکھنؤ کے وسیع ہال میں جلسہ دستار بندی کے نام سے ندوہ کا عام سالانہ جلسہ ہوا جس کی صدارت مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری مرحوم نے کی، جو شروع سے ندوہ کے شریک و معاون رہے تھے، اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جدید و قدیم علوم کے ماہرین اور اساتذہ کی نہایت اچھی تعداد شریک تھی، جو دارالعلوم کے بلند بانگ دعووں کا امتحان کرنا چاہتی تھی۔

مولانا (شبلیؒ) نے اس جلسہ میں پیش کرنے کی غرض سے اپنے چند منتہی طالب علموں کو بعض عنوانات پر تقریر کے لئے تیاری کی ہدایت فرمائی، اس ضمن میں مجھی مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی (ایم۔اے رجسٹرار انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد) نے قرآن مجید کے اعجاز و بلاغت پر اور راقم نے علوم جدیدہ و قدیمہ کے موازنہ پر تقریر کی، اسی تقریر کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلسہ کو تماشا گاہ اور سامعین کو آئینہ حیرت بنا دیا، یعنی راقم کی تقریر کے اثناء کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو بے شبہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں، مولانا حسب قاعدہ جلسہ سے باہر چلے گئے ، مولوی سید عبد الحی صاحب مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ "تم کر سکتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا اور عربی میں تقریر شروع کی ، جلسہ پر ایک سماں چھا گیا۔ مولانا کو باہر یہ خبر معلوم ہوئی تو فوراً اندر آئے اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ " اگر تم کو اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم تقریر کر سکتے ہو؟" میں نے پھر اثبات میں جواب دیا تو مولا

نے مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس طالب علم نے جو تقریر کی اس کی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے تھے، اس رفع بدگمانی کے لئے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت کوئی موضوع دے سکتے ہیں، یہ اس پر تقریر کریں گے۔

چنانچہ موضوع کے تقرر کے لئے لوگوں نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نام پیش کیا جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور جلسہ میں موجود تھے، انھوں نے یہ موضوع مقرر کیا کہ "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہو"۔ میں نے اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کئے، ہر طرف سے احسنت و آفریں کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں، استاذ مرحوم نے جوشِ مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پر باندھ دیا جو اس خاکسار کے واسطے ہمیشہ کے لئے عزۃ افتخار بن گیا۔[1]

استاذ کی نظر میں شاگرد کا مقام

مذکورہ واقعہ سے مولانا شبلی رح کا فرطِ مسرت و محبت ظاہر ہی ہے مگر مولانا نے اپنے مایہ ناز شاگرد کے کرشمۂ علمی و لسانی کی اطلاع مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم کو جن الفاظ میں فرمائی ہے اس سے تاثر کی انتہا ظاہر ہوتی ہے، لکھا ہے:۔

"......سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھ کو بتایا جاتے میں اسی وقت عربی زبان میں اس پر لکچر دوں گا، غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا اور بغیر ذرا سی دیر کے سلیمان نے نہایت مسلسل فصیح اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی، تمام جلسہ محوِ حیرت تھا اور آخر لوگوں نے نعرہ ہائے آفرین کے ساتھ خود کہا کہ بس اب حد ہو گئی"۔[2]

اس کے بعد حضرت والا رح کی ہر تقریر، تحریر اور تحقیق استاذ عالی مقام کے دل میں

---

[1] و [2] حیاتِ شبلی ص ۲۵۶ تا ص ۲۵۸

شاگرد کی عظمت کو بڑھاتی ہی چلی گئی، یہاں تک کہ ذاتِ سلیمانی علامہ شبلی کی نظرِ انتخاب کا حصہ بن گئی تھی، چنانچہ جب چل چلاؤ کا وقت قریب محسوس ہوا تو علامہ شبلی کو سب سے زیادہ رنج سیرتِ نبوی کی ناتمامی اور فکر اس کی تکمیل کی تھی، جب تھوڑی طاقت تھی، اسی وقت سیرۃ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تمام مسودات اور مبیضے کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کروا دیئے اور عزیزوں کو جو تیمارداری میں مصروف تھے یہ وصیت فرمائی کہ:

"یہ مسودے حمید الدینؒ[1] اور سید سلیمانؒ[2] کے سپرد کئے جائیں، ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دیے جائیں"۔[3]

پھر وفات سے تین دن قبل حضرت والاؒ کو پونا[2] کے پتہ پر تار دلوایا کہ فوراً چلے آئیں، چنانچہ تار پہنچتے ہی حضرت والاؒ اعظم گڑھ مضطربانہ آپہنچے۔ پھر جو کچھ ہوا حضرت والاؒ کی زبان اقدس سے سنئے اور اس سے استاذ کی نگاہ میں شاگرد کے اعتماد و اختصاص کا اندازہ لگائیے، حیاتِ شبلی کے صفحہ (۷۲۲) پر لکھا ہے:-

"لیکن آہ! جب ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سرہانے کھڑا تھا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، مولانا نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ "اب کیا رہا" پھر زبان سے دوبارہ فرمایا "اب کیا! اب کیا!! لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلا دیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی تو معانقہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے[3] سب کام چھوڑ کر

---

[1] مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ جو مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی تھے [2] ان دنوں حضرتِ والا اپنے استاذ ہی کے حکم سے دکن کالج پونہ میں عربی و فارسی کے لیکچرار تھے۔ [3] اس سے مولانا شبلیؒ کا ذاتِ رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے والہانہ تعلق بالکل عیاں ہے۔ [ع] حیات شبلی صفحہ ۷۲۱، ۷۲۲

سیرت تیار کردو" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، ضرور! ضرور!!"

شاگرد کے دل میں استاذ کی عظمت

استاذ کے تعلقِ خاطر کے بعد شاگرد کی وفاشعاری بھی لائق دید اور مثالی شان کی ہے حضرت والا فرماتے ہیں کہ "جب تک مولانا شبلی زندہ رہے میں نے اپنے نجی معاملات تک کو انہی کے ایما، اور حکم پر منحصر رکھا، ان کا ہر فیصلہ میرے لئے مفید اور تسکین بخش رہا۔" اس گہرے تعلق کے بعد استاذ کی مفارقت شاگرد کے لئے جس قدر کٹھن اور روح فرسا رہی ہوگی اس کا اندازہ ہر حساس دل کو ہوسکتا ہے، حضرت والارح فرماتے تھے کہ "مجھ پر اتنا شدید غم کبھی عمر بھر طاری نہیں ہوا، مجھے وفورِ غم سے اپنی زندگی کی کوئی توقع باقی نہ تھی، اور دیکھنے والے بھی محسوس کرنے تھے کہ میرا خون جل گیا ہے اور چہرہ زرد پڑ گیا ہے" ——— یہ بھی فرمایا کہ "مولانا کی رحلت کے عرصہ بعد تک مولانا کا خیال ذہن وقلب پر اس درجہ چھایا ہوا تھا کہ جب میں مطالعہ میں غرق ہوتا اور کوئی مشکل مقام آجاتا تو بے خیالی میں کتاب لے کر مولانا کے کمرے کی طرف نکل پڑتا تاکہ یہ مقام حل کرالوں، لیکن دو تین قدم چل کر ان کی جدائی یاد آتی تو حسرت کے ساتھ لوٹ آتا" ——— یہ ارشادات تو خود راقم نے سنے تائیداً حضرت والا کی تحریر بھی پڑھ لیجئے، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو ایک مکتوب میں اپنے اس حال سے مطلع فرمایا ہے:-

"باوجود اس کے کہ میں مولانا مرحوم کی وفات پر تجہیز وتکفین میں شریک تھا مگر بار بار بھول جاتا تھا کہ وہ وفات پاگئے اور ان کی وہی ہیبت مجھ پر بعد وفات بھی تھی جو زندگی میں تھی"۔ (مکاتیب سلیمان ص ۱۳۰)

حضرت والا کی اس شیفتگی اور وارفتگی کا اثر اس جاں گداز "نوحۂ استاذ" میں آج بھی دیکھا جاسکتا ہے جو حیاتِ شبلی کے ختم پر موجود ہے اور ان کے جذبۂ فدویت کے ثبوت میں اسی کتاب کے آغاز میں "محسن کی شکر گذاری" کے زیرِ عنوان یہ برملا اعتراف

بھی ملتا ہے کہ:-

"اس حیات شبلی کو لکھ کر اگر میں یہ سمجھوں کہ استاذ مرحوم کے احسانات کے بارے میں سبکدوش ہو گیا تو یہ ناشکری ہوگی، کیونکہ میری حقیر ذات پر ان کے جو احسانات ہیں وہ کیف وکم کے احاطہ سے باہر ہیں، ان کے تین سب سے بڑے احسانات تو ایسے ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہی ہے۔ سب سے اوّل یہ کہ انہوں نے اس بے مایہ کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا، اور اس قابل کیا کہ دو حرف لکھ پڑھ کر اپنی استطاعت کے بموجب دین وملّت کی خدمت بجا لا سکے، دوسرا یہ کہ تعلیم سے فراغت کے بعد جو طالب علم کا سب سے نازک دور آتا ہے اس میں اس کی ایسی دستگیری فرمائی کہ حصولِ علم اور شوقِ مطالعہ کے سوا کسی اور راہ میں بھٹکنے نہ دیا اور خاندان کے بزرگوں سے کہہ سن کر طبابت کے خاندانی پیشہ سے ہٹا کر علم وفن کے آستانہ پر لا کھڑا کیا، اور سب سے آخر یہ کہ انہوں نے اپنی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی بہ شکل وصیت اس کو سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، رحمت عالم سیّد اولادِ آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکارِ اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے، سب سے اول پہنچایا، یعنی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے مطالعہ، جمع وتنقید اور تالیف وتحقیق کی خدمت ابتدا ہی سے سپرد فرمائی جو الحمدللہ یہاں اس کے لئے سعادت کا ذریعہ ہے اور وہاں اس کے لئے آخرت کا ذخیرہ ہوگی!"

یہ اعتراف جس تأثر کے ساتھ فرمایا گیا ہے اس کا صحیح اندازہ راقم کو نہ ہو سکتا اگر اس کے سامنے ایک اور واقعہ پیش نہ آتا، وفات سے چند مہینے پہلے کی بات ہے، میں نے مولانا شبلی کا تذکرہ چھیڑا۔ حضرتِ والارح صوفہ پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے، فوراً سیدھے ہو بیٹھے

اور بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا "مولانا کے احسانات کا شمار ہی کیا ہو سکتا ہے، میرے پاس جو کچھ ہے وہ انہی کا رہین منت ہے"۔ یہ دو جملے ابھی درد بھری زبان سے ادا بھی نہ ہونے پائے تھے کہ آنکھوں نے سبقت کی اور ہدیۂ اشک محسن کی یاد پر نچھاور کر دیے۔

احسان مندی کا یہی اثر اپنے شیخ عالی مرتبت کے ساتھ بھی دیکھنے میں آیا جس کا ذکر آئندہ آئے گا یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میں نے تو صاف طور پر مشاہدہ کیا کہ علم و عرفان کی یہ دو نسبتیں ذاتِ سلیمانی میں یکساں مستحکم اور تا دمِ آخر قائم رہیں، اور یہ حضرتِ والا کا کمال تھا کہ ع ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن! بڑے نادان ہیں وہ لوگ جو بہ زعم محبت کسی ایک ہی نسبت کو سیرتِ سلیمانی میں غالب دیکھنا یا دکھانا چاہتے ہیں، یہ اُن کی تمنا ہو تو ہو مگر حقیقتِ حال سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔

علامہ کی ایک سندِ حدیث

حضرت علامہ کی ایک سند حدیث تو وہی ہے جو اس وقت اکثر علمائے ہند کی ہے یعنی شاہ عبد الغنی محدث رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ سے ہو کر اوپر تک پہنچتی ہے[۱] اور معروفِ عام ہے، دوسری سند حدیث شیخ الاسلام مولانا الشیخ عبد القادر توفیق الشبلی الطرابلسی الشامی ثم المدنی سے ۱۰ محرم ۱۳۶۱ھ کو مدینہ طیبہ میں حاصل کی تھی جو نہایت اعلیٰ ہے کہ بارہ واسطوں سے امام بخاری قدس سرہٗ تک مربوط ہے اور پندرہ واسطوں سے امام مسلم قدس سرہٗ تک پہنچتی ہے۔ ذیل میں دونوں سندیں تبرکاً درج ہیں:۔

روایۃ صحیح البخاری

الشیخ عبد القادر[۱] توفیق المدنی عن المعمر عبد[۲] اللہ السکری الدمشقی عن الوجیہ عبد الرحمٰن[۳] الکزبری الحفید عن المعمر صالح[۴] الفلانی عن المعمر محمد[۵] بن سنۃ عن المعمر احمد[۶] بن العجل الیمنی عن المعمر مفتی مکۃ قطب الدین[۷] محمد بن احمد النہروانی عن ابی الفتوح[۸]

---

[۱] سید سلیمانؒ عن ابو الفضل محمد حفیظ اللہ عن عبد الحیؒ (فرنگی محلی) عن والدہ عبد الحلیم عن شاہ عبد الغنی[۵] المہاجر المدنی (رحمہم اللہ اجمعین)

الطاودسی عن المعمر باباپوسف[9] النهروانی عن ابن شاذبخت[10] الفارسی الفرغانی بسماعہ عن ابی لقمان یحییٰ بن[11] عمار الختلانی المعمر مائۃ والثلاثۃ وارعبین سنۃ وقد سمع جمیعہ من محمد بن یوسف[12] الفربری بسماعہ عن مولفہ الامام محمد بن اسمٰعیل البخاری (رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین)

فبین الحبر العلماء السید سلیمان الندوی نور اللہ مرقدہ وبین الامام البخاری قدس سرہٗ اثنا عشر شیخا وھذا فی غایۃ العلو۔

روایۃ صحیح المسلم

الشیخ عبدالقادر[1] توفیق المدنی عن المعمر ابی النصر[2] الخطیب عن عبداللہ[3] القلعی عن العارف عبدالغنی[4] النابلسی عن حسن[5] العجیمی المکی عن احمد[6] بن العجل عن یحییٰ[7] بن مکرم الطبری عن جدہ محب الدین[8] عن الزین[9] المراغی عن احمد[10] بن الحجار عن الانجب[11] بن ابی السعادات الحمانی عن مسعود[12] بن حسین الثقفی عن الحافظ ابی القاسم عبدالرحمٰن[13] بن مندہ عن الحافظ ابی بکر محمد بن[14] عبداللہ الجوزقی عن ابی[15] الحسن مکی النیسابوری عن مولفہ الامام مسلم الحجاج۔

فبین الحبر العلام السیّد سلیمان الندوی نور اللہ مرقدہٗ وبین الامام مسلم قدس سرہٗ خمس عشر شیخا وھذا ایضاً فی غایۃ العلو۔

یہ اسناد مجھے حضرت مولانا محمد عتیق فرنگی محلی نے کراچی میں عطا فرمائیں جب وہ اپنے ترجمۂ قرآن کی طباعت کے سلسلے میں یہاں مقیم تھے اور فرمایا تھا کہ انہوں نے اور حضرت علامہؒ نے ایک ساتھ یہ سند حاصل فرمائی تھی، مولانا فرنگی محلی سے میرا تعارف جولائی یا اگست ۱۹۶۱ء میں حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کے ذریعہ لکھنؤ میں انکی قیامگاہ پر ہوا تھا اور اسی وقت سے وہ بہت شفقت فرمانے لگے تھے، رحمۃ اللہ علیہ۔

باب دوم

شباب سے آغازِ پختہ عمری تک

۱۹۰۷ء تا ۱۹۳۹ء

"شکوہِ سلیمانی"

تکمیل تعلیم سے چالیس برس کی عمر تک کا زمانہ حیاتِ سلیمانی کے سر تا سر علمی شغف، تحقیقی انہماک اور تصنیفی مصروفیت کا دور ہے گو درمیان درمیان میں اجتماعی کاموں میں بھی حصّہ لینا پڑا، لیکن یہ محض اپنوں کے اصرار اور پاسِ مروّت سے تھا ورنہ مرکزِ توجہ کبھی بدلنے نہ پایا، چنانچہ جب ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کے اصرار پر وفدِ خلافت کے رکنِ خاص بن کر یورپ روانہ ہو رہے تھے تو ایک مکتوب میں اپنے عم محترم مولانا عبدالحکیم دیسنوی کو لکھتے ہیں[1]:-

"ڈر ہے کہ کہیں پالیٹکس میرے علمی مشاغل کو تہ و بالا نہ کر دے"۔

اس فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرتِ والا کو اپنا متعینہ مقصد کس درجہ عزیز تھا اور اس سے کچھ دیر کے لئے دوری بھی نہیں بلکہ کم التفاتی کیسی شاق تھی، یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دور میں جہادِ علمی ہی کی خدمت حضرتِ والا کو عطا فرمائی تھی، چنانچہ اس معرکہ کے وہ شہسوار نکلے اور اس میدان میں اُن کو وہ نُصرت اور غلبہ حاصل ہوا جو ہر زمانہ میں کسی کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔

یہ تو دیکھا جا چکا ہے کہ عطائے سند کے ساتھ ہی دفعتہً اہلِ علم کی بزم نے محسوس کیا کہ ایک علم نواز آ رہا ہے، یہ سلیمان عالی مقام کی آمد آمد کا چرچا تھا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملکِ سلیمانی کے حدود اتنے پھیلے اور ایسے پھیلے کہ نئی اور پرانی علمی دنیا سب زیرنگین آ گئی ———— یہ کوئی حسنِ عقیدت کی خوش تعبیری نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جو تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو چکی، اب اس کو کوئی کیسے جھٹلائے؟ اس کی تفصیل گو ہمارے موضوعِ تالیف سے غیر متعلق ہے مگر اجمالی تذکرہ اسلئے ناگزیر ہے کہ آئندہ اس عزّت و عظمت کے باطنی محرکات کو پیش کرنا ہے

---

[1] معارف بابتہ مئی ۱۹۵۶ء

اور یہ دکھانا ہے کہ اس علمی شہرت کے پیچھے یہاں اخلاص اور بے نفسی کی کیسی قوتیں کارفرما تھیں جو بڑے بڑے مجاہدات کے بعد بھی مشکل ہی سے عام طور پر میسّر آتی ہیں چنانچہ دیکھتے چلئے کہ ۱۸،۱۷ برس کی قلیل مدت میں تخت سلیمانی کن بلندیوں اور پہنائیوں کو عبور کرتا چلا گیا اور کس خداداد دبدبہ اور شکوہ کے ساتھ۔ ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔

الندوہ اور علمی شہرہ

ابھی فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہی تھے کہ الندوہ جیسے بلند پایہ خالص علمی ماہنامہ کے نائب مدیر (سب ایڈیٹر) بنا دیے گئے جس کی "ادارت صحافت تو برائے نام ہی تھی، اصل میں یہ ایک شعبۂ تصنیف و تالیف تھا اسی لئے ہما شما کی ہمت ہی اس میں مقالہ نگاری کی نہیں پڑتی تھی"[۱] ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۲ء کی مدت میں تین مرتبہ وقفہ وقفہ سے حضرت والا رحمہ نے اس رسالہ کی ادارت سنبھالی اور اس شان سے کہ ان کے معاصر شہیر اور مدیر بے نظیر مولانا دریابادی گواہ ہیں کہ "نگاہیں جس شوق اور بے تابی سے مولانا شبلی رحمہ کی تحریروں کی منتظر رہتی تھیں اس سے کچھ کم اشتیاق حضرت سلیمان کے بھی علمی افادات کا نہیں رہتا تھا"[۲]۔ اور اس ڈھائی تین برس میں حضرت والا رحمہ نے جدید و قدیم عقلی و نقلی علوم و فنون پر ایسے بلند پایہ مضامین لکھے کہ اس آغاز ہی میں جدید و قدیم دماغوں پر ان کی دھاک بیٹھ گئی اور وہ صف علماء میں فرد فرید نظر آنے لگے، ذرا مضامین کی دقت پسندی اور گوناگونی ملاحظہ ہو، تفصیلاً نہیں صرف چند عنوانات کے ذریعہ:-

اشتراکیت اور اسلام، علم ہیئت اور مسلمان، اسلامی رصدخانے، مسئلہ ارتقاء برناباس کی انجیل، مکررات القرآن، طبقات ابن سعد کا تعارف۔ قیامت، ایمان بالغیب وغیرہ۔

شاگرد کی اس علمی جامعیت سے خود علامہ شبلی اس درجہ متاثر تھے کہ ۱۹۱۲ء کے اجلاس ندوۃ العلماء میں برملا فرما دیا:-

---

[۱-۲] دیکھو صدق جدید بابتہ ۲۲ جنوری ۱۹۵۴ء "سید سلیمان ایڈیٹر کی حیثیت سے"۔ از مولانا دریابادی

"ندوہ نے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا، صرف ایک سلیمان کو پیدا کیا تو یہی کافی ہے"[1]

بلاشبہ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے اور اس تخیل کی ایک جامع ومانع تعبیر جس کو لفظ ندوہ کی اصطلاح سے ادا کیا گیا تھا۔

ممتاز معلم

یہ کام ہو ہی رہا تھا کہ اور علامہ سید سلیمان ایک جامع العلوم صاحب قلم کی حیثیت سے مشہور ہوتے جا رہے تھے کہ عین اسی زمانہ میں دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں علم کلام اور جدید عربی کے ایک اعلیٰ استاذ کی ضرورت پیش آئی اور مولانا شبلیؒ نے یہ اہم مسندِ درس اپنے اسی جوان عمر، پختہ علم شاگرد کے سپرد فرمادی اور ان کا یہ انتخاب لاجواب ثابت ہوا، آناً فاناً حضرت علامہ کی تدریسی مہارت کا شہرہ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل گیا اور تشنگانِ علم دُور دور سے اس تازہ چشمہ کی طرف لپکے[2] اور جنہوں نے اس مشرب سے پیا، سیراب ہو گئے[3]۔

---

[1] ملاحظہ ہو خطبۂ شبلی اجلاس ندوۃ العلماء ۱۹۱۳ء۔

[2] محترمی مولانا محمد صابر صاحب حیدرآبادی (سابق پروفیسر عربی وشعبۂ دینیات اورنگ آباد کالج) نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں علم کی خاطر ہندوستان کے چپہ چپہ کی خاک چھانی ہے، مجھ سے ازراہِ لطف فرماتے تھے کہ آپ کے شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا شہرہ تو خود مولانا شبلی ہی کی حیات میں اسقدر بلند ہو گیا تھا کہ میں مولانا شبلیؒ کے بجائے انہی کی خدمت میں حاضر ہوا اور منطق کی اونچی کتاب سُلّم پڑھانے کی درخواست کی۔ مولانا (سید سلیمان ندویؒ) نے فرمایا کہ اگر آپ کا مقصود کتاب نہیں بلکہ فن منطق میں مہارت حاصل کرنا ہے تو اس کے بجائے فلاں کتاب (نام اب راقم ہیچمدان کو یاد نہیں) پڑھ لیجئے وقت کم صرف ہوگا اور فن قابو میں آجائے گا۔

مولانا صابر فرماتے تھے کہ اس وقت میں نے اپنی تجویز پر اصرار کیا تو سید صاحب نے بھی پڑھانے سے انکار فرمادیا تو میں نے ایک اور جگہ وہ کتاب جاکر پڑھ لی، مگر جب پورا فن پڑھ چکا اور اس میں کافی وقت ضائع کرچکا تو حضرت سید صاحب کی رائے عالی کی قدر محسوس ہوئی، اور ان کے مرتبہ علمی کا اندازہ ہوا اور اپنی نادانی پر ندامت ہوئی!!

[3] مشہور استاد فلسفہ مولانا عبد الباری ندویؒ مدظلہٗ کا اعتراف بھی قابلِ شنید ہے جو ندوہ میں حضرت والا کے

یہ ۱۹۰۷ء کا ذکر ہے جبکہ معلمِ جلیل کی عمر صرف ۲۴، ۲۵ برس کے قریب تھی، یہ سلسلہ تدریس کا دَورِ اوّل تھا جو مختصر ہی رہا، مگر اسی دوران میں علامہ نے دروس الادب اور پھر بعد کو لغاتِ جدیدہ کے نام سے ایک عربی لغت تالیف فرمائی جو اہلِ علم میں مقبول ہوئی۔

اس کے چند برس بعد پھر کچھ عرصہ کے لئے ندوۃ میں تدریسی خدمت حضرت کے سپرد ہوئی مگر اس تعلق سے ہٹ کر بھی علامہ کا تدریسی شغل برابر جاری رہا اور اعلیٰ استعداد کے طلباء نے مختلف علم و فنون میں آپ سے ماہرانہ تعلیم حاصل کی، مثلاً تفسیر و علومِ قرآنی میں مولانا محمد اویس نگرامی (استاذ تفسیر ندوۃ العلماء) نے فلسفہ و کلام میں مولانا محمد ابو العرفان خان (استاذ معقولات ندوہ) نے اور عربی ادب و فلسفہ میں مولانا مسعود عالم مرحوم اور مولانا محمد ناظم ندوی (شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور) نے تاریخ و ادب میں مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی (مدیر معارف) نے!! ———— چنانچہ مولانا مسعود عالم ندوی نے لکھا ہے :-

"دسمبر ۱۹۳۳ء جنوری ۱۹۳۴ء (میں) دار المصنفین بھی حاضری ہوئی تھی، ...... باضابطہ شاگردی کا موقع بھی نصیب ہوا، محمد ناظم صاحب .. اور

ہم زمانہ ممتاز طالب علم تھے مگر فرق اتنا تھا کہ جب وہ درجۂ اعلیٰ میں پہنچے تو حضرت والا استاذ مقرر ہو چکے تھے، اور اعلیٰ جماعتیں ہی آپ کے ذمہ تھیں۔ مولانا مدظلہٗ نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ اور انکی علمی منزلت کا اظہار کس بلیغ انداز میں فرمایا ہے، لکھتے ہیں :-

"ندوہ میں نہ صرف طالب علمانہ معیت و رفاقت رہی بلکہ جب استاذ مقرر ہوئے تو شاگردی کی دولت بھی ملی، استاذ مرحوم و مغفور علامہ نعمانی کی مجالس میں سالہا سال انکے پیچھے صف نعال میں شریک رہا مگر سید صاحب کے علم و فضل کا اتنا قائل تھا کہ اپنے شکوک و شبہات ان ہی کے سامنے زیادہ پیش کرتا۔ ایک مرتبہ جبر و قدر کے متعلق اچھی طرح یاد ہے کہ انہی کی تفہیم و توجیہ سے خوب تشفی ہو گئی"۔

(مضمون سیرۃ السید سلیمان نمبر معارف)

ابو اللیث صاحب بھی ساتھ تھے، ہم تینوں قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیتے۔" (سلیمان نمبر معارف)

انہی مولانا مسعود عالم کا یہ بھی بیان ہے کہ نامور شاگردوں کی جو تعداد اس دور میں حضرت علامہ کے حصہ میں آئی ہے اور وہ ان کے معاصر مشاہیر علماء میں کسی کو... نصیب ہی نہیں ہوئی، ایک مضمون میں اپنے اس بیان کو انہوں نے تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے!

ضیا بخش الہلال

حضرتِ والا علمی مسند کو چھوڑنا پسند نہیں فرماتے تھے مگر حالات کچھ ایسے ہوئے کہ مجبوراً اس کو خیر باد کہنا پڑا۔ ۱۹۱۲ء میں ملکی سیاست میں اتحادِ اسلامی کا جوش اٹھا اور مولانا ابو الکلام نے جو کلکتہ سے ہفتہ وار "الہلال" نکال رہے تھے حضرت والا کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ مولانا شبلیؒ کے ایماء سے بالآخر حضرت والا کو کلکتہ پہنچنا پڑا۔" سید صاحب جب الہلال میں پہنچے تو نام کا یہ اب بھی ہلال ہی رہا لیکن اہلِ بصیرت دیکھ رہے تھے کہ ہلال بدر بن گیا ہے، اور اسکی نور افشانی کلکتہ کے مطلع سے شروع ہو کر مشرق و مغرب، شمال و جنوب سب کو مطلع انوار بنا رہی ہے، خود عربی کے قدیم و جدید دونوں طرح کے ماخذوں کی مدد سے مسلمانوں کے لئے دینی، تمدنی، سیاسی، تاریخی ہر عنوان سے متعلق بہترین معلومات پیش کرنا، یہ کام تو سید صاحب کا تھا ہی، باقی خود ہندوستان کی سیاسیاتِ حاضرہ پر مقالہ لکھنے میں اپنے چیف ایڈیٹر (مولانا آزاد) سے پیچھے نہ رہے[۱]"۔ البتہ الہلال پر نام چونکہ مولانا آزاد کا ہوتا تھا اس لئے بہت سوں کو پتہ بھی نہ چل سکا کہ "الہلال" کس کی کرامت سے بدرِ کامل بن گیا ہے، مگر جب ایک سال کی رفاقت کے بعد بعض وجوہ سے صاحب کرامت ہستی بے تعلق ہوگئی تو جو بدر تھا وہ ہلال بھی نہ رہ سکا، محاق بننے لگا، مولانا آزاد گھبرا گئے ۹ جنوری ۱۹۱۴ء کو ایک طویل خط حضرتِ والا کی خدمت

میں تحریر فرمایا جس کا ایک اقتباس پیش ہے :۔

"آپ نے پونہ میں پروفیسری قبول کرلی حالانکہ خدا نے آپ کو درس وتعلیم سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے، خدا کے لئے میری سینے میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاہد ہے کہ آپ کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طلبہ کو عربی فارسی سکھلادی، آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلاسکتے ہیں۔

آپ آکر "الہلال" بالکل لے لیجیئے اور جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجئے، صرف اپنے مضامین دیدیا کروں گا اور کچھ تعلق نہ ہوگا۔ آپ معاً وہاں استعفیٰ دیں اور کلکتہ چلے آئیں۔ (ابوالکلام کان اللہ!!)[2]

شکر ہے کہ حضرت والا کی حیات ہی میں (قیام بھوپال کے زمانہ میں) "الہلال" کے وہ مضامین جو سلیمانی قلم کی یادگار ہیں "مضامین سید سلیمان" کے نام سے شائع کئے گئے، اور اس کی سعادت صوبہ بہار کے ایک قدرشناس کے حصہ میں آئی۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ یہ سب وہ مضامین ہیں جن پر الہلال کی عظمت قائم تھی مثلاً

الحریت فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل اور مشہد اکبر وغیرہ وغیرہ۔

جلیل القدر پروفیسر الہلال کو وداع کرکے حضرت والا پھر لکھنؤ علامہ شبلی مرحوم کے دفتر سیرت میں تشریف لائے لیکن قدرت نے یہاں سے بھی بہت جلد یعنی ۱۹۱۳ء ہی کے آخر میں بمبئی یونیورسٹی کے نامی گرامی دکن کالج پونہ میں

---

[1] سید سلیمان ایڈیٹر کی حیثیت سے۔ از مولانا دریابادی بحوالہ سابق

[2] دیکھو معارف دسمبر ۱۹۵۳ء

پہنچا دیا، اس کی تفصیل خود حضرت ہی کی زبانی سنئے :۔

"انگریزی عہد میں کسی طلب و درخواست کے بغیر کسی سرکاری نوکری پانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مگر میرے ساتھ یہ بھی ہوا میں انہی دنوں لکھنؤ میں مقیم تھا کہ مجھے بمبئی گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم کا سرکاری لفافہ موصول ہوا کہ تم کو دکن کالج پونہ میں السنۂ مشرقیہ کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا گیا ہے میں سمجھا کہ میرے پتے پر غلط مراسلہ آ گیا ہے کیونکہ میں نے تو اس کی درخواست بھی نہیں دی تھی۔ میں اسی حیص بیص میں تھا کہ اس مراسلہ کو کیا کروں کہ شام کی حاضری میں مولانا (شبلیؒ) سے اس واقعہ کو بیان کیا، فرمایا کہ مراسلہ آ گیا، اچھا ہوا۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب[1] کو شکریہ کا خط لکھو اور پونہ روانہ ہو جاؤ، میں نے کچھ معذرت کرنی چاہی، مگر ان کی خوشی اسی میں پائی اور شیخ صاحب کے پاس پونہ روانہ ہو گیا اور ڈھائی تین سال کے قریب اُن کے ساتھ رہا[1]"

یہیں پونہ میں حضرت والاؒ نے ایک یہودی عالم سے عبرانی زبان سیکھ لی اور اس نیت سے یہ مشقت اُٹھائی گئی کہ عربی الفاظ کے عبرانی مآخذ پر عبور حاصل ہو جائے۔ اس اعتبار سے بھی صفِ علما میں ان کی حیثیت انفرادی امتیاز رکھتی ہے۔

اسی دکن کالج کے دورانِ قیام حضرت والاؒ نے اپنی مجتہدانہ تصنیف ارض القرآن کا آغاز کیا جو قرآنی لٹریچر میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے اور جس کی وجہ سے متداول تفاسیر کی کتنی تاریخی و جغرافیائی غلطیوں کا ازالہ ہوا۔ علمائے عصر نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور علمی دنیا نے اس احسان سلیمانی کا برملا اعتراف کیا[2]

---

[1] ڈاکٹر شیخ عبدالقادر صاحب سرفراز مرحوم پروفیسر اردو فارسی دکن کالج پونہ (ف دسمبر ۱۹۵۲ء) یادِ رفتگان صفحہ ۲۹۹

[2] ملاحظہ ہو مولانا گیلانی کا مضمون مندرجہ سلیمان نمبر معارف بہ عنوان تاریخ ارض القرآن نیز حواشی قرآن از مولانا شبیر احمد عثمانی میں بھی موقع بموقع اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ۵۰۰و

مایہ ناز ریسرچ اسکالر | راقم آثم نے تو حضرتِ والا رح سے یہی سنا ہے کہ اسی پروفیسری کے زمانہ میں مشہور فلسفی عمر خیام پر لکھنے کا خیال پیدا ہوا اس

لئے کہ یورپ نے خیّام کو نہایت غلط رنگ میں پیش کیا تھا اور اس کے فلسفہ کو بہت ہی مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ ——— حضرت والا نے اس موضوع کے مواد کی فراہمی اسی دور سے شروع فرمائی اور اوّلاً اس کو ایک مقالہ کی صورت میں دسمبر ۱۹۳۰ء کی اورینٹل کانفرنس منعقدہ پٹنہ میں پیش کیا پھر بعد میں اس کو بڑھا کر "خیّام" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع فرمایا، اس میں خیام کے ان فلسفیانہ مقالات کی روشنی میں اس کی فارسی رباعیات کو سمجھایا گیا ہے جو اپنی گہرائی اور وقت پسندی کے علاوہ عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے عام فلاسفہ کے فہم سے بالاتر تھے اور جن کو نہ جاننے کی وجہ سے مشرق و مغرب کا ہر کس و ناکس خیّام کی من مانی تعبیر کر رہا تھا، ——— چنانچہ جب یہ کتاب علمی افق پر نمودار ہوئی تو جہل سرنگوں ہو گیا مستشرقین یورپ نے جن کو اپنے ریسرچ پر بڑا ناز ہے یہ تسلیم کر لیا کہ خیام کی اس سے مستند اور صحیح تعبیر آج تک کسی نے نہیں پیش کی خود ہمارے حکیم مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے حضرتِ والا کو لکھا کہ :۔

"عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا، الحمد للہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا۔" [۱]

بلادِ اسلامیہ میں اس کتاب کی عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف بھیجے ان میں ایک تحفہ خیّام بھی تھا۔

کتاب کی اس مقبولیت کا سبب کیا تھا؟ اگر مصنف رحمۃ اللہ کی زبانی اس کے سببِ معنوی کا پتہ نہ ملا ہوتا تو اس کا یقینی تعین دشوار تھا، لیکن خود مصنّف باصفا نے کراچی کے دورانِ قیام میں ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ :۔

---

[۱] مکاتیب اقبال ص۱۷۸

"میں نے تو یہ کتاب محض اس اظہارِ خیال کے لئے پیش کی تھی کہ اہلِ مغرب کو
معلوم ہو کہ ان کو جس ریسرچ پر ناز ہے، مشرقی علماء اس میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں
خدا کا شکر ہے کہ ایسا ہی ہوا"۔

یعنی اس پیش کش سے مقصود ذاتی نام و نمود نہیں بلکہ طبقۂ علماء کے وقار کی بلندی تھی، تاکہ مسلمانوں سے فرضی مرعوبیت دور ہو جائے اور اغیار پر ان کی علمی دھاک بیٹھ جائے ——— ادب کے پردہ میں یہ دینِ اسلام کی بڑی خدمت تھی جس کی قدر وہی جان سکتے ہیں جن کو یہ شعور حاصل ہو کہ دورِ حاضر میں اسلام پر حملہ کس کس محاذ سے ہو رہا ہے؟ ———

وَقَلِیْلاً مَا یَشْعُرُوْنَ!

خیام کے علاوہ عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہازرانی، نقوشِ سلیمانی اور سیکڑوں تاریخی، ادبی اور علمی مقالات جو سلیمانی قلم سے نکلے سب ریسرچ کی اعلیٰ یادگاریں اور اسلامی محاذ کے مستحکم مورچے ہیں۔

سیّد الطائفہ

نومبر ۱۹۱۴ء میں علامہ شبلی نعمانی کا وقت آخر آگیا۔ حضرتِ والا کو پونہ سے تار دے کر طلب کیا گیا اور وہ فوراً تشریف لے آئے، مسافرِ آخرت نے نہایت شفقت و محبت سے چھوڑے ہوئے کاموں خصوصاً سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کی وصیت شاگردِ رشید کو فرمائی اور اس عہد کو مستحکم کر کے ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو کوچ فرمایا۔ ———

اب شبلی کی مسند خالی تھی، مگر کس کی مجال تھی کہ اس شہ نشین پر آنے کی جسارت کرتا، جو اس کا حقیقتاً اہل تھا بھی تو اسی کے قلب و دماغ پر استاذ کی عظمت اور احترام مسند کا خیال سب سے زیادہ چھایا ہوا تھا بالآخر یہی ہوا کہ سب وابستگانِ شبلی رح نے مل کر حضرت سلیمان ندوی کے سر پر استاذ مرحوم کی جانشینی کا تاج رکھا اور "سیّد الطائفہ" کا لقب عطا کر کے ان کی جلالتِ شان کا اعتراف کیا ——— یہ ۱۹۱۵ء کی روداد ہے، جب حضرتِ والا دکن کالج (پونہ) سے مستعفی ہو کر اعظم گڈھ پہنچ گئے تھے۔

"سید الطائفہ ثانی" قدس سرہٗ جب اعظم گڑھ تشریف لائے تو نہ یہاں کچھ تھا، نہ خود ان کے ساتھ کوئی ظاہری سامان واسباب آئے تھے۔ برس بھر پہلے مولانا شبلی نے دار المصنفین کا ایک خاکہ ضرور تیار فرمایا تھا، لیکن یہ تو ایک تصوّر تھا جس کا خارج میں کوئی وجود نہ تھا، بلکہ اس کے آثار بھی پیدا نہ تھے، اس کو موجود کر دکھانا، ظاہر ہے کہ آسان کام نہ تھا، یہ تو حضرت "سید الطائفہ" کے اخلاص، ان کی بلند ہمتی اور توکلِ ایمانی کا کرشمہ تھا کہ دو چار رفقاء کو لے بیٹھے اور ان تھک کوشش اور بے مثل مالی و منزلی ایثار کے ساتھ دار المصنفین کی بنا ڈالی۔ اپنے قلب و دماغ کی ساری صلاحیتیں اس میں لگا دیں اور چند برس میں اس کو اس قدر بلند و بالا کر دکھایا کہ ۱۹۲۲ء میں وہ علمی دنیا میں اپنی ہستی منوا چکا تھا اور پھر بعد کو جو مقام اس کو حاصل ہوا وہ بالکل منفرد تھا، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں عالم اسلام کے موجودہ علمی اداروں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ایک علمی اکیڈمی بھی دار المصنفین کی ہمسر نہیں اور خود اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ بھی اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے[1]۔

اس عظیم الشان کارنامہ کی وجہ سے بانیٔ دار المصنّفین کی عظمت سارے ممالک اسلامیہ میں مُسلّم ہوگئی، ان کی تصانیف کے ترجمے مشرقی اور مغربی زبانوں میں ہونے لگے، ان کو داخلِ نصاب کیا گیا، محققین نے ان سے استناد کا کام لیا، ملتِ اسلامیہ کو اس ذریعہ سے ایک شعور ملا، اور ہاں یہ بھی ہوا کہ جو لوگ ہر نعمت کو دنیا ہی کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں، ان کو اس راہ سے دنیا بھی مل گئی، کسی نے مقالاتِ سلیمانی کا ترجمہ کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں جرمنی اور انگلستان سے حاصل کیں[2]۔ کسی نے اس

---

[1] ملاحظہ ہو ماہنامہ "چراغِ راہ" (کراچی) بابت ماہ ۱۹۵۴ء۔

[2] ایک صاحب تو ہمارے علم میں بھی ہیں جنہوں نے حضرتِ والا کے ایک تاریخی مقالہ کا لفظ بہ لفظ جرمن زبان میں ترجمہ کر کے برلن یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی اور پھر یا تو ضمیر کی چبھن سے مجبور ہو کر یا

مقدس سرقہ کو اپنی شہرتِ علمی کے لئے استعمال کیا اور واقعتہً اس کو شہرت مل بھی گئی،[1] مگر مخلوق کی نگاہ میں سربلندی کا خیال اور اس کے لئے یہ دوڑ دھوپ عقل کی کیسی گمراہی، ایمان کا کیسا ضعف اور انجام کا کتنا بڑا خسارہ ہے!

علامہ اقبالؒ کی گرویدگی

مکاتیب اقبال جلد اول میں مفکرِ اسلام علامہ اقبالؒ مرحوم کے ستر خطوط وہ ہیں جو انہوں نے سید العلماء رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھے تھے۔ ان میں اقبالؒ مرحوم نے مسئلہ زمان و مکان، ختم نبوت، حقیقتِ وحی، قرآن میں ناسخ و منسوخ اور اسلام میں خلیفہ کے اختیارات وغیرہ جیسے چوٹی کے فلسفیانہ اور متکلمانہ قرآنی اور فقہی مسائل میں استفادہ فرمایا ہے، اور اس بار بار کے اعتراف کے ساتھ ہے۔

افشائے راز کے ڈر سے ہندوستان پہنچتے ہی حضرت والاؒ سے اس جسارت کی معافی چاہی، حضرت والاؒ نے یہی فرمایا کہ:۔

"کچھ حرج نہیں، میرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا اور آپکا فائدہ ہو گیا"

یہ تو خیر کہنے کو ایک دنیادار انسان تھے، ایک دیندار کہلانے والے کی مثال بھی سنئے۔ شہر حیدر آباد (دکن) کا آنکھوں دیکھا حال ہے، حضرت والاؒ کی رحمتِ عالم شائع ہوئی تو تبلیغی گروپ کے ایک عالم نے اس کی سرخیاں بدل کر "رحمتِ دو عالم از مولانا فلاں" کے عنوان سے کتاب شائع کر دی اور اس جرأت پر ان کو ندامت بھی نہیں ہوئی۔ آخر اس کا قانونی تدارک کیا گیا۔

[1] مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک مرتبہ علمی سرقوں کا تذکرہ تھا مولانا فرمانے لگے:۔

"بیچارہ نیاز (فتحپوری) تنہا اس میں بدنام ہے، حالانکہ چور اور بھی ہیں فلاں فلاں کتاب کو دیکھو اور سیرۃ النبی کی پانچویں اور چھٹی جلدوں کے متعلقہ عنوانات سے اس کا مقابلہ کرو بجز پیرایۂ بیان کی تبدیلی کے ان میں اور کیا ہے؟ مگر کہیں کوئی حوالہ موجود نہیں۔ سارا بیان اپنی طرف منسوب کر دیا ہے"! یہ ذکر ایک ایسے مشہور اہل قلم کا تھا کہ اس کے نام کے اظہار میں خود اپنی زبان کو عار آتی ہے!

"مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ استاذ الکل ہیں"۔ (مکاتیب اقبال ج ۱ ص ۸۰)

"علومِ اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے" (مکاتیب اقبال ج ۱ ص ۱۶۶)

یہ تو مرتبۂ علمی کا اعتراف ہا، عظمت کردار سے متعلق بھی اپنی عقیدت کا اظہار یوں فرمایا ہے:-

"آپ قلندر ہیں مگر وہ قلندر جس کی نسبت اقبال نے یہ کہا ہے ؎

قلندراں کہ براہ توسخت می کوشند | زشاہ باج ستانند وخرقہ می پوشند
بجلوت اند وکمندے بہ مہر ومہ پیچند | بخلوت اندوز زمان ومکاں دراغوشند
دریں جہاں کہ جمالِ تو جلوہ ہا دارد | زفرق تا بقدم دیدہ ودل وگوشند

بروز بزم سراپا چو پرنیاں وحریر | (ایضاً ص ۱۳۹)
بروز رزم خود آگاہ وتن فراموشند | " ص ۱۴۰

دیوبند و علی گڈھ کا اعتراف

حضرت والاؒ کے تبحرِ علمی، ان کی وسعتِ نظر اور ان کی علمی دیانت وغیر جانب داری نے ان کو دیوبندی مکتبِ خیال اور علیگڑھ اسکول میں یکساں اعتماد اور عزت عطا فرمائی تھی چنانچہ ان کی ہمہ گیر شخصیت کے اعتراف میں دارالعلوم دیوبند نے ان کی خدمت میں مجلس شوریٰ کی رکنیت پیش کی اور علی گڑھ یونیورسٹی نے ان کو اپنی سینٹ کا ممبر بنانے میں عزت محسوس کی اور پاکستان آنے تک وہ ان دونوں اداروں کے مشیر ومعاون رہے۔

اس کے علاوہ علیگڑھ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری پیش کر کے حضرت والا کی عظمت علمی کا اعتراف کیا۔ ادھر علمائے دیوبند کے سرخیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ نے بعض مجلسوں میں حضرت والا کے تحقیقی کمال کی تحسین کے علاوہ اپنی تصنیف عقیدۃ الاسلام میں سات یا آٹھ جگہ اس انداز توصیف کے ساتھ ارض القرآن کے حوالے

درج فرمائے ہیں کہ "صاحب ارض القرآن نے اس مقام پر تحقیق ختم فرمادی ہے"۔[1]

اسی طرح حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح نے بھی اپنے شاہکار تفسیری حواشی میں ... ارض القرآن سے استناد کیا ہے۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رح نے بھی اپنی خود نوشت مختصر سوانح حیات "انوار النظر فی آثار الظفر" میں "تتمہ" کے زیر عنوان حضرت والا رح کی عظمت کا اعتراف یوں فرمایا ہے :-

"اساتذہ کرام جن سے سند حدیث حاصل کی ہے ان سے ہی زیادہ متاثر ہوا ہوں، ان کے علاوہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سے بھی متاثر ہوا ہوں ... ... مولانا سید سلیمان ندوی علم تاریخ اور عربی ادب کے ماہر تھے۔ میں اکثر اپنے اشعار عربیہ ان کے ملاحظہ کے لئے بھیجتا تھا" (ص ۹۰)

اجتماعیات میں سربلندی

عرض کیا جا چکا کہ اجتماعات جس کی سب سے زیادہ جاذبِ توجہ صورت آج سیاسیات ہے اس سے حضرت والا رح کو عملی طور پر کوئی دلچسپی نہ تھی، مگر ایک مورخ اور مفکر اسلام ہونے کی حیثیت میں سے نطق سلیمانی کا ایک ایک جملہ اصابت رائے اور دُور بینی و مآل اندیشی کا معیار ہوتا تھا اپنوں اور پرایوں میں سے جس کسی نے حضرتِ والا رح کو اس نگاہ سے دیکھا، ان کی فراست کے معترف ہو گئے، گاندھی جی جیسے شاطر سیاس نے حضرت والا کے متعلق یہ کہا کہ "یہ بڑا جائز مولوی ہے"۔[2]

---

[1] یہ قلمی حواشی بطور خاص اپنی شفقت و محبت سے مجھ کو علامہ کشمیری کے جانشین محدث جلیل مولانا محمد یوسف بنوری مدظلہ نے دکھلائے۔ ان کے پاس عقیدۃ الاسلام کا جو نسخہ ہے، اس پر حضرت مولانا کشمیری رح کے قلم سے عربی زبان میں یہ حواشی تحریر فرمودہ ہیں۔ رہا یہ کہ مطبوعہ نسخہ میں یہ حاشیے کیوں حذف کر دیے گئے؟
ع کوئی تبلاؤ کہ ہم تبلائیں کیا۔

[2] یہ بات راقم نے خود حضرتِ والا رح کی زبان سے بھی سنی اور جاننے والوں سے بھی یہی سُن چکا تھا۔

اسی لئے مسلمان اہل سیاست نے بار بار حضرت والا رح کو اپنی طرف کھینچا مگر بقول خود حضرت ہی کے :۔

"میں نے کبھی اس خرقۂ مے آلود کو از خود نہیں پہنا، کبھی محمد علی نے پہنا دیا اور کبھی شوکت علی نے اور جب کسی نے پہنایا بھی تو میں نے فوراً اتار پھینکا ۔

حافظ ز خود نہ پوشید این خرقۂ مے آلود

اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

اور اس گریز کی وجہ بھی خود ہی یہ ارشاد فرماتے تھے کہ

"ڈپلومیسی (سیاست) کے معنے تو یہ ہیں کہ ہر ایک کو غیر دیانت دار سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے اور پھر اگر اس کی دیانت ثابت ہو جائے تو دیانتدار مانا جائے، اور میرا مسلک یہ ہے کہ ہر ایک کو اچھا اور دیانت دار سمجھا جائے اور پھر اگر اس کی بددیانتی ثابت ہو جائے تو اس سے قطع تعلق کیا جائے۔"

اسی مشرب کی وجہ سے وہ عملی سیاست سے کنارہ کش تھے اور زیادہ سے زیادہ مشورہ اور رائے کی حد تک وہ تعاون فرما لیتے تھے، اپنے مسلک کے متعلق ایک مرتبہ مزاحاً فرمایا کہ :۔

"بھئی مجھے چیمبر پریکٹس تو آتی ہے پبلک پریکٹس نہیں آتی۔"

حضرت والا رح کے اس محتاط مسلک و مشرب اور اپنی طرف سے پورے اجتماعیاتی گریز کے باوجود حق تعالیٰ نے اجتماعی امور میں بھی وہ سربلندی عطا فرمائی جو ان کے معاصر علماء میں کسی کو نہ مل سکی، اس دعوے کے ثبوت میں صرف چند واقعات کی اشاراتی تفصیل پیش ہے :۔

(۱) حضرت والا رح نے ۱۹۱۷ء میں اجلاس مجلس علمائے بنگالہ (منعقدہ کلکتہ) کی صدارت فرمائی اور باوجود حکومت کے جبر و تشدد کے ایک ایسا جرأت آموز خطبہ عطا فرمایا کہ لوگوں کے ذہن سے انگریزی مرعوبیت اٹھ گئی،

(۲) فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ وغیرہ کے اصرار پر وفدِ خلافت میں علمائے ہند کے تنہا نمائندے کی حیثیت سے یورپ تشریف لے گئے اور نمائندگی کا حق ادا فرمایا۔ [1] رعب ودبدبہ کا یہ عالم تھا کہ سرلائڈ جارج جیسے متکبر وزیر انگلستان نے جب ڈنر پر مدعو کیا تو جو رقعے چھپے تھے اس پر یہ پرچی بھی چسپاں تھی کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی شرکت کی وجہ سے ڈنر میں شراب اور سور کا گوشت نہیں پیش کیا جائے گا۔

(۳) ۱۹۲۳ء میں صوبہ بہار میں خلافت کانفرنس کی صدارت فرمائی۔

(۴) ۱۹۲۴ء میں ابنِ سعود اور شریف حسین کی جنگ چھڑی اور دونوں نے مجلسِ خلافت کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس وقت مسلمانانِ ہند نے حضرتِ والا رحؒ ہی کی قیادت میں ایک وفد حجاز بھیجا تاکہ دونوں میں مصالحت ہو جائے، حضرت والا رحؒ نے دوماہ تک تحریرو

---

[1] لندن سے ایک مکتوب میں حضرت والا اپنے عزیز دوست مولانا دریابادی مدظلہ کو بے تکلفانہ پیرایہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"...... آپ محمد علی صاحب کی تمام لندنی تقریروں کو پسند کرتے ہیں، یہ کیا بوالعجبی ہے؟ اختلافِ مقاصد کے ساتھ یہ اتحاد مذاق! مگر واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف آپ بلکہ یہاں کے معتبر انگریز تک ان کا لوہا مانتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ خاکسار بھی اپنے درجہ میں نیچا نہیں، سعد پاشا زاغلول مع وفدِ مصری نوری سعید پاشا مع وفدِ شامی ومصری ودیگر اہلِ تونس میری عربی دانی کا بھی لوہا مان گئے۔ (اما بنعمة ربك فحدث) میری عربی گفتگو پر ان کو تعجب ہوا، فرمایا کہ تم ہم سے بھی اچھی عربی بولتے ہو۔ ولا فخر۔ لوگ کہتے تھے کہ عربی تقریر وتحریر پر تمہاری محنت ضائع ہوئی لیکن بمبئی چھوڑنے کے بعد میں دیکھتا ہوں کہ انگریزی کے بعد اسی نے بڑے وقتوں میں کام دیا۔ ...... (بریدِ فرنگ)

(نوٹ) حضرت والا کی تفصیلی مساعی اور وفدِ خلافت کی کامیابی میں ان کی موثر خدمات کے لئے بریدِ فرنگ کا مطالعہ ضروری ہے!! علامہ اقبالؒ نے اس موقع پر حضرت والا رحؒ کو لکھا تھا "مراجعت مع الخیر مبارک۔ آپ نے بڑا کام کیا ہے جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گذاری کی صورت میں عطا ہوگا۔" مکاتیب اقبال ص۱۱۲

تقریر کے ذریعہ اس کی کوشش کی مگر نتیجہ خیز نہ ہوسکی تو پھر مصر کا رخ فرمایا اور وہاں کے اکابر علماء کے سامنے اپنی تجاویز رکھیں، شیخ ازہر نے ان تجاویز سے اتفاق فرمایا اور یہ ایسی کامیابی تھی کہ عالم اسلام کے تمام اخباروں نے اس خبر کو نمایاں کر کے شائع کیا۔

(۵) مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ العلماء کا جو اہم اجلاس کلکتہ میں ہوا تھا، اس کی صدارت کا شرف و امتیاز بھی حضرت والاؒ ہی نے پایا، جب کہ اس کے شرکاء میں استاذ العلماء مولانا محمد انور شاہ کشمیری بھی موجود تھے، اس اجلاس میں حضرت والاؒ نے وہ خطبۂ صدارت پڑھا، جو مسلمانوں کی سیاست میں یادگار سمجھا جاتا ہے۔

(۶) ۱۹۲۶ء ہی میں سلطان ابن سعود نے مسئلہ حجاز کے سلسلہ میں ایک موتمر عالم اسلامی طلب کی، ترکی، افغانستان، مصر اور یمن سب ہی نے اس میں شرکت کی، ہندوستان کی طرف سے جو وفد گیا اس کے رئیس حضرت والاؒ ہی تھے اور اراکین میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی وغیرہ، مکہ معظمہ پہنچ کر ممالک اسلامی کے سارے نمائندوں نے متفقہ طور پر حضرت والاؒ اور مفتی اعظم فلسطین کو نائبین صدر منتخب کیا اور بقول مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم "شریف شرف عدنان تو اپنی خاندانی سیادت و وجاہت کی بناء پر صدر موتمر منتخب ہوئے تھے لیکن نائبین صدر کا انتخاب صلاحیت و ہر دلعزیزی کی بنا پر ہوا تھا"[1]

(۷) اسی سال خلافت کمیٹی کے اجلاس خصوصی منعقدہ دہلی کی صدارت فرمائی۔

(۸) ۱۹۲۷ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر "عہد رسالت میں اشاعتِ اسلام" کے عنوان پر تقریر فرمائی، اس اجلاس میں اور ارباب علم کے علاوہ ڈاکٹر اقبال مرحوم بھی شریک تھے اور معترف ہو کر اٹھے۔

(۹) ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں ساردا ایکٹ (نابالغوں کی شادی پر امتناع) کے سلسلے میں مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہوا اور انہوں نے اس کی مخالفت بھی کی، لیکن بعض قانون داں

---

[1] مضمون مولانا مسعود عالم مرحوم بحوالہ سابق۔

مسلمانوں نے فقہ اسلامی میں تحریف کر کے اس قانون کی حمایت کی کوشش کی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے نابالغی میں نکاح کی بھی تردید کردی، اس موقع پر حضرت والا رحؒ نے معارف میں نکاح کے وقت حضرت عائشہ رضؓ کی عمر پر ایک محققانہ مضمون لکھا اور اس انداز سے پیش فرمایا کہ باطل سرنگوں ہوگیا۔ حضرتِ والا رحؒ نے اعلان فرمایا کہ نابالغوں کا نکاح تو شرعاً جائز ہے مگر ہر حال میں مستحسن نہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی جتادیا کہ کسی غیر اسلامی حکومت کو مسلمانوں کے قانون میں دست اندازی کا حق نہیں۔

اسی سلسلہ میں حضرت والا رحؒ کو اس اعلان کی اولیت کا شرف حاصل ہے کہ "سوراج قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کے پیش نظر جو معاملات ہیں اُن میں ایک مطالبہ یہ بھی ہو کہ آئندہ حکومت میں مسلمانوں کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کے تحفظ، ترقی و اصلاح اور استحکام کے لئے ایک علیحدہ انتظام ہونا چاہیئے اور اس کے لئے ایک قابلِ عمل خاکہ پیش کیا جائے۔۔ اگر آسمان کو دیکھ کر موسم کے انقلاب کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے تو موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھ کو یقین ہے کہ اگر اس قسم کی تدبیر نہیں کی گئی تو مسلمانوں کی ممتاز حیثیت اس ملک میں قائم نہیں رہ سکتی" [1]

غرض اجتماعی خدمات اور حضرتِ والا رحؒ کی اجتماعی عزت و منزلت کی داستان تو بہت طویل ہے اور زندگی کے ساتھ ترقی کرتی چلی گئی ہے مگر چونکہ ان چند واقعات سے ہمارا مدعا پوری طرح ثابت ہے اور جس دور سے متعلق گفتگو ہو رہی ہے وہ بھی یہاں ختم ہو رہا ہے اس لئے قلم کو یہاں رک جانا چاہیئے، اب ہم اس دور کے معنوی مشاہدے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ہماری نگاہ کا مقصود اصلی ہے!

---

[1] تشکرہ سلیمانی کے زیرعنوان جو معلومات بلا کسی حوالہ کے فراہم کردی گئی ہیں وہ سب محترم سید صباح الدین صاحب نائب مدیر معارف کے مضمون سے ماخوذ ہیں جو سلیمان نمبر میں چھپا ہے!

اس دور کے معنوی امتیازات اور باطنی احوال

اخلاصِ نیت

"تاریخ تو مولانا شبلیؒ کے دسترخوان کی چٹنی تھی"۔ یہ جملہ نطق سلیمانی کی شگفتگی اور بلاغت کی یادگار بن کر حافظہ پر نقش ہوچکا ہے، اس کی تفصیل "حیات شبلی" کے دیباچہ میں ملے گی، اس کا حال خود حضرتِ والاؒ کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"ایک دور آیا جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی سے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے[1]........... ایسے ہوشمند حریفوں کے لئے ساری دنیائے اسلام میں جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے جنہوں نے انہی کے طریقے سے انہی کے اسلوب پر جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرح بخش ہواؤں نے دنیا کے علم و تمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا اور یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے مردہ علوم میں کیونکر اپنی محنتوں اور تحقیقوں سے جان ڈالی"۔[2]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ شبلی کی نیت اسلام اور اس کے علوم کا احیاء ہی تھا اور یہی غذا انہوں نے مسلمان ذہنوں کے لئے تیار کی، لیکن اس کو قابلِ قبول بنانے کے لئے تاریخی اسلوب اختیار فرمایا جو عین مقتضائے حکمت تھا، یہی حُسنِ نیت جانشین شبلی کو بھی استاذ عالی مقام سے ورثہ میں ملا ـــــ اور یوں بھی اسلام کی سربلندی اور اس کا اظہار حضرتِ والاؒ

---

[1] و [2] حیات شبلی رح صہ ۱۷ و صہ ۲۵

ی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا، فرماتے تھے۔ لڑکپن میں بعض عیسائیوں سے دو ایک مناظرے اسی جوش میں کیے تھے، لیکن جوں جوں ہوش سنورتا گیا مناظروں سے طبیعت ہٹتی گئی اور طریقِ شبلی کو اپنا مسلک بنا لیا، چنانچہ عیسائیوں کے اس جواب میں کہ "مسلمانوں کا خدا تو بڑا جابر و قاہر ہے"۔ ایک رسالہ تحریر فرمایا جس کا نام ہی "بشریٰ" رکھا یہ حضرتِ والا کے ابتدائی رسائل میں سے ہے لیکن اس کا حسن استدلال، اس کی اثر آفرینی اور خود مصنف کے سوز دروں کی چاشنی اس میں ایسی مل گئی ہے کہ یہ آخری دور کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

اُن مضامین، رسائل اور کتابوں کے علاوہ جو حضرت مصنفؒ نے قرآنی یا حدیثی عنوانات کے تحت تحریر فرمائے خود ان مضامین اور تصنیفات میں بھی جو بظاہر ٹھیٹ تاریخی اور جغرافیائی موضوعات پر مرتب کیے گئے ان کی نیت ہمیشہ یہی رہی کہ اس ذریعہ سے مسلمان قرآن اور اسلام سے روشناس ہو جائیں۔ حضرتِ والا کو خود راقم نے یہ فرماتے سنا ہے کہ میں نے جب بھی قلم اٹھایا ہے تو میرا اصل مدعا مسلمانوں کو اسلام اور قرآنِ پاک سے قریب تر کرنا رہا ہے اس کے لئے عنوانات البتہ مختلف اختیار کیے، تاریخی بھی، جغرافیائی بھی اور سوانح وسیر کے بھی، اور بحمد اللہ یہ طریقہ تجربہ میں نہایت مفید و موثر ثابت ہوا[1] ——— چنانچہ عربوں کی جہازرانی اور عرب و ہند کے تعلقات کا اگر کوئی شخص مطالعہ کرے تو اندازہ ہوگا کہ وہ پڑھنے تو بیٹھا تھا تاریخ و جغرافیہ مگر جب پڑھ چکا تو قرآن سے متعارف ہو چکا تھا اور قرآن فہمی کی تشنگی اس میں پیدا ہو چکی تھی۔

دورِ حاضر میں خدمتِ اسلام کے اسی حکیمانہ طرز اور اسی اخلاصِ نیت کا یہ اثر تھا کہ نو تعلیم یافتہ حضرات حضرت علّامہ قدس سرہٗ سے انس محسوس کرنے لگے تھے اور ان

---

[1] یہ روایت بالمعنے سے پورے الفاظ مجھے یاد نہیں، البتہ معنی بالکل مستحضر ہیں۔

سے قریب ہوکر اسلامی جذبہ اور محبّت میں ترقی پاتے تھے، خود حضرت والاؒ فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"بھئی مجھ سے نو تعلیم یافتہ اصحاب جو وحشت محسوس نہیں کرتے اور محبت سے ملتے ہیں اس کی وجہ خدانخواستہ یہ تو نہیں کہ میں ان کی مرضی کی باتیں کرتا ہوں بلکہ صرف یہ ہے کہ سچی بات کو ان کی زبان اور محاورہ میں سمجھا دیتا ہوں جس سے ان کو اجنبیت نہیں محسوس ہوتی"۔

غرض نیت کی یہ درستی اور اس کا یہ اخلاص تھا جو جانشین شبلی کی علمی و عملی جدوجہد کا اوّل سے آخر تک محرک بنا رہا، پھر تعجب کیا ہے کہ قدم قدم پر خیر و برکت اسکا استقبال کرتی رہی، سلیمانی قلم کی ہر نگارش مقبول خاص و عام ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ اقلیم علم پر سلیمانی سطوت قائم ہوگئی۔

پاکیٔ مشرب

حسنِ نیت کے بعد دوسری اہم چیز مشرب و مسلک کی پاکی ہے، جہاں ذوق میں نکھار نہیں وہاں حسنِ نیت کا نمود بھی بدنما ہی دکھائی دیتا ہے ــــــ لعن طعن، سب و شتم، اور ایراد و اعتراض ہمیشہ بدنیتی ہی کا تو نتیجہ نہیں ہوا کرتا، بلکہ اکثر نیک نیتی کے باوجود اختلافِ نظر کا تقاضا نازیبائی پر مجبور کر جاتا ہے اور دراصل اس میں ذوق و مشرب ہی کا عیب چھپا ہوتا ہے۔

ہمارے حضرتِ والاؒ کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے یہاں حسنِ نیت اور پاکیٔ مشرب کا بے نظیر امتزاج موجود ہے وہ حمیتِ دین میں سب سے پیش پیش ہیں مگر مزاج کی نرمی اور خدا ترسی ہر مرحلۂ اختلاف میں ان کو خلاف و جدال سے باز رکھتی ہے، وہ باطل کے پرخچے اڑا جاتے ہیں مگر کوئی طبقہ یا فرد ان کا نشانِ ملامت نہیں بنتا بلکہ اس نوعیت کے اشارے کنایہ سے بھی وہ پوری طرح احتراز فرماتے ہیں، ان کے اس کمال پر ان کی ہر تصنیف گواہ رہے گی، مثال کے لئے سیرۃ النبیؐ کی ضخیم مجلدات ہی کو

دیکھ لیا جائے خصوصاً چوتھی اور پانچویں جلد جس میں مصنف عالی مقام ؒ نے منصب نبوت، اور عقائد و عبادات کی تشریح فرمائی ہے، یہاں ان کو کتنی گمراہیوں اور فتنوں کا قلع قمع کر کے صراطِ مستقیم کی توضیح کرنی پڑی ہے، مگر کمال اس کو کہتے ہیں کہ کہیں کسی گروہ یا فرد کا نام لے کر اس کی مذمت نہیں ملتی، اپنے اس حزم و احتیاط اور صفائی مشرب کی طرف اشارہ خود انہی مجلدات کے دیباچوں میں فرما بھی دیا ہے، چنانچہ جلد چہارم کے دیباچہ کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"کوشش کی ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام و تعلیم کو پوری تشریح، استناد، استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے، قرآنِ پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اس کے پرتو میں احادیثِ صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، تاکہ اسلام کی تکمیلی شان نمایاں ہو جائے ...... ان تکمیلی مباحث میں یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہے۔ اس لئے اس خارزار سے کبھی آبلہ پا کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کر لوں۔ چلنے والا تو تھک کر چور ہے، اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہروی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی؟"

اہلِ نظر نے دیکھا کہ چلنے والا شرطِ رہروی میں بدرجۂ اتم پورا اُترا اور منزلِ مراد کو جا پہنچا۔[1]

---

[1] مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مدیر برہان کی تصدیق ملاحظہ ہو جو تحسینِ حق شناس کی ایک مثال ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"مولانا شبلی کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ ان کو مولانا سید سلیمان ندوی کی شکل میں ایک ایسا

حضرت والاؒ نے یہ مسلک سوچ سمجھ کر اختیار فرمایا تھا اور اس کو نہایت درجہ محبوب رکھتے تھے اور اپنے حلقہ بگوشوں کو اسی مشربِ عالی سے سیراب کرنا چاہتے تھے، چنانچہ راقم ہیچمدان کو بھی اس کے اتباع کی تلقین فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اس اتباع کے کئی فائدے ہیں مثلاً:-

(۱) اس سے منفعت زیادہ عام ہوجاتی ہے (۲) فریق مخالف کے لئے بھی قبولِ حق آسان ہوجاتا ہے (۳) گمراہی یا فتنہ کی اہمیت بڑھنے نہیں پاتی (۴) نفسانیت کی آمیزش سے اپنی زبان اور اپنا قلم محفوظ رہتا ہے اور کلام میں تاثیر بڑھ جاتی ہے (۵) کسی فرد سے ندامت اٹھانی نہیں پڑتی۔

واللہ کہ یہ مسلک سلیمانی تمام تر حق اور سراسر موجبِ خیر و برکت ہے مگر اس پر قدم اُسی کے جم سکتے ہیں جس کے جذبات عقل کے قابو میں ہوں اور خود عقل شریعت کی فرمانبردار ہو۔ ورنہ علماء اور تعلیم یافتہ حضرات بھی جب کسی سے کسی مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں تو ان کی زبان اور ان کا قلم شخصی حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا چنانچہ حضرتِ والا کے خلاف لوگوں نے یہی کیا، مگر اس کا نتیجہ ہم نے اپنی آنکھوں سے یہی دیکھا کہ رفتہ رفتہ حضرتِ والاؒ سے معذرت خواہ ہونے والوں اور اظہارِ ندامت کرنے والوں کی ایک فہرست بن گئی جس میں علمائے عصر بھی ہیں اور نو تعلیم یافتہ بھی، صاحبِ ارشاد بھی ہیں اور اہلِ سیاست بھی، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کا احسان ہے کہ خود حضرتِ والاؒ کو کبھی اس صورتِ حال سے

شاگرد مل گیا جو وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، دقیقہ رسی اور علم و فضل میں استاذ کا صحیح جانشین اور ساتھ ہی اپنے اندر ایسی بہت سی خوبیاں اور کمالات رکھتا تھا جو اس کا اپنا حصہ تھیں۔ اس کا قلم بجائے گرم مزاج ہونے کے نرم اور سبک خرام تھا جو تنقید کے نازک سے نازک موقع پر بھی جادۂ احتیاط و اعتدال سے منحرف نہیں ہوتا تھا۔ اس کی طبیعت میں متانت و سنجیدگی اور حلم و بردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کے خامۂ گوہر فشاں کی پیشانی پر کبھی بھی جھنجھلاہٹ اور غیظ و غضب کے تیور ظاہر نہیں ہوتے تھے۔" (سلیمان نمبر معارف)

دوچار ہونا نہیں پڑا۔

یہ عقل و فراست ایک ایمانی روشنی ہے جو اس کو حاصل ہوتی ہے جو ظلمت نفسانی سے بچ نکلا ہو اور ہمارا مدعا یہی ثابت کر دکھانا ہے کہ حضرت والا اس وقت بھی جب کہ وہ ضابطہ کے سالک طریق نہ تھے، مکائد نفس سے محفوظ تھے، جس پر اُن کے مشرب کی پاکی ایک محکم دلیل ہے۔

حُسنِ اخلاق

حضرتِ والارح کے نہ جاننے والے یا صرف دورِ آخر کے پہچاننے والے جو کچھ سمجھتے ہوں، مگر جن خوش نصیبوں کو ان کی دیرینہ رفاقت کا فخر حاصل ہے وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ اشرفی نسبت سے پہلے اور بہت پہلے بھی سیرت نگارِ رسولِؐ اطہر کی حیات خلقِ اسلامی کا نہایت پاک وصاف مرقع تھی، فضائل اخلاق کے حصول کے لئے ان کو مجاہدہ و ریاضت کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی کیوں کہ یہ دولت ان کو بے مانگے اور گھر بیٹھے مل چکی تھی، وہ سیّد زادہ تھے اور غیرت و مروّت، حیا و تواضع حلم و ایثار، فراخ دلی اور بلند نگاہی ان میں بالطبع موجود تھی، تعصب، تنگ نظری، حرصِ جاہ و مال ان کے لئے اجنبی اور مکروہ ترین چیزیں تھیں —— مولانا دریابادی مدظلہٗ کو حضرت والارح کی چالیس سالہ رفاقت حاصل رہی ہے، مولانا نے راقم حقیر سے فرمایا کہ "ہمارے سید صاحب تو مولانا تھانوی سے نہ بھی رجوع فرماتے تب بھی وہ نیک ہی تھے اس لئے کہ رذائل اخلاق بالطبع ان میں موجود ہی نہ تھے" —— یہی بات اور زیادہ واضح پیرایہ میں مولانا موصوف ہی نے اپنے پہلے تعزیتی مضمون میں بھی تحریر فرمائی ہے، جو صدقِ جدید بابت ۴ دسمبر ۱۹۵۳ء میں سید الطائفہ مولانا سید سلیمان ندوی کے زیر عنوان چھپا تھا، اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"خدا ترسی، نرم مزاجی، فروتنی پہلے ہی سے تھی اور مروّت کے تو گویا پُتلے ہی تھے (پھر) تصوّف کے اثر نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔"

اسی طرح کی تصدیق حضرت والا رح کے ایک اور دیرینہ رفیق مولانا عبدالباری ندوی کی زبانی بھی سنیئے جن کی نظر طالب علمانہ دور سے لے کر حضرتِ والا کی عارفانہ منزلت تک سیرتِ سلیمانی کا آزادانہ مشاہدہ کرتی رہی ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں :-

"سید صاحب بطنی سید ہی نہیں ماشاء اللہ بڑے بطنی سعید تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مرحوم معصوم نہ تھے، لیکن ان کی زندگی کا جو رُخ طالب علمی سے لے کر آخر تک کم و بیش ہر نوع کے سابقہ میں سب سے زیادہ معصوم نظر آیا وہ یہی کہ خود رائی و خود پسندی دور دور نظر نہیں آتی"[1]

یہی خود رائی و خود پسندی تو اربابِ بصیرت کے نزدیک اُم الامراض ہے، جس کے علاج معالجہ میں مدتوں کی سعی و کاوش کے بعد بھی شفائے کلّی کا یقین خطرناک سمجھا جاتا ہے اور یہاں خلق سلیمانی میں سرے سے اس کا کوئی جرثومہ نہیں ملتا، اور اس پر حیرت کیوں ہو، جب کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ کے کلیہ کے تحت اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ کا استثناء خود قرآنِ کریم میں موجود ہے ۔

خیر یہ تو حضرت والا رح کے احباب کی شہادتیں ہیں جن میں سے ایک بزرگ تو ندوی ہیں اور دوسرے بھی فکر و نظر اور تعلقِ خاطر کے اعتبار سے غیر ندوی نہیں سمجھے جاسکتے لیکن اگر مطالبہ مصدقوں اور شاہدوں کے تنوع کا ہو تو دیوبندی، جامعی، علی گڈھی، بلکہ دینی اور غیر دینی افراد کی ایک فہرست تیار ہو سکتی ہے جو خلق سلیمانی کی تعریف و توصیف میں یک زبان نکلیں گے مگر طولِ بیان سے بچنے کے لئے اب یہاں صرف ایک دو غیر جانبدار نا قدوں کی شہادت پیش کی جاتی ہے ۔ مولانا محمد یوسف بنوری نے راقم عاجز کو سنایا کہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رح سید صاحب کے حلم کا ایک واقعہ بڑی عظمت سے سنایا کرتے تھے وہ یہ تھا کہ جمعیت علمائے ہند کا کلکتہ والا اجلاس (۱۹۱۷ء) جس کی صدارت حضرت والا رح ہی نے کی تھی، اس میں قیام علامہ کشمیری اور حضرت والا کا ایک ہی جگہ تھا،

---

[1] سیرۃ السید "سلیمان نمبر معارف

رات کے ۲ بجے علامہ کشمیری جاگ اُٹھے تو دیکھا کہ حضرت والا ٹہل رہے ہیں، وجہ پوچھی تو بلا کسی ناگواری کے جواب یہ ملا کہ چارپائی میں کھٹمل بہت ہیں سویا نہیں جاتا، علامہ کشمیری فرمایا کرتے تھے کہ کوئی اور ہوتا تو گلہ شکوہ کا دفتر کھولتا، ہنگامہ مچاتا مگر سید صاحب نے یہ تکلیف برداشت کرلی، اور کسی کو خبر تک نہ ہوئی، نزاکت طبع کے ساتھ یہ تحمل نادر ہے!

دیکھئے مولانا سعید احمد اکبرآبادی (مدیر برہان، دہلی) جو ایم اے بھی ہیں اور فاضل دیوبند بھی، کس باریکی سے سیرت سلیمانی کا جائزہ لیتے چلے گئے ہیں اور اس کے ہر ہر پہلو کے معترف ہوہو گئے ہیں، ان کے ایک طویل مضمون کا صرف ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو:-

"مولانا شبلیؒ کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ ان کو مولانا سید سلیمان ندوی کی شکل میں ایک ایسا شاگرد مل گیا جو وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، دقیقہ رسی اور علم و فن میں استاد کا صحیح جانشین تھا اور ساتھ ہی اپنے اندر بہت سی ایسی خوبیاں اور کمالات رکھتا تھا جو اسی کا اپنا حصہ تھیں، ...
تشرع، تدین بلکہ تقشف اس کے قبائے علمی کا تکمۂ زرین تھا جس کے باعث کسی مسئلہ میں اختلاف کے باوجود جماعت علماء کو بھی اس پر نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے مزاج میں استقلال، طبیعت میں صلح پسندی، مزاج میں مسکنت تھی، ....
ان خداداد اوصاف و کمال کے باعث وہ جس محفل میں بیٹھا، صدر بزم ہوکر رہا، جس انجمن میں بھی شرکت کی شمع انجمن کہلایا۔"

اب آخر میں ایک اقتباس مختصر مگر نہایت موثر اور بلیغ انداز میں اردو کے مشہور صاحب طرز انشاء پرداز رشید احمد صدیقی، پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی کے قلم سے پڑھیے۔ لکھتے ہیں

"سید صاحب کو کوئی مشتعل نہیں کرسکتا تھا، وہ کسی حال میں بھی برہم یا

بے اختیار نہیں ہوتے تھے ۔۔ ۔۔ ۔۔ شکل وصورت ، وضع قطع ، چال ڈھال ہر اعتبار سے سید صاحب کی شخصیت بڑی دلآویز اور قابلِ احترام تھی ، ان کو دیکھ کر اور پا کر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے رسوا نہ کریں گے اور جب تک ساتھ رہیں گے زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی "۔

آخری جملہ میں کس اعلیٰ خلق کی ترجمانی کی ہے ۔ یہ حسنِ اخلاق اور رفعتِ کردار کتنے زاہدانِ شب بیدار میں مل سکے گا ۔ لاکھ اہتمامِ زہد سہی پر جب تک غلظتِ قلبی دور نہیں ہوتی شفقت و رافت سے دل مملو نہیں ہوجاتا ، نیکی و سعادت کیسے عام ہوجائے گی ؟ یہ اللہ کی دین ہے کہ قلب سلیمانی لینت ، مروّت اور گہرائی کے اوصاف عالیہ سے اس وقت بھی مزین تھا جب کہ وہ ابھی " اہلِ دل " کے زمرہ میں متعارف نہ تھے !!

حُبِّ نبوی حضرتِ والا رح نے اپنے استاذ خاص مولانا شبلیؒ رحمۃ اللہ علیہ کے عظیم ترین احسانات کا شمار کرتے ہوئے بڑے تاثر کے ساتھ اس منت پذیری کا اظہار فرمایا ہے کہ :-

" انھوں نے اپنی زندگی اور زندگی کے بعد بھی بہ شکل وصیت اس کو سرورِ کائنات ، فخرِ موجودات رحمتِ عالم ، سید اولادِ آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکارِ اقدس میں جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے ، سب سے اوّل پہنچایا ، یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے مطالعہ ، جمع و تنقید و تالیف و تحقیق کی خدمت ابتداء ہی میں سپرد فرمائی جو بحمد اللہ یہاں اس کے لئے سعادت کا ذریعہ اور وہاں اس کے لئے آخرت کا ذخیرہ ہوگی " (حیاتِ شبلیؒ ص۱۱) ۔

چنانچہ دار المصنفین کے قیام کی پوری مدت میں مرکز توجہ یہی سیرۃ النبیؐ بنی رہی ، ترتیب

سوانح کا کام تو مولانا شبلیؒ بڑی حد تک کر گئے تھے لیکن جو کام دراصل کرنا تھا وہ تو حضرتِ والا ہی کو کرنا پڑا یعنی "کان خلقہٗ القرآن" کے تحت حیاتِ طیبہ کے ہر ہر پہلو کو قرآن کی تفسیر ثابت کر دکھانا! اس کے لئے برسہا برس حضرتِ والا شب و روز قرآن و حدیث میں غرق رہے، اپنی قرآنی، حدیثی اور فقہی، متکلمانہ اور فلسفیانہ ساری صلاحیتیں اس کام کے لئے وقف فرما دیں اور تائیدِ الٰہی کے ساتھ ایسی سیرۃ النبیؐ تیار فرما دی جس کی نظیر سیرت کے سارے عظیم الشان لٹریچر میں نہیں ملتی، بقول مولانا گیلانی کے نام "سیرت النبیؐ" ہے ورنہ دراصل یہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (یعنی اسلام کا دائرۃ المعارف) ہے"۔

اس سارے وقت کو جو محبوب دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک کے ایک ایک نقش کی تلاش و جستجو میں گذرا کس منہ سے کہا جائے کہ ارتقائے روحانی میں معاون نہیں رہا؟ حضرات صوفیاء کا تو متفق علیہ قول ہے کہ ایک عالم کے لئے حدیث شریف کا شغل سارے اشغال سے زیادہ نفع بخش اور صحبتِ رسولؐ کا قائم مقام ہے، پھر اس طویل شغل نہیں بلکہ شغف اور انہماک کو جو بختِ سلیمانی کے لئے مقدر ہو چکا تھا، کیسے باور کیا جائے کہ صفائے باطن اور کمالِ قربِ نبوی میں موثر نہیں رہا، یقیناً رہا، یہ بات اور ہے کہ اسی انہماک کی وجہ سے کبھی اپنی حالت پر نظر نہ گئی ہو اور خود حضرت والاؒ کو اس کا اعتبار نہ رہا ہو، چنانچہ آگے چل کر ایک مکتوبِ سلیمانی میں یہ جملہ بھی ملے گا کہ:

"بُرا ہو علمِ باطل کا جس نے مدتوں کے لئے اس راہ (روحانی) سے ہٹا دیا۔"

یعنی جس تخم کی کاشت شاہ ابوحبیب رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک سے ہوئی تھی، اس کی آبیاری سے توجہ سلیمانی ہٹی رہی، اس کے نشو و نما کا قصد نہ کیا جا سکا ــــــ مگر اسی مکتوب میں اس جملہ سے پہلے یہ فقرہ بھی آپ پڑھیں گے جو ہمارے دعوے کی دلیل ہے کہ:-

"سیرۃ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ کی تالیف وتدوین نے ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جذبۂ محبت پیدا کر دیا ہے۔"

یہی جذبۂ محبت تو وہ اصل ہے جو تکمیلِ ایمان کی ضامن ہے ـــــــ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

لا یومن احدکم حتیٰ	تم میں سے کوئی بھی اس وقت
اکون احب الیہ من	تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں
ولدہ ووالدہ والناس	اسکے نزدیک اُسکی اولاد ماں باپ اور تمام
اجمعین ہ	لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاوں

یہ حُبِّ نبوی اس دور میں بھی جب کہ ابھی حضرتِ والاؒ نے طۓ سلوک کا باقاعدہ قصد نہیں فرمایا تھا، اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ منہ اور کسی کے قلم سے ذاتِ نبویؐ یا پیغامِ محمدیؐ کے خلاف ادنیٰ بے ادبی کا کلمہ نکلا اور اُدھر وہ مچل جاتے تھے اور اس وقت تک چین نہ پاتے تھے جب تک اس کا ترکی بہ ترکی جواب نہ دیدیتے تھے، یہی وہ مقام تھا جہاں ان کا نرم مزاج قلم، تیغ برّاں بن جاتا تھا، ـــــــ مستشرقین یورپ نے جو محاذ ذاتِ رسالت پناہ کے خلاف علمی روپ میں قائم کیا تھا، اس کی شکست و ریخت کا سہرا تو تمام تر اسی عاشقِ رسول سید سلیمان ندوی کے سر ہے۔

اسی زمانہ میں حضرتِ والاؒ نے ایک مختصر سا رسالہ "رسولِ وحدت" کے نام سے تحریر فرمایا جس میں وحدتِ الٰہی، وحدتِ کتاب، وحدتِ انسانیت اور آخر میں دین و دنیا کی وحدت کو نہایت مدلل اور موثر انداز میں پیش کر کے پیغامِ محمدی کے اتباع کی دعوتِ عام دی گئی ہے!

اس رسالہ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے وہ مقبولیت بخشی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اسکا ترجمہ ہندوستان کی متعدد مقامی زبانوں کے علاوہ، عربی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی

ہوگیا۔ کیا یہ مقبولیت بلا قبولیتِ حق کے ہوگئی؟ اگر نہیں تو قبولیتِ حق کا ذریعہ نرا زورِ قلم ہا ہوگا یا صاحبِ قلم کا جذبِ دروں اور اس کی محبوب دوعالم کے ساتھ شیفتگی؟ ——
اس سوال کا جواب ایک صاحبِ ایمان کے لئے نہ تو مشکل ہے نہ غیر یقینی!

ایک نعت سیرت نگار رسولِ عربی کے عشقِ نبوی کا اندازہ جن کو ابھی پوری طرح نہ ہوا ہو ان کے لئے مدّاحِ نبوی کی ایک نعت درج کی جاتی ہے تاکہ سازِ محبت کے اس نغمے سے اُن کے احساس کی تشفی ہوجائے —— ذرا اس کے مطلع پر ہی نظر ڈالیئے اور پھر کہیئے کہ کوئی نا آشنائے عشق و محبت وہ فتویٰ صادر کرسکتا ہے جو عاشق صادق حضرت سلیمانؒ کی زبان سے پورے زورِ ایمانی کے ساتھ نکل گیا ہے،

فرماتے ہیں:

نقش جس قلب پہ نامِ شہ ابرار نہیں — سکۂ قلب[1] ہے وہ درخورِ بازار نہیں
تو ہے مجموعۂ خوبی و سراپائے جمال — کون سی تیری ادا دل کی طلب گار نہیں
مجلسِ شاہ میں ہے نغمۂ تسلیم و درود — شورِ تسبیح نہیں شورشِ اذکار نہیں
ذرہ ذرہ ہے مدینہ کا تجلی گہہِ نور — دشتِ ایمن یہ نہیں جلوہ گہہ ناز نہیں
جان دے دے کے خریدار بنے ہیں انصار — عشق زارِ مدنی مصر[2] کا بازار نہیں
شک نہیں مطلعِ والشمس ہے بطحا کی زمیں — کون سا ذرہ وہاں مطلعِ انوار نہیں؟
ہر قدم بادِ صبا حُسنِ ادب سے رکھنا — بوئے گیسوئے نبی نافۂ تاتار نہیں

صیدِ مژگانِ محمدؐ ہیں غزالانِ حرم
اس لئے ناوک و پیکاں کے طلبگار نہیں

اہلِ بصیرت دیکھ سکتے ہیں کہ اس نعتِ عالی کا ایک ایک مصرعہ نعت گو کی محبت و

---

[1] سکۂ قلب یعنی کھوٹا سکہ۔

[2] تلمیح: حضرت یوسف علیہ السلام کی مصر کے بازار میں فروخت۔

معرفتِ نبوی کا آئینہ ہے اور باوجود روحانی تربیت کی طرف تعلقِ خصوصی نہ ہونے کے روحِ سلیمانی کا ذاتِ رسالت پناہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کتنا گہرا ربط قائم ہو چکا ہے۔ کیا چشمۂ فیض سے اس تعلق کے بعد فیوضِ روحانی کا سلسلہ بند رہا ہوگا؟ نہ عقل اس کو باور کر سکتی ہے نہ واقعۃً ایسا ہوا، ـــــــ بلکہ حُبِّ نبوی برابر روحانی ترقی کا ذریعہ بنتی چلی گئی۔

سیرۃ النبیؐ کی مقبولیت کا مژدہ

سیرۃ النبیؐ کو جو قبولیت عام نصیب ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے، اور یہ قبولیت آج بھی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے، اس کی کئی جلدوں کے ترجمے عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں خود حضرت مصنف علیہ الرحمتہ کی حیات میں ہو چکے تھے اور اب کئی زبانوں میں ہو رہے ہیں یہ قبولیت عام کتاب کی عند اللہ مقبولیت ہی کا ایک اثر ہے، اور اس کے ہوتے مقبولیت پر کسی اور شہادت کی حاجت نہیں رہتی، پھر بھی اس کا ایک اور یقینی ثبوت خود سیرت نگار کے قلمِ زرنگار سے سیرۃ النبی جلد پنجم کے دیباچہ میں فراہم کیا گیا ہے وہ رقم طراز ہیں کہ :-

"ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی[۱] اور جنکی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہیں نکلا مجھ سے فرمایا :

"یہ کتاب وہاں قبول ہو گئی!"

کہاں قبول ہو گئی؟ یہ کس بزرگ کا مشاہدہ اور بیان ہے؟ میں نے خود حضرت والا سے اس کی تفصیل پوچھی، فرمایا کہ یہ میرے والد ماجدؒ تھے، عالمِ رویا میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے اور دیکھا کہ سیرۃ النبیؐ بارگاہِ رسالت میں پیش کی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرمایا اور اس پر اظہار خوشنودی سے مزید سرفرازی ہوئی حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی محنت ٹھکانے لگ گئی اور جیتے جی اس کی بشارت

---

[۱] فرزند کا تعلقِ عقیدت پدر بزرگوار کے کمالِ تقدس کی دلیل ہے، کیونکہ اس سے وہ فطری بے تکلفی تک مغلوب ہو گئی ہے جو اولاد اور باپ کے درمیان ہوتی ہے اور جو محبت کے باوجود عقیدت کو قبول نہیں کرتی!

مل گئی۔ ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔

سیرۃ عائشہؓ یہ تالیف جو سیرتِ نبوی کا در اصل تتمہ ہے حضرت علامہ کی محدثانہ عظمت پر شاہد عدل ہے۔ طبع اول کے دیباچہ میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"سوانح عمریوں کے لئے عموماً تاریخ کی کتابیں کارآمد ہوتی ہیں، لیکن اس وقت جس زمانہ کے واقعات لکھنا ہیں اس کی تاریخ صرف حدیث کی کتابیں ہیں۔ یہ تمام ذخیرہ درحقیقت جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم امہات المومنین رضا اور اصحاب کبارؓ کی مقدس زندگیوں کی علمی تاریخ ہے اس بنا پر میری معلومات کا ماخذ صرف احادیث کی کتابیں ہیں ...."

آگے حدیثی ماآخذ کی تفصیل ہے اور پھر تحریر فرماتے ہیں:۔

"اربابِ نظر جانتے ہیں کہ کتب احادیث خصوصاً بخاری میں حالات اس قدر متفرق اور منتشر ہیں کہ ان کو ڈھونڈ کر یکجا کرنا چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے چننا ہے" تاہم مسلسل مطالعہ نے جو سرمایہ فراہم کردیا وہ پیشِ نظر ہے"

اس کتاب کے طبع سوم کے موقع پر حضرت علامہ نے "عین الاصابہ فیما استدرکتہ السیدۃ عائشۃؓ علی صحابہؓ" جو علامہ سیوطی کا وہ بے نظیر رسالہ ہے جس میں انہوں نے وہ حدیثیں جمع کی ہیں جن میں حضرت عائشہؓ نے اپنے معاصرین کی غلطیاں یا غلط فہمیاں ظاہر کی ہیں، تصحیحات اور تعلیقاتِ مفیدہ کے ساتھ شامل فرمایا ہے، اس سلسلہ میں بہ کمالِ تواضع تحریر فرماتے ہیں:۔

"رسالہ عین الاصابہ کو بھی بطور ضمیمہ شامل کرنا مناسب معلوم ہوا تاکہ یہ نایاب رسالہ منظرِ عام پر آجائے اور خاکسار کو حدیث شریف کی ایک ادنیٰ خدمت کا شرف حاصل ہو۔"

آگے تجدید و تصحیح نیت کا اظہار جن الفاظ میں فرمایا گیا ہے وہ حضرت کی عرفانی حیات کے دور کا امتیاز ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اس کتاب کی تصنیف کے وقت چاہے مولف کی غرض طالب علمانہ ہو اور اس کی تکمیل کے وقت ایک رئیسہ وقت کی فرمائش کا خیال ہو، لیکن اب بحمد اللہ اس نظر ثانی میں حق اور ذاتِ حق کے سوا کچھ مطلوب نہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق سے مسلمانوں کو عموماً اور مسلمان بیبیوں کو خصوصاً اہلِ بیتِ نبوی کی محبت اور عمل کی توفیق اور خاکسار مؤلف کو حسنِ خاتمہ اور مغفرت کا انعام ملے۔" ہیچمداں سلیمان ۲۵ ربیع الاول ۱۳۶۴ھ

سیرۃ عائشہؓ تحقیق، تفصیل اور استناد کے ساتھ ساتھ حضرت علامہ کی ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے والہانہ محبت کا مرقع ہے ــــــــ دنیا کی کسی زبان میں حضرت عائشہ رضؓ کی سیرت مبارکہ اس شان کی لکھی نہیں گئی تھی، یہ شرف سید عالی مرتبت کے حصہ میں آنا تھا۔

خطبات مدراس سیرۃ النبیؐ کے علاوہ وہ آٹھ خطبات جو اکتوبر و نومبر ۱۹۲۵ء میں "مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا" کی دعوت پر شہر مدراس میں دیئے گئے اور خطباتِ[1] مدراس ہی کے نام سے مشہور و

---

[1] ان خطبات کا انگریزی ترجمہ "Prophet Muhammad" کے نام سے حضرت والا رح کی حیات ہی میں شائع ہو چکا تھا، اب تو اور بھی کئی ترجمے چھپ چکے ہیں ــــــــــــ ان کا عربی ترجمہ حضرتِ والا کے شاگرد مولانا محمد ناظم ندوی (حال شیخ الجامعہ عباسیہ بہاولپور) نے مدت ہوئی فرما دیا تھا، مگر چھپ نہ سکا تھا۔ اب عبدالحمید خطیب (سابق سفیر حجاز بہ پاکستان) اور عمر بہاالامیری (سابق سفیر شام بہ پاکستان) کی توجہات سے اس کی اشاعت "الرسالۃ المحمدیۃ" کے نام مبارک سے ہو چکی ہے اور شام ہی کو اس نودِ سحر کا فخر حاصل ہوا ہے۔

معروف ہیں وہ درحقیقت حضرتِ والاؒ کی ایک زندہ و پایندہ معنوی کرامت ہے، دماغ و دل کا یہ حیرت انگیز امتزاج، زورِ استدلال اور جذب و اثر کی یہ دو دھاری تلوار ادب و انشا۔ اور حسنِ خطابت کی یہ مثالی یادگار محض حضرتِ والاؒ کی فکر و کاوش کا کارنامہ نہیں بلکہ دل کی لگن اور موہبت و عطائے الٰہی کا کرشمہ ہے۔

میں نے خود حضرتِ والاؒ سے سنا ہے اور اس بات کے راوی بیسیوں معتبر اصحاب ملیں گے کہ خطبات مدراس بالکل قلم برداشتہ تحریر فرمائے گئے تھے ـــــــ مگر ایسے صحیح و مکمل نکلے کہ حیات کے آخری لمحات میں بھی راقم نے حضرت والا کو فرطِ مسرت سے یہ فرماتے سنا کہ "بحمداللہ آج بھی ان میں ایک لفظ کی کمی بیشی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی"۔ ایک مرتبہ اسی بے مثل کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے، احقر کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور یہ شعر پڑھا ؎

لختے بردا ز دل گذرد ہر کہ زپیشم
من قاش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

روحانی منازل سے گذر چکنے کے بعد دورِ سابق کے خطبات کو اپنے دلِ صد پارہ کی قاشیں سے تعبیر فرمانا کم از کم میرے نزدیک تو اس امر کا صریح اشارہ ہے کہ خود حضرت مصنف کے نزدیک اس کتاب کی حیثیت قلبی و روحانی کرشمہ اور ربانی فیضان کی ہے۔ ویسے جس کو انکار ہو وہ خود خطبات مدراس کو پڑھ جائے اور دیکھے کہ جوں جوں نظر اس متبرک کتاب کے الفاظ پر پڑتی چلی جاتی ہے، دل کیفیات و اثرات کے مقدس تلاطم میں ڈوبنے لگتا ہے ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
گر دلیلش باز خواہی رو متاب

سیکڑوں زبانوں سے سنا اور کتنی مثالیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ان خطبات

کو پڑھ کر زندگیوں میں انقلابِ ایمانی برپا ہوگیا ـــــ یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟ بلکہ کرامت بھی "کرامتِ معنوی" جس کا درجہ کرامتِ حسّی سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے!

امام مالکؒ سے خصوصی تعلق ہمارے حضرت والا رحؒ کو امامِ دار الہجرت، مالک بن انس (رحمۃ اللہ علیہ و قدس سرہٗ) سے جن کی فکر و نظر میں اور روح و قلب میں خالص مدنی تنویر تھی، خصوصی قلبی لگاؤ تھا، جس کا اظہار حضرت کی تالیف "حیاتِ مالک" میں جا بجا ملتا ہے ـــــ چند اقتباسات سے اس کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

حیاتِ مالکؒ کے دیباچہ میں تیسرے فقرہ کی پہلی سطر یہ ہے:-

"مجھ کو علم حدیث کی ابتدائے طلب سے امام موصوف اور ان کی موطا سے بدرجۂ غایت عقیدت رہی ہے"۔

اصل کتاب میں "تلامذہ و مستفیدین" کے زیرِ عنوان جہاں محدث کبیر شمس الدین ذہبی اور امام نووی کے امام مالکؒ سے قربِ نسبت پر ناز کا ذکر فرمایا ہے اس کے ذیل میں بلیغ جملہ بھی قلم سے نکل گیا ہے:-

"اگر بڑوں کے ساتھ چھوٹوں کا نام لینا سوءِ ادب نہ ہو تو اس ذرّۂ بے مقدار کو بھی اس آفتابِ کمال سے ایک قرب کی نسبت حاصل ہے"۔

مگر اس کی تفصیل ظاہر نہیں فرمائی ـــــ آگے "اخلاق و عادات و حالاتِ ذاتی" کے عنوان کے ختم پر یہ فقرہ کس شدتِ عقیدت و محبت کو ظاہر کر رہا ہے:-

"امام کو جو خصوصیاتِ شرف حاصل تھیں ان میں یہ کیا کم ہے کہ مدینہ مطہرہ کی خاک پاک جسمِ مبارک کا عنصر تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ مزید شرف یہ ہے کہ مسکن وہ تھا جو حضرت عبداللہ بن مسعود کا مکان تھا اور مجلس و نشست گاہ وہ تھی جو حضرت عمر فاروق رضؓ کا دولت خانہ تھا، یہیں اکثر

املائے حدیث کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ اس بنا پر امام مالکؒ نہ صرف علم و معارف فاروقی کے وارث تھے بلکہ ان کی جائداد ظاہری کا بھی خدا نے انہیں وارث بنایا۔"

امام مالکؒ سے یہ خصوصی عقیدت حضرت والاؒ کو آخر دم تک رہی ——— کاش حضرتِ والاؒ کے قلم سے حیاتِ مالکؒ کی تکمیل ہوگئی ہوتی!!

مجدد الف ثانیؒ سے برزخی ملاقات

اسی درمیانی دور میں غیر شعوری طور پر صفائی قلب اور پاکیزگی رُوح کا ایک عجیب معاملہ حضرت والاؒ کے ساتھ پیش آیا جس کو سُن کر اس بات میں کوئی شبہ نہ رہے گا کہ وہ اصطلاحی ریاضت و مجاہدہ کے بغیر روحانیت کی ایسی منزل میں پہنچ چکے تھے کہ بڑی بڑی ریاضتوں کے بعد بھی اس درجہ تک رسائی یقینی نہیں ہوتی، واللہ یجتبی الیہ من یشاء!

ایک مرتبہ حضرتِ والاؒ کی خدمت میں میری زبان پر مولانا آزاد سبحانی مرحوم کا ذکر آگیا، تو حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ "ایک روز میں نے یونہی مولانا سے کہا کہ آپ تو ماشاء اللہ نقشبندی سلسلہ کے شیخ ہیں ذرا میرے قلب کو تو دیکھئے کہ کیسا ہے؟ ہم لوگ تو علم ظاہر کے سوا کچھ اور جانتے نہیں، مولانا آزاد سبحانی فوراً میری طرف متوجہ ہوئے اور کچھ دیر بعد یہ فرمایا کہ ماشاء اللہ آپ کا قلب بہت اچھا ہے، بس صرف ایک حجاب اور مرتفع ہونا ہے اور وہ ہے حجابِ علم!

حضرت والاؒ نے فرمایا کہ "میں نے مزاحاً کہا کہ یہ بھی بڑی بات ہے، میں تو اتنا بھی نہ سمجھتا تھا۔"

یہ تو لطیفہ ہوگیا مگر اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ انہی مولانا آزاد سبحانی مرحوم نے حضرت سے فرمایا کہ "آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے، آپ کا قلب تو

بہت صاف ہے"، مگر حضرت والا نے جواب میں پھر وہی فرمایا کہ "میں تو کچھ بھی نہیں جانتا وہ بھی آپ ہی کا ارشاد تھا اور یہ بھی آپ ہی کا ارشاد ہے"۔

واقعہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۶ء میں حضرت والا رح کانپور کے ایک نامی گرامی تاجر حافظ عبدالحلیم کی پر اُن کے وطن بسّی (سرہند کے قریب پٹیالہ ریاست میں ایک شہر ہے) ایک یتیم خانہ کے افتتاح کی تقریب میں تشریف لے گئے تھے، وہاں مولانا آزاد سبحانی اور بعض اور حضرات بھی مدعو تھے، واپسی پر ان سب حضرات کا خیال ہوا کہ سرہند پہنچ کر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ کی زیارت بھی ضرور کر لینی چاہیئے، حضرت والا رح کو اس سفر زیارت سے کوئی خاص دلچسپی تو نہ تھی مگر رفقائے سفر کے خیال سے ساتھ ہو لئے ــــــ حضرت مجدد صاحب کے مزار پُرانوار پر حاضری ہوئی۔ حضرت والا رح فاتحہ مسنون پڑھ کر مزار مبارک سے ہٹ گئے اور متصلہ مسجد کے کٹہرے پر جو تقریباً تین فٹ اونچا ہوگا، بیٹھ گئے، مولانا آزاد سبحانی مع احباب کے مزار پر مراقب تھے۔

حضرتِ والا رح نے عین عالمِ ہوش میں دیکھا کہ یکایک ایک پُرنور ہستی اُن کی طرف چلی آرہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ذاتِ سراپا انوار قریب آگئی اور اس نے حضرت رح کو خطاب کرتے ہوئے سوال فرمایا:۔

"مکتوباتِ ما را خواندہٗ ؟"

حضرت نے عرض کیا "بلے خواندہ ام !"

اُدھر سے پھر سوال ہوا "آن را فہمیدہٗ ؟"

ادھر سے عرض کیا گیا "اندکے ازاں فہمیدہ ام !"

بس یہ سوال و جواب ہو رہا تھا اور حضرت والا رح غش کھا کر زمین پر گر چکے تھے مگر خود اس گر پڑنے کا ہوش ان کو نہ تھا۔ ایسے میں مولانا آزاد سبحانی وغیرہ پہنچے اور حیرت زدہ ہو گئے۔ حضرتِ والا کو جگایا اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بے ہوشی کی وجہ پوچھی گئی مگر

حضرتِ والاؒ نے سکوت فرمایا، پھر تخلیہ میں مولانا آزاد سبحانی کے اصرار پر حضرتؒ نے سارا ماجرا بیان فرمایا، مولانا مرحوم حضرت کے صفائے باطن اور عظمت روحانی کے معترف ہو گئے اور فرمایا کہ :-

"آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے"

یہ واقعہ حضرتِ والا نے ایک مرتبہ حکیم نصیر الدین صاحب ندوی (اجمیری) کی قیام گاہ پر مولانا محمد ہاشم مجددی (المعروف بہ پیر ہاشم جان) کو بھی ازراہِ لطف سنایا تھا، جو حضرت مجدد صاحب قدس سرہٗ کی اولاد میں سے ہیں اور خود بھی ایک صاحبِ دل جیّد عالم ہیں، اس محفل میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب وغیرہ بھی موجود تھے۔

اس برزخی واقعہ سے علاوہ روحانی مرتبت کے مجددی طریق اور رلون سے حضرتِ والاؒ کی مناسبت تامّہ بالکل ظاہر ہے۔

باب سوم

تلاشِ شیخ

۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۸ء

تلاشِ شیخ

اضطراب روحانی ظاہری علوم کب کسی مخلص متلاشئ حق کا ساتھ دے سکے ہیں ، علامہ فہامہ جلال الدین رومیؒ برسہا برس میدانِ علم کی بادیہ پیمائی کرتے رہے ، لیکن بالآخر ہار مان کر جب شمس تبریزؒ (قدس سرہٗ) کی رفاقت قبول کی ہے تب ہی منزل مقصود پر پہنچ پائے ہیں امام ہمام محمد بن محمد غزالیؒ نے معقول و منقول کے سمندر کھنگال ڈالے ، لیکن درِ مقصود کو نہ پا سکے ، [1] سراسیمہ و پریشان ہو کر جب بوعلی فارمدی (قدس سرہٗ) کے آستانہ پر آئے تو یہاں حاصلِ جستجو کو موجود پایا ، مطمئن و سرشار ہو گئے ــــــــ اس کی وجہ کیا ہے ؟

وجہ صرف یہ ہے کہ روح کو تسکین یقین سے ملتی ہے اور یقینِ کامل کسی حقیقت کے مشاہدہ ہی سے حاصل ہوتا ہے ، عقل بے چاری حقائق کا قائل کر بھی دیتی ہے تو ان کو دکھا نہیں سکتی ـــ

عقل گو آستان سے دور نہیں　　　اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اسی لئے ہر کامل العقل انسان علمِ کتابی کے نقطۂ کمال پر پہنچ کر مضطرب ہو جاتا ہے اور اپنی روحانی تشفی کے لئے وہ ذرائع ڈھونڈھنے لگتا ہے جو اس کو حضوری بخش سکیں ، معلوم کا مشاہدہ کرا سکیں ــــــــ چنانچہ مرحلۂ اربعین سے گذر کر یہی اضطراب یگانۂ عصر حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کو بھی پیش آیا اور بڑی شدت سے پیش آیا ، یہ ان کے اخلاص علمی اور بلند نگاہی کا لازمی نتیجہ تھا !

---

[1] ملاحظہ ہو امام غزالی کی خود نوشت سوانح "المنقذ من الضلال" جس کا ترجمہ ڈاکٹر خالد حسین قادری نے "تلاشِ حق" کے زیرِ عنوان کیا ہے (شائع کردہ محکمۂ اوقاف پنجاب ۱۹۷۱ء)

عین اس اوجِ علمی پر پہنچ کر جو اس دور میں ان کے لئے خاص ہو چکا تھا۔ حضرت والاؒ کا قلبی اضطراب اور روحانی تشنگی اور بڑھ گئی جو جاہ و منزلت بھی زیرِ قدم آئی، ہمت عالی نے اس پر قناعت سے انکار کیا، ملکِ دانش زیرِ نگین آیا تو نظریں مطلعِ عرفان کو تاکنے لگیں ؎

ملکِ اقلیم ار بگیرد پادشاہ　　ہمچناں در بندِ اقلیم دگر

محبت اور معرفت الٰہی کی جو چنگاری لڑکپن ہی سے دل میں پڑی ہوئی تھی اور برابر سلگتی جا رہی تھی اب اس نے قلب کو گرما دیا، حاسۂ قلبی جاگ اٹھا، ضرورت محسوس ہوئی کسی کے جنبش داماں کی۔

ع آتشِ افتاد بجاں جنبشِ داماں مددے

تلاشِ شیخ

مگر دامن کہاں سے لاتے؟ کس کا تھامتے؟ گھر کے بزرگ رخصت ہو چکے تھے، البتہ سندھ میں خانوادہ مجددیہ کے ایک مرتاض شیخ مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ اس وقت حیات تھے، ان کے علم و تقدس کی تعریف سُن سُن کر حضرت والاؒ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا رہا کہ خاص ان ہی بزرگ کی زیارت کے لئے سندھ کا سفر اختیار کیا جائے اور اگر "شنیدہ" کی تصدیق مشاہدہ کر دے تو ان کو اپنا رہبر طریق بنا لیا جائے مگر یہ خیال روبہ عمل نہ آسکا[1] ـــــــ اب اضطرابِ شوق جہاں جہاں لے گیا یا تو رسوم و بدعات کا دور نظر آیا یا پھر کوئی پابند سنت شخصیت نظر آئی بھی تو طبیعت اور ذوق کا میل نہیں ملا اور دو دل ایک نہیں ہو سکے۔ مثلاً حضرت کے محب مخلص مولانا گیلانی رحؒ نے چاہا تھا کہ ان کے شیخ عالی مقام مولانا محمد حسین حیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے ارادتِ سلیمانی قائم ہو جائے مگر عدم مناسبت کی وجہ سے یہ مخلصانہ کوشش بھی بار آور نہ ہو سکی

---

[1] یہ روایت مجھ سے مولانا محمد ہاشم صاحب مجددی مدظلہٗ نے بیان فرمائی جو حضرت مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ کے خلف الصدق اور ہمارے حضرتِ والا کے مرتبہ دانوں بلکہ عقیدت کیشوں میں تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ بات ان سے خود حضرتِ والاؒ نے فرمائی تھی۔

خود حضرت والا سے سنی ہوئی روایت ہے کہ وہ کسی ضرورت سے حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تھے، قیام مولانا گیلانی رحمی کے ہاں تھا، ایک روز مولانا نے حضرت والاؒ کو اپنے شیخ قدس سرہ سے ملایا اور پھر تنہائی میں حضرت شیخ نے کوئی دو گھنٹے تک وجودی رنگ کی تقریر فرمائی جس کا موضوع یہ آیت پاک تھی: "فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ـــــــــ مگر ہمارے حضرت والا کا مذاق چونکہ اس رنگ سے مختلف تھا، اس لئے اس کا کوئی خاص اثر قلب پر نہیں ہوا۔

حضرت والا کو اصل کشش حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ قدس سرہ کی ذات سے تھی، مگر وہ اس عالم رنگ و بو میں موجود نہ تھے، اسی لئے تلاشِ شیخ ایک لاینحل سا مسئلہ بن گیا تھا، خود فرماتے تھے کہ:-

"کامل دس برس تک چپکے ہی چپکے ہندوستان سے عرب تک نظر دوڑاتا رہا لیکن کوئی ہستی ایسی نظر نہ آتی تھی جو میرے درد کی درمانی کر سکے، بعض بزرگ ملے بھی تو طبیعت کو ان سے مناسبت نہیں ہوئی، بار بار یہی خیال آتا تھا کہ کاش حضرت حاجی امداد اللہ صاحب حیات ہوتے!"

اللہ اللہ تلاش شیخ کی اس دس سالہ طویل مدت نے جذبۂ شوق کو کس انتہا پر پہنچا نہ دیا ہوگا اور "حق نما" کی اس جستجو میں غیر شعوری طور پر خود قربِ حق کی کتنی منزلیں طے نہ ہو گئی ہوں گی!

حکیم الامت سے مراسلت کی غیبی صورت!

اسی دوران میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے خط و کتابت کی ایک غیبی صورت پیدا ہو گئی ـــــــــ

مفتی عبداللطیف صاحب استاذ تفسیر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے ایک رسالہ

صدارتِ عالیہ اور محکمۂ شرعیہ دولتِ آصفیہ سے "الاستفتاء" کے نام سے شائع فرمایا، اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ربا (سود) صرف بیع وشرا ہی میں متحقق ہوتا ہے (مثلاً چاندی سونے کے عوض زیادہ چاندی یا سونا خریدا جائے) قرض کی صورت میں اس کا تحقق نہیں ہوتا (مثلاً یہ کہ کوئی سو روپے دے کر سوا سو یا کم وبیش وصول کرے) لہٰذا قرض میں نفع لینا جائز ہے اور وہ ربا نہیں،

چونکہ اس رسالہ سے عوام ہی نہیں بلکہ بعض خواص اہل علم کی بھی گمراہی کا خدشہ تھا، اس لئے حکیم الامت قدس سرہٗ نے اس کے رد اور نفس مسئلہ کی تحقیق میں ایک جوابی رسالہ اپنے خواہر زادہ مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہٗ سے لکھوایا اور اس کا نام "کشف الدجی عن وجہ الربوا" تجویز فرمایا ـــــــ یہ رسالہ عربی میں لکھا گیا تھا (گو بعد میں اس کا ترجمہ بھی ہوا) اور النور بابتہ ماہ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ (م ۱۹۲۹ء) میں پہلی بار شائع ہوا پھر علیحدہ رسالہ کی صورت میں بھی اس کی اشاعت ہوئی [1]

حکیم الامتؒ نے مولانا ظفر احمد عثمانی کو ہدایت فرمائی کہ اس رسالہ پر علمائے عصر کی تصدیقات بھی حاصل کرلی جائیں تاکہ علماء کی موافقت سے اس کا وزن بڑھے اور نفع عام ہوجائے۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے اس رسالہ کا ایک نسخہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی خدمت میں بھی بھیجا حضرت علامہ نے اس خیال سے کہ یہ رسالہ حضرت مولانا تھانوی کی طرف سے موصول ہوا ہے جوابی خط بجائے مولانا ظفر احمد صاحب کے راست حکیم الامتؒ ہی کی خدمت بابرکت میں ارسال فرمایا۔

اس طرح خط وکتابت کا آغاز ہوا اور اسی مراسلت میں اصلاح نفس کا تذکرہ بھی ضمنی طور پر چھڑ گیا، اس ضروری تمہید کے بعد اب حضرت والا کا مکتوب ملاحظہ ہو:-

---

[1] اب یہ رسالہ امداد الفتاویٰ ج ۳ (مرتبہ مولانا محمد شفیع صاحب) میں شائع ہوا۔

مکتوب سلیمانی (۱)

حضرۃ العلامۃ المفضال متع اللہ المسلمین بطول بقائکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رسالہ النور متضمن رسالہ "کشف الدجیٰ" مع ہدایت نامہ سرفرازی کا باعث ہوا، میں اس کو اپنے لئے سعادت کا طغریٰ سمجھتا ہوں کہ آپ اس ظلوم وجہول سے تقریظ لکھنے کو فرمائیں، خدا گواہ ہے کہ میں اپنے کو اس سے کمتر سمجھتا ہوں کہ آپ کی کسی تحریر پر تقریظ لکھوں مجھے یہ بھی شک ہے کہ میرا طریقہ تحریر اور طرز استدلال پسند خاطر اشرف ہو، مگر بحکم الامر فوق الادب تعمیل کروں گا۔ اگر میرا یہ عذر قابل پذیرائی نہ ٹھیرا ——— ساتھ ہی زبان کے متعلق فیصلہ ہو کہ عربی ہو یا اردو جواب کے لئے لفافہ و ٹکٹ کی حاجت نہیں۔

حضرت مستفتی میرے استاذ و شیخ ہیں۔ یہ رسالہ انھوں نے مجھے حیدر آباد (دکن) میں خود دیکھنے کے لئے دیا تھا اور میں اس کو بغور پڑھنے کے لئے ساتھ لایا تھا، پڑھ کر ان کو میں نے ان الفاظ کے ساتھ اس کو واپس کیا کہ آپ جس کو مکروہ سمجھتے ہیں میں اس کو عین ربوٰا کہتا ہوں اور میرے نزدیک تو قیل وقال و روایت سے زیادہ مستحکم دلیل عمل سلف کرام ہے کہ یہ ایسا کھلا اور شدید الاحتیاج مسئلہ ہونے کے باوجود کسی نے اس کو جائز نہیں بتایا اور نہ اس پر کبھی عمل کیا، لفظ بیع و دین و قرض کے اصطلاح سے بڑھ کر لغت کا فیصلہ ہے، رسالہ کشف الدجیٰ کے مطالعہ سے بہرہ مند ہوا، طرز عبارت اور انشا کی سلاست اور جاذبیت نورٌ علیٰ نور ہے۔

بار بار میرا دل جب زمانہ کے فتن وحوادث سے گھبرا اٹھتا ہے اور بے اختیار کسی سکینت وطمانیت کی تلاش ہوتی ہے تو خانقاہ امدادیہ کی یاد آتی ہے لیکن ڈر تھا کہ معلوم نہیں کہ اجنبیت و بے گانگی سے میرے متعلق کیا کیا اب تک پہنچا ہو اور آپ مجھے تخاطب

کا اہل بھی سمجھیں یا نہیں![a] ـــــ میں تو اس رسالہ استغناء کا ممنون ہوں کہ اس اجنبیت و بے گانگی کی جگہ اس کی بدولت انسیت و یک جہتی کی صورت پیدا ہوئی، اب میں اس کشمکش کی منزل میں ہوں جس میں علوم ظاہری تسکین کا باعث نہیں بنتے۔

دعا کا طالب و ہمت کا خواستگار ہوں۔ والسلام

سلیمان ندوی

اس مکتوب کے جواب میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو والانامہ لکھا، وہ بھی ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ حضرت حکیم الامت کے ہاں ہر ایک کے حفظ مرتبت کا کس قدر پاس و لحاظ تھا!

جوابِ اشرف

مولانا المحترم دامت فیوضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عجب بات ہے کہ انبساط کا قصد نہ میرا تھا نہ جناب کا، دونوں طرف اتفاقاً ہی اس کے اسباب پیش آگئے، اس کا واقعہ تو جناب نے تحریر ہی فرما دیا، اس طرف یہ واقعہ ہوا کہ میں نے بالتعیین کسی بزرگ کے پاس رسالہ بھیجنے کو نہ کہا تھا، دو وجہ سے :- ایک یہ کہ مجھے بزرگوں کی فہرست ہی بہت غیر مکمل معلوم ہے، دوسرے کسی کو ایسی تکلیف دیتے

---

[a] حضرت والا رح فرماتے تھے کہ بعض لوگوں نے حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کو مجھ سے اتنا بدظن کرا دیا تھا کہ وہ مولانا شبلی سے بھی زیادہ مجھ ہی سے ناراض تھے ـــــ

کچھ اسی قسم کی شکایت "حکیم الامت" (مصنفہ مولانا دریابادی) کے اوراق میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے قلم سے بھی پڑھنے میں آتی ہے (صفحہ ۳۵۱)، افسوس ہے ان افراد پر جو کسی کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور اسکو حسنِ ظن اور اتصال کے بجائے بدظنی اور انفصال میں صرف کریں ؎ ہر کہ شاہ آں کند کہ او گوید؛ حیف باشد کہ جز نکو گوید (سعدیؒ)

ہوئے ہمت نہیں ہوتی خصوص اگر میرا کلام ہو تو بے حد حجاب ہوتا ہے، یہ رسالہ میرے ہمشیرہ زادے نے لکھا، اگرچہ میرے ہی کہنے سے لکھا، چونکہ عام طبائع کی حالت پر نظر کر کے اس استفتاء کی مضرت عامہ کا قوی اندیشہ تھا، اس کے انسداد کی سب سے انفع تدبیر علماء کی موافقت حاصل کرنا ذہن میں آیا کہ عوام پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے[1]، اس لئے میں نے عزیز موصوف کو مصارف دیکر مشورہ دیا کہ جہاں مناسب ہو بھیج دیا جاوے میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے جناب کو بھی تکلیف دے کر یہ موقع دیا کہ میں جناب کا مخاطب بن سکا، غرض یہ واقعہ ادھر سے ہوا۔

بہرحال حجاب مرتفع ہونے کے بعد اب مضامین محبت کا جواب عرض کرتا ہوں جناب کی تواضع نے ضرور مجھ کو ایک معتدبہ درجہ میں معتقد بنا دیا، اور غالب یہ ہے کہ آئندہ اس میں اضافہ اور قوت ہو، باقی طرز عبارت یا استدلال کی پسندیدگی و عدم پسندیدگی، سو اس کے متعلق اعتقاد دلی سے ایک نظیر عرض کرتا ہوں کہ سادے کپڑے پہننے والے کو کسی طرح یہ حق نہیں کہ رنگین کپڑے پہننے والے کو ناپسند کرے بشرطیکہ مقصودِ ستر بوجہ مشروع محفوظ رہے اور زبان کا فیصلہ سو دونوں شقوں کو اختیار کرنے سے مجھ کو ایک ایک عذر مانع ہے، اردو زبان تو جناب کی شان سے گری ہوئی ہے اور عربی زبان سے میری شان گری ہوئی ہے کیونکہ میں عربی زبان پر قادر نہیں، اس لئے اس کو جناب ہی کی رائے پر چھوڑتا ہوں۔

مسئلہ کے متعلق جس عنوان سے رائے سامی ظاہر فرمائی ہے اس سے سہل اور

---

[1] حکیم الامت قدس سرہٗ نے جب بھی کوئی کتاب چھوٹی ہو یا بڑی خود تحریر فرمائی یا اپنی نگرانی میں لکھوائی تو اسوقت ملت کی کوئی نہ کوئی ضرورتِ وقتی اور منفعت انکے پیشِ نظر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ مصنفاتِ اشرفیہ میں بیان القرآن اور اعلاء السنن جیسی خالص علمی اور ضخیم کتابیں بھی ہیں، اور اصلاح الرسوم اور اغلاط العوام جیسے چھوٹے رسالے بھی شامل ہیں۔ یہ حکیم الامت کے جذبۂ شفقت کی کھلی دلیل ہے! اعلی اللہ مقامہ۔

دل میں اُتر جانے والا عنوان کم نظر آتا ہے۔ بارک اللہ فی معارفکم۔

عبارت کے متعلق جو ارشاد فرمایا ہے اس سے میں کاتب عبارت کا زیادہ معتقد ہو گیا کہ ماہر کی شہادت ہے باقی اپنی حالت قصور باع فی العربیۃ کو اوپر عرض کر چکا ہوں، اس لئے کاتب کے متعلق دینی اعتقاد کو بھی غیر ماہر کی شہادت ہونے سے شہادت ناقصہ سمجھتا تھا۔

آخر میں جو خانقاہ کے متعلق اپنا انجذاب اور اس کے ساتھ کچھ موانع محتملہ کا ذکر فرمایا ہے اگر خانقاہ میں حضرت شیخ قدس سرہٗ رونق افروز ہوتے تو یہ سب مضامین حقیقت پر منطبق ہو سکتے تھے لیکن اب محض حسنِ ظن پر منطبق ہو سکتے ہیں، اس سے آگے ہیچ، البتہ زیادہ تکلف کرنے کو بھی اعادۂ حجابِ سابق اور موہن انبساطِ لاحق سمجھ کر پسند نہیں کرتا، اس لئے بلا تکلف معاملہ کی سچی بات عرض کرتا ہوں کہ جناب کا یہ حسنِ ظن اگر کسی روایت پر مبنی ہے تو لا یوثق بہ، اور اگر ذوقی و وجدانی ہے تو میں دوستی کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ مجھ کو علوم میں مخاطب نہ بنایا جائے کہ ان سے معرّا ہونے کو اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔ والصدق ینجی، والسلام

التماس! جناب کا الطاف نامہ رکھ لیا ہے، اگر اجازت ہوگی، اس کے بعض جملے جن کا تعلق مسئلہ سے ہے، تقریظ کے ساتھ منضم کر دیئے جائیں گے، یہ کاتب کی درخواست ہے جس کے قبول فرمانے میں جناب بالکل آزاد ہیں، اگر مصلحت یا طبیعت کے ذرہ بھی خلاف ہو۔ ممانعت پر بھی وہی مسرت ہوگی جو اجازت پر ہوگی[1]۔ فقط

ناکارہ، آوارہ، ننگِ انام اشرف برائے نام

از تھانہ بھون ۲۸، دسمبر ۱۹۲۹ء

---

[1] معاملہ کی صفائی مسلک اشرفیہ کا خاص امتیاز ہے!

اس پہلی مراسلت کے بعد جس کے سامان غیب ہی سے ہوئے تھے، ہمارے حضرت والا نے ایک اور عریضہ خدمت اشرف میں بھیجا جس میں نسخۂ روحانی کی درخواست اور اپنے ابتدائی ماحول، باطنی رجحانات اور فقہی مسلک کا تذکرہ ہے، اس اعتبار سے یہ مکتوب بہت اہم ہے، ملاحظہ ہو:۔

مکتوب سلیمانی (۲)

حضرت ہادیٔ طریقت متع اللہ المسلمین بطول بقائکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

والانامہ جو لطف وعنایت سے بھرا ہوا تھا، ورود فرما ہوا، اس سے ایک پریشان حال و منتشت البال کی سکنیت ہوئی۔

• مولانا! میں آپ کی دعا و دعوت کا بہترین مستحق ہوں۔ مسائل علمی کی الجھن سے نجات کا خواستگار نہیں بلکہ روح کی الجھن سے نجات کیلئے دعا وہمت کا طالب ہوں، میں نے اعتزال سے لے کر سلفیت تک بمدارج ترقی کی ہے، عقائد میں امام مالک کے اس اصول کا پیرو ہوں: الاستوے معلوم والکیفیت مجھول والایمان بہ واجب والسوال عنہ بدعۃ[1]۔ سیرۃ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ کی تالیف وتدوین میں خواہ مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں مگر اس مصروفیت نے ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جذبۂ محبت پیدا کر دیا ہے، وللہ الحمد، فقہ میں متاخرین کا متبع نہیں، مگر الحدیث بالمعنی المتعارف نہیں ہوں، ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا دل سے ادب کرتا ہوں اور کسی رائے میں کلیتۂ اُن سے عدول حق نہیں سمجھتا،

---

[1] یعنی استویٰ معلوم ہے کیونکہ قرآن میں مذکور ہے) مگر اسکی کیفیت (کہ کیونکر ہے) نامعلوم ہے۔ اس پر ایمان واجب ہے اور اسکے بارے میں سوال بدعت ہے۔

میرا خاندان صوبۂ بہار میں علمِ ظاہر و باطن کا جامع رہا ہے، والد مرحوم ابو العلائی المشرب تھے، بھائی صاحب مرحوم مجددی تھے اور دونوں صاحبِ حال و نسبت تھے، بچپن بھی ان بزرگوں کی آغوش میں بسر ہوا، ذکر و مراقبہ اُسی سن سے شروع کر دیا گیا، مگر بُرا ہو علمِ باطل کا کہ جس نے مدتوں کے لئے اس راہ سے ہٹا دیا اور خدا جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں، اور اب جب مرحلۂ اربعین سے گذر کر ہوش آیا ہے تو ان بزرگوں کا سایہ سر سے اُٹھ چکا ہے میں نے یہ کیفیت اس لئے لکھ دی تا کہ جناب میرے مستقبل کی اصلاح میں میرے ماضی سے باخبر رہیں۔

میرے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں کہ مجھ میں استقامت و تثبت اور رغبت الی الطاعت پیدا ہو۔ فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں، کبھی کبھی ذوقِ سجود کی لذت بھی پاتا ہوں۔ امام ربانی مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے سلسلہ سے عقیدت تامّہ رکھتا ہوں، خرافات وطاماتِ صوفیہ کا دل سے منکر ہوں، صالح نہیں لیکن صلاح حال کا دل سے خواستگار ہوں، یورپ کے مذہبی و علمی حملوں کے مقابلہ میں اسلام کی خدمت کا ولولہ ہے اور اب تک پچیس برس کا زمانہ انہی مشاغل میں گذرا۔ اب آپ سے دعا کا طالب، ہمت کا خواستگار اور حصول اخلاص اور اصلاح قلب کے لئے کسی نسخہ کا سائل ہوں۔

رسالہ کشف الدجے پر قلم نے جو یاوری کی ہے، مولوی ظفر احمد صاحب کی خدمت میں ارسال ہے۔

سلیمان ندوی

۲۱ شعبان ۱۳۴۸ھ

اس رقیمۂ سلیمانی کا جواب حضرت تھانویؒ نے بڑے ہی انشراح سے تحریر فرمایا، جواب سے پہلے یہ نوٹ ہے اور پھر اصل تحریر شروع ہوتی ہے:۔

"عرضِ اطلاعی:- میں نے سہولت کے لئے یہ معمول جاری کر رکھا ہے کہ جواب کے ساتھ اصل خط بھی رکھ دیتا ہوں اور اسی طرح منگانا بھی پسند کرتا ہوں تاکہ انطباق میں آسانی ہو، گو صورۃً یہ خلاف تہذیب ہے اور اسی لئے اور صحیفہ کے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا، مگر اب کسی قدر بے تکلفی ہونے سے معنی کو صورت پر ترجیح دی۔ فقط"

اب اصل مکتوب ملاحظہ ہو، جو اس اعتبار سے بھی بہت اہم ہے کہ اس کے آخری فقرے میں عطرِ تصوف کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے۔

جوابِ اشرف

از خاکسار اشرف علی عفی عنہ بخدمت مکرمی محترمی دام فیضہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

الطاف نامہ نے مع تقریظ مسرور فرمایا اور تقریظ نے علومِ مفیدہ میں اضافہ فرمایا، اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کو مسرور رکھے بمسرت ظاہرہ وباطنہ۔

سب سے اول اس عنوان کے تبدیل کے متعلق درخواست کرتا ہوں جس سے مجھ کو خطاب فرمایا ہے یعنی "ہادیٔ طریقت" اس کو دیکھتے ہی ذہن پر یہ وارد ہوا۔ ع

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

اور یہ بھی:- ع صلاحِ کار کجا و من خراب کجا

اگر جامی کا یہ شعر

بیا جامی رہا کن شرمساری
زصاف و درد پیش آرانچہ داری

فوراً ذہن میں نہ آجاتا تو عجب نہیں یہی عنوانِ خطابت غایت درجہ کے خجلت زا ہونے سے عرض جواب سے عذر مانع ہو جاتا، مگر اب صرف اس درخواست پر اکتفا کرتا ہوں کہ جو عنوان خود میں نے آپ کے لئے اختیار کیا ہے اس سے تجاوز نہ فرمایا جائے، گو میں اس

کا بھی اہل نہیں مگر عرف کی روایت میں زیادہ اہلیت شرط نہیں۔ اس کے بعد الطاف نامہ کا جواب عرض کرتا ہوں مگر اس کے ساتھ یہ بھی شرطیا درخواست ہے کہ میرے معروضات کو قولِ فیصل خیال نہ فرمایا جائے بلکہ خُذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل رہے اور اس انتخاب سے مجھ کو مطلع فرمانا بھی ضروری نہیں[1] ——— اب بے تکلفی سے جواب عرض کرتا ہوں۔

مجھ کو اس سے خاص مسرّت ہوئی کہ میرا معروضہ کسی درجہ میں موجب سکینت ہوا اور بالیقین یہ اثر میرے عریضہ کا نہیں، جناب کے حُسنِ ظن کا ہے اور عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ حسن ظن کے محل سے عطایا تقسیم فرماتے ہیں اس حسنِ ظن سے مجھ کو بھی انشاء اللہ اپنے نفع کی امید ہے، فصدق اللہ رجاءنا جمیعاً، اور یہی توقع نفع کی حسن ظن کی بنا پر سبب ہے میری جرأت مکاتبت کا ورنہ ع صلاح کار کجا و منِ خراب کجا۔ میں دل سے دعا کی خدمت کو اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں اور اس کا طالب بھی ہوں۔

جناب نے جو بے تکلف اپنا مسلک تحریر فرمادیا اس سے میری عقیدت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوگیا دو وجہ سے، ایک صدق وخلوص پر دال ہونے سے دوسرے خود مسلک کے پاکیزہ ہونے سے تمام اہل حق کا یہی مسلک ہے، کسی جزئی تفاوت سے حقیقت نہیں بدلتی صرف رنگ بدلتا ہے، چنانچہ اس احقر پر دو جگہ دوسرا رنگ ہے، ایک یہ کہ میں بوجہ اپنی قلّتِ روایت و درایت کے متاخرین کا بھی متبع ہوں، دوسرے یہ کہ صوفیہ کے احوال واقوال کو محتمل تاویل سمجھتا ہوں[2] الا من تحقق بطلانہم بالقطع۔

شرف وبرکاتِ خاندانی سے حقیقۃ الحقیقت تک وصول کی بہت جلدی اور قوی

---

[1] اس پورے فقرے سے کس قدر عبدیت اور شان تواضع عیاں ہے

[2] چنانچہ التکشف اور بوادر النوادر حضرت تھانوی کے اس رنگ کی آئینہ دار ہیں، اور "التنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی" تو خاص اسی ضرورت کے تحت تحریر فرمائی ہے۔

امید ہو لر خاص طمانیت ومسرت حاصل ہوئی۔ اللھم افعل وقد فعل انشاء اللہ تعالیٰ۔ اس ضمن میں میں نے بھی اپنا کچا چٹھا اس لئے عرض کر دیا کہ آپ کو خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل فرمانے میں سہولت ہو، دوسرے طبعاً یہ چاہتا ہوں کہ اپنے احباب سے اپنا کوئی راز مکتوم نہ رہے، میری رائے میں اس سے تعلق بڑھتا ہے اور یہ خاص نعمت ہے اللہ تعالیٰ کی کہ دو مسلمانوں میں خاص اور خالص تعلق رہے، اور اسی مصلحت سے آج ہی ایک رسالہ جو میرے رسالہ کی تسہیل ہے روانہ خدمت کر رہا ہوں[1]، اصل بھیجنے سے معذور رہا، اس وقت یہی موجود تھا، اس سے میرا مسلک جو طریق کے متعلق ہے ضروری درجہ میں واضح ہوگا۔ اس کے بعد جناب نے ایسے نسخہ کی فرمائش فرمائی ہے جو خاص آثار کے لئے مثمر ہو، اسکے صحیح عذر کو تو صفحہ اوّل میں عرض کر چکا ہوں کہ صلاح کار الخ او خویشتن الخ لیکن اس کے ساتھ ہی جناب کا حکم اور جامی کا امر "رہا کن شرمساری" اور اپنی درخواست خذ ما صفا الخ اس مجموعہ نے حیا کو امتثالِ امر سے مغلوب کر کے چند سطریں عرض کرنے کی جسارت دلائی اور یہ سطریں بطور اصول موضوعہ کے ہیں اگر پسند فرمائی جائیں گی تو آئندہ عرض معروض کرنے میں مجھ کو یکسوئی رہے گی کیونکہ ان کا اکثر حصہ انہی اصول کی فروع ہوں گی۔ ان اصول کا خلاصہ ایک ہی اصل ہے وہ یہ کہ:۔

مامور بہ وجوباً یا استحباباً اس طریق میں صرف افعال ہیں، انفعالات نہیں مثلاً استقامت وتثبت ورغبت الی الطاعات والتزام فرائض وتنفر عن البدعات ولذت وذوق واخلاص واصلاحِ قلب وامثالہا، ان میں جو چیزیں یا بعض چیزوں کے جو جوارحی افعال ہیں وہ مامور بہ ہیں کیونکہ وہی اختیاری ہیں اور جو انفعالات ہیں وہ مامور بہ نہیں کیونکہ وہ غیر اختیاری ہیں، البتہ وہ انفعالات بعضے مطلقاً بعضے خاص احوال میں محمودہ ضرور

---

[1] یعنی تسہیل قصد السبیل۔

ہیں اور اسی درجہ میں مطلوب بھی ہیں مگر وہ سب آثار و ثمرات انہی افعال کے ہیں اور وہ افعال ہی ان کے اسباب ہیں کہ ان کی طرف فی الجملہ یا فی الاکثر مفضی ہیں، ان کے علل نہیں کہ ان سے متخلف ہی نہ ہوں، اگر تخلف بھی ہو تو مضر نہیں کیونکہ اصل مقصود یعنی قرب و رضا کی وہ شرطیں نہیں[۱]۔ فقط والسّلام

اس مکتوبِ اشرف کے تقریباً دو مہینے بعد ہمارے حضرتِ والا نے پھر ایک عریضہ لکھا اور اس کا جواب حکیم الامتؒ نے عطا فرمایا، یہ مکاتبت سہولت فہم کے لئے سوال و جواب کی شکل میں درج ذیل ہے، حضرت والا کی تحریروں کے لئے (س) کا اشارہ اور حضرت تھانویؒ کے ارشادات کے لئے (ا) کا اشارہ ذہن میں محفوظ رہے۔

مراسلت (۳)

(س) حضرت اقدس دام فضلکم السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

نادم ہوں کہ دیر کے بعد حاضر ہو رہا ہوں، رمضان المبارک سے کچھ دن پہلے والانامہ مع رسالہ تسہیل قصد السبیل شرف افزا ہوا تھا، رسالہ تو اسی زمانہ میں ایک روز میں پڑھ لیا اور اس کے مطالب کو سمجھ لیا، رمضان المبارک کے ایام مبارکہ میں تکلیف دینے سے احتراز کیا اور مولوی ظفر احمد صاحب کو اس کی اطلاع اور رسالہ کی رسید بھیج دی، شوال میں خط لکھنے کا ارادہ تھا مگر اوائلِ شوال سے آج سے چند روز پیشتر تک سفر میں گذرا اور موقع نہ ملا۔

---

[۱] کس قدر گٹھی ہوئی عبارت ہے اور معانی دریا بہ کوزہ کر دیئے گئے ہیں۔ ایک بزرگ جو اس مکتوب کی تحریر کے وقت حضرت حکیم الامت کی خدمت میں حاضر تھے مجھ سے فرماتے تھے کہ لکھ کر حکیم الامت نے فرمایا کہ میں نے مولوی صاحب کے لئے تصوف کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

(ا) از اشرف علی

بخدمت مولانا دام مجدہم السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دیر پر ندامت کا مبنی غالباً احتمال ہے میری کلفتِ انتظار کا، اسی طرح رمضان المبارک میں خطاب سے سبکدوش رکھنے کا مبنی بھی وہی احتمال ہے میری تکلیف کا اور ان احتمالوں کا سبب محض محبت اور اس محبت کا حق اپنے ذمہ یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کو یہ اطلاع دے کر بے فکر کردوں کہ مجھ کو جس کے سبب ایسا انتظار ہی نہیں ہوتا اور قلت اوراد کے سبب رمضان میں بھی مکاتبت سے تکلیف نہیں ہوتی۔

(س) رسالۂ تسہیل کو پڑھ کر سب سے پہلا اثر جو دل پر ہوا یہ تھا کہ یہ راہ سخت مشکل ہے دوسری چیز یہ معلوم ہوئی کہ ان جزئیاتِ فقہیہ کا جن کا اس میں ذکر ہے میرے لئے تحقیق طلب تھا میں نے بات صفائی سے لکھ دی۔ ان اللہ لا یستحی من الحق۔

(ا) تسہیل کا سبب تعسیر ہونا، اور جزئیات فقہیہ کا قابلِ تحقیق ہونا جو تحریر فرمایا گیا ہے اگر یہ اطلاع مکاتبت فی الباب کا خاتمہ ہے تو ع

صلاح ما ہمہ آنست کاں تراست صلاح

اور اگر یہ اطلاع مکاتبت کی اطلاع اور اس کی مانعیت کا رفع مقصود ہے تو کسی قدر واضح تقریر کی حاجت ہے یعنی یہ کہ طریق میں کون امر دشوار معلوم ہوا اور کون مسئلہ سبب تباعد ہوا، تاکہ اذنِ جواب کا امتثال کرسکوں۔

(س) رمضان المبارک کے عشرۂ آخر میں بعد سحر و نماز صبح میں کچھ دیر کے لئے سوتا تھا میں نے اس میں دو خواب دیکھے، اپنے کو دیکھا کہ میں مدراس میں ہوں حضرت والا بھی مع اپنے ہمراہیوں کے ایک مکان میں فروکش ہیں، آپ کے ہاتھ میں بہت بڑی تسبیح ہے آپ کے ایک ہمراہی مولوی ظفر احمد صاحب جو الگ بیٹھے ہیں جن کی وضع قطع، داڑھی کی تراش خراش اہلِ پنجاب کی سی ہے۔ انہوں نے مجھ سے کچھ اردو ادبیات پر گفتگو کی، مگر آپ

کے دوسرے ہمراہی جو ضعیف العمر معلوم ہوئے وہ مصلیٰ بچھائے نہایت خضوع کے ساتھ مصروف نماز ہیں، ان کی نسبت معلوم ہوا کہ یہ آپ کے خادم خاص ہیں۔

اس کے دو دن بعد ۲۳ کو پھر اسی وقت خواب دیکھا کہ میں ریل میں سوار کہیں جا رہا ہوں کہ ایک جگہ گاڑی کھڑی ہو گئی، معلوم ہوا کہ یہ تھانہ بھون ہے۔ جی میں آئی کہ اتر جاؤں چنانچہ اتر گیا اور سامان لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا کہ یہاں تو جگہ بہت کم ہے یہاں نہیں ٹھیر سکتے، میں نے عرض کیا کہ اس کی فکر نہ فرمائیے میں نے راستہ میں ایک مسجد دیکھی ہے میں اس میں ٹھہر جاؤں گا۔

(ا) دونوں منقول خواب ذوقاً مبشرات ہیں مگر علمی کم مائگی کے سبب باقاعدہ تعبیر سے قاصر ہوں[1]۔

(س) میری حالت میں استقامت نہیں ہے اور اسی کی فکر مجھے رہتی ہے۔ میری حالت یہ ہے، ؎

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

اس کے لئے دعا فرمائیے۔

(ا) استقامت کی نسبت جو تحریر فرمایا ہے اس کے امثال کے متعلق رقیمۂ سابقہ میں عرض کر چکا ہوں کہ مقصود او ر مامور بہ اعمال ہیں، انفعالات نہیں ــــــ اگر یہ معروضہ رائے سامی میں مجمل ہو تو مفصل بھی عرض کر سکتا ہوں، دعا اللہ خوان کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

(س) کسی مناسب دعا یا ورد کی تلقین فرمائیے۔

(ا) ورد کی تجویز میرے نزدیک اس کا درجہ ترتیب میں مسائل زیر کلام کے بعد ہے

---

[1] تعبیر سے قاصر تو کیا تھے۔ البتہ راقم آثم کا گمان غالب یہ ہے کہ اول مرحلہ میں اس طرح کا رد کھایا حقیقتاً اصولی جواب دینے میں حکمت یہ تھی کہ سالک کی نظر ابتداءً تصوف کے غیر مقصود امور سے ہٹی رہے۔ واللہ اعلم۔

آگے جیسا ارشاد ہو، حاضر ہوں۔

(س) مولوی عبدالحیٔ صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے دمِ آخر آپ کا ایک رسالہ بھیجا، "آئینہ تربیت" اور ساتھ دوسرے تیسرے دن وفات کی اطلاع ملی، غفر لہ الاحد۔

والسّلام

(ق) رسالہ "آئینۂ تربیت" مولانا کی یادگار ہے! مگر یہ صرف ایک مختصر فہرست ہے جو کہ مفصّل مضامین دیکھنے کے بعد یادداشت کے لئے اشارات ہیں، وہ مفصّل مضامین "تربیت السالک" میں ہیں۔ اطلاعاً عرض کیا۔ والسّلام

از تھانہ بھون۔ ۲۹ شوال ۱۳۴۸ھ

یہ مراسلت تمامتر صیغۂ راز میں ہوئی تھی اور مناسبت کی جستجو اس کا محرّک تھا، یکسوئی اب تک میسر نہیں آئی تھی، چنانچہ حضرت والا اپنے عم محترم سید عبدالحکیم مرحوم کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"آپ بیتی کیفیت کا ایک زیرِ پردہ نظارہ باقی رہ گیا، روز بروز طبیعت کا رُخ دوسری طرف ہو رہا ہے، مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے خط و کتابت جاری ہے، خدا جانے توفیق ملتی ہے یا نہیں، معیار اتنا بلند ہے کہ نظر کہیں کم جمتی ہے، بہرحال کچھ نہ کچھ راز و نیاز کا سلسلہ جاری ہے یہ تمام تر راز ہے![1]"

۲ مئی ۱۹۳۰ء

غرض اس کیفیت قلبی کے ساتھ تین عریضے لکھے گئے، اور مرشد تھانوی نے ان کے جوابات عطا فرمائے ـــــ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے پاس اس مراسلت کی جو نقل موجود ہے، اس کے ختم پر میں نے حضرت تھانویؒ کے قلم مبارک سے یہ جملہ لکھا ہوا دیکھا کہ

---

[1] معارف بابت نومبر ۱۹۵۵ء

"پھر جواب نہیں آیا"

اس جملہ سے ظاہر ہے کہ حضرت شیخ قدس سرہٗ نے جواب کا انتظار ضرور فرمایا اور جب مدت تک خاموشی دیکھی تو یہ جملہ تحریر فرما کر نقلِ مراسلت کو داخلِ دفتر فرما دیا۔

رُکاوٹ

کیوں جواب نہیں آیا؟ اس کی وجہ میں نے حضرت والاؒ سے یہ سنی ہے کہ اسی زمانہ میں تھانہ بھون سے رسالۂ النور مولانا ظفر احمد تھانویؒ کے زیرِ ادارت نکلتا تھا اور اعظم گڈھ سے "معارف"! جب جب حضرت مولانا تھانویؒ کی خدمت میں عریضہ لکھنے کا ارادہ ہوتا تھا، کوئی نہ کوئی اختلافی مسئلہ النور میں شائع ہو جاتا اور اس کی وجہ سے طبیعت میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی تھی ظاہر ہے کہ اس طرح کے مسلسل دو چار اتفاقات بھی پیش آ گئے ہوں تو نفسیاتی طور پر مستقل تامل اور توقف کے لئے کافی تھے، کیونکہ اب تک نہ تو فریقین نے ایک دوسرے کو دیکھا اور سمجھا تھا نہ جو خط و کتابت ہو گئی تھی وہ کسی عزم و ارادہ کے ماتحت تھی، جو کچھ ہوا وہ محض قدرت کا ایک لطیف اشارہ تھا کہ حق کے متلاشی کو آخر کار خانقاہ امدادیہ اور خاص دستِ اشرف ہی سے گوہرِ مقصود عطا ہو گا ــــــــ

پہلی مُلاقات اور شیخ کا تاثر

۱۹۳۴ء ختم اور ۱۹۳۵ء کے آغاز کا زمانہ تھا۔ حضرتِ والا ڈاکٹر اقبال مرحوم کی دعوت پر کسی کمیٹی میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے تھے، چونکہ اب تک حضرت مولانا تھانویؒ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لئے لاہور سے واپسی پر خیال آیا کہ تھانہ بھون کچھ دیر کے لئے اُتر جائیں، چنانچہ یہ اندرونی تقاضا پورا ہوا اور مرشد تھانوی کی زیارت ہو گئی، اس ملاقات سے خود حضرت شیخ قدس سرہٗ نے جو اثر لیا اس کو خود انہی کے نچے تُلے پُر کیف الفاظ میں سنیئے، مولانا دریابادی کے ایک مکتوب میں اس کا ذکر فرماتے ہیں۔

"مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دفعتہً تشریف لے آئے ہیں مکان

پیر تھا، سنتے ہی حاضر ہوا، میرے ذہن میں ان کا جثہ طویل وعریض تھا، ملا تو معتدل الخلقت پاکر قلب کو بہت اُنس ہوا۔ پھر ملاقات ومکالمت سے ان کو تواضع وسادگی ورعایت جلیس کو دیکھ کر تو مسخر ہی ہو گیا[1]۔ گیارہ بجے تشریف لائے تین بجے واپس تشریف لے گئے مجلس میں بہت دیر تک ثناخوانی کرتا رہا[2]"

یہ ثناخوانی اور زبانِ اشرفؒ سے بجز حضرت سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کس کو نصیب ہو سکی؟ یقین ہے کہ اس ملاقات سے جو اثر حضرت شیخ کے قلب مبارک پر ہوا، اسی طرح کا اثر حضرت والا رحؒ کی طبیعت نے بھی قبول کیا ہوگا، اور اس کی وجہ سے امید کی جا سکتی تھی کہ جو رکاوٹ اختلاف مسائل کی وجہ سے پیدا ہو چلی تھی وہ دور ہو جاتی مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا، اس لئے اس اثر وتاثر کے باوجود ربط قائم نہ ہو سکا، طرح طرح کی مزاحمتیں پیدا ہوتی گئیں۔

غوغائے تکفیر سرائے میر (اعظم گڑھ) میں ایک مدرسہ، مدرسۃ الاصلاح کے نام سے مولانا شبلی کے خاکہ کے مطابق قائم تھا، اس میں عربی، صرف ونحو کی دقتوں کو کم کر کے عربی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی اور قرآن پاک کو تعلیم کا محور قرار دیا گیا تھا اور دوسرے علوم کو قرآن پاک کا خادم بنا کر سکھایا جاتا تھا، اسی لئے فلسفہ اور منطق کی دور از کار کتابیں نصاب سے نکال دی گئی تھیں، اس مدرسہ کے ناظم اوّل مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ تھے، مولانا فراہی کی رحلت پر ان کی یادگار اور ان کی تصنیفاتِ قرآنی کی اشاعت کے لئے مدرسۃ الاصلاح کے علماء نے ایک دائرہ

---

[1] کیسے مفتری ہیں وہ لوگ جنہوں نے بزعم محبت یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سید صاحب گئے تو تھے ملنے کے لئے لیکن مولانا تھانوی نے بزور تصرف ان کو مسخر کر لیا اور از خود ان کو مرید بنا لیا، اس بیان میں اگر مولانا تھانویؒ کی شکایت ہے تو سید والا مرتبت کے رتبۂ عالی کا کونسا پاس ولحاظ ہے۔ [2] ملاحظہ ہو "حکیم الامت" صفحہ ۴۳۸

حمیدیہ قائم کیا اور الاصلاح نام کا ایک ماہوار رسالہ بھی جاری کیا گیا۔

مدرسۃ الاصلاح کی روز افزوں ترقی آس پاس کے دوسرے مدارس کے لئے جو دیوبند کے طرز پر قائم تھے رشک وحسد کا باعث بنی اور انہوں نے اس مدرسہ کو ناکام بنانے کے لئے مسلمانوں میں غلط افواہیں پھیلانی شروع کیں اور جب اس میں کامیابی نہ ہوسکی تو آخری حربہ کافر گری کا استعمال کیا گیا۔ تھانہ بھون، سہارن پور، دہلی، بمبئی اور دیوبند کے چند علماء کو مولانا شبلیؒ اور مولانا فراہی رح کی چند بے محل عبارتیں دکھلا کر دونوں کی تکفیر کا فتوے حاصل کیا گیا اور جلسے کر کر کے ان مرحومین کے خلاف وہ شور وغوغا مچایا گیا[1] جو شائستگی کے لئے بھی قطعاً زیبا نہ تھا، تقویٰ کا معیار تو بہت ہی اعلیٰ و اشرف ہے!

اس آخری حربہ کے مقابل دائرۂ حمیدیہ کے ارکان کی طاقت ناکافی تھی، مولانا امین احسن اصلاحی نے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی سے درخواست کی کہ اب وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں، خود حضرت والا رح کے قلب پر بھی اپنے محبوب استاذ اور استاذ مرحوم کے ممتاز بھائی (مولانا فراہیؒ) کے خلاف اس ناحق ہنگامہ آرائی سے جو کچھ گذر رہی ہوگی اس کو ہر سعادت مند شاگرد محسوس کر سکتا ہے، مگر داد دیجئے سید عالی مقام کے حلم اور عالی ظرفی کو کہ زبان وقلم کی ساری قوت کے باوجود امکانی کوشش یہی فرمائی کہ کہیں چھوٹوں کی نادانی سے بڑوں میں آویزش پیدا نہ ہوجائے، اس لئے پہلے مولانا عبدالباری صاحب ندوی کو جو اس وقت بھی حضرت تھانوی رح کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے ایک خط تحریر فرمایا کہ:۔

"آج کل اعظم گڈھ میں عجب طوفان بپا ہے، مدرسہ سرائے میر کی مخالفت

---

[1] یہ تفصیل میں نے نہیں لکھی ہے بلکہ یہ خود حضرت والا کے اس مفصل شذرہ کا ملخص ہے جو غوغائے تکفیر ہی کے سلسلہ میں معارف بابتہ ماہِ اگست ۱۹۳۶ء میں چھپا ہے۔

میں ایک دیوبندی مولوی صاحب جو مولانا تھانوی کے مرید ہیں، دیوبند اور تھانہ بھون سے مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کی تکفیر کا فتویٰ لکھوا کر لائے ہیں اور جلسے کر کے دیوبندی لوگوں کو بلوا کر اس فتوے کی خوب تشہیر کروا رہے ہیں، ہم عقیدت مندوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ ان دو متضاد قوتوں میں تطبیق دے سکیں، دیوبند تو خیر مگر مولانا (تھانوی) کے خلاف بولنے پر مجبور ہونا بڑی بدبختی ہے، خدا اس سے بچائے۔ آپ سے کچھ ہو سکے تو کیجئے۔

والسّلام | سید سلیمان۔ | ۲۵ جون ۱۹۳۶ء

خط کشیدہ جملہ کا لفظ لفظ شرافت، صلح جوئی اور پاکی مشرب کا کتنا بلند معیار پیش کر رہا ہے اور مخالفت کے ہجوم میں جذبات سے گریز کی یہ کوئی معمولی مثال ہے؟

مولانا عبد الباری صاحب نے یقیناً اس سلسلہ میں کوشش فرمائی ہوگی اور "حکیم الامت" (مؤلفہ مولانا دریابادی) کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا دریابادی نے بھی اس کارِ خیر میں پورا حصہ لیا، مگر بات غالباً کچھ بن نہ سکی، بالآخر حضرت والا کو قلم اٹھانا پڑا، اور اس انداز سے حضرت والا نے اس فتنہ کا جواب تحریر فرمایا جیسے کوئی ثالث پورے سکونِ خاطر کے ساتھ حق کو عیاں کر رہا ہو، کسی پر شخصی حملہ نہیں، طنز و ایراد نہیں بات صاف اور دلائل محکم!! ———

یہ مضمون رسالہ "الاصلاح" بابتہ یکم جمادی الاول ۱۳۵۵ھ سے پورا کا پورا ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

"مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم پر غوغائے تکفیر"

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ مدرسوں کی باہمی رقابت کے سلسلہ میں علماء ایک

دوسرے پر تکفیر و تضلیل کے فتوے جاری کر کے مسلمانوں میں نت نئے اختلافات پیدا کر رہے ہیں اور امت مسلمہ کو سرگرداں و حیراں بناتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کس کو حق اور کس کو ناحق سمجھیں، وہ مسائل جن کی تحقیق یا تغلیط علماء کی خاص مجلسوں میں ہونی چاہیئے ان کو عوام میں پھیلا کر طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کسی مسلمان کو کافر کہنا کسی کافر کو مسلمان کہنے سے زیادہ بڑا گناہ ہے۔

مولانا شبلیؒ کی تکفیر

مولانا شبلیؒ کی تکفیر جن مسائل کی بنا پر کی گئی ہے وہ ان کے نہیں بلکہ ملحدین کے خیالات ہیں جن کو انہوں نے رد کے لئے نقل کیا ہے[1]۔ بہرحال ان کے مفصل جوابات تو بعد میں شائع ہوں گے اس وقت مختصراً یہ کہنا ہے کہ آج سے بائیس ۲۲ برس پیشتر ندوۃ العلماء کے اختلافات کے سلسلہ میں ندوہ کے اجلاس دہلی کے موقعہ پر ۱۹۳۲ء میں ان ہی علماء میں سے چند نے انھیں عبارتوں کو نقل کر کے مولانا پر تکفیر کا فتویٰ مرتب کیا تھا، اس وقت[2] مولانا نے اپنے دستِ خاص سے ایک مختصر تحریر لکھ کر شائع کی تھی جو میرے پاس ہے اس میں مخالفین کے ان الزامات کی پوری تردید کر دی تھی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آگاہی کے لئے اس کو مع سوال و جواب کے شائع کر دیا جائے۔

---

[1] انا للہ، یہ خداترسی اور حق پسندی کا کون سا درجہ ہے! (غ۔م)

[2] یعنی وفات سے چھ مہینے پہلے!

مولانا شبلیؒ کے عقائد

بحضرت مولانا شبلی صاحب ، السلام علیکم

مجھے آپ سے چند سوال پوچھنے ہیں ، اجازت ہو تو عرض کروں ،

(۱) میں نے سنا ہے کہ آپ نے اپنی تصنیف الکلام میں مادۂ عالم کو غیر مخلوق لکھا ہے ، کیا یہ آپ کا اعتقاد صحیح ہے ؟ اور آپ نے اپنی تصنیف میں یہ مسئلہ اپنے مذہب کا لکھا ہے یا کیا ؟

(۲) کیا آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں ؟ کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ ہر ایک آدمی اکتساب اور محنت سے نبی ہو سکتا ہے ؟ یا اسکی اصلیت کچھ اور ہے ؟

(۳) اس کے علاوہ اور بھی کوئی خیال آپ نے ایسا ظاہر کیا ہے جس کی شہادت قرآن مجید اور صحیح احادیث سے نہ مل سکے ؟

آپ جو کچھ جواب دیں گے ، اسے میں پبلک میں شائع کر دوں گا ۔

عاجز

سید عبد السّلام ، مالک مطبع فاروقی ، دہلی

۴ ؍ جمادی الآخر ۱۳۳۲ھ

الجواب

جناب میر صاحب ! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

(۱) جس کا یہ عقیدہ ہو کہ مادہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں ہے ، وہ ملحد اور زندیق ہے ، میں مادّہ کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں نہ قدیم بالزمان ،

البتہ یہ مانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں، الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں تو وہ غیر مذہب والوں کے اقوال ہیں اور اس غرض سے لکھے گئے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے۔

(۲) نبوت کے متعلق میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ وہ اکتسابی ہے اور ہر شخص نبی ہو سکتا ہے، میں نبوت کو عطیۂ الٰہی سمجھتا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء یقین کرتا ہوں۔ اور جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ آنحضرت کے بعد بھی کوئی نبی ہو سکتا ہے، اس کو مسلمان نہیں جانتا۔

(۳) باقی میرے عقائد وہی ہیں جو قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہیں، میں عقیدۃً اور فقہاً دونوں لحاظ سے اہل سنّت وجماعت سے ہوں۔

شبلی نعمانی۔ دہلی

خود الکلام میں جس کی ناقص عبارتوں پر فتوائے تکفیر کی بنیاد پر توحید کے عنوان کے نیچے مذکور ہے:۔

"نظام عالم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو وہ کثیر الاجزاء یا کثیر الافراد ہے، لیکن سب مل کر ایک ہے یعنی اس کل کا ایک ایک پرزہ دوسرے سے اس قدر وابستہ ہے کہ وہی ایک شخص اس کو چلا سکتا ہے جو تمام پرزوں کا موجد اور ان کے باہمی تناسب کا محافظ ہو۔" (ص۶۰)

صفحہ ۶۱ میں ہے: "خدا عالم کی علتِ تامہ ہے"

"نبی کی حقیقت جیسا اوپر بیان ہو چکا اجزائے ذیل سے مرکب ہے، اس کے علوم ومعارف اکتسابی نہ ہوں بلکہ منجانب اللہ ہوں۔"

(صفحہ ۱۳۰)

کیا اس کے بعد بھی کسی کو غلط فہمی ہو سکتی ہے؟[1]

مولانا حمید الدین صاحب کی تکفیر

مولانا حمید الدین صاحبؒ پر جو نہ صرف علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھے، بلکہ اپنی صحتِ اعتقاد اور زہد و تقوے کے لحاظ سے خواص اُمّت میں تھے، بعض الفاظ کی بنا پر کفر کا فتویٰ مرتب کرنا حد سے زیادہ جرأت ہے۔

مولانا کی دو باتیں تکفیر کا باعث سمجھی گئی ہیں، حالانکہ ان دو میں سے ایک بھی تکفیر کی مستوجب نہیں۔

پہلی بات کا منشا یہ ہے کہ قرآن میں کہیں کہیں قافیہ کی رعایت اور عبارت کی روانی اور فصاحت کا لحاظ کر کے مروجۂ عامّہ اصول نحو کی پیروی نہیں کی گئی ہے یا لفظ آگے پیچھے کئے گئے ہیں۔ مولانا کہتے ہیں کہ جہاں کہیں ایسا ہوا ہے، ترجمہ میں بھی قرآن پاک کی بعینہٖ پیروی کی جائے اور لفظ کو آگے پیچھے نہ ہٹایا جائے۔ کہ ترجمۂ قرآن کی ذمہ داری بہت بڑی ہے۔"

دوسری بات کا منشاء یہ ہے کہ جو لوگ قرآن پاک کی ہر بات کو مسلسل و مربوط و متحد المقصد مضمون کی حیثیت سے غور کرنا چاہتے ہیں ان کو ایک غلطی یہ پیش آتی ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر سورۃ کا جو نام ہے وہی اس سورۃ کا موضوع ہے، حالانکہ یہ نام محض سورتوں کے امتیاز کے لئے ہر سورہ کے کسی خاص لفظ کا لحاظ کر کے رکھ دیئے گئے ہیں، ان ناموں کو سورتوں کے موضوع

---

[1] غلط فہمی تو مٹ سکتی ہے مگر ادارتی تعصب بھی بہرحال تعصب ہی کی ایک قسم ہے، اس کا نکلنا کوئی آسان بات ہے؟ اب بھی شبلی کے نام نامی کے ساتھ زندیق و ملحد کے القاب بے محابا استعمال کئے جاتے ہیں، نہ معلوم اس وقت مسئولیت کا تصور ہمارے بزرگوں کے ذہن سے کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ (غ۔م)

ومطلب سے کوئی تعلق نہیں،   یہی مذاق عرب تھا، اور اس کی پیروی سورتوں کے نام رکھنے میں کی گئی ہے، گلستان، بوستان خدائی نامہ خالق باری، قادر نامہ، فارسی میں کتابوں کے نام ہیں، مگر ان ناموں کو کتاب کے موضوع بحث سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح قرآن پاک میں پاروں اور رکوعوں کی تقسیم سے بعض طالب علم جو یہ سمجھتے ہوں اس پارہ پر یا رکوع پر مضمون ختم ہو گیا ہے، دوسرے پارے یا رکوع سے دوسرا شروع ہوتا ہے، ان کا یہ سمجھنا درست نہیں کیونکہ قرآن کی تیس پاروں میں تقسیم معنی کے لحاظ سے نہیں بلکہ تلاوت کے لئے ہے تاکہ تیس دن میں قرآن کو برابر حصّوں میں تقسیم کر کے ختم کیا جا سکے، اسی طرح رکوع کی تقسیم جس کا صحیح نام عشرات ہے یعنی دس دس آیتوں کا ایک ایک حصّہ معنوی تقسیم نہیں بلکہ لفظی ہے تاکہ نماز میں عام لوگ آسانی کے ساتھ قرآن کے ایک مناسب حصّہ کو پڑھ سکیں، اسی لئے ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں میں چھپے ہوئے قرآن پاک میں یا تو رکوع کے نشان ہی نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو ہندوستان سے مختلف کیوں کہ آیتوں کے شمار میں اختلافات ہوتے ہیں۔

بہرحال یہ غامض علمی بحثیں ہیں جن کو علما جانتے ہیں، مگر مخالفت کا بُرا ہو کہ جو صحیح بات کے سمجھنے سے انسان کو ہمیشہ باز رکھتی ہے۔ فتوے میں مولانا شبیر احمد صاحب نے درست لکھا ہے کہ سیاق وسباق عبارت پر غور کر کے کسی عبارت کا مطلب سمجھا جائے مفتی صاحب نے افسوس ہے کہ اسی نکتہ پر غور نہیں فرمایا اور یہ وہی شکایت ہے حضرات فتوی اور ان کے اکابر کو علماء بریلی و فرنگی محل سے ہمیشہ رہی ہے، پھر ہم گنہگاروں

کے معاملہ میں ان حضرات نے اس ضروری نکتہ کو کیوں فراموش فرما دیا"

تمت

اپنے مخالفوں کا جواب حق کو اپنی تائید میں رکھتے ہوئے اس متانت و سنجیدگی اور اس حلم و وقار سے کتنے ارباب علم و فضل دے سکے ہیں، ذرا اختلافی لٹریچر اٹھا کر دیکھ جائیے تو کلکِ سلیمانی کی عظمت نظر آئے گی۔

حضرت مولانا تھانوی کا رجوع

بہرحال یہ مضمون جب اہلِ علم و دیانت حضرات کے سامنے آیا تو انصاف پسند طبیعتوں کو حق و باطل، اصلیت اور شور و غوغا میں امتیاز کا موقع ملا ——————

سب سے پہلے وقت کی سب سے برگزیدہ شخصیت نے بلا تامل اپنے فتوے سے رجوع فرمالیا، یہ وہی ہستی تھی جس کے خلاف قلم اٹھانے میں حضرت والا نہ آمادہ تھے نہ اپنی تحریر میں اس سے شخصی خطاب کی جھلک بھی پیدا ہونے دی یعنی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح!

حضرت تھانوی کے رجوع کی یہ پوری عبارت "حکیم الامت" کے صفحات ۴۸۷ و ۴۸۸ پر موجود ہے، یہاں بنظر اختصار صرف متعلقہ جملے نقل کئے جاتے ہیں:-

ضمیمہ ثانیہ رسالہ الایضاح لما فی الافصاح

رسالہ مذکور کے ضمیمۂ اولی کی تحریر سے تقریباً "ایک ہفتہ بعد میرے پاس سرائے میر اعظم گڈھ سے ایک جدید و مطبوع مضمون معنون بہ عنوان فلاں فلاں حضرات پر غوغائے تکفیر مرقوم جمادی الاول جس میں زید (مراد مولانا شبلی) و عمر (مراد مولانا فراہی) کے تبریہ کے متعلق توجیہات تھیں پہنچا، چونکہ میں عمر کے متعلق خود رسالہ الاصلاح میں اپنے دستخط سے رجوع کر چکا ہوں، اس حصّہ سے متعلق تو مزید کسی تبریہ کی ضرورت

نہیں، البتہ اس ضمیمہ میں زید کے متعلق بنا بر کسی تاویل یا تبریہ کے معلوم نہ ہونے کے رجوع سے معذوری ظاہر کی تھی۔ زید کے متعلق بھی اپنے دستخط سے رجوع کرتا ہوں، مگر زید کی جماعت کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ امت محمدیہ پر رحم کر کے نہ زید کی ایسی تصنیفات کو شائع کریں نہ ان کی حمایت کریں!!"

اب اسی تحریر کا آخری جزو ملاحظہ ہو جس میں خود حضرت تھانوی نے ندویوں کے سید الطائفہ کی متانت اور پاسِ ادب کو سراہا ہے، لکھتے ہیں:۔

"اور چونکہ میں اس رائے کو حق سمجھتا ہوں اگر اس میں مجھ کو بدنام بھی کیا جائے جس سے مجھ کو اب تک غایت تہذیب کے سبب بچایا گیا ہے جس کی مجھ کو خاص قدر ہے، جزاہم اللہ تعالیٰ۔ تب بھی یہی عرض کرونگا ۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

والسلام خیر الختام ولیکن ھذا آخر الکلام فے ہذا المرام وافوض امری الی اللہ فی کل قال و مقام۔ آخر الاسبوع الاول من جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ

ہمارے حضرتِ والا کو اس رجوع کے بعد کسی اور کی فکر نہ رہی اور ماہنامہ معارف بابتہ ستمبر ۱۹۳۶ء کے شذرات میں بڑے ہی انبساط اور جذبۂ قدردانی سے اس کا اعلان فرمایا، وہ شذرہ یہ ہے:۔

"مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین صاحب کی تکفیر کے فتوے پر جن لوگوں نے دستخط کئے تھے، ان میں سب سے ممتاز شخصیت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی تھی، مولوی عبد الماجد دریابادی اور دوسرے دوستوں کے خطوط اور اخبار صدق لکھنؤ سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ

حضرت مولانا نے فتوے کے بعض جوابی مضامین پڑھنے کے بعد اپنے مسلک توسع کی بنا پر ان دونوں بزرگوں کی تکفیر کے فتوے سے رجوع فرمایا۔ اس زمانہ میں جب کہ اعترافِ حق کبریت احمر ہے، حضرت مولانا تھانوی کی یہ حق پسندی بے حد قابلِ قدر ہے!"

پھر اگلے مہینہ یعنی نومبر ۱۹۳۶ء کے معارف میں اس سلسلہ کا دوسرا شذرہ تحریر فرمایا' جو یہ ہے:-

"مولانا شبلیؒ و مولانا حمید الدینؒ کے فتوائے تکفیر پر دستخط کرنے والوں میں دوسری اہم شخصیت جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی تھی موصوف نے حقیقت حال سننے اور مولانا شبلی کی آخری تحریر دیکھنے کے بعد اپنے فتوے سے رجوع فرمایا، مولانا حمید الدین صاحب کے دونوں فقروں کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کو زیادہ سے زیادہ نقص تعبیر یا سماحتِ بیان کہہ سکتے ہیں، ان سے کفر لازم نہیں آتا، ان کی پوری تحریر اخبار صدق لکھنو میں چھپی ہے۔ مولوی محمد طیب صاحب دیوبندی نے بھی رجوع کیا، انہوں نے اپنا خط مدینہ بجنور میں چھپوا دیا ہے، اسی طرح مولوی لطف اللہ صاحب شاہجہانپوری مدرس ذکریا مسجد بمبئی نے بھی رجوع فرمایا، ان کا خط الاصلاح سرائے میر میں چھپا ہے۔ فالحمدللہ۔

ایک اور ناخوشگوار واقعہ

خدا خدا کر کے ایک غلط فہمی مٹی تھی اور فتنۂ تکفیر ابھی دبا ہی تھا کہ تین مہینے کے اندر ہی اندر ایک اور ناخوشگوار صورتِ حال پیش آئی جس میں حضرت مولانا تھانویؒ کی شخصیت کو پھر سپر بنانے کی کوشش کی گئی۔

نومبر ۱۹۳۶ء میں مولانا شوکت علی مرحوم اور فقیہ الامت مولانا کفایت اللہ

دہلویؒ کے اصرار پر حضرت والارحؒ نے آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت قبول فرمائی،[1] یہ اوجِ سلیمانی بعض نظروں میں بُری طرح کھٹکا، ایک دہلوی اہلِ قلم نے ۵۰ صفحہ کا رسالہ "علامہ سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" کے زیرِ عنوان لکھ کر عین اس کانفرنس میں عام کیا، اس رسالہ میں حضرت والا کی تصانیف سے گیارہ غلطیاں فراہم کرکے یہ الزام لگایا تھا کہ ان کی تحریروں سے الحاد واہمال کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں، اس رسالہ کے آغاز پر ایک تائیدی رائے حضرت تھانویؒ کی بھی تھی جو محض مؤلف پر اعتماد کرکے تحریر فرمائی گئی تھی، حضرت تھانویؒ کے سامنے مولانا سلیمان ندوی کی اصل تحریرات قطعاً نہ تھیں۔ البتہ اسی پر ایک تقریظ مفتی کفایت اللہ صاحب کی بھی ہے جس میں مفتی صاحب مرحوم نے اپنے قلم کو اس اظہار کے ساتھ بچا لیا ہے کہ چونکہ میں مصنف (سید سلیمان ندوی) سے ذاتی طور پر واقف ہوں اس لئے جو باتیں ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں ان کی تصدیق نہیں کرسکتا۔[2]

دسمبر ۱۹۳۶ء کے معارف میں حضرت والارحؒ نے ان اعتراضات کا مدلل جواب تحریر فرمایا اور اس کا شبہ اظہار بھی فرمایا کہ یہ رسالہ کسی[3] اور کے اشارہ پر لکھا بلکہ غالباً لکھوایا گیا ہے، مؤلف رسالہ حضرت والارحؒ کے جواب کا جواب دینے سے عاجز تھے، لاچار انہوں نے علمی محاذ چھوڑ کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا، حضرت والا کے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کرکے ہرجانے کا مطالبہ پیش کیا، جس سے دیکھنے والوں

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت والا نے اس میں جو خطبہ پڑھا وہ دنیائے اسلام میں مقبول ہوا، مصر اور شام کے اخبارات نے اس کے ترجمے چھاپے، مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر مفتی سید امین الحسینی نے خاص طور پر تار کے ذریعہ ان کا شکریہ ادا کیا۔ (سلیمان نمبر معارف ص ۳۰)

[2] یہ رسالہ میں نے آج سے کوئی بارہ چودہ برس پہلے حیدرآباد دکن میں دیکھا تھا۔

[3] یہ اشارہ حضرت تھانوی کی طرف نہ سمجھا جائے بلکہ کوئی اور شخصیت مراد تھی!!

کے سامنے ان کی حسنِ نیت اور قرآن دانی کھل کر آگئی ——— حضرت والا کو ایک عدالتی سمن کے ذریعہ دہلی کی عدالت میں طلب کرنے کی کوشش کی گئی لیکن دہلی کے مشہور وکیل جناب عبدالرحمٰن صاحب کی وکالت اور وساطت سے یہ مقدمہ عدالت سے خارج ہوگیا اور سید صاحب کو عدالت میں حاضر ہونے کی نوبت نہ آئی[1]

الحاصل اس ساری ناخوشگوار تفصیل کو بادلِ نخواستہ دہرانے کی وجہ صرف یہ تھی کہ قارئین باتمکین یہ دیکھ سکیں کہ بیٹھے بٹھائے کیسی صورتیں پیدا ہوتی رہیں، یہ تلخیاں حضرت والا کے طبعی میلان اور عقلی رجحان کے باوجود ان کے خانقاہ امدادیہ اور ذاتِ اشرف سے ارادت میں رکاوٹ بنی رہی، اور یہ عین مقتضائے بشریت تھا کہ ایسے موقع پر عقیدت کا ہاتھ بجائے آگے بڑھنے سے کھنچا رہتا ——— یہ تو حضرت سلیمان رح ہی کا حوصلہ تھا اور کمالِ بے نفسی کہ جب کسی اور جگہ اپنی باطنی تشفی کا سامان نظر نہ آیا تو گذشتہ اختلافات کو یکسر بھلا کر حضرت حکیم الامت کے کمالاتِ احسانی کے آگے خود کو جھکا دیا اور اس کی کوئی پرواہ نہ کی اس رجوع سے علمی دنیا میں کیا تہلکہ مچے گا!

کوئی ایثار و بے نفسی کی نظیر تو پیش کر دکھلائے!

اس دور کا ایک روحانی کرشمہ

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں نادر خان شاہ افغانستان کی دعوت پر حضرت والا افغانستان تشریف لے گئے، یہ بڑی سفر تھا[2]۔ واپسی میں مختصر سا قیام شہر ملتان میں بھی ہوا اور یہاں کی

[2] اس سفر کی تفصیلات خود حضرت والا رح نے تحریر فرمائی ہیں جو "سفرنامہ افغانستان" کے زیر عنوان پہلے معارف میں چھپی تھیں اور پھر نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن (منتقل شدہ کراچی) نے انکو کتابی شکل میں "سفرنامہ افغانستان" کے نام سے شائع کیا۔ یہ سفرنامہ تاریخی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے نہایت اہم اور دلچسپ ہے!

[1] سلیمان نمبر معارف (صفحہ ۳۰ و ۳۱)

مشہور خانقاہ بہاء الحق اور مرقد شیخ بہاء الدین زکریا سہروردی ملتانی کی زیارت بھی حضرتِ والارحؒ نے فرمائی، مرقد شیخ پر پہنچ کر حضرت والارحؒ کے قلبِ مصفّیٰ نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کو خود صاحب مشاہدہ کی زبان میں سنیئے۔ فرماتے ہیں:۔

"میں سیدھے حضرت کے مزار پر گیا، دعا مسنونہ پڑھی، مقبرہ کے اندر خاصی تاریکی تھی، تاہم آنکھیں بند کرتے ہی ایک نور سا چمک گیا، سہروردی خاندان کا سرتاج یہاں محو استراحت ہے، میں سبب نہیں جانتا، تاہم دل نے ایک اثر محسوس کیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ڈھلک گئے۔"

(سیر افغانستان صفہ ۱۹۱-۱۹۲)

روحانی مناسبت کی یہ چمک اور اثرات ایک مجلیٰ قلب اور مزکی نفس ہی دیکھ اور محسوس کر سکتا ہے اور حضرت والا جیسے عاشق سنت کی روح کو یہاں مناسبت حاصل نہ ہوتی تو اور کہاں ہوتی کیونکہ ایک طرف تو خود سلسلہ سہروردیہ کا طغرائے امتیاز ہی سنتِ نبویؐ کا کمال اتباع ہے اور اس کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ کے متعلق تو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی کشفی شہادت بھی موجود ہے کہ:۔

"او را در بحر شریعت غرق یافتم"

پھر خود شیخ زکریا ملتانیؒ کے متعلق بھی حضرت والارحؒ ہی نے تحریر فرمائی ہے کہ:۔

"کہتے ہیں کہ اسکی (یعنی خانقاہِ بہاء الحق) تعمیر حضرت بہاء الدین زکریا نے خود کرائی تھی اور یہاں بیٹھ کر چالیس برس تک حدیث کا درس دیا تھا۔" (سیر افغانستان صہ ۱۹۱)

غرض اس واقعہ سے حضرت والا کے قلب کی جلا اور نفس کا تزکیہ نمایاں ہے، البتہ "میں سبب نہیں جانتا" والا جملہ بھی بڑا معنی خیز ہے۔ یعنی اسرار و رموزِ باطنی کا ادراک ابھی تک حاصل نہیں ہوا تھا، اسی دریافت کیلئے کسی دیدہ ور کی رفاقت مضطرب کیئے ہوئے تھی مگر ذوق اس قدر بلند اور سنت کے سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا کہ اسکے تشفی کے سامان کہیں نظر نہ آتے تھے، کامل دس سال اس تلاش و جستجو کی نذر ہو گئے!!

حیاتِ نو مجھے اُن کی نگاہ ناز نے بخشی
بھرا ہے آبِ حیواں کاسۂ زہرِ ہلاہل میں
(سید سلیمانؒ)

باب چہارم

حضرت مولانا تھانویؒ سے بیعت وخلافت
اور حضرت تھانوی کی رحلت

۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۳ء

حکیم الامت (علیہ الرحمۃ) سے رجوع اور بیعت

شیخ کی تلاش برابر جاری تھی اور اب تو اس جستجو میں دس سال گزر چکے تھے، چونکہ قلب سلیمانی کو اصل کشش حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی ذاتِ اقدس سے تھی، اس لئے اس ساری مدت میں ہر پھر کر نظر خانقاہ امدادیہ (تھانہ بھون) ہی پر پڑتی تھی اور غیبی اشارے بھی اسی سمت کو متعین کر رہے تھے، چنانچہ گذشتہ باب میں جو مراسلت (حضرت والا اور حضرت تھانوی کے درمیان) درج ہو چکی، اس میں بھی دو خواب صاف طور پر اسی کے مؤید تھے، یہ ۱۹۲۹ء کا ذکر ہے۔

حضرت حاجی صاحب کی زیارت

اب یہ ہوا کہ ایک رات عالم رویا میں شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی زیارت نصیب ہوئی حضرت سیدی نے اپنی انگشتِ شہادت سے اپنے سینہ کی طرف اور پھر حضرت حاجی صاحب کے سینۂ فیض گنجینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کی:-

"اس کو ایسا کر دیجئے"

شیخ الشیوخ قدس سرہٗ مسکرائے اور ارشاد فرمایا:-

"اب تو میں ایسا نہیں کرتا"

حضرت والا فرماتے تھے کہ جب آنکھ کھلی تو اس خواب کی تعبیر یہ ذہن میں آئی کہ حضرت حاجی صاحب چونکہ عالمِ ناسوت سے تعلق منقطع فرما چکے ہیں اس لئے ان کو عذر ہے اور اب ان کے کسی جانشین سے تعلق جوڑنا چاہیئے۔

انتخاب شیخ

ہندوستان میں اس وقت حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفۂ ارشد

تنہا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ہی تھے اور انہی کی ذات با برکات سے خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کو وہ مرجعیت حاصل ہوگئی تھی جو گیارہویں صدی کے آغاز پر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ذاتِ اقدس سے سرہند کو حاصل تھی، لازمی طور پر حضرت کے قلب و نظر نے پھر ذاتِ اشرف ہی کی طرف جاذبیت محسوس کی اور ایسی جاذبیت جس نے رجوع پر مجبور کر دیا۔

باطنی اسباب تو یہ ہوتے رہے، اس کے کچھ ظاہری اسباب بھی پہلے ہی سے موجود تھے، یعنی حضرت والاؒ کے دو مخلص احباب مولانا دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی پہلے ہی سے تھانوی چشمۂ فیض پر پہنچے ہوئے تھے اور ازراہِ محبت و اخلاص حضرتِ والا کو بھی اپنا ہم مشرب بنانا چاہتے تھے خصوصاً مولانا عبدالباری تو اس معاملہ میں مضطر تھے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"آخر اپنے اس مرضِ 'خیر خواہی'[1] سے مضطر ہو کر دھیرے دھیرے ادھر متوجہ کرنا شروع ہی کر دیا، ابتداء غالباً تھانہ بھون ہی کی کسی حاضری کے دوران میں ہوئی، وہیں یہ تقاضا قلب میں تیز ہوتا جاتا تھا کہ میرے جیسے بے علموں سے زیادہ اور بہت زیادہ یہ آستانہ سید صاحب جیسے اکابرِ علم و قلم کے استفادہ کا ہے کہ ان کے استفادات کا سونا یہاں کی ایک آنچ میں ان شاء اللہ کندن ہو جائے گا، الحمد للہ ایسا ہی ہوا۔"[2]

غرض ظاہری موثرات اور باطنی تقاضوں سے مجبور ہو کر حضرت والاؒ کی نظر انتخاب مرشد تھانویؒ کو قبول ہی کرنے والی تھی کہ اسی دوران میں ایک صاف وصریح اور سچا خواب

---

[1] اس لفظ پر مولانا عبدالباری ندوی مدظلہ کا فٹ نوٹ یہ درج ہے:۔ "ظاہر و باطن کے اس سراپا مریض میں اس مرض کی تشخیص بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کی تھی"۔

[2] سیرۃ السیدؒ کے کچھ انمول سبق۔ سلیمان نمبر معارف ص۹

یہ دیکھا کہ ایک پلنگ پر حضرت مولانا تھانویؒ تشریف فرما ہیں اور اسی کے پاس ایک دوسرے پلنگ پر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ خود حضرت والا بیٹھے ہوئے ہیں، یکایک مولانا مدنی اپنی جگہ سے اٹھے اور حضرت والاؒ کا ہاتھ پکڑ کر مرشد تھانوی کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"ان کو میری طرف سے قبول فرمالیں[1]"۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس رویائے صادقہ کے بعد حضرت والا کو یکسوئی حاصل ہوئی اور مرشد تھانوی قدس سرہٗ کی حلقہ بگوشی کا عزم فرمالیا۔

عزم تھانہ بھون

جولائی و اگست ۱۹۳۸ء میں مولانا عبدالباری ندوی مدظلہ تھانہ بھون میں مقیم تھے، اس مرتبہ کھل کر اور اصرار سے حضرت والا کو لکھا کہ "بس اب میری اس حاضری کے زمانہ میں ہمت فرماکر آ ہی جائیں" ــــــــ اس اصرار کی وجہ بھی خود مولانا ہی کی زبانی سنیئے :-

"اصرار کی وجہ خصوصیت کے ساتھ یہ تھی کہ حضرت علیہ الرحمۃ کا سلسلۂ علالت طول پکڑتا جارہا تھا اور ڈر تھا کہیں یہ آفتابِ ارشاد و تربیت لبِ بام نہ ہو[2]"۔

اِدھر حضرت والاؒ خود آمادہ ہی تھے، مولانا کو جواب تحریر فرمایا کہ :-

"لفافہ ملا، میں آپ کے حرف حرف سے متفق ہوں، کل صبح انشاء اللہ علی گڈھ کے لئے روانہ ہوتا ہوں، خوشی ہوئی کہ آپ ۲۵ اگست تک وہاں (تھانہ بھون میں) رہیں گے، انشاء اللہ شاہدرہ لائن ریلوے سے ۱۱ اگست کی شام کو پہنچتا ہوں، دو روز ٹھہروں گا اور بقدر ظرف فائدہ اٹھاؤں گا[3]"۔

---

[1] سلیمان نمبر معارف صہ ۹۶۸و۹۶

[2]، [3] سلیمان نمبر معارف صہ ۹۶،۶۵۔

چنانچہ پروگرام کے مطابق حضرت والا عازم سفر ہو گئے اور چپ چاپ[1] تھانہ بھون پہنچ گئے، مگر حکیم الامت سے یہاں ملاقات مقدر نہ تھی، حضرت حکیم الامت اپنے علاج کی غرض سے لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔

لکھنؤ میں مرشد تھانوی سے رجوع

تھانہ بھون میں مرشد تھانوی کو نہ پاکر حضرت والا لکھنؤ پہنچے، حکیم الامت کا قیام یہاں مولوی محمد حسن صاحب کاکوروی کے مکان پر تھا، بیماری کے سبب سے عام ملاقات کا سلسلہ تو بند تھا، البتہ مخصوص حضرات جیسے خواجہ عزیز الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے لئے حاضری پر امتناع نہ تھا، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے بغرض رجوع آمد کی اطلاع جب حکیم الامت کی خدمت میں پہنچی تو فوراً بلا لیا گیا اور ان کی ہی درخواست پر تربیت کی خدمت بلا تامل قبول فرمالی گئی! اس طرح دس سالہ تلاش شیخ وسط اگست ۱۹۳۸ء میں بارآور ہوئی۔

جستجو آج وہاں پر مجھے لے آئی ہے	خود جہاں حسن محبت کا تماشائی ہے

ایک مجذوب کا افشائے راز

حضرت والا کے اس رجوع کے سلسلہ میں ایک واقعہ کا اظہار دلچسپی اور بصیرت سے خالی نہ ہو گا، حضرت تھانویؒ قدس سرہٗ جب لکھنؤ تشریف لے گئے تو تھانہ بھون میں ایک مجذوب نے آپ کے کسی مرید سے پوچھا کہ تمہارے پیر کہاں گئے ہیں؟ ـــــ انھوں نے فرمایا کہ اپنے علاج کے لئے لکھنؤ تشریف لے گئے ہیں، اس پر مجذوب نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا:۔

"علاج ولاج تو ایک بہانہ ہے، وہ تو ایک شہباز کے شکار کو گئے ہیں.
اور شکار کر لائیں گے!"

---

[1] تھانہ بھون اور پھر یہاں سے لکھنؤ تک کا سفر حضرت والا نے رفقائے دارالمصنفین بلکہ اہل خانہ تک سے مخفی رکھا تھا اور اس کی کچھ وجوہ تھیں

چنانچہ جب شہبازِ علم و دانش کے رجوع کی اطلاع عام ہوئی تو سب کو اس قلندر کی تصدیق کرنی پڑی کہ ع قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

اور اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے تمام عارفین اس بات پر متفق ہیں کہ ہمیشہ پیاسا ہی پانی کی طرف نہیں جاتا، بلکہ خود پانی کو بھی کبھی پیاسے کی تلاش ہوتی ہے ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں
آب ہم جوید بعالم تشنگاں (رومی)

خود حضرت والاؒ کی تصدیق مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے قلم سے اسی حقیقت کی تائید میں خود حضرتِ والاؒ کا ایک مکتوب نقل ہوا ہے اور اس تمہیدی عبارت کے ساتھ کہ :۔

"کچھ غیبی کشش پہلے سے بھی تھی جس کا ایک والا نامہ میں اس طرح اظہار فرمایا کہ :۔

"مولانا گیلانی نے مجھے لکھا ہے کہ سنا آپ نے بھی ایک دیوبندی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے، میں لکھنے والا تھا کہ ہاتھ گو اب بھی دیا ہو نہ دیا ہو، مگر دل تو اس کو دس بارہ برس پہلے دے چکا تھا، پھر مجھے فخر یہ ہے کہ لوگوں نے مولانا تھانوی کو اپنی طرف کھینچا اور مجھے خود مولانا تھانویؒ نے بار بار اپنی طرف کھینچا۔ (بعالم رویا)"[2]

مُناسبت کا فوری اثر بہرحال اس ملاقات اور تعلق ارادت کے ساتھ ہی پیر و مرید کی مناسبت نے جذب و اثر کا حیرت انگیز

---

[1] یہ روایت مجھ کو دو ثقہ اور معتبر راویوں یعنی حضرت حاجی عثمان خاں صاحب مرحوم اور مخدومی ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ سے ملی اور شبہ کے احتمال سے پاک ہے۔

[2] سلیمان نمبر معارف ص ۹۴۔

کرشمہ دکھایا، روحانی یگانگت نے پچاس پچپن سالہ بیگانگی کو یکسر جھٹلا دیا، غیریت کا کوئی حجاب اب باقی نہ تھا، چار دن کے مختصر قیامِ لکھنؤ کے بعد حضرت والاؒ نے اپنے جس تأثر کا اظہار فرمایا ہے وہ قابلِ دید ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"لکھنؤ میں چار ہی روز صحبت رہی مگر مولانا (تھانویؒ) کی شفقت میری عقیدت کو بڑھاتی رہی اور آخر ان کی ہدایت کے بموجب اور آپ (مولانا عبدالباری) کا مشورہ تو پہلے ہی تھا، باب مکاتبت وا ہے اور اب تو وہی وہ ہیں۔ ع آتے ہیں نگاہوں میں خیالوں میں دلوں میں

معائنہ سے بڑھ کر تصور میں مکالمے تک نوبت آتی ہے[1]:۔ ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

بہرحال اپنی طرف سے سفر شروع کر دیا ہے منزل پر پہنچانا جس کا کام ہے وہ پہنچائے گا[2]، دعا کیجئے!

مولانا کے مواعظ و رسائل پڑھتا ہوں، اکثر علمی مسائل بھی اپنے ہی مذاق کے مطابق پائے[3] اور احوال و کیفیات میں اُن سے نئی نئی گرہیں کھلتی ہیں[4] افسوس کہ اتنے دنوں کیوں غافل و محروم رہا۔"

" اتنے دنوں کیوں غافل رہا" کے خیال نے سالک کی طلب بے انتہا تیز کر دی تھی، ایک

---

[1] اللہ اللہ پہلا ہی قدم فنا فی الشیخ کے زینہ پر!! جس کے اوج کی یہ ابتدا ہو اس کے لئے منازل کی رفتار کو برق نظر بھی کیا پا سکے؟ اور اس کے مقام منتہا کو کیا دیکھ سکے؟ سلوک سلیمانی کو سمجھنے سمجھانے کا خیال ایک خیال خام اور جسارت بے جا نہیں تو اور کیا ہے ع اس حوصلہ کو دیکھئے اور خود کو دیکھئے۔

[2] نگاہ حقیقت پر کیسی جمی ہوئی ہے اور دل رحمت باری سے کس قدر لبریز ہے۔

[3] علمی مذاق کے اس اکثری توافق پر حضرت والاؒ ہمیشہ مسرور نظر آئے۔

[4] یہ مواعظِ اشرفیہ کی زندہ کرامت ہے کہ ان کے مطالعہ سے سالکین کی ہر الجھن دور ہو جاتی ہے۔

جگہ شیخ سے فرماتے ہیں ؎

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں
ہو عطائے خاص مجھ کو جو عطائے عام ہے

تبدیلی احوال اب حضرت والاؒ کی طبیعت دفعتہً بدل گئی، وہ عارف رومیؒ کے اس شعر کا مصداق بن گئے کہ ؎

صد کتاب وصد ورق در نار کن[1]
سینہ را از نور حق گلزار کن

چنانچہ مولانا عبدالباری ندوی مدظلہٗ ہی کے موسومہ مکتوبات کے دو اقتباسات سے اس کی کھلی تصدیق ملتی ہے۔

"(۱) دس بارہ برس سے جو چیز نظری طور پر سمجھ میں نہ آتی تھی وہ عملاً سمجھ میں آگئی اور اب تلافی مافات میں مصروف ہوں لعل اللہ یرزقنی صلاحًا۔[2]

(۲) اب نہ دارالمصنفین سے زیادہ دلچسپی ہے نہ ندوہ سے نہ علمی مقالات وتصنیفات سے، چونکہ میری روزی قلم سے وابستہ ہے اور گھر میں اثاثہ بھی نہیں، اس لئے ناچار پڑا پھرتا ہوں، خدا تعالےٰ ہمت دے کہ ترک تعلق کرسکوں"۔[3]

---

[1] اس مصرعہ کو بہت غلط سمجھا گیا اور صوفیاء پر ناحق اور ناروا تنقید کی گئی، یہاں "صد کتاب وصد ورق" کنایہ ہے دو قباحتوں کی طرف، اولاً "ادعائے علم" اور جہاں یہ نہ ہو تو پھر لذّت علم" جس کے چھوٹے بغیر عرفان نہیں ملتا کیونکہ ہر لذّتِ غیر، طالبِ حق کیلئے ایک حجاب ہے۔ عارف کامل حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کا قول مشہور ہے کہ "طالبِ لذّت طالبِ حق نہیں" اسی لئے صوفیائے کرام کا مطالبہ ہوتا ہے کہ "ادعائے علمی کہ جسکو ہر سلیم فطرت انسان بُرا جانتا ہے اور لذّتِ علمی کو بھی جس کی بُرائی فوراً سمجھ میں نہیں آتی، دور کردینی چاہیئے۔

[2] یہ علامۂ عصر کا اعتراف ہے، فاعتبروا یا اولی الابصار۔ [3] سلیمان نمبر معارف ص ۹۵۔

دوسرے اقتباس کا لفظ لفظ اس حال کا آئینہ ہے جو ایک سالک کو معلوم کو مشہود پانے کی سعی میں طاری ہوتا ہے لیکن کسی حال کو بھی قیام نہیں چنانچہ برس ڈیڑھ برس بعد پھر حضرت والارح کے اس حال میں تغیر آگیا، وہی تغیر جس نے امام غزالیؒ کو ترکِ تصنیف وتالیف کے بعد "احیاء العلوم" کی ترتیب وتدوین پر مجبور کر دیا تھا (اس کی تفصیل آگے آئے گی) ــــــ مگر آج تک بعض لوگ نادانستہ طور پر اور بعض "دروغ مصلحت آمیز" کے اصول کے ماتحت اسی کیفیت اور اسی حال کو حضرت والارح کی دار المصنفین سے مفارقت کا سبب بتاتے ہیں جو واقعہ کے یکسر خلاف ہے[۱]

بہرحال اب دل کی دنیا زیروزبر ہوگئی، فکرونظر کی قدریں بدلیں، اپنی اس حالت کا نقشہ مولانا مسعود عالم مرحوم کے ایک خط میں بھی حضرتِ والارح نے ہی ایجاز کے ساتھ کھینچا ہے، معنویت کے ساتھ اعجازِ بیان بھی ملاحظہ ہو:۔

"واہ واہ کا مزہ بہت اُٹھا چکا، اور اب یہ رنگ دل سے اُتر چکا اب تو آہ آہ کا دور ہے اور اپنی پچھلی تباہی کا ماتم اور آئندہ کی فکر درپیش ہے"[۲]

یہ آہ آہ (یعنی کثرت استغفار وذکر) اس درجہ بڑھی کہ دار المصنفین کے ایک رفیق نے مجھ سے فرمایا کہ "دار المصنفین کے درودیوار پر اس کا اثر چھا گیا تھا" ــــــ اسی کی شہادت اور رفقائے دار المصنفین کے بیان سے بھی ملتی ہے، چنانچہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کا بیان ہے:۔

"اس تعلق کے ساتھ سید صاحب کے لیل ونہار ہی بدل گئے، اگرچہ ان کی پوری زندگی دینداری اور پرہیزگاری میں گذری تھی، لیکن بادۂ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد ان کی دینداری میں تقویٰ وتورع کا اد

۱؎ اسکی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مولانا عبد الباری ندوی کا مضمون شائع شدہ ماہنامہ "فاران" کراچی بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۵۵ء۔ ۲؎ مکاتیب سلیمان مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم مکتوب ۱۱۹۔

بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہوگیا، عبادت و ریاضت بڑھ گئی، ذکر خفی کے ساتھ ذکر جلی بھی کرنے لگے۔ تقریر و خطابت نے وعظ و پند کی شکل اختیار کرلی، زیادہ وقت علمی مذاکروں کے بجائے رشد و ہدایت میں صرف ہونے لگا"[1]

اور مدیر معارف مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ:-

"وہ صبغۃ اللہ میں بالکل رنگ گئے تھے، ومن احسن من اللہ صبغۃ اور ان میں بڑا روحانی انقلاب ہوگیا تھا، ان کے خیالات میں بھی بڑا تغیر پیدا ہوگیا اور ان کی تقریروں اور تحریروں کا رنگ بھی بدل گیا"[2]

حضرت والاؒ کے داماد محترمی جناب سید حسین صاحب نے جو خود بھی حضرت تھانویؒ ہی کے دست گرفتہ ہیں حضرت والا کے تبدیلی احوال کا بڑا جامع نقشہ کھینچا ہے لکھتے ہیں:-

"پہلے دارالمصنفین کے کاموں سے خالی اوقات کا کافی بڑا حصہ اہل و عیال کے ساتھ دینی مذاکرہ میں صرف فرمانے یا چھوٹے بچوں سے بذلہ سنجی میں، اب اوقات کا بڑا حصہ خلوت میں گذرتا، خواہ مسجد میں ہو یا اپنے مسکونہ کمرے میں۔ پہلے عصر کے بعد چائے رفقائے دارالمصنفین کے ساتھ نوش فرماتے اور مغرب تک ان سے مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے یہ مجلس بھی ختم ہوگئی۔ کبھی اعزہ اہلیہ محترمہ سے اشتیاق ظاہر کرتے کہ قبلہ سے کچھ باتیں سنوا دیجئے، عرصہ ہوا ان کی صحبت میسر نہیں آئی تو وہ جاکر خلوت سے آتیں اور کچھ دیر کے لئے آپ تشریف لے آتے، اہل و عیال اور احبا

---

[1] و [2] سلیمان نمبر معارف ص۳۴ و ص۱۱۱

کی درخواست آپ کم مسترد فرماتے تھے، اس لئے ان کی دلجوئی و استمالت کے لئے برآمدہ یا آنگن میں تشریف رکھتے مگر دل کہیں اور ہی ہوتا، سب کی خیر وعافیت دریافت فرماتے اور جلد ہی کہیں اٹھ کر جانا چاہتے، اگر کوئی اصرار کرتا تو تھوڑی دیر کے لئے رُک بھی جاتے لیکن سب کو یہ محسوس ہوتا کہ ؎

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح و شام کا

اب میں تمہارے کام کا ہمنفسو نہیں رہا (مجذوب)

یہ صورت دیکھ کر لوگوں نے اصرار کرنا ترک کر دیا اور حضرت قبلہ کا اہل و عیال سے ملنا جلنا بھی دس پانچ منٹ کا رہ گیا، باہر کے سفر بھی ترک فرما دیئے۔ ایم۔ اے وغیرہ کے امتحانات کی ممتحنی وغیرہ سب چھوڑ دی، اور دارالمصنفین کے کام کے علاوہ خلوت کو زیادہ عزیز رکھنے لگے۔

خورد و نوش اور لباس وغیرہ میں بڑی تبدیلی ہو گئی پہلے کے لباسِ فاخرہ سب بکسوں ہی میں بند رہ گئے، نادر شاہ کی عطا کردہ خلعت کو کیڑوں ہی نے چاٹ لیا اکثر اہلیہ محترمہ یاد کر کے ہر دوسرے دن کپڑے نکال دیتیں اور اگر کاموں کی مشغولیت سے انھیں خیال نہ رہتا تو خلاف معمول تین تین دن تک ایک ہی کپڑا پہنے رہتے، بعض لوگ جنہیں مزاج ۔۔لی میں درخور تھا، کبھی یہ عرض کرتے کہ حضرت تصوف کے یہ معنی تو نہیں کہ ۔نسان کو کپڑا بدلنے کی بھی خبر نہ رہے، تو مسکرا کر فرماتے کہ اب بوڑھا ہو گیا ہوں، یاد نہیں رہتا، آپ یاد دلا دیا کریں ——————

۔ی ۔یام میں دیکھا کہ حضرت قبلہ فرش زمین پر بیٹھے ہیں کہ لوگ آ گئے، ۔پ بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے، کبھی بعد نماز مغرب دارالمصنفین

کی مسجد کی شمالی چار دیواری پر ایک گوشہ میں ذکرِ حق میں مشغول ہوتے، کبھی
مکان مسکونہ کے باہر برآمدہ میں تخت پر بغیر کسی فرش کے، کبھی مکان کے
کسی اور گوشہ میں متوجہ الی الحق پائے جاتے۔ کھانے کا وقت آتا یا کسی اور
ضرورت سے لوگ تلاش کرتے ہوئے پہنچتے تو اس حالت میں دیکھ کر عرض
کرتے کہ اس طرح کیوں تشریف رکھتے ہیں، فرما دیئے ہوتے تو فرش بچھا دیا
جاتا یا قالین کی جانماز بچھا دی جاتی سردی کا موسم ہے، ٹھنڈک نہ لگ جائے
فرماتے کہ ان ظاہری باتوں میں کیا رکھا ہے
یہ اس شخص کا حال ہے جو اس دور میں نفاستِ مزاج میں مرزا مظہر
جان جاناں شہیدؒ کی مثال اور ظاہری و باطنی حسنِ اخلاق کا مجسمہ تھا، جس
کا رہن سہن اور لباس شاہانہ رہ چکا تھا"[1]

ایک اور خاص کیفیت جو ارادت کے تعلق کے بعد ظاہر ہوئی وہ جذباتِ شوق کا
وفور تھا، جو جب سینے سے اٹھ کر زبان پر آتے شعر بن کر نکلتے تھے، چنانچہ خود صاحب کلام
کو حیرت ہے، فرماتے ہیں ؎

نغمۂ اللہ سے طبع حزیں موزوں ہوئی
جو کبھی گاتی نہ تھی وہ وجد میں گانے لگی

اور پھر فرماتے ہیں ؎

فیض ہے یہ کس ولی وقت کا — اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

یہ بھی حضرت والا کی زبانِ صدق سے سنا ہے کہ
میری اس دور کی شاعری کا آغاز حضرت والا تھانوی قدس سرہٗ کے تعلق

---

[1] سلیمان نمبر معارف ص ۳۲۹ تا ص ۳۳۲

سے ہوا اور انجام بھی حضرت کی رحلت ہی پر ہوگیا، بعد میں مشکل سے دو چار
غزلیں ہوئی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت کی موجودگی میں جذبات کا
وفور رہتا تھا، جو پھر باقی نہ رہا۔

اسی حقیقت کی ترجمانی ان اشعار میں بھی فرمائی ہے ؎

جو شعر بھی سپرد قلم کر رہا ہوں میں — سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں
دیوانگانِ عشق کو دیکر صلائے عام — آراستہ یہ مجلسِ جم کر رہا ہوں میں

اسی لئے یہ انتباہ بھی کر دیا ہے کہ ؎

سمجھیں مرے کلام کو جو ہوشمند ہیں — مستی مری یہ بادۂ انگور کی نہیں

درخواست نصیحت

غرض لکھنؤ کی مذکورہ حاضری کے بعد حضرت والا کی طبیعت اب پوری قوت کے ساتھ اپنے شیخ عالی مرتبت سے اخذِ فیض کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ذوق و شوق نے بار بار تھانہ بھون کی حاضری پر مجبور کر دیا اور شیخ کے خصوصی الطاف سے برسوں کے مراحل منٹوں میں طے ہونے لگے ۔

ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ نے فرمایا کہ" ایک مرتبہ حضرت سید صاحب خانقاہ تھانہ بھون تشریف لائے، محفلِ خاص آراستہ تھی، سید صاحب حضرت مولانا تھانوی سے متصل بیٹھے ہوئے تھے پچکے سے سید صاحب نے کوئی بات حضرت شیخ کے گوش گذار فرمائی اور کچھ دیر کی خاموشی کے بعد حضرت شیخ قدس سرہٗ نے سید صاحب کے کان میں کچھ ارشاد فرمایا، ہم لوگ یہ عرض و ارشاد کو سن نہ سکے، مگر دیکھا یہ کہ دفعتہً سید صاحب پر گریہ طاری ہوگیا یہاں تک کہ سسکیاں بندھ گئیں، پھر سید صاحب رخصت ہوگئے، ساری محفل محوِ حیرت تھی کہ یہ کیا ماجرا تھا لیکن بارگاہ اشرفیہ میں اِستفسار کی کس کو مجال ہوسکتی تھی، ایک عرصہ بعد حضرت خواجہ صاحب (خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب) نے جرأت کرکے وہ بات پوچھی تو حضرت حکیم الامت نے اظہار فرمایا اور خواجہ صاحب نے اس واقعہ

کو بلا اظہار نام کے اشرف السوانح میں بھی درج فرما دیا" ________ وہ یہ ہے
"ایک مشہور فاضل ندوی اتفاقاً چند گھنٹوں کے لئے حضرت والا کی خدمت
میں حاضر ہوئے اور چلتے وقت عرض کیا کہ مجھ کو کوئی نصیحت فرمایئے
حضرت والا رح فرماتے ہیں کہ میں متردد ہوا کہ ایسے فاضل شخص کو میں کیا
نصیحت کروں، پھر اللہ تعالیٰ نے فوراً میرے دل میں ایک مضمون ڈالا جو
بعد کو معلوم ہوا کہ ان کے بالکل مناسب حال تھا[1] میں نے کہا کہ حضرت
آپ جیسے فاضل کو میں نصیحت تو کیا کر سکتا ہوں لیکن ہاں میں نے جو
اپنی اس تمام عمر میں سارے طریق کا حاصل سمجھا ہے وہ عرض کئے دیتا ہوں[2]
وہ حاصل جو میں سمجھا ہوں وہ فنا و عبدیت ہے۔ بس جہاں تک ممکن ہو
اپنے آپ کو مٹایا جائے، بس اسی کے لئے سارے ریاضات و مجاہدات
کئے جاتے ہیں اور بس اپنی ساری عمر فنا و عبدیت کی تحصیل میں گذار دینی
چاہیئے، اس تقریر کا ان پر اس درجہ اثر ہوا کہ وہ آبدیدہ ہو گئے"[3]
شیخ عالی مقام کی اس نصیحت کا بااخلاص مرید کے قلب نے ایسا اثر قبول کیا کہ پھر
صاحب نظر حضرات اس بات پر متفق ہو گئے کہ "حضرت سید صاحب نے فنائیت میں جو
کمال حاصل کیا اس کو کوئی نہ پا سکا"[4]

درخواست بیعت | اس مناسبت تامہ کے بعد جو بہت جلد شیخ و مرید میں پیدا

---

[1] یہ ہیں شیخ الشیوخ کے الفاظ لفظ لفظ عبدیت کی تاثیر میں ڈوبا ہوا اور درس عبدیت کا مظہر بنا ہوا۔

[2] اس پیرایۂ بیان میں طالب کی حیثیت و عظمت کا کس درجہ پاس و لحاظ ہے۔

[3] اشرف السوانح جلد دوم ص ۲۱۸ مطبوعہ برقی پریس لکھنؤ۔

[4] یہ تصدیق میں نے حضرت مفتی صاحب حاجی محمد عثمان خان صاحب مرحوم، ڈاکٹر صاحب مولانا مسیح اللہ
جلال آبادی مدظلہٗ اور متعدد خلفائے حکیم الامت کی زبانی سنی ہے!

ہو گئی تھی، حضرت والاؒ نے فرمایا کہ "میں نے بیعت کی درخواست پیش کر دی" مگر حکیم الامت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ

"پچاس خط لکھ چکیں تو پھر انشاء اللہ!"

پھر فرمایا:۔ "خواہ روزانہ یا صبح و شام خطوط لکھ کر یہ عدد پورا کر دیجیے"۔

حضرت مولانا تھانویؒ پر انتظامی شان غالب تھی، اس لئے بیعت سے قبل ایک معتد بہ مراسلت کی شرط ضرور عائد فرماتے تھے، یہاں بھی عام ضابطہ کے مطابق ایک قید تو عائد فرما دی مگر دیکھئے کہ کس حکیمانہ و کریمانہ انداز سے ضابطہ و محبت کے تقاضوں کو ہم آہنگ کر دیا کہ نہ یہ ٹوٹے نہ وہ چھوٹے!

حضرت والاؒ نے یہ شرط قبول فرما لی کہ ؏

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

لیکن اس انقیاد نے ان کو یہ شرف بخشا کہ ابھی چند ہی خطوط آنے گئے تھے کہ تھانہ بھون کی ایک حاضری میں مرشد تھانویؒ نے از خود بیعت سے سرفراز فرما دیا، گویا ایک عطا کو بے طلب اور بے گمان بنا کر اور بھی لذیذ بنا دیا!!

حضرت والاؒ فرماتے تھے کہ میرے کل خطوط جو حضرت تھانویؒ کی رحلت تک لکھے گئے ۲۵۔۳۰ سے زائد نہیں ہیں۔

بیعت پر شیخ کا اظہارِ تشکر یہ بھی حضرت والا ہی سے سنی ہوئی بات ہے کہ حضرت مولانا تھانویؒ جب حضرت سیدی کو دست بدست بیعت فرما چکے تو اظہارِ تشکر کے طور پر زبان اشرف سے یہ جملہ نکلا کہ:۔

"الحمدللہ میرے حصہ میں سارے عقلا ہی آئے ہیں"

بیعت کا اثر مرید پر حضرت والاؒ سے بارہا سنا ہے کہ بیعت سے قبل حضرت مولانا تھانویؒ کی عقیدت اور عظمت ان پر غالب رہی

لیکن بیعت کے ساتھ ہی محبت عقیدت پر غالب آگئی اور بے تکلفی نے عظمت کی جگہ لے لی، اس تغیر احوال کی اطلاع جب شیخ کی خدمت میں کی گئی تو حضرت شیخ نے اس حال کی تصدیق فرمائی اور یقین دلایا کہ:۔

"یہی مطلوب ہے، عقیدت کا شیشہ تو ادنیٰ ٹھیس سے چور چور ہو جاتا ہے مگر محبت ایک پائیدار چیز ہے!"

خصوصی تربیت حکیم الامت کے مرتبہ شناس جانتے ہیں کہ وہ اپنے وقت کے مجدد اور ایک محققِ کامل مرشد تھے، ان کے دامنِ تربیت میں ہر رنگ اور ہر مزاج کے انسان کو پناہ اسی لئے ملتی اور اطمینانِ کامل اسی لئے میسر آجاتا کہ ان کے طریقہ اصلاح میں مزاج کا لحاظ بطور خاص رکھا جاتا تھا، اس کُلیہ کو جاننے پہچاننے کے باوجود بارگاہِ اشرفیہ کے اربابِ خاص کا کہنا ہے کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے ہمارے حضرت کی تربیتِ روحانی ایک خاص نہج پر کی تھی۔

حکیم اشفاق الحسین صاحب[1] مرحوم جو حضرت تھانویؒ کے مجازِ صحبت تھے راقم سے ازراہ مہر وکرم فرماتے تھے کہ:۔

"حضرت مولانا (تھانوی) کے سب خلفاء جانتے ہیں کہ حضرت سیّد صاحب کی تربیت بالکل خاص نہج سے کی تھی"۔

اس کی تائید ڈاکٹر صاحب مدظلہ کی زبانی بارہا سننے میں آئی کہ

"حضرت سید صاحب کا معاملہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، دیکھنے والوں کو تو صرف یہ نظر آتا تھا کہ سید صاحب تھانہ بھون تشریف لائے ہیں محفل

---

[1] حکیم اشفاق الحسین صاحب بریلوی تقسیم ہند کے بعد کراچی تشریف لائے۔ ناظم آباد میں انکا مطب خاصا مشہور تھا اور خود ان کی زاہدانہ سیرت لوگوں پر کافی اثر انداز تھی۔ غالباً ۱۹۵۵ء میں رحلت فرماگئے رحمۃ اللہ علیہ، مرحوم حضرت والا کے کمالات علمی و ایمانی کے بڑے معترف تھے اور (۴۰) برس سے معارف کے خریدار تھے۔

میں شرکت فرماتے ہیں چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں اور چلے جاتے ہیں
نہ کوئی گفتگو ہوتی ہے نہ کچھ عرض و معروض ——— مگر دیکھتے ہی دیکھتے
درجۂ کمال کو پہنچ گئے!"

مولانا دریابادی مدظلہ نے بھی مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اس تاسف پر کہ:-

"ہمارے مولانا سید سلیمان ندوی ایسے وقت جاگے جب جگانے والا[1] خود
نیند میں تھا"

یہی تحریر فرمایا کہ:-

"مولانا ندوی کا شمار دیکھتے ہی دیکھتے "اصحاب الیمین" ہی میں نہیں
"مقربین" میں ہونے لگا"[2]

سب سے بڑھ کر حضرت مفتی صاحب مدظلہ کی زبانی بھی جن کا خلفائے اشرفیہ میں ایک اہم مقام ہے یہ تصدیقی ارشاد سننے میں آیا کہ:

"ہم لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ حضرت سید صاحب کو اتنی جلد اس قدر
رسوخ کیسے حاصل ہو گیا؟ مگر بعد کو پتہ چلا کہ جوہر ہی کچھ اور تھا۔"

ان سب ارشادات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ قلبِ سلیمانی کو قلب اشرفی سے ایک خاص ربط تھا اور اسی مخفی رابطہ سے سب کچھ ہوتا رہا، قیل و قال کی ضرورت ہی کیا تھی

ع میان عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

اپنے اس قیاس کو تقویت ایک اور خلیفہ اشرفیہ مولانا محمود الغنی صاحب سہارنپوری کے اس قول سے ہوتی ہے کہ:-

---

[1] یعنی حضرت تھانوی جو اپنی حیات کے آخری منازل میں تھے۔

[2] حکیم الامت ص ۵۳۶ و ۵۳۷۔

"حضرت سیدؒ صاحب کی بات اور تھی، وہ "مرتبۂ نفس" کو طے کر کے حضرت
تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آتے تھے!"

اور ایک دوسرے خلیفۂ مجاز حاجی حافظ محمد عثمان خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول تو اس سے بھی زیادہ واضح ہے، فرماتے ہیں کہ:۔

"ایک مرتبہ حضرت سیدؒ صاحب ہی کے کمالات کا ذکر آگیا تو حضرت مولانا
تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو لکڑی سوکھی ہوتی ہے دیا سلائی
دکھلاتے ہی بھڑک اٹھتی ہے اور جو گیلی ہوتی ہے اس کو عمر بھر بھی پھونکتے
رہیے تو سوائے دھوئیں کے کچھ نہیں اٹھتا ———— ان میں
(یعنی مولانا سید سلیمان ندوی) کس بات کی کمی تھی!"

اس سب کے علاوہ یہ تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ لڑکپن ہی میں حضرت ابوحبیب مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے زیرِ تربیت قلبِ سلیمانی نے ایک خاص استعداد پیدا کر لی تھی، کیا عجب کہ اسی نہج پر حضرت تھانویؒ سے بھی فیض رسانی ہوتی رہی ہو، کیونکہ حکیم الامتؒ کی ذاتِ اقدس چشتیت و نقشبندیت کی جامع تھی!

پیرِ تھانوی اور مریدِ ندوی کا بے مثل ربط و تعلق

کمالِ ارادت حُبِّ شیخ گو بالذات مقصود نہیں پھر بھی ایک بے بہا شئے ہے کیونکہ محبت حق کا اس سے اعلیٰ اور موثر موصل (CONDUCTOR) کوئی نہیں چنانچہ تزکیۂ نفس کے مامور اور سیدالاذکیا صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا تلقین کی ہے کہ

اللّٰھم انی اسئلک حبّک | اے اللہ! میں آپ سے آپ کی

وحب من یحبك وحب عمل یقرب الی حبك	محبّت کا طالب ہوں[1] اور اس کی محبت کا بھی جو آپ کا محب[2] ہو اور اس عمل کی محبت کا بھی[3] جو آپ کی محبت سے قریب تر کر دے!

غور کیجئے کہ یہاں "محب ربّانی" کی محبت کو "تقرب نواز" عمل پر مقدم رکھا گیا ہے جس کی حکمت کو نفسیات بشری کا ہر واقف کار سمجھ سکتا ہے!

پس وہ ہستی جس کو واصل باللہ جان کر اپنا رہنما و رہبر بنایا گیا، اس کی محبت جس قدر جلد اور جتنی زیادہ حاصل ہو جائے خود اپنے وصول الی اللہ کی ضامن کیوں نہ ہوگی؟ اسی حقیقت کو عارف باللہ دباغ قدس سرہٗ[4] نے اپنے انداز میں یوں بیان فرمایا ہے کہ

"مرید ہی کی محبّت جاذب اسرار ہوتی ہے، اگر مرید کی ذات میں صفائی طہارت اور خیر کے قبول کرنے کی قابلیت اور محبتِ جاذبہ نہ ہو تو شیخ

---

[1] مقصود اصلی [2] و [3] حصولِ مقصود کے ذرائع و ثانوی درجہ میں مقصود!

[4] حضرت سید عبدالعزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ مادرزاد ولی اللہ اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے امی محض تھے، لیکن کشف تکوینی کے علاوہ کشف تشریعی بھی ایسا زبردست حاصل تھا کہ قرآن و احادیث کے مشکلات علمائے وقت نے آپ سے حل کرائے ہیں اور آپ نے عربی الفاظ کے سریانی و عبرانی ماخذ تک کی تشریح فرمادی ہے۔ شہر فاس میں ۱۱۰۰ھ کے لگ بھگ آپکی پیدائش معلوم ہوتی ہے، آپکے ایک مسترشد خاص علامہ حافظ احمد بن المبارک السجلماسیؒ نے آپکے کچھ ملفوظات جمع فرمائے ہیں جو ابریز کے نام سے مشہور ہیں ابریز تصوف کے مہمات مسائل پر ایک نادر اور مستند کتاب ہے۔ اس کا نہایت سلیس ترجمہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے اردو میں کیا تھا جو دو جلدوں میں جید پریس دہلی میں طبع ہوا تھا، اب نایاب ہے میرے سامنے یہی نسخہ موجود ہے حیرت ہے کہ ترجمہ تو اس قدر سہل فرمایا گیا ہے لیکن خود کتاب کے نام (ابریز) کا ترجمہ (تبریز) کیا گیا ہے جو اصل سے کچھ کم غیر مانوس نہیں۔ یوں بھی ناموں کا ترجمہ نامناسب ہی معلوم ہوتا ہے۔

کچھ بھی نہیں بنا سکتا۔"

پھر آگے فرماتے ہیں کہ یہ محبت اپنے کچھ آثار بھی رکھتی ہے مثلاً۔

"اس محبت صادقہ کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ شیخ کو وزن کرنے کی ترازو مرید کے ہاتھ سے گر جائے"۔

اس محبت صادقہ کا ایک اور اثر یہ ہے کہ مُرید، مسلوب الارادہ ہو جائے ؎

ومن لم یکن سلب الارادۃ وصفہ
فلا یطمعن فی شم رائحۃ الفقر[1]

(جس مرید کو سلب ارادہ حاصل نہ ہوا، اس کو فقر کی خوشبو سونگھنے کی ہوس نہ کرنی چاہیئے)

انقیاد کامل حضرت علامہ ندوی نے شیخ کے انتخاب میں جتنی بھی دیر اور کرید کی ہو مگر جب حکیم الامت کو اپنا شیخ بنا لیا تو پھر شیخ کو وزن کرنے کی ترازو" اپنے ہاتھ سے پھینک دی اپنی ساری عالمانہ عظمت سے دست بردار ہو گئے اپنے ارادہ کو مسلوب کیا، شیخ کی مرضی پر دل کو حاضر کر لیا، ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ شیخ کی خانقاہ کے دروازہ پر کھڑے ہوئے بڑے موثر لہجہ میں فرمایا کہ

"جو کچھ لکھا پڑھا تھا سب ان بڑے میاں (حضرت تھانویؒ) کے قدموں پر لا ڈالا"۔

اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں اپنی اس تفویض کا ذکر مولانا عبدالباری ندوی کے ایک مکتوب میں فرمایا ہے کہ

"حضرت تھانویؒ میرے ہر معاملہ حتیٰ کہ ذاتی معاملہ سے بھی باخبر ہیں، یہ میرا جوشِ محبت ہے کہ اپنے والد شفیق کی طرح ان کو ہر معاملہ لکھے بغیر چین ہی نہیں ملتا"۔

---

[1] ملاحظہ ہو قصیدہ انوار السرائر وسرائر الانوار۔ از حضرت ابو العباس احمد بن محمد قرشی المصری۔

اور یہ محبت محض جذباتی محبت نہیں تھی بلکہ حبِ ایمانی کا ایک مقتضا تھا چنانچہ آگے اس کی دلیل لائے ہیں :-

"میرا مذاق تو یہ ہے کہ شیخ وقت قائم مقام نبی ہے اُن امور میں جو مختص بالنبوۃ نہیں، غرض یہ کہ جس طرح نبی کی شان یہ ہے کہ لا یومن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ و نفسہ (او کما قال) اس کا عکس شیخ (کے ساتھ تعلق) میں بھی ہونا چاہیئے۔"

سیرت نبویؐ کے مسلم محقق و ماہر اور ادا شناس سے بڑھ کر کس کا ذوق پاکیزہ اور کس کی بات مستند ہو سکتی ہے!!

نجی معاملات میں تعلق شیخ کے پاس و لحاظ کی مثال!

غرض اب حضرت والاؒ نے اپنے شیخ عالی مقام کی ایک ایک ادا پر اپنے طور و طریق کو نثار کر دیا، تحریر کا طرز بدلا، تقریر کا انداز وہ نہ رہا، بلکہ دیکھنے والوں کا تو بیان یہاں تک ہے کہ شیخ کا جمالِ ظاہری بھی یہاں تک جذب کیا کہ چہرہ بشرہ سے آثار جھلکنے لگے ——— شیخ کا تعلق اس درجہ غالب آیا کہ نجی معاملات میں بھی اس کا پاس و لحاظ اولیت حاصل کر گیا، چنانچہ منجھلی صاحبزادی کی نسبت کا معاملہ درپیش آیا تو اس کے لئے بھی نگاہ ایسے جوان صالح کی متلاشی ہوئی جو اشرفی نسبت سے مشرف ہو، جویندہ یابندہ، آخر نگاہ نے اپنا مطلوب پالیا تو فرطِ مسرت سے اپنے دوست مولانا عبدالباری ندوی کو تحریر فرماتے ہیں

(۵۸۱ تا ۶۴۴) جو ایک متبحر عالم اور امام طریقت حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے ممتاز خلیفہ تھے قدس اللہ سرہما، شیخ کی کتاب "عوارف المعارف" میں آدابِ مریدین پر جو کچھ لکھا ہے اس کو اس قصیدہ کی صورت میں منظوم فرمایا گیا ہے، اس قصیدہ کو مدتوں تزکیۂ نفس کی تربیت گاہوں میں نصابی حیثیت اور بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔

"آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میں اپنی منجھلی لڑکی کی نسبت ایک ایسے نوجوانِ صالح سے کر رہا ہوں جو حضرت مولانا تھانویؒ کے متوسلین میں ہیں۔"

ذکر اس نوجوان کے عہدے یا اس کی تنخواہ کا نہیں، اس کی ثروت یا ظاہری وجاہت کا نہیں بلکہ صرف اس کا ہو رہا ہے کہ وہ صالح اور بارگاہِ اشرفیہ کا متوسل ہے!——

یہ اظہار اور اظہار مسرّت محبت شیخ کی کس کیفیت کا ترجمان ہے؟

ڈاکٹریٹ کی قبولیت رضائے شیخ پر منحصر!

عجیب بات ہے کہ جن دنوں حضرت والاؒ مٹنے مٹانے پر تُلے ہوئے تھے۔ قدرت نے ایک اور ظاہری اعزاز سے نوازنا چاہا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے یہ طے کیا کہ علامہ ندوی کے کمالاتِ علمی و ادبی کے اظہار اعتراف کے لئے ان کی خدمت میں ڈی، لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کرے، حضرت والا کو اس کی اطلاع ملی تو حضرت نے اپنے شیخ کی خدمت میں اس اعزاز کے عطا کئے جانے کی حقیقت وصورت کی ساری تفصیل لکھ بھیجی اور اس بارے میں شیخ کا فیصلہ طلب کیا، یہ بھی ظاہر فرما دیا کہ اپنے دل میں اس کی کوئی طلب موجود نہیں مگر مرشد تھانویؒ قدس سرہٗ کا جواب آیا کہ ضرور قبول کیجئے۔" الفضل ما شهدت به الاعداء۔

اس فیصلہ کے بعد حضرت والا نے وہ اعزاز قبول فرما لیا اور نومبر ۱۹۴۰ء میں مسلم یونیورسٹی نے حضرت علامہ ندویؒ کی خدمت میں ڈی، لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کرنے کا فخر حاصل کیا۔

حصول اعزاز کے بعد پھر حضرتِ والاؒ نے اس کی اطلاع خدمتِ شیخ میں کی، اور عرض حال کے طور پر یہ بھی لکھ دیا کہ "جس وقت مجھ کو گوَن (عبا) پہنایا جا رہا تھا تو دل میں کوئی ایسی لہر بھی نہیں اٹھی جو نیا کپڑا پہنتے وقت محسوس ہوتی ہے اور سارے اعزاز و مراسم میں بحمداللہ ذرّہ برابر فخر و مباہات کا گمان بھی نہیں گذرا۔"

اس کے جواب میں شیخ عالی مرتبت نے لکھا کہ

" الحمد للہ۔ یہی توقع تھی!"[1]

یہ تھا تفویض کا عالم اور اس کا نتیجہ۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ ایک عالم نہیں بلکہ علامۂ عصر اور مقتدائے اہل علم و کمال کا محبت کی راہ میں اس درجہ اپنے آپ کو مٹانا اور اللہ کی خاطر ایک اللہ والے کا طوقِ ارادت اپنے گلے میں ڈال لینا، ایثار و تواضع کی کوئی معمولی مثال ہے؟ پھر کیا تعجب ہے کہ "من تواضع لِلّٰہِ رفعہُ اللّٰہ" کے محکم اصول کے تحت وہ سلوک و احسان کی راہ میں بھی اتنے اونچے کر دیئے گئے ہوں کہ اچھوں اچھوں کی نظر وہاں تک نہ پہنچ سکے!

تھانہ بھون کی بار بار حاضری سب جانتے ہیں کہ حضرت والا کو حکیم الامت قدس سرہٗ کی صحبت بہتوں کے مقابلے میں بہت کم میسر آئی مگر ایک طرف ذاتی فضائل اور دوسری طرف فدویت کے کمال نے اس کمی کی اہمیت بالکل گھٹا دی، لیکن خود حضرتِ والا کو اس کا بڑا احساس تھا، فرماتے تھے اور ایک شعر میں اس کا اظہار کیا ہے ؎

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں
ہو عطائے خاص مجھ کو جو عطائے عام ہے

یہ اندرونی خلش حضرت والا کو مضطرب بنائے ہوئے تھی، وہ اپنی ساری مصروفیات کے باوجود بار بار خدمت شیخ میں حاضر رہتے تھے، کبھی چار آٹھ روز کے لئے آ رہتے، کبھی دو تین دن کا قیام ہوتا اور کبھی محض چند گھنٹوں کی حاضری ہوتی تھی مگر سلیمان ذی جاہ کے وقت کا بظاہر یہ مختصر ایثار اپنی حقیقت کے اعتبار سے

---

[1] یہ ساری تفصیل حضرت سیدی قدس سرہٗ نے اس بے استحقاق کو سنائی تھی، یہ انکا کرم خاص تھا کہ اپنے بعض احوال سنا گئے ورنہ ایک مورِ ناتواں کا کیا حوصلہ کہ وہ مملکتِ سلیمانی کے رموز تک رسائی کی طمع بھی کرے!

اوروں کے کئی کئی چلوں پر فائق تھا اور سب نے دیکھا کہ اس کے نتائج طول طویل چلہ کشی سے فائق تر نکلے۔

خود اپنی طرف سے جواب شیخ کی تعیین

حضرت والاؒ کو اللہ تعالیٰ نے اور کمالات کے ساتھ ذہانت و فراست سے بھی خوب نوازا تھا۔ دوسرے کے مزاج، مذاق اور انداز فکر کو بھانپنے میں ان کو کچھ دیر نہ لگتی تھی، اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ واقعہ ہے جو حضرت تھانویؒ سے ربط کے بعد پیش آیا ــــــ حضرت والاؒ فرماتے تھے کہ کچھ عرصہ کے تعلق کے بعد حضرت (مولانا تھانویؒ) کی تصانیف کے مطالعہ کے بعد میں حضرت کے مذاق سے واقف ہو چکا تھا، بعض مرتبہ یہ کیا کہ جب کوئی اشکال پیش آیا تو اس کا جواب خود حضرت ہی کی تصانیف سے نکال کر حضرت کی خدمت میں عرض کر دیا کہ یہ اشکال ہے اور اس کا جواب حضرت والا کی طرف سے غالباً یہ ہوگا، بغرض تصدیق پیش ہے ــــــ حضرت نے میرے ہر جواب کی تصدیق فرمائی کہ آپ بالکل صحیح سمجھے اور اہل محفل کو خطاب کر کے فرمایا کہ:۔

> "یہ مولوی سلیمان صاحب بھی خوب ہیں کہ ہماری ہی تحریروں سے اپنے ہر اشکال کا جواب خود ہی نکال لیتے ہیں۔"

ذرا غور تو کیجئے کہ یہ جواب کا نکال لینا کس کمال پر دلالت کر رہا ہے! جب تک شیخ کی روحانیت سے مناسبت تامہ حاصل نہ ہو اور اس کے الفاظ اس کی باطنی کیفیات کے موصل نہ بن جائیں اور جب تک مرید اپنے علوم باطنی کو فنا کر کے شیخ کے علوم اپنے اوپر طاری نہ کر سکے جو فنا فی الشیخ کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے اس وقت تک اس طرح کے "جوابات" قطعاً نہیں نکالے جا سکتے ــــــ اس سلسلہ میں راقم حقیر کو ایک رویائے صادقہ کے ذریعہ پوری تشفی کرا دی گئی اور خود حضرت حکیم الامت کی زبان فیض ترجمان کے ذریعہ، کہ حضرت والاؒ کے علوم باطنی بالکل اپنے شیخ کے ہم رنگ تھے،

شیخ کا کمال مہر وکرم

ادھر ارادت کا یہ رنگ تھا اُدھر شیخ بھی اپنے وقت کا سب سے بڑا جوہر شناس اور محبت نواز محب و محبوب کی جاں نثاری اور دلنوازی میں مسابقت کی ادا جھلکنے لگی اور بعض معاملات میں تو یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ محب کون ہے اور محبوب کون ؟

غایتِ کرم

حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے بارہا فرمایا کہ "حضرت سید صاحب خانقاہ تشریف لاتے تو ہمارے حضرت (مولانا تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہو جاتا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا جوان ہو گئے ہیں، گھنٹہ بھر کی محفل کو دو دو گھنٹہ طول دیتے تھے حالت مرض میں بھی معلوم ہوتا تھا کہ گویا مرض چلا گیا اور فرماتے تھے کہ سید صاحب بہت صاف دل انسان ہیں"۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے فرمایا کہ "آخر زمانہ میں تو حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ بس یہی فرماتے تھے کہ جب رات کے دو بجے آنکھ کھلتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ سیّد صاحب کو بلا کر باتیں کرتا رہوں لیکن پھر ان کی زحمت کے خیال سے چپ ہو رہتا ہوں!"

محبوب کے دل میں محب کا یہ مقام خوش بختی کی معراج ہے!

فرطِ محبّت

خود حضرت والا نے اپنے محبوب مرشد کے الطاف و عنایات کے سلسلہ میں یہ واقعہ بھی سنایا تھا کہ ایک مرتبہ وہ خانقاہ میں تشریف لے جا رہے تھے، شیخ کی محفل آراستہ تھی، حکیم الامتؒ کی نظر جو سید والا مرتبت پر پڑی تو بے ساختہ کھڑے ہو گئے، مرید صادق نے بڑھ کر عرض کی:

"حضرت تشریف رکھیں"

تو ارشاد فرمایا:۔

"واللہ میں تعظیماً کسی کے لئے نہیں اُٹھتا میں تو فرطِ محبت سے کھڑا ہو گیا"

اظہارِ محبت اور دلنوازی کی یہ ادا سنت کے سانچے میں کیسی ڈھلی ہوئی ہے!!

عطائے عصا اور کمالِ دلنوازی

ایک مرتبہ حکیم الامتؒ نے ایک چھڑی تحفۂ محبت کے طور پر بھیجیؒ اور اس کے ساتھ ایک رقعہ بھی جس میں خطاب اس بلیغ جملہ سے فرمایا تھا:۔

"راحت جان راحت جسم کا سامان بھیج رہا ہوںؒ"

دُعاؤں کی سوغات

حضرت سیدی نے اس عطائے شیخ کو دل وجان سے قبول فرما کر جواباً عرض کیا کہ:۔

"اس عطائے خاص سے میں نے استقامت فی العمل کی تعبیر لی!"

حضرت شیخ قدس سرہٗ نے جب یہ عارفانہ جواب پڑھا تو انبساط سے معمور ہو گئے اور اس کا ایک طویل جواب عطا فرمایا جو تمام تر دعاؤں سے لبریز تھا اور دعائیں بھی ایسی پُر شفقت اور والہانہ انداز کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جن وانس کے شر سے محفوظ رکھےؒ وغیرہ ـــــــ حضرت والا فرماتے تھے۔ ان دعاؤں میں قرآن پاک کی ان آیات کی طرف اشارات تھے

ؒ شیخ الشیوخ کا یہ ہدیہ حضرت سیدیؒ کے غایت کرم سے مجھ حقیر کے حصہ میں آیا، حضرت والاؒ نے اس عطا کے ساتھ جو سندِ عطا تحریر فرمائی وہ یہ ہے:۔ عزیزی السعید ادام اللہ توفیقکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حضرت والا کا عطا فرمودہ عصائے مبارک جو میرے پاس ہے مع اسکی سند کے میرے پاس موجود ہے، حالات کے تقاضا اور عمر کی ناپائیداری سے میں اس کی حفاظت کا حق ادا نہیں کر سکتا میں اسکو آپکے سپرد کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اسکی برکت سے آپکو مستفید فرمائے۔ والسّلام ۔ الفقیر الی اللہ سید سلیمان ۔ ۱۵ ذی حجہ سنہ ۱۳۷۰ھ

ؒ حضرت والا نے بھرائی ہوئی آواز میں یہ جملہ دہرایا اور فرمایا کہ شاید ہی حضرت نے کسی کو اس انداز سے خطاب فرمایا ہو واللہ اعلم"

ؒ سلیمان علیہ السلام کے سلسلہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

فسخرنا الریح تجری بامرہٖ رخاءً حیث اصاب والشیٰطین کل بناءٍ وغواصٍ وآخرین	پس ہم نے ہوا کو اسکے تابع کر دیا کہ وہ اسکے حکم سے جہاں وہ جانا چاہتا نرمی سے چلتی اور جنات کو بھی انکا تابع

جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں آتی ہیںؔ!! گویا مناسبت اسمی کی رعایت بھی فرمادی اور حضرتِ والارحؒ کے قابلِ رشک مرتبہ کا اظہار بھی فرمادیا۔

خوب یاد آگیا، اس عطائے عصا کی تقریب میں حضرتِ والارحؒ نے ایک فی البدیہہ قطعہ بھی موزوں فرمایا تھا جو ان کے تاثراتِ قلبی، بلند ہمتی اور ذاتِ حق پر اعتماد وانحصار کا ترجمان ہے وہ قطعہ یہاں اسی عنوان اور انہی حاشیوں کے ساتھ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے جیسے حضرت والارحؒ نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے ؎

"بہ تقریب عطائے شیخ عصائے اقدس بہ ایں فقیر"

۲۸۔ شوال ۱۳۶۱ھ

سلیماں بودم و در دست منساتم[۲] نمی دادند
مرا از لطفِ حق در دست خواجہ داد منساتم
وگرچوں لطفِ حق خواہد مرا نقش و نگیں بخشد
ہماں نقش و نگیں کو ملک معنی را بود خاتم[۳]

مقرنین فی الاصفاد (ص)
اسی آیت کی طرف اشارہ ہے اس دعائے اشرف میں

کر دیا، تعمیر بنانے والوں کو بھی اور غوطہ زنوں کو بھی اور دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے۔

[۱] کاش "مکاتیب سلیمان و اشرف" مل جاتے تو آج اس مرقع سلیمانی میں جان پڑجاتی، سلوک و معرفت کے کیسے دلکش مناظر دیکھنے میں آتے اور منتہی سالکین کی کتنی گتھیاں ان سے سلجھتیں! ـــــ مگر جو مقدر نہ تھا کیسے ہوجاتا ـــــ میری عاجزانہ درخواست اور حضرت مفتی صاحب و ڈاکٹر صاحب دام فیوضہم کے اصرار پر حضرت والاؒ نے اجازت تو عطا فرمادی تھی کہ میں اس خط وکتابت کو نقل کرلوں جو ان کے اور حضرت تھانویؒ کے درمیان رہی، مگر مرض الموت کی وجہ سے حضرت خود اس قابل نہ تھے کہ اپنے دستِ مبارک سے یہ خزینہ نکال کر اس بے بضاعت کے حوالہ فرماتے حکم البتہ فرمادیا تھا کہ یہ مکاتیب دیدیئے جائیں مگر ابھی تعمیل نہ ہوسکی تھی کہ آقا نے سفر آخرت اختیار فرمالیا اور اپنے خادم کو بے بس چھوڑ گئے ـــــ حضرت والا سے اسکی اجازت حاصل کرنے میں دیر اسوجہ سے ہوگئی کہ حضرت پر حیا اور تواضع کا بے حد غلبہ تھا، فرماتے تھے کہ حضرت تھانوی نے مجھ کو

مگر یہ قطعہ حضرت تھانویؒ کے علم میں نہ آسکا، کیونکہ حضرت والارحؒ نے ازخود تو کبھی ان باتوں کے اظہار کا قصد نہیں فرمایا، بلکہ کبھی دوست احباب ہی نے بلا ایما، اس قسم کے اشعار خدمتِ اشرف تک پہنچا دیئے تھے۔

عطائے سبحہ اس کے بعد ۸ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ کو شیخ الشیوخ قدس سرہٗ نے ایک اور عطیہ سے اپنے مسترشد کو مشرف فرمایا، اس واقعہ کو خود حضرت سیدی نور اللہ مرقدہٗ کے الفاظ ہی میں سنیے لکھا ہے:۔

"ایک دفعہ حضرت (مولانا تھانویؒ) نے خاکسار کو ایک تسبیح عنایت فرمائی تو خاکسار نے ایک بیت کہی ؎

خواجہ بخشید مرا سبحہ صد دانہ بلطف دانہ انداخت و در حلقہ مرا کرد اسیر

وصل بلگرامی (مرحوم) نے موقعہ سے حضرت کو یہ سنا دیا تو فرمایا۔ "تو بھئی مجھے بھی اس کا جواب لکھنا پڑے گا" مگر کچھ فرمایا نہیں[1]۔

راقم الحروف نے اور حضرات سے اسی سلسلہ میں یہ بھی سنا کہ اہل محفل سے حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ:۔

"ہم تو مولوی سلیمان کو خشک سمجھتے تھے مگر وہ بھی تر نکلے"۔

ملک سلیمان اور زہد عیسےٰ ایک اور واقعہ مرشد تھانوی کے انداز کرم کا یاد آیا، خود حضرت والارحؒ کی زبانی کئی محفلوں میں

(سلسلہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اپنی شفقت و محبت کی بناء پر ایسے ایسے انداز سے خطاب فرمایا ہے کہ ان مکتوبات کی اشاعت محض خودنمائی معلوم ہوتی ہے۔ جس سے بہت شرم آتی ہے!"

[2] عصائے سلیمانی

[3] کما قال الرومیؒ: ؏ خاتم ملک سلیمان است علم۔

---

[1] ملاحظہ ہو "حکیم الامت کے آثار علمیہ"۔ معارف بابتہ فروری ۱۹۴۴ء

سنا ہوا۔

حضرت کی منجھلی صاحبزادی سلمہا کی نسبت جناب سید حسین صاحب دام مجدہٗ سے قرار پائی، اس نسبت کے قیام میں ہاتھ حضرت مولانا سید محمد عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، بلکہ دولہا کی طرف سے وہی سب کچھ تھے۔ مہر کی مقدار کا مسئلہ آیا، ہمارے حضرت والا زیادہ مہر باندھنا چاہتے تھے اور "مہر مثل" کو لڑکی کا شرعی حق بتا رہے تھے، ادھر مولانا عیسیٰ[1] اسم بامسمےٰ ردائے زہد اوڑھے ہوئے مقدار مہر کی کمی پر اصرار فرما رہے تھے۔ حضرت والا شیخ عالی مقام کے بعد سب سے زیادہ مولانا عیسیٰ قدس سرہٗ کی عظمت کے معترف تھے، ان کی بات مان بھی لیتے مگر یہ بذل نفس کا موقع نہیں تھا بلکہ لڑکی کے تحفظ حق کا۔ اس لئے طے یہ پایا کہ اس اختلاف کا فیصلہ حکیم الامت پر چھوڑا جائے۔ ایک عریضہ لکھ کر حضرت والا نے صورتحال کی تفصیل شیخ کی خدمت میں پیش کر دی اور فیصلہ طلب فرمایا حضرت حکیم الامت نے صرف یہ جملہ تحریر فرمایا کہ :-

---

[1] حضرت مولانا عیسیٰ صاحب (ف مارچ ۱۹۴۴ء) کے متعلق حضرت والا نے لکھا ہے کہ "خیال تھا کہ مرشد رحمۃ اللہ علیہ کے بعد انکی ذات مرجع انام بنے گی مگر اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو آپ جانتا ہے، انکا وطن محی الدین پور ضلع الہ آباد تھا، نسبتاً سادات کرام میں تھے سلوک و طریقت، مسلک و مشرب، صورت و سیرت حتیٰ کہ نشست و برخاست اور خط و کتابت اور گفتگو میں اپنے مرشد کامل سے اس درجہ مشابہت حاصل کر لی تھی کہ ان کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا تھا ع تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری! وہ نہایت ہی عابد و زاہد متبع سنت اور مرشد کے اصولوں کے سختی سے پابند تھے، اطراف میں حلقۂ ارشاد بھی قائم تھا۔ صاحب مقامات، مستجاب الدعوات اور واردات صحیحہ سے سرفراز تھے!" (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "یاد رفتگان")۔

"مُلک سلیمان زہد جیسے سے بڑھ گیا"۔

مراد یہ تھی کہ اس معاملہ میں مولانا سلیمان ندوی کا پلہ شریعت کی میزانِ عدل میں بھاری ہے مگر ذرا لطفِ خطاب دیکھئے کہ ایک فقہی خشک جواب کو بھی پیمانۂ محبت بنا کر بھیجا!! یہ ادائے دلنواز کس تعلقِ خاص کی غمازی کر رہی ہے؟

حضرت والا فرماتے تھے کہ بات چونکہ مسئلہ کی تھی اسلئے میں نے حضرت (مولانا تھانوی) کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا کہ "جواب کا مفہوم میں پوری طرح سمجھ نہ سکا، اسلیئے وضاحت کا طالب ہوں اس پر حضرت والا نے پھر صاف الفاظ میں میری تائید فرما دی"!

سلیمان کا پھیرا ایک اور لطیفہ بھی جو طرفین کی غایت محبت ہی کا آئینہ ہے سُن لیجئے اور خود حضرت والاؒ ہی کی زبانی سنیئے "حکیم الامت کے آثارِ علمیہ" والے مضمون میں لکھا ہے کہ" ایک دفعہ میں نے اپنے برادرِ گرامی قدر مولوی مسعود علی صاحب (ندوی) کو جو تھانہ بھون میں مقیم تھے، اپنے حاضر ہونے کے قصد سے مطلع کیا اور ریاضؔ مرحوم کا یہ مصرعہ لکھ دیا ؎ " زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا" برادر موصوف نے یہ اطلاع مولانا کو دی اور یہ مصرعہ بھی سنا دیا، تو فوراً "فقیروں" کو بدل کر یوں فرمایا:۔

؎ زندگی ہے تو سلیماں کا بھی پھیرا ہوگا

انتباہ یہ تھے چند واقعات جن سے شیخ و مرید کے خصوصی ربط پر پوری طرح روشنی پڑ جاتی ہے۔ یہ ہمارے معلومات کی حد ہے، اس کے سوا بھی ؎

"میانِ عاشق و معشوق رمزیست"

والے کتنے اسرار ہوں گے جن تک کسی کی رسائی نہیں ـــــ جو واقعات جمع کر دیئے گئے ہیں ان میں تاریخی ربط نہیں ہے، ممکن ہے ان میں بعض عطائے خلافت سے پہلے کے ہوں اور بعض بعد کے، اسکی وضاحت اسلیئے ضروری تھی کہ اب خلافت کا واقعہ لکھا جا رہا ہے۔

ـــــــــ ✻ ـــــــــ

خلافت سے سرفرازی

اگست ۱۹۳۸ء کو حضرت سید سلیمان نے راہِ سلوک میں قدم رکھا اور اب اکتوبر ۱۹۴۲ء آپہنچا تھا، مسافر نے عشق و معرفت کی اتنی منزلیں طے کر لی تھیں کہ اب وہ مجدد وقت حضرت تھانویؒ کی نگاہ میں راستہ کے سارے نشیب و فراز اور پیچ و خم سے پوری طرح باخبر اور ناواقفوں کی رہبری کے لئے ہر طرح لائق اعتبار تھا۔

استخارہ واستشارہ حکیم الامت نے اپنے قلبی داعیہ کی مزید تشفی کی خاطر استخارہ فرمایا، استخارہ سے تائید و تقویت پائی، پھر حضرت والا کے نام ایک مکتوب لکھا جس کا عنوان تھا ــــ "استشارہ بعد از استخارہ" ــــ اسمیں لکھا تھا کہ "میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو خلافت دوں، میں نے اس سلسلہ میں استخارہ بھی کر لیا ہے، اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

جواب حضرت والا فرماتے تھے کہ چونکہ دو تین ہی روز میں تھانہ بھون کی حاضری کا قصد تھا اس لئے میں نے اس گرامی نامہ کا جواب نہیں دیا بلکہ ب تھانہ بھون حاضر خدمت بھی ہوا تو خاموش ہی رہا ــــ آخر ایک دن حضرت الا (حکیم الامتؒ) کی طرف سے ایک پرچہ ملا کہ :۔

" آپ نے میرے استشارہ کا جواب نہیں دیا"۔

اس اصرار پر میں نے جواباً یہ عرض کر دیا کہ

"حضرت والا کا مکتوبِ گرامی پڑھ کر قدموں تلے سے زمین نکل گئی، کہاں میں اور کہاں یہ ذمّہ داری"۔

عطائے خلافت حکیم الامت علیہ الرحمۃ اپنے مریدوں کو ہر مرحلہ پر آزماتے اور

پر کھتے رہتے تھے، اور اکثر ایسے لطیف پیرائے میں کہ خود آزمائے جانے والے کو اپنی آزمائش کا احساس تک ہونے نہیں پاتا تھا، یہاں اس "استشارہ" میں بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیدالسالکین کے "تاثر" اور "حال" کی آزمائش بھی مقصود تھی اور خود اپنے اذعان کا مشاہدہ بھی!! ـــــ چنانچہ جب سیدالسالکین کا وہ جواب جو ابھی نقل ہو چکا پہنچا، تو حضرت شیخ بے حد مسرور ہوئے اور حاضرین سے فرمایا کہ:۔

"الحمدللہ وہی جواب آیا، جس کی توقع تھی"

بس اس کے بعد سید والا مرتبت کو سلاسل اربعہ میں خلافتِ باطنی عطا فرما دی اور مسند ارشاد پر ان کو متمکن فرما دیا، پھر خود اپنی حیات میں بعض اپنے زیر تربیت افراد کو بھی اپنے خلیفۂ مجاز کے سپرد فرما دیا، یہ واقعہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کا ہے!

شیخ الشیوخ کا تاثر

اس بات کے راوی حافظ عثمان صاحبؒ دہلوی ہیں، (جو خود بھی حکیم الامت کے فدائی اور خلیفۂ مجاز تھے) کہ:۔

"حضرت سید صاحب کو خلافت عطا فرما کر حضرت والا (حکیم الامت) اس درجہ مسرور و مطمئن تھے کہ بارہا فرمایا کہ الحمدللہ مجھے اب کچھ فکر نہیں، میرے بعد ایسے ایسے لوگ موجود ہیں"۔

مرشد اور وہ بھی مرشد تھانوی جیسے شیخ محقق کی نگاہِ تحقیق میں یہ اعتبار کوئی معمولی امتیاز ہے؟

خلیفۂ مجاز کا حال

بہرحال شیخ کا تاثر تو وہ تھا، خود خلیفۂ مجاز کی کیفیت بھی قابلِ دید ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس عطائے خلافت کے ساتھ ہی حضرت والا پر نیستی اور فنائیت بدرجۂ اتم چھا گئی وہ غرق عبدیت ہو گئے اس اثر میں ڈوب کر حضرت نے جو غزل کہی ہے وہ ان کے نزول پر شاہد ہے۔ یہ غزل جس طرح حضرت والا کی قلمی بیاض میں درج ہے۔ اسی طرح یہاں نقل کی جاتی ہے البتہ حاشیہ اس عاجز کی طرف سے ہوگا۔

براہ الہ آباد بتقریب خلافت ۲۲ر اکتوبر ۱۹۴۲ء

ابھی تو مشقِ فغاں کُنجِ میں ہزار[1] کرے — اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے
جو آج لذتِ دردِ نہاں[2] کا جویا ہے — وہ پہلے سوز سے دل[3] کو تو داغدار کرے
انہیں کے دینے سے ملتا ہے جسکو ملتا ہے — وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے[6]
ادب سے دیکھ لیں مشتاق دُور سے ان کو — مجال ہے جو کوئی انکو ہمکنار کرے[7]
سنا تو دے اُنھیں افسانۂ غمِ ہجراں — وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے[8]
وہ اپنے کان سے سنتے ہیں میرے نالوں[9] کو — وہ طرزِ نالہ[10] ہو جوان کو بیقرار کرے
تری نظر میں ہے تاثیرِ مستی صہبا[11] — تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے[11]

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں
وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے[12]

---

[1] تحلیل ذکر [2] نہاں خانۂ دل [3] ذات سالک [4] حصولِ تمکین [5] منصب و مقامِ ولایت جو وہبی ہے یوتیہ من یشآء، البتہ راہ ولایت کھلی ہوئی ہے جو چاہے پہنچنے کی کوشش کرے [6] یعنی حق تعالیٰ کا وصال حقیقی تو ایک محال عقلی ہے، البتہ وصال مجازی یعنی بندہ کے حسبِ استعداد و حجابات کا ارتفاع ممکن بھی ہے اور مقصود بھی! [7] یعنی دعا بذاتِ خود عاشق کا مطلوب ہے بقول عارف رومی

از دعا نبود مرادِ عاشقان — جز سخن گفتن باآں شیریں دہان

[8] اشارہ ہے "ادعونی استجب لکم" کے وعدہ ربانی کی طرف [9] مراد آداب دعا جن کی تفصیل احادیث میں موجود ہے، مثلاً اخلاص، عجز اور یقین وغیرہ [10] یعنی وہ اللہ (ہمہ مہر) ہے، رحمٰن، رحیم اور ودود ہے! [11] مراد توفیق الٰہی جس پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ قل ان الھدے ھدے اللہ۔ (قرآن)
[12] یعنی وصول الی اللہ کے دونوں ہی طریق ہیں: (۱) اجتباء یا جذب (۲) انابت یا سلوک۔ طالبِ مولیٰ بہرحال کامیاب ہے!! "تری نگاہ جسے چاہے" والے مصرعہ سے طالبِ مولا کا دل چھوٹنے کو تھا کہ اس

سلسلۂ سَنَد | اب حضرت والا کا سلسلۂ سند جس کو عرفِ تصوف میں شجرہ کہا جاتا ہے پیش کر کے اس عنوان کو ختم کرتا ہے۔ وہ طلائی زنجیر جس کی چالیسویں کڑی ہمارے حضرت ممدوح کی ذات ہے، بمدارج ذاتِ پاک رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اسطرح مربوط ہے:-

اسم گرامی	سنہ وفات	مدفن
حضرت اقدس سید سلیمان ندوی ؒ	(۱۳۷۳) ھ	کراچی
حضرت اقدس اشرف علی تھانوی ؒ	(۱۳۶۲) ھ	تھانہ بھون
حضرت اقدس امداد اللہ ؒ فاروقی تھانوی ثم مہاجر مکی	(۱۳۱۷) ھ	مکہ مکرمہ
حضرت اقدس میانجی نور محمد علوی جھنجانوی	(۱۲۵۹) ھ	جھنجانہ
حضرت اقدس حاجی سید عبدالرحیم ؒ افغانی	(۱۲۴۶) ھ	پنجتار (صوبہ سرحد)
حضرت اقدس عبدالباری صدیقی امروہوی ؒ	(۱۲۲۶) ھ	امروہہ
حضرت اقدس سید عبدالہادی امروہوی ؒ	(۱۱۹۰) ھ	امروہہ
حضرت اقدس سید عضدالدین امروہوی ؒ	(۱۱۷۳) ھ	امروہہ
حضرت اقدس شاہ محمد مکی جعفری ؒ	(؟) ھ	
حضرت اقدس سید محمدی اکبرآبادی ؒ	(۱۱۰۷) ھ	مکہ مکرمہ
حضرت اقدس محب اللہ فاروقی ؒ الہ آبادی	(۱۰۵۸) ھ	الہ آباد
حضرت اقدس ابوسعید نعمانی گنگوہی ؒ	(۱۰۴۰) ھ	گنگوہ
حضرت اقدس نظام الدین فاروقی ؒ تھانیسری	(۱۰۳۵) یا (۱۰۳۶) ھ	تھانیسر
حضرت اقدس جلال الدین فاروقی ؒ تھانیسری	(۹۹۰) ھ	تھانیسر

شعر نے حقیقت کبریٰ کو (اللہ یجتبی الیہ من یشاء ویھدی الیہ من ینیب) نظر کے سامنے کر کے ڈھارس بندھا دی کہ یہاں تو مایوسی کا گذر بھی نہیں!!

اسم گرامی	سنہ وفات	مدفن
حضرت اقدس عبدالقدوس نعمانی گنگوہی	(۹۴۴ یا ۹۴۵) ھ	گنگوہ
حضرت اقدس شیخ محمد فاروقی ردولوی	(۸۹۸) ھ	ردولی
حضرت اقدس شیخ عارف فاروقی ردولوی	(۸۸۲) ھ	ردولی
حضرت اقدس شیخ احمد عبدالحق ابدال فاروقی ردولوی	(۸۳۷) ھ	ردولی
حضرت اقدس جلال الدین کبیرالاولیاء عثمانی پانی پتی	(۷۶۵) ھ	پانی پت
حضرت اقدس شمس الدین ترک علوی پانی پتی	(۷۱۶) ھ	پانی پت
حضرت اقدس سید علاء الدین علی بن احمد صابر کلیری	(۶۸۹ یا ۶۹۰) ھ	کلیر
حضرت اقدس شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر فاروقی	(۶۶۴) ھ	اجودھن (پاکپتن)
حضرت اقدس سید قطب الدین بختیار کاکی اوشی ثم دہلوی	(۶۳۳) ھ	دہلی
حضرت اقدس سید معین الدین سجزی ثم اجمیری	(۶۲۷) ھ	اجمیر
حضرت اقدس خواجہ عثمان ہرونی ثم مکی	(۶۰۳) ھ	مکہ مکرمہ
حضرت اقدس حاجی شریف زندنی منیرالدین	(۵۸۴) ھ	زندنہ
حضرت اقدس سید قطب الدین مودود چشتی	(۵۲۷) ھ	چشت شافلاں
حضرت اقدس ناصرالدین ابویوسف بن سمعان چشتی	(۴۵۹) ھ	چشت شافلاں
حضرت اقدس سید ابومحمد چشتی	(۴۱۱) ھ	چشت شافلاں
حضرت اقدس سید ابواحمد بن سلطان فرسافہ چشتی	(۳۵۵) ھ	چشت شافلاں
حضرت اقدس ابواسحاق شامی چشتی	(۳۲۹) ھ	عکہ (شام)
حضرت اقدس ممشاد علوی دینوری	(۲۹۹) ھ	عکہ (شام)
حضرت اقدس ہبیرۃ البصری	(۲۸۷) ھ	بصرہ
حضرت اقدس حذیفہ مرعشی	(۲۵۲) ھ	بصرہ

اسم گرامی	سنہ وفات	مدفن
حضرت اقدس ابراہیم بن ادہم بلخیؒ	(۱۶۲) ھ	جبلِ شام
حضرت اقدس فضیل بن عیاضؒ خراسانی (یا بخاری) ثم مکیؒ	(۱۸۷) ھ	مکہ مکرمہ
حضرت اقدس عبدالواحد بن زید بصریؒ	(۱۷۷) ھ	بصرہ
حضرت اقدس حسن بصریؒ	(۱۱۰) ھ	بصرہ
خلیفہ رابع حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ	(۴۰) ھ	کوفہ
خاتم الانبیاء احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم	(۱۱) ھ	مدینہ منورہ

نوٹ :- یہ شجرہ "تعلیم الدین" مولفہ حضرت مولانا تھانویؒ سے ماخوذ ہے۔

سیّد العلما کا اعلان رجوع اور حکیم الامّت کی تبریک و تحسین

راہ سلوک میں آکر ایک مخلص سالک کی نظر اپنے نفس و اعمال پر محاسبانہ انداز سے پڑنے لگتی ہے، وہ اپنے حال ہی کا نہیں بلکہ ماضی کا بھی جائزہ لے ڈالتا ہے تاکہ جہاں کہیں کوئی کور کسر نظر آئے اس کی تلافی کر سکے اور ماضی کے دامن پر اگر کہیں کوئی داغ دھبہ پڑ گیا ہو تو اسے دھو ڈالے، اس دور کے سید السالکین کو بھی اس مرحلہ سے گذرنا پڑا اور تلافی مافات کی فکر ان پر بھی غالب آرہی۔ ادھر شیخ سے والہانہ محبت نے مسلک شیخ کو اس درجہ محبوب بنا دیا کہ اس کی خاطر ہر ایثار و قربانی کی امنگ خود بخود دل میں پیدا ہونے لگی، چنانچہ حکیم الامت کے کسی اشارے کنایہ کے بغیر، از خود اپنے احساس سے مجبور ہو کر، حضرت والا نے "رجوع و اعتراف" کے نام سے جنوری ۱۹۴۳ء کے معارف میں ایک تحریر شائع فرمائی جو ان کے اسی حال کی ترجمان ہے جس میں مبتلا ہو کر خسرو بے ریا کہہ اٹھا تھا ؎

خلق میگوید کہ خسرو عشق بازی می کند

آرے آرے میکنم با خلق عالم کار نیست

وہ تحریر دلپذیر یہ ہے، ذرا دل و دماغ کی یکجائی اور یکسوئی کے ساتھ ملاحظہ ہو تاکہ اس حال عالی کا فیضان آپ پر بھی ہوسکے۔

رجوع و اعتراف

"میری پیدائش صفر ۱۳۰۲ھ میں ہوئی اور اب یہ محرم ۱۳۶۲ھ شروع ہوگیا یعنی میری عمر نے زندگی کے ساٹھ مرحلے طے کر لئے، میری تحریر کا آغاز ۱۹۰۲ء سے ہوا ہے اور اب ۱۹۴۳ء!! جس کے معنی یہ ہیں کہ میری تحریری عمر نے چالیس سال پورے کر لئے، جب اس پر نظر جاتی ہے کہ اس ساٹھ سال کی زندگی میں کیا کیا کوتاہیاں ہوئیں اور کیسی کیسی لغزشیں پیش آئی ہوں گی تو دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے:

ع از کردۂ ناصواب یارب توبہ

تحریری زندگی کے چالیس سال پورے ہوگئے، یاد نہیں کہ ان چالیس برسوں میں قلم نے کیا کیا لکھا اور کہاں کہاں غلطی کی۔ اتباع حق کے بجائے اتباع ہوی کے موقعے کہاں کہاں پیش آئے اور اب بھی اپنی موجودہ حالت پر بزبان حال یہ صدائے غیب آتی ہے ؎

چہل سال عمر عزیزت گذشت
مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

کتابوں اور مضمونوں کے ہزارہا صفحات اتنے دنوں میں سیاہ کئے گئے، کہا نہیں جاسکتا کہ کہاں کہاں حق کا ساتھ چھوٹا ہے اور کس باطل کی تائید میں قلم نے لغزش کی ہے جس سے اتباع حق کے بجائے اتباعِ ہوا کا ارتکاب ہوا ہو، بندہ ہر حالت میں قصوروار ہے، خطا و نسیان اس

کا خمیر ہے اور اس کا علم و عمل کی لغزش گاہوں سے ٹھیک ٹھیک بچ نکلنا بہت مشکل ہے اس لئے یہ خاکسار ہیچمداں علی الاعلان اپنی ان تمام غلطیوں سے جو دانستہ یا نادانستہ حق کے خلاف ہوئی ہوں صدقِ دل سے توبہ کرتا ہے اور اپنے قصور کا اعتراف اور اپنی ہر اس رائے سے جس کی سند کتاب و سنّت میں نہ ہو، اعلانِ برأت کرتا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ!

مذہبی مسائل کی تحقیقات میں میرا یہ عمل رہا ہے کہ عقائد میں سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مسلک سے علیحدگی نہ ہو۔ البتہ فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی تقلید بتمامہ نہیں ہو سکی بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہا کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے لیکن کبھی کوئی ایسی رائے اختیار نہیں کی جس کی تائید آئمہ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہ حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمت اللہ علیہم کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے[۱]!

ایسا بھی دو چار دفعہ ہوا ہے کہ ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہے اور اپنی غلطی ظاہر ہوئی ہے تو بعد کے ایڈیشن میں اسکے مطابق تبدیلی کر دی[۲] ہے مثلاً معراج بحالت بیداری و بہ جسم ہونے پر قرآن پاک سے صحیح استدلال مجھے پہلے نہ مل سکا اور بعد کو اللہ تعالیٰ نے توفیق سے صحیح دلیل سمجھا دی تو دوسرے ایڈیشن میں اس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کر دی۔ اسی طرح فنائے نار کے مسئلہ میں پہلے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی پیروی میں کچھ لکھا گیا، بعد کو جمہوری رائے کا اضافہ کر کے دونوں کے دلائل کی تشریح کر دی اور اب بحمد اللہ کہ اس باب میں جمہوری کے

---

[۱] فقہیات میں حضرت والا کا یہی مسلک ابتداء سے آخر تک قائم رہا [۲] یہی باتیں تو دلیل ہیں اس امر کی کہ حضرت والا "مرتبہ نفس" کے مرحلہ سے ہمیشہ برتر و بالا رہے۔

مسلک کا حق ہونا سمجھ میں آگیا وما توفیقی الا باللہ۔[1]

مسئلہ تصاویر کے متعلق میں نے ۱۹۱۹ء میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں (۱) ذی روح کے فوٹو لینے یعنی عکسی تصویر کشی اور خصوصاً، (۲) نصف حصہ جسم کے فوٹو کا جواز ظاہر کیا تھا، اس سلسلہ میں بعد کو ہندوستان اور مصر کے بعض علما نے بھی مضامین لکھے جن میں سے بعض میرے موافق ہیں اور بعض میرے مخالف۔ لیکن بہرحال اس بحث کے سارے پہلو سامنے آگئے ہیں، اس لئے سب کو سامنے رکھ کر اب اس سے اتفاق ہے کہ صحیح یہی ہے کہ امر اول دستی تصویر کی طرح ناجائز ہے اور امر ثانی کا کھینچنا ناجائز اور کھنچوانا باضطرار جائز اور دھڑ کا بغیر سر اور چہرے کے دونوں جائز! پوری تفصیل آئندہ لکھی جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ![2]

زیوروں میں زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب کے مسئلہ پر صحابہ رضی اللہ عنہم میں اختلاف رہا ہے، روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عدم وجوب کی قائل تھیں۔ سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں ان کے اس مسلک کی تشریح میرے قلم سے کچھ اس انداز سے نکلی ہے، جس سے اس مسئلہ میں ان کی اس رائے کی تائید ظاہر ہوتی ہے چنانچہ ایک صاحب علم نے بڑی خوبی سے اس کا جواب بھی ایک رسالہ میں لکھا ہے

---

[1] یہ ہے محققانہ رنگ جو ہر دور کے صفِ علما کی چند ہی ہستیوں میں دیکھا جاتا رہا ہے! ورنہ ہر عالم کا ایک حلقہ نظر ہوتا ہے جسکے باہر جھانکنے کو وہ جرم سمجھتا ہے مثلاً موجودہ ہندوستان و پاکستان میں دیوبند، بریلی اور خیرآباد کے تین حلقے قائم ہیں اور بالعموم علماء ان ہی حدبندیوں میں محصور رہ کر کام کرتے ہیں۔

[2] معلوم نہیں کہ تفصیل لکھی جا سکی یا نہیں لیکن جو کچھ تحریر فرما دیا گیا اس میں تصویر کے مسئلہ میں ہر پہلو سے حاوی فتویٰ مل گیا۔

جو شائع ہو چکا ہے[1] اس لئے اس غلط فہمی کو دور کر دینا ہے اور کہہ دینا ہے کہ میں زیوروں میں جمہور کے فیصلہ کے مطابق زکوٰۃ کے وجوب کا قائل اور اسی پر بحمد اللہ عامل ہوں اور کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں انشاء اللہ اس کی تصحیح بھی ہو جائے گی۔

یہ باتیں کسی معترض کے خوف سے نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کے حضور میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے لکھ رہا ہوں[2] اور دعا کرتا ہوں کہ بارالٰہا مجھے صراطِ مستقیم پر قائم رکھ اور جب کبھی تقاضائے بشری سے مجھ سے غلطی ہو تو مجھے متنبہ اور معاف فرما اور مسلمانوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھ اور مجھے راہِ صواب دکھا، ربنا اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ۔ ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطأنا...... وعف عنا و اغفر لنا وارحمنا انت مولانا[3]!!

اگر مسلمانوں میں کوئی ایسا ہو جس نے میری وجہ سے ان مسئلوں میں میری رائے اختیار کی ہو تو اس کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ اس میرے رجوع اور تصحیح کے بعد اپنی غلطی سے رجوع کر لے اور صحیح امر اختیار کرے۔ علمائے سلف میں اپنی رائے سے رجوع اور ترجیح اور قولِ ثانی کا عام رواج رہا ہے

---

[1] اپنے ناقد کا ذکر اس خندہ پیشانی اور قدرشناسی کے ساتھ سلیمان پاک نہادہی کے قلم سے پڑھنے میں آئے گا ورنہ اور حضرات کی کتابوں میں اس مرحلہ پر طالب علمانہ شان اور عالمانہ زبان کی تقصیر صاف نظر آئے گی۔

[2] یہ ہے حقیقت حال جو طاری تھی۔

[3] یہ ہے رنگِ عبدیت جو پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا گیا تھا۔

یہ انہی کا اتباع حق ہے۔ والحق احق ان یتبع والسلام علی من اتبع الھدی"۔

سبحان اللہ اتباعِ حق کا کیسا حق ادا فرمایا، آخرت میں اس اظہار حق پر جو کچھ انعام و کرام ملے گا وہ تو ملے ہی گا، مگر دنیا میں بھی اہل نظر کی نگاہ میں حضرت والا کا رتبہ کس قدر عالی ہوگیا، وہ خلف میں سلف کی تصویر بن کر نمایاں ہو گئے۔

شیخ کی تبریک و تحسین اس اعلان "رجوع و اعتراف" کے ساتھ معارف کا ایک رسالہ حضرت والا نے اپنے شیخ معرفت آگاہ کی خدمت میں بھی بھیجا حضرت شیخ کے قلب مبارک پر اس تحریر کا بڑا اثر ہوا، اپنی عادت و مزاج کے خلاف پہلی اور آخری مرتبہ اپنے خلیفۂ ارشد کی مدح میں چند اشعار لکھ کر بھیجے، ان میں قلب سلیمانی کی تنویر اور معرفت آگاہی کی تصدیق فرمائی اور خوب خوب تحسین و آفرین کی ہے، ساتھ ہی اپنی کتابوں کی نظر ثانی کا بھی مشورہ دیا ہے کہ یہی خود شیخ کا بھی طریق عمل تھا۔

اس نظم کا آغاز آیاتِ قرآنی کے جن جواہر پاروں سے کیا گیا ہے اس کے بعد کا ایک شعر مثنوی معنوی سے ماخوذ ہے اور اس میں "تصرف یسیر" کے بعد ذات سلیمانی پر چسپاں کیا گیا ہے، بقیہ اشعار اور نظم کے کل عنوانات حکیم الامت ہی کے قائم کئے ہوئے ہیں، اس ضروری تعارف کے بعد وہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اعتراف (یعنی اخذ اعلان)	**از اعتراف** (یعنی رجوع سلیمان)
لمثل ھٰذا فلیعمل العاملون	وفی ذٰلک فلیتنافس المتنافسون[1]

---

[1] یعنی عمل کرنے والوں کو چاہیئے کہ حضرت سلیمان کے اس عمل (رجوع) کو اپنے لئے شمع ہدایت بنائیں اور ایسے اعمال حق و صداقت کی حرص پیدا کریں۔

اقتباس ترغیب دلپذیر، از مثنوی رومی بتصرف یسیر

از سلیماں گیر اخلاص عمل ۔۔۔ داں توندوی را منزہ از دغل[1]

اے دلت معمور از اسرارِ حق ۔۔۔ اے دلت مخمور از آثارِ حق

بشارت

اے دلت پُرنور از انوارِ حق ۔۔۔ اے دلت مسرور از اخبارِ حق

دُعا

صد مبارک باد ایں اظہارِ حق ۔۔۔ صد مبارک باد ایں اقرارِ حق

مشورہ

لیک باشد ایں طریقِ نفعِ خاص ۔۔۔ کہ بر اہلِ علم دارد اختصاص

سعیِ نفعِ عام اینجا واجب است ۔۔۔ آنکہ نافع بہر ہر ہر طالب است

تفسیرِ نفعِ عام

در کلامِ خود نظر خود کردنی ۔۔۔ یا کہ نقادے بدست آوردنی[2]

ہمچناں کردم بہ تالیفاتِ خویش ۔۔۔ صرف ہم کردم پے او نقدِ خویش

معذرت

گرچہ ناظم نیستم ابیات را ۔۔۔ نثر کردم لیک ایں جذبات را

مقصدِ من خیر خواہی ہست و بس ۔۔۔ بو کہ بارغبت فتد در گوشِ کس

اشرف علی ۲۷، محرم ۱۳۶۱ھ

---

[1] اصل شعر یہ ہے:۔ از علیؓ آموز اخلاص عمل ÷ شیرِ حق را داں منزہ از دغل ۔ (دفتر اول مثنوی معنوی)

[2] حضرت والا فرماتے تھے کہ اس نصیحت کے مطابق سیرۃ النبی کی نظرثانی کی گئی مگر بجز ان دو مسائل کے جنکا ذکر خود اعلان رجوع میں آچکا کوئی بات قابلِ ترمیم و تصحیح نظر نہیں آئی ۔ رسالہ اہلسنت والجماعت کی بھی نظرثانی فرمائی تھی، اور کچھ تنسیخ و ترمیم کے بعد اس کو دوبارہ کراچی کے دوران قیام میں مکتبہ الشرق میں چھپوایا تھا

ان اشعار کو ایک بار نہیں بار بار پڑھیے اور محسوس کیجئے کہ شیخ کے آئنہ خاطر میں باطن سلیمانی کا کیسا نقش اتر آیا ہے کہ اسی کے کیف نظارہ سے ہشتاد سالہ شیخ کے جذبات متحرک ہو گئے اور زبان ترنم ریز ہو گئی ہے!

جہاں تک اپنی نگاہ کی پہنچ ہے نظر نہیں آتا کہ حسام الدین چلپی رحمۃ اللہ علیہ[1] کے بعد یہ سعادت حضرت والا کے سوا کسی اور کو نصیب ہوئی ہو کہ شیخ وقت نے اپنے مسترشد کی مدح میں بے ساختہ اشعار کہے ہوں، اللہ کی دین ہے کہ سید ذی جاہ کا اعتبار علم و معرفت کی اقلیموں میں یکساں قائم رہا، اُدھر علامہ شبلیؒ اور ادھر عارف تھانویؒ سے تحسین و آفرین پائی!

وَلَيْسَ عَلَى اللهِ بِمُسْتَنْكَرٍ
أَنْ يَجْمَعَ الْعَالَمَ فِي وَاحِدٍ

---

[1] مثنوی کے دفتر ششم کا آغاز ہی مولانا روم نے اس تمہید سے فرمایا ہے ؎

اے حیات دل حسام الدین بسے	میل می جوشد بقسم سادسے
گشت از جذب چو تو علامہ	در جہاں گرداں حسامی نامہ
پیش کش می آرمت اے معنوی	قسم سادس در تمام مثنوی

شور و غوغا اور حضرت والاؒ کی استقامت

حضرت والاؒ نے حکیم الامتؒ سے تعلق تو کہنا چاہیئے "بصیغہ راز" ہی جوڑا تھا مگر یہ راز وہ راز نہیں تھا جو زیادہ دیر چھپا رہتا، زبان اس کو افشانہ کرتی مگر حال کا اخفا کس کے بس کی بات ہے، بقول خسروِ ثانی خواجہ عزیز الحسن مجذوب ؎

زباں چُپ رہی گرچہ مجبور ہو کر　　رہا بال بال اپنا منصور ہو کر

شور تسبیح و استغفار سے پہلے دار المصنفین گونجا اور انقلابِ باطن کی خبر ملی، پھر خلافت کی منادی ہو گئی اور اب جو رجوع اور اعتراف کی تحریر چھاپ دی تو ساری علمی دنیا میں اس کا ڈنکا پٹ گیا، لوگ حیران تھے کہ مسند نشین شبلیؒ آستانۂ اشرفیہ پر؟ علم کا دھنی فقیر کی دہلیز پر؟ ملت کا رہبر خانقاہ کے حجرہ میں؟ ؎

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا میروی

حیرت نے مخالفت کی کروٹ بدلی، ایک ہنگامہ بپا ہوا حضرت علامہ کے لئے بڑا صبر آزما! ــــ اندر کے کچوکے، باہر کے وار، اپنوں کی ناراضی، بیگانوں کی شماتت، ع

کھاؤں کہاں کی چوٹ بچاؤں کہاں کی چوٹ

بہت تنگ کئے گئے خطوط کی بھرمار ہوئی کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ کیوں کیا؟ آپ کو اس کی کیا ضرورت پڑی تھی مگر جس کو ستایا جا رہا تھا وہ کوہِ وقار تھا، اس کا دل یقین سے معمور تھا کہ جو راہ اختیار کی گئی ہے وہ حق ہے، صداقت ہے اور حق و صداقت ہی

کی دونوں جہان میں کامرانی ہے۔

عمومی جواب ان سارے استفسارات و اعتراضات کے جواب میں حضرتِ والا اکثر یہی فرماتے رہے کہ:۔

"وہ لوگ مجھ کو زبان سے تو فاضل اور محقق کہتے ہیں مگر درحقیقت مجھ کو بے عقل جانتے ہیں، آخر اس بات پر کیوں نہیں غور کرتے کہ ان کے خیال کے مطابق اگر میں واقعی علامہ اور محقق ہوں تو کیا بلا وجہ میں نے مولانا تھانوی کا دامن تھاما ہے؟ میں نے اپنے اندر کوئی کمی تو پائی جس کی تکمیل کے لئے میں وہاں گیا۔"

ایک اور محکم جواب اس کے باوجود جب بعضوں نے گلہ کیا کہ ہم نے تو آپکو اپنا قبلہ بنایا تھا، آپ کو کسی کے آگے جھکنے کی کیا ضرورت تھی تو صاف یہ جواب باصواب لکھ دیا کہ:۔

"جن کمالات کی بنا پر آپ نے مجھے اپنا قبلہ بنایا تھا، ان ہی کمالات نے مجھ کو مولانا تھانوی کے آگے جھکا دیا میں نے اپنے انجام کی فکر کرلی اب آپ کو اختیار ہے کہ اپنا قبلہ کوئی اور تجویز کرلیں۔!"

یہ پامردی اور استقامت کی کوئی معمولی مثال ہے؟ عزت وجاہ کی کوئی معمولی قربانی ہے؟

عم محترم کو بصیرت افروز جواب اس شور و غوغا سے بہت پہلے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سیدیؒ کے محبوب چچا حضرت سید عبدالحکیم صاحب دیسنوی مدظلہٗ نے بھی حضرت کی ارادت سے متعلق شاید لکھا تھا کہ ظاہر و باطن کے سارے کمالات کے باوجود اب اس کی کیا ضرورت تھی، ظاہر ہے کہ چچا کی اپنے بھتیجے سے یہ ہمدردی، غایت مہر و محبت ہی کا کرشمہ تھی۔

حضرتِ والا رحؒ نے ان کی تسکینِ خاطر کے لئے جو جواب تحریر فرمایا، اس کا ایک ایک جملہ چشمِ بصیرت کے لیئے سرمۂ سلیمانی کا اثر رکھتا ہے اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت پر حقیقت کیسی کھل گئی تھی اور اب وہ ماسوی اللہ سے کس قدر مستغنی ہو کر طریقِ اخلاص پر گامزن تھے۔ مکتوب پوری توجہ سے ملاحظہ ہو:۔

"آپ اپنی محبت سے مجھے سب کچھ سمجھتے ہیں، لیکن من آنم کہ من دانم علماء پر فرائض کا بارِ عام مسلمانوں سے زیادہ ہے اس لئے اگر وہ درست نہ ہوں تو ان پر عذاب دوسروں سے زیادہ ہے۔ معاملہ دماغ کا نہیں قلبِ سلیم اور قلبِ منیب کا ہے۔ نفس کا نہیں روح کا ہے۔

میری اتنی زندگی بندوں میں گذری، اب کچھ اس زندگی کے لئے کرنا چاہیئے جو باقی ہے[1]۔ ابھی منزلِ مقصود بہت دور ہے ....

صرف تسبیح و مراقبہ سے کچھ نہیں ملتا جب تک دل کا تعلق دل والے سے نہ ہو[2]۔ ہم تو بندوں کی رضامندی اور ناراضی میں گرفتار ہیں مالک کی رضامندی اور نارضامندی کی کس کو فکر ہے، دعا کیجیئے کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ صحیح راستہ پر چلائے۔"[3]

(۳۱ دسمبر ۱۹۴۱ء)

مولانا ابوالکلام آزاد کا استعجاب

مولانا ابوالکلام مرحوم حضرت والاؒ کے قدیم رفیق اور انکے کمالات کے معترف[4] تھے

---

[1] بے ساختہ عارف شیراز کے شعر یاد آگئے۔

از قیل و قال مدرسہ حالے دلم گرفت — یک چند نیز خدمتِ معشوق می کنم

این جان عاریت کہ بہ حافظ سپرد دوست — روزے رخش بہ بینم و تسلیم وی کنم

[2] تسبیح و مراقبہ تو محض ذرائع ہیں مقصود نہیں۔ مقصود حصول نسبت مع اللہ ہے!! [3] سلیمان نمبر معارف۔

[4] ملاحظہ ہوں مکاتیب ابوالکلام بنام علامہ سید سلیمان، شائع شدہ معارف ۱۹۵۴ء ۱۹۵۵ء۔

مدّت تک مل جل کر کام کرتے رہے لیکن ادھر عرصہ سے دونوں کی راہ الگ الگ ہوگئی تھی اور ملنے ملانے تک کا موقع برسوں سے نہیں آیا تھا مگر مولانا تک حضرت کے انقلاب روحانی کی خبر بہرحال پہنچ چکی تھی اور وہ بھی حیرت زدہ تھے کہ یہ کیا ہوگیا؟

خود حضرت والاؒ نے سنایا کہ برسوں بعد جب مولانا ابوالکلام بھارت کے وزیرِ تعلیم بن چکے تھے، دہلی میں کسی دعوت میں ان سے ملاقات ہوگئی تو انہوں نے بڑے تعجب سے پوچھا:۔

"مولانا میں نے سنا ہے کہ آپ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید ہوچکے ہیں اور ان کے خلیفۂ مجاز بھی ہیں؟"

حضرت والاؒ نے دونوں باتوں کا اعتراف فرمایا تو پھر مولانا نے سوال کیا:۔

"آخر تصوّف میں ہوتا کیا ہے؟"

حضرت والاؒ نے جواب دیا کہ:۔

"یہ بات تو کسی تفصیلی صحبت میں پوچھنے کی ہے اس مختصر وقت میں کیا بتاؤں؟"

(بات ختم ہوگئی اور پھر کسی ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ سوال تشنۂ جواب ہی رہ گیا مگر اب سائل و مسئول دونوں وہاں پہنچ گئے جہاں بغیر سوال کے ہر حقیقت خود بخود شاہد ہے!)

غرض اس واقعہ کو سنا کر حضرتِ والاؒ نے فرمایا کہ یہ وہی مولانا ابوالکلام ہیں جن کے والد ماجد کلکتہ کے مشہور پیر تھے اور ان کے وصال پر لوگوں نے ان کو ان کا گدّی نشین بھی کیا تھا، اگر وہاں کچھ پایا ہوتا تو آج یہ سوال کیوں کرتے، رسم و رواج نے حقیقت گم کردی اور اس رسمی پیری مریدی کو دیکھ کر لوگ حقیقت تصوّف کے، جس کا صحیح عنوان تقویٰ و احسان ہے منکر ہوگئے!!

اب تک اعتراض عجیب بات یہ ہے کہ حضرت والارح سے متعلق یہ ہنگامہ کوئی ہنگامی نہ تھا بلکہ آج تک سیرت سلیمان کا یہ باب ایک اختلافی مسئلہ بنا ہوا ہے اور کہنے والے اب بھی یہی کہے جاتے ہیں کہ سید صاحب نے "ندوی" نسبت کو ٹھیس پہنچائی، اس رجوع سے ان کو کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو مگر سید صاحب کی ارادت کے طفیل مولانا تھانوی کا نام تاریخ میں محفوظ ہو گیا جو ذرا نرم ہیں وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ خیر اس تعلق میں تو کوئی مضائقہ نہ تھا مگر سید صاحب کے ذکر و شغل میں انہماک کی وجہ سے ان کی علمی تحقیقات رک گئیں غرض جتنے منہ اتنی باتیں، یا یوں کہئے کہ جتنے ہمدرد اتنی ہمدردیاں، ان سب کا ایک جواب تو وہی ہے جو خود حضرت والا کے جگر گوشے سید سلمان صاحب سلمہٗ اللہ تعالےٰ نے ایک محفل جہاں اسی قسم کا تذکرہ چھڑ گیا تھا دیا تھا کہ :-

> "جو ہونا تھا وہ ہو چکا اور وہ واقعہ تاریخ کا ایک جزو بن چکا اب اس پر بحث کون سی عقلمندی ہے! انہوں نے جو ٹھیک سمجھا وہ کیا اب آپ لوگوں کی جو سمجھ میں آتا ہے وہ کیجئے"۔

فرزندِ سعید کا یہ جواب بالکل اپنے والدِ بزرگوار (قدس سرہٗ) کے رنگ میں رنگا ہوا ہے اور ان کی زبان سے ادا ہو کر اس کا لطف دوبالا ہو گیا۔ رزقہ اللہ تعالیٰ معرفۃً کاملۃً۔

جواب خاتم میں سب اہلِ علم معترضین سے بکمال ادب پوچھتا ہوں کہ اگر "آبروے ندوہ" اپنی عظیم الشان رسمی و تعلیمی، قومی و ملی خدمات کے بعد اور اپنے نہج پر کام کرنے والوں کی ایک جماعت تیار کر کے بالآخر ہمہ تن متوجہ بحق نظر آ رہا تھا، تسبیح و استغفار میں منہمک تھا تو کیا وہ اپنے عمل سے محبوب دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اسی سنت مطہرہ کو زندہ نہیں کر رہا تھا جو اسوۂ محمدیؐ کا آخری باب ہے؟ ——— حیرت ہے محمد رسول اللہؐ تو منصبِ تبلیغ پر

ماموراور ساری انسانیت کے داعیٔ شرح صدر سے مشرف اور پیکرِ معصومیت ہونے کے باوجود فسبح بحمد ربك واستغفرہ کا حکم پائیں اور سب کاموں سے ہاتھ کھینچ کر تسبیح و استغفار میں مشغول ہو جائیں لیکن اگر ان کے کسی خوش نصیب امتی کو یہی سعادت زندگی کے ایسے ہی مرحلہ میں حاصل ہو جاتے تو وہ قابلِ گرفت ٹھہرے ؟ یا للعجب ۔

مقام ڈرنے اور توبہ کرنے کا ہے ! دعا تو سب خادمان علم اور خدمت گزارانِ ملّت کی یہی ہونی چاہیئے کہ آخر کار ان کو بھی ایسی ہی سعادت مل جائے جیسی سیّد الملّت علیہ الرحمۃ کو مل گئی تھی ۔

لمثل ھٰذا فلیعمل العاملون

و فی ذالك فلیتنافس المتنافسون

معتقدین کے لئے سامانِ تشفّی

ایک بات جہاں معترضین کی خدمت میں عرض کر دی گئی، دو جملے حضرتِ والاؒ کے معتقدین کی تشفّی کے لئے بھی ضروری ہیں۔ یہ ہنگامہ جو ہمارے سید ذی شانؒ کے ساتھ پیش آیا، عرفاء اور اتقیاء کی تاریخ میں انوکھا نہیں ــــــ دیکھئے عارف رومیؒ نے جب شمس تبریز کا دامن تھاما تھا تو کیا خود مولانا روم ہی کے شاگردوں نے شمسِ تاباں پر دھول جھونکنے کی کوشش نہیں کی ؟ اور کیا بالآخر انہی ناقدروں کے ہاتھوں عارف رومیؒ کو مدّتوں بادیہ پیمائی نہیں کرنی پڑی ؟ ــــــ اسی طرح امام غزالیؒ کو بھی اس مرحلہ پر پہنچ کر کیا کچھ نصیحتیں سننی نہ پڑیں، خود امام عالی مقام ہی کی زبانی اس کی کچھ روداد سنیئے :۔

"علماء اور ارکانِ سلطنت کو جب یہ خبر ہوئی تو سب نے نہایت الحاح کے ساتھ روکا اور حسرت سے کہا کہ یہ اسلام کی بدنصیبی ہے،

ایسی نفع رسانی (یعنی درس وتدریس) سے آپ کا دست بردار ہوجانا شرعاً کیوں کر جائز ہو سکتا ہے؟ تمام علماء و فضلا یہی کہتے تھے، لیکن میں اصل حقیقت کو سمجھتا تھا، اس لئے سب کو چھوڑ چھاڑ دفعتہً کھڑا ہوا اور شام کی راہ لی۔"[1]

---

[1] الغزالی از علامہ شبلی نعمانیؒ

حضرت شیخ کی خدمت میں آخری حاضری اور

رحلتِ شیخ

ہوتا رہا جو کچھ ہوتا رہا، مگر حضرتِ والا اپنی متعینہ راہ پر پورے عزم ویقین سے گامزن تھے، اور گردوپیش سے بالکل بے نیاز

ع خلقے پسِ دیوانہ ودیوانہ بکارے

اپنی مشغول ومصروف زندگی کے باوجود وقت نکال نکال کر بار بار شیخ عالی مقام کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فیض صحبت اٹھاتے رہے، یہاں تک کہ وہ حاضری بھی جس پر اس عالمِ ناسوت کی ملاقات ختم تھی، اس کی تفصیل خود حضرت والا ہی کی زبانِ فیض اثر سے سنئے:۔

"میری آخری حاضری[1]"

"خاکسار جون (۱۹۴۳ء) کے آخر میں اپنے مستقر (اعظم گڑھ) سے تھانہ بھون اور پھر بھوپال کے ارادہ سے روانہ ہوا، لیکن لکھنؤ پہنچ کر دارالعلوم ندوہ کے معاملات نے الجھا لیا۔ لکھنؤ میں ہر روز حضرت کی شدت علالت کی اطلاعیں آرہی تھیں۔ حضرت کے ہزاروں

[1] یادرفتگاں صہ۲۸۷ زیرِ مضمون "موت العالم موت العالم"۔

معتقدوں کی طرح خاکسار بھی زیارت کے لئے بے چین تھا۔ حضرت کی طرف سے سخت قدغن تھی کہ باہر لوگوں کو اس شدت علالت اور کیفیت مزاج کی کوئی اطلاع نہ دی جائے تاکہ مخلصین میں اضطراب پیدا نہ ہو اور وہ سفر کی زحمت نہ اٹھائیں، جو پہنچ جاتے تھے عام طور پر بطور تنبیہ ان کو اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اس پر بھی خاکسار خلافِ دستور بے اطلاع ۶ جولائی کو لکھنؤ سے روانہ ہو گیا اور ۷ کی دوپہر کو عین بارش کی حالت میں اسٹیشن سے خانقاہ تک پیادہ پا بھیگتے ہوئے پہنچا، دریافت حال سے معلوم ہوا کہ افاقہ کی صورت ہے، جس سے تسکین ہوئی میرا اس طرح خلاف دستور بے اطلاع اچانک پہنچ جانا حضرت کے لئے تعجّب کا موجب ہوا، میری آمد کی خبر دینے والے سے پوچھا "تم مولوی سلیمان کو پہچانتے بھی ہو یا یوں ہی کہہ رہے ہو"۔ اس نے اثبات میں جواب دیا تو ارشاد ہوا "ان کی عادت بے اطلاع آنے کی تو نہ تھی" حضرت کے عزیز خاص مولانا جمیل احمد صاحب نے عرض کی، علالت کی خبر سُن کر چلے آئے ہوں گے۔ نماز ظہر کے بعد مجلس میں حاضری ہوئی ضعف سے بستر پر لیٹے تھے، مصافحہ فرمایا، خاکسار نے دستِ مبارک کو بوسہ دیا، شفقت سے بشاشت ظاہر فرمائی[1]۔ قیام کے دن پوچھے[2] خاکسار

---

[1] ذرا اس جملہ کی روح تک رسائی ہو! کیا شانِ تواضع ہے کہ اپنی محبت کو بھی بے امتیاز کر کے رکھ دیا ہے!! ورنہ حب شیخ جس نقطۂ کمال تک پہنچی ہوئی تھی اس کا اندازہ ابھی چند جملوں کے بعد ہو جائیگا (ع۔م)

[2] حضرت والا فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالےٰ نے مجھے ہمیشہ ناز ونعم ہی میں رکھا، یہاں تک کہ شیخ کی خدمت میں بھی جب بلا کسی خادم کے حاضری ہوئی تو حضرت شیخ نے تاکید فرمائی کہ آپ کو سفر میں ایک خادم ہمیشہ اپنے ساتھ ضرور رکھنا چاہیئے۔

نے بھوپال کے سفر کی ضرورت ظاہر کی کہ سرکار بھوپال نے اپنی ریاست میں مسلمان عورتوں کے طلاق و تفریق کے مسائل طے کرنے کے لئے علماً اور اہلِ قانون کی ایک مجلس مقرر کی ہے، اس کی شرکت کے لئے مع مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب یہاں سے جانا چاہتا ہوں، اس لئے مجلس کی تاریخ کی اطلاع تک یہاں چند روز رہنا چاہتا ہوں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ والیۂ بھوپال پر رحمت فرماتے کہ انھوں نے مسلمان عورتوں کے حال پر رحم کھایا[1]، خاکسار نے عرض کی کہ حضرت وہاں اب والیہ نہیں والی ہیں، فرمایا ٹھیک ہے، غرض اس حالت میں بھی کہ ضعف پوری شدت پر تھا، تکلم میں تکلف تھا، پھر بھی حاضرینِ مجلس پر شفقت فرما کر ملفوظات سے ذرا تھم تھم کر بہرہ ور فرما رہے تھے، اور لوگوں کے آئے ہوئے خطوط سُن رہے تھے اور بدستور جواب لکھوا رہے تھے بلکہ بعض بعض خطوط پر خود دست مبارک سے بھی لکھ دیتے تھے کبھی جو قوت پاتے اور اس وقت کام کرنے لگتے تو تھوڑی دیر کو حاضرین کو یہ خیال ہونے لگتا کہ حضرت بیمار ہی نہیں، مگر ادھر جوش بیان کم ہوا اور ادھر تکیہ پر سر رکھ دیا، ہمیشہ کی عادت یہ تھی کہ بڑا تکیہ پیٹ سے لگا کر سر کو بے سہارا اونچا رکھتے تھے، یہی حال اس وقت بھی تھا، دیکھنے والوں کو تکلیف معلوم ہوتی تھی اور اس مشورہ کو جی چاہتا تھا کہ دوسرا تکیہ اور رکھ کر اس پر حضرت سر مبارک کو رکھ لیں، چنانچہ میں نے اس سلسلہ میں عرض کیا تو ارشاد ہوا، "نہیں اس کی حاجت نہیں"، بعد کو خواجہ صاحب (خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری ریٹائرڈ انسپکٹر آف

---

[1] یہ ہے عارفانہ نقطۂ نظر اور عارف کامل کی دُعا کا محرک۔

اسکولس یوپی، جو حضرت کے خلیفۂ خاص، محرم خاص بلکہ خادم خاص ہیں[1]) نے فرمایا کہ حضرت کی ہمیشہ کی عادت یہی ہے، اس ضعف واضمحلال کی حالت میں بھی مجلس کا وقار، نظم وضبط اور اصول وقواعد کی پابندی بدستور جاری تھی اور اخیر لمحۂ حیات تک اس میں فرق نہیں آیا۔

عصر کے وقت مجلس برخاست ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ کھانے کے الگ انتظام کی ضرورت نہیں[2]، چند روز کے مہمانوں کے لئے اس کی ضرورت نہیں، بڑے گھر سے کھانا آجائے گا، اور ایک خادم خاص کو اس کی ہدایت فرمائی۔

اس ناسزاوار کے لئے تو یہ خیر وبرکت کا سامان تھا، یہ بھی ارشاد ہوا کہ جب چاہو اور جس وقت چاہو آسکتے ہو، کوئی قید نہیں۔ یہاں

---

[1] ایک مسلّم ادیب اور صاحبِ خبر ونظر کے قلم سے خلیفہ، محرم اور خادم کے الفاظ، یہ نہ سمجھئے کہ یونہی نکل گئے ہیں، نہیں، اس ترتیب میں معنوی ترقی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ محبت واخلاص کی نگاہ میں خلافت بلکہ محرمیت سے بڑھ چڑھ کر خادمیت ہی کا رتبہ ہے کہ یہاں خادم اپنے آقا ومحبوب کا محض عاشق ہی نہیں، بلکہ عاشق فانی ہوتا ہے وہ وفاداری کے منتہا پر پہنچ کر وفا کے معنی کو بھول جاتا ہے اور اپنی حالت پر شرمسار ہوتا ہے ؎

جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

اس خادمیت کی مثال صدیوں پہلے امیر خسرو دہلوی نے قائم کی تھی، یا پھر اس دور میں خواجہ عزیز الحسن مجذوب نے، ورنہ خلفاء تو حضرت سلطان اولیا قدس سرہٗ کے بھی سیکڑوں تھے اور حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے بھی بیسوں!

[2] ہمارے حضرت والا رح کو یہ امتیاز بھی ہمیشہ حاصل رہا کہ حکیم الامت رح نے ہمیشہ اپنا ہی مہمان بنائے رکھا حتیٰ کہ اس مرض الموت کی حاضری میں بھی اس شفقت خاص کو برابر مبذول رکھا۔

سے اٹھ کر جب خانقاہ پہنچا تو بعد نماز حضرت والا رح کی طرف سے ، حضرت کی اخیر تصنیف "بوادر النوادر" کا ایک نسخہ مولانا جمیل احمد صاحب نے ہدیہ لاکر عنایت فرمایا اور یہ ارشاد سامی پہنچایا کہ میرے مضامین سے اقتباسات جمع کر کے شائع کرو، اس حکم کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا نسخہ سمجھ کر اپنی سعادت کا اظہار کیا دوسرے دن حاضری کے موقع پر حضرت نے اپنی زبانِ مبارک سے خود یہ ارشاد فرمانا چاہا تو خاکسار نے حضرت کی زحمتِ تکلم کے خیال سے عرض کیا کہ یہ ارشاد مبارک مولانا جمیل احمد صاحب کے ذریعہ پہنچ چکا، مگر وہاں سے اٹھنے کے بعد مولانا جمیل احمد صاحب سے جب میں نے پوچھا کہ حضرت کا مقصود کیا ہے؟ یعنی اس کتاب بوآدر سے اقتباس یا عام کتابوں سے؟ انہوں نے فرمایا اس کو میں خود بھی نہیں سمجھا، بعد کی حاضری میں موقع پاکر میں نے تفصیل چاہی تو ارشاد ہوا، نہیں، عام کتابوں میں جو مضمون مفید نظر آئیں، اُن کو یکجا کر لیا کرو۔ ،

میری حاضری ۷ جولائی سے ۱۱ جولائی ۱۹۴۳ء کی دوپہر تک رہی حاضری کے دوسرے یا تیسرے دن استفسار ہوا کہ کھانا تو مزاج کے موافق ہوتا ہے؟ عرض کی کہ بالکل مطابق ہے، کس تواضع اور کس شفقت اور کس بلاغت سے ارشاد ہوا کہ "میں (یعنی حضرت تھانوی) معافی کا خواستگار نہیں مستحق ہوں" ـــــ اس نکتہ پر اہلِ ذوق نے تحسین کی سعادت پائی کہ ضعف و نقاہت کے اس عالم میں بھی دل و دماغ ناقصوں کی تربیت میں مصروف ہیں اور اکرامِ ضیف کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔

خاکسار کو بھوپال کی مجلس کی تاریخ ۹ جولائی کو تار سے معلوم ہو چکی، تھی، ۱۰ کو رفیقِ سفر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا بھی مکرمت نامہ آگیا۔ ۱۱ کی صبح کی مجلس کے بعد رخصت کی درخواست پیش کی، باوجود ضعفِ قوت لیٹے ہی لیٹے دونوں ہاتھ رخصت کے لئے بڑھائے، حقیر نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دستِ مبارک کو بوسہ دیا، اور آنکھوں کو ملا، آہ! کس بلا کا رخصتانہ تھا، فرمایا: "جاؤ، خدا کے سپرد کیا[1]" یہ لفظ کانوں نے پہلے نہیں سنے تھے، آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور دیر تک چہرۂ مبارک پر جمی رہیں کہ یہ جمالِ جہاں آرا شاید پھر دیکھنے کو نہ ملے، سو ایسا ہی ہوا۔"

رحلتِ شیخ

غرض حضرت والا آخری زیارت سے مشرف ہو کر ۱۱ جولائی کو تھانہ بھون سے بھوپال روانہ ہو گئے، اس کے آٹھ دن بعد یعنی ۱۹، ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب کو شیخِ وقت حضرت حکیم الامت نے رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دل را بدل رہیست"۔ اسی رات کو حضرت والا رح نے ایک خواب دیکھا، جس کی تفصیل خود حضرت ہی کی زبانی سنیئے:۔

"خاکسار اب تک بھوپال میں تھا، عنایتِ الٰہی دیکھئے کہ عین شبِ وصال کو خواب دیکھا کہ مولانا شبیر علی صاحب (برادر زادہ حکیم الامت) مجھ سے فرما رہے ہیں کہ حضرت مولانا کو پوری صحت ہو گئی، صبح اٹھ کر

---

[1] کیا عجیب بات ہے کہ یہ ٹھیک وہی جملہ ہے جو شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان چھوڑتے ہوئے اپنے خلیفہ رشید مولانا رشید احمد گنگوہی رح سے وداعی ملاقات پر فرمایا تھا اور رخصت ہو گئے تھے!! (ملاحظہ ہو امداد المشتاق مولفہ مولانا تھانوی رح)۔

میں نے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے یہ خواب بیان کیا، دونوں چپ رہے، مفتی صاحب ۲۱ر جولائی اور خاکسار ۲۲ر جولائی کو بھوپال سے روانہ ہوئے، میں ۲۳ر کی دوپہر کو لکھنؤ پہنچا اور ندوہ آیا۔ حادثہ سے بالکل بے خبر تھا۔ مدرسہ پہنچنے کے ساتھ میرے بچے سلمان سلمہ نے سب سے پہلے خبر دی۔

وما کان قیسٌ ھلکہ ھلک واحد ولکنہ بنیان قوم تھدما[1]"

حضرت والا کا گہرا تأثر

مرشد تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی رحلت کا حضرت والا کے قلب مبارک پر جس قدر گہرا اثر ہوا، اسکا اندازہ ہم کیا کر سکتے ہیں، باقی اتنی بات تو آنکھوں دیکھی ہے کہ اس سانحہ کے کوئی ۹ - ۱۰ مہینے بعد یعنی مارچ واپریل ۱۹۴۴ء میں جب وہ حیدر آباد دکن تشریف لائے تھے تو چہرہ بشرہ مرقع غم اور لب ولہجہ اس قدر درد انگیز تھا کہ اہلِ محفل کے قلوب گداختہ ہو جاتے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ حضرت علامہ کا قلب ابھی خون ہوا ہے،

"فراق یار" کا یہ اثر برسوں باقی رہا[2]، بلکہ سکون پانے پر بھی آخر حیات تک یہی دیکھا کہ جب حضرت تھانویؒ سے اپنے تعلق کا ذکر فرماتے تو آواز بھرّا جاتی اور آنکھیں ڈبڈبا آتیں۔ بس ایک آدھ جملہ فرما کر خاموش ہو جاتے تھے۔

تأثر کے قلمی اثرات

غرض اس سانحہ کے فوراً بعد حضرت والاؒ نے چند اشعار درد وکرب سے مجبور ہو کر کہے، مگر چونکہ خود عارف تھے اور مسندِ ارشاد پر فائز اسلئے جذبات کا سیلاب حصارِ شرع کو چھو بھی نہ سکا اور آہ وبکا

---

[1] یاد رفتگان ص۲۹۸

[2] حضرت حاجی حافظ محمد عثمان صاحب دہلوی فرمایا کرتے تھے کہ جن حضرات کو حکیم الامت قدس سرہ کے جنازہ میں شرکت کا موقع حاصل رہا، ان کو سکون پھر بھی جلد نصیب ہوا مگر جو اس شرکت سے محروم رہے انکے غم وحزن کی آگ بہت دیر میں بجھ سکی، چنانچہ خود اپنی روداد بھی سنایا کرتے تھے کہ میں بھی انھیں

میں بھی تلقین وصبر کی شان پیدا ہوگئی ———— ملاحظہ ہو، اشعار اسی انداز میں لکھے جا رہے ہیں جیسے حضرت والاؒ نے اپنے قلم سے اپنی بیاض میں لکھے ہیں ؎

رحلتِ شیخ

داغِ فراقِ یار مٹایا نہ جائے گا ۔۔۔ اب دل کا یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

حرفِ دمِ وداع "خدا کے سپرد ہو" ۔۔۔ تا آخرِ حیات بھلایا نہ جائے گا

خیالِ سربالین[۱]

دل بھر کے دیکھ لو یہ جمالِ جہاں فروز ۔۔۔ پھر یہ جمالِ نور دکھایا نہ جائیگا

گوشِ جہاں بغور سنے اس کلام کو ۔۔۔ پھر یہ کلام شوق سنایا نہ جائے گا

اے میکشو یہ دردِ تہ جام بھی پیو ۔۔۔ ترسوگے پھر یہ جام پلایا نہ جائیگا

میں سے تھا جو تدفین شیخ کے وقت موجود نہ تھے، مجھ پر ایک عرصہ دراز تک اس درجہ شدید گریہ طاری رہا کہ بصارت رخصت ہونے کا قوی امکان پیدا ہوگیا تھا، ایسے میں حضرت حکیم الامت کو ایک رات خواب میں دیکھا کہ تشریف لائے اپنے سینۂ مبارک سے مجھ کو لگا لیا اور میرے شانوں پر بوسہ دیا، اس رویا کے بعد سیلاب اشک تھم گیا اور دل کو ایک گونہ قرار آگیا۔ یہ عشق ومحبت کے احوال ہیں نری عقل سے نہیں بلکہ حاسۂ قلب کی بیداری سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔

[۱] اس عنوان اور ان تین اشعار سے متعلق خود حضرت والاؒ نے لکھا ہے کہ جب وہ مولانا تھانویؒ کی خدمت میں آخری بار حاضر ہوئے تو حضرت نے از راہِ محبت سربالین ایک کرسی پر بیٹھنے کا امر فرمایا حضرت تھانویؒ پر غنودگی یا استغراق کا عالم بار بار طاری ہوجاتا تھا اور آنکھیں بند فرما لیتے تھے، صاحب نظم رحمۃ اللہ علیہ اپنے رومال سے مگس رانی فرماتے رہے، اسی عالم میں یہ خیالات انکے دل ودماغ پر گزرتے رہے!!

اے دل خموش صبر و رضا کا مقام ہے — نقشِ دوامِ فیض مٹایا نہ جائے گا
پیرِ مغاں نہیں ہے مگر میکدہ تو ہے — جام و سبو یہاں سے ہٹایا نہ جائے گا
یونہی بچھا رہے گا یہاں خوانِ فیضِ عام — جب تک ہیں میہمان بڑھایا نہ جائے گا

چاہا خدا نے تو تری محفل کا ہر چراغ
یونہی جلا کرے گا بجھایا نہ جائے گا!

اس کے علاوہ معارف میں "موت العالِم مَوْتُ العالَم" کے زیرِ عنوان وفات شیخ پر اپنے انداز کا ایک مضمون بڑے سوز و گداز سے لکھا جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں:-

"محفلِ دوشین کا وہ چراغِ سحر جو کئی سال سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا، بالآخر ۸۲ سال ۳ ماہ دس روز جل کر رجب ۱۳۶۲ھ کی شب کو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا،

داغِ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی — اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یعنی حکیم الامت، مجددِ طریقت، شیخ الکل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مرض ضعف و اسہال میں کئی ماہ علیل رہ کر ۱۹، ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب کو ۱۰ بجے نمازِ عشاء کے وقت اس دارِ فانی کو الوداع کہا اور اپنے لاکھوں معتقدوں اور مریدوں و مستفیدوں کو غمگین و مہجور چھوڑا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اب اُس دور کا بالکلیہ خاتمہ ہو گیا جو حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ اور مولانا یعقوب صاحب نانوتوی اور مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ کی یادگار تھا، اور جس کی ذات میں حضرات چشت اور حضرت

مجدد الف ثانیؒ اور حضرت سیّد احمد بریلویؒ کی نسبتیں یکجا تھیں، جس کا سینہ چشتی ذوق و شوق اور مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا، جس کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی جس کے قلم نے فقہ و تصوّف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا[1]"

پھر اس کے کچھ عرصہ بعد فروری ۱۹۴۴ء (صفر ۱۳۶۳ھ) کے معارف میں "حکیم الامّت کے آثارِ علمیہ" کے عنوان سے اپنے شیخ یگانہ کی تصنیفات پر ایک مضمون سُپرد قلم فرمایا جو انہی کا حق بھی تھا، اور حِصّہ بھی! اس مقالہ میں حسنِ ادب کے ساتھ کل تصنیفات اشرفیہ کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا گیا ہے اور بقول ہمارے محترم مولانا عبدالباری ندوی مدظلہٗ کے

"جامع المجددین حضرت تھانویؒ کی تصنیفی و اصلاحی، علمی و عملی جامعیت پر حضرت سیّد القلم ایجاز رقم کا اعجاز مجسّم ہے"[2]

اور سچ یہ ہے کہ اپنے موضوع پر حرف آخر ہے، اس کے دو تین اقتباسات نمونۃً پیش ہیں:۔

(۱) تمام تصانیف کا ایک اجمالی تعارف پہلے کرایا گیا ہے جس کے درمیانی چند فقرے یہ ہیں:۔

" ان تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں، آٹھ سو کے قریب ہے، ۱۳۵۴ھ میں ان کے (مولانا تھانویؒ کے) ایک خادم مولوی عبدالحق صاحب فتحپوری نے

---

[1] ملاحظہ ہو یادِ رفتگان ص ۲۸۳۔

[2] ملاحظہ ہو میری تالیف "حیاتِ اشرف" کا پیش لفظ رقم فرمودہ مولانا عبدالباری ندویؒ۔

ان کی تصانیف کی ایک فہرست شائع کی تھی جو بڑی تقطیع کے پورے (۸۶) صفحوں کو محیط ہے۔ اس کے بعد ۹ برسوں میں جو رسائل یا تصانیف ترتیب پائیں وہ ان کے علاوہ ہیں،

علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جن کی تصانیف کے اوراق اگر ان کی زندگی پر بانٹ دیئے جائیں تو اوراق کی تعداد زندگی کے ایام پر فوقیت لے جائے، امام ابن جریر طبری، حافظ خطیب بغدادی، امام رازی، حافظ ابن جوزیؒ، حافظ سیوطیؒ وغیرہ متعدد نام اس سلسلہ میں لئے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان میں مولانا ابو الحسنات عبد الحی فرنگی محلی اور نواب صدیق حسنؒ خان مرحوم کے نام بھی اس سلسلہ میں داخل ہیں، اس سلسلہ کا اخیر نام مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کا ہے!"

(۲) اس کے بعد تصانیف کے انواع، اُن کی زبان اور موضوعات کا ذکر کر کے ہر فن کی کتابوں پر الگ الگ تبصرہ فرمایا گیا ہے، بیان القرآن پر تبصرہ ملاحظہ ہو:۔

"تفسیر بیان القرآن:۔ یہ بارہ۱۲ جلدوں میں قرآنِ پاک کی پوری تفسیر ہے جس کو ڈھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا ہے اس تفسیر کی حسب ذیل خصوصیتیں ہیں: سلیس و بامحاورہ، حتی الوسع تحت اللفظ ترجمہ، نیچے "ف" کے اشارۂ فائدہ سے آیت کی تفسیر، تفسیری روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے، لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے، شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے،

صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں، تمام کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہلِ علم کے لئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کئے گئے ہیں اور حاشیہ پر عربی میں اعتبارات وحقائق و معارف الگ لکھے گئے ہیں، ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر روح المعانی پر اعتبار فرمایا گیا ہے.......!

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو تفسیر صرف عوام اردو خوانوں کے لئے علماء لکھتے ہیں، یہی خیال مولانا کی اس تفسیر کے متعلق بھی علماء کو تھا، لیکن ایک دفعہ اتفاق سے مولانا کی یہ تفسیر مولانا انور شاہ صاحب (کشمیری) نے اُٹھا کر دیکھی تو فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ اُردو میں یہ تفسیر عوام کے لئے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے

خود میرا خیال[1] یہ ہے کہ قدیم کتب تفسیر میں راجح ترین قول مولانا کے پیشِ نظر رہا ہے، ساتھ ہی ربط آیات و سور کا ذوق مولانا کو ہمیشہ رہا ہے اور اس کا لحاظ اس تفسیر میں بھی کیا گیا ہے مگر چونکہ ربط آیات کے اصول سب کے سامنے یکساں نہیں، اسلئے ہر مستند ذوق والے کے لئے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ اسی طرح مفسرین کے مختلف اقوال میں سے کسی قول کی ترجیح میں زمانہ کی خصوصیات اور ذوق ووجدان کا اختلاف بھی امر طبعی ہے، اس لئے اگر کلام سلف کے اصولِ متفقہ سے دور نہ ہو تو تنگی نہ کی جائے۔"

(۳) اب ایک اور اقتباس "کلید مثنوی" سے متعلق پیش ہے تاکہ "فن احسان" کا تذکرہ بھی آجائے جو مرقع سلیمانی کی روح ہے۔

---

[1] یعنی حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کا!

"طریق اور سلوک کے اسرار و رموز اس قدر دقیق اور نازک ہیں کہ ذرا ان کے سمجھنے میں بے احتیاطی کی جائے تو ہدایت کی بجائے ضلالت کا ذریعہ بن جائیں۔ اس لئے مولانا رومیؒ کی نے "جو مثنوی معنوی کے نام سے سرود نواز حقیقت ہے اور اسی لئے وہ اس سلسلہ کے اکابر کے خانقاہی درس میں رہی ہے، حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اس سے خاص ذوق تھا، اور وہ بھی خاص خاص لوگوں کو اس کا درس دیتے تھے، چنانچہ حضرت حاجی صاحب کے ایماء سے مولانا احمد حسن صاحب کانپوری نے اس کا حاشیہ لکھا اور منشی رحمت اللہ رعد مرحوم کے مطبع نے اس کو چھاپا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا بحرالعلوم کے بعد مثنوی کی حکیمانہ شرح اس سے بہتر نہیں لکھی گئی۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں حضرت حکیم الامت نے اس مثنوی کی خدمت محض فن کی حیثیت سے فرمائی سلوک کے مسائل، طریقت کی تعلیمات اور مثنوی کے بیانات کی قرآن و حدیث سے اس خوبی کے ساتھ "کلید مثنوی" کی تطبیق فرمائی، کہ اب فن کا مبتدی بھی چاہے تو اس کلید کے ذریعہ مثنوی کے خزانہ کو کھول سکتا ہے"۔

یہ چند نمونے تھے جو بڑی مشکل سے اصل مقالہ سے منتخب کئے جا سکے، ورنہ جو مضمون خود "ایجاز بیانی" کا اعجاز مجسّم ہو، اس میں سے اقتباس کا نکالنا کوئی آسان کام ہے؟ حاصل یہ ہے کہ اس مقالہ کی وجہ سے حکیم الامت قدس سرہٗ کے افادات کا ایک مستند تعارف عالمگیر علمی حلقوں میں ہو گیا ــــ یہ ایک بڑی خدمت تھی جو حضرت والاؒ کے ہاتھوں انجام پا گئی۔

باب پنجم

دار المصنفین سے بے تعلقی اور قیام بھوپال

۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۹ء

تواصی بالحق کا عزمِ نو

جو ہستی برسوں مسندِ شبلی کے حقوق ادا کرتی رہی اُس کو اب مسندِ اشرف کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا تھا یا یوں کہیئے کہ فروغِ دانش ہوکر اب اسے ضیائے قلوب بننا تھا۔

گھر کا جائزہ اس کے لئے دینی اور فطری ترتیب کے لحاظ سے اپنے نفس کے بعد اپنے اہل وعیال ہی افادۂ خاص کے حقدار تھے چنانچہ پہلے گھر ہی کا جائزہ لیا بھی گیا ـــــــ یہ نہیں کہ دینی اقدار گھریلو تربیت میں پہلے ہی سے پیشِ نظر نہ تھے مگر تحریکِ خلافت کے سیاسی جوش وخروش اور نئے ولولوں کے ساتھ قائم شدہ "جامعہ ملیہ" کے قیام کی وجہ سے حضرت والاؒ نے اپنے بڑے صاحبزادے سید سہیل صاحب کو جامعہ میں داخل کرادیا تھا جس کی وجہ سے ان کی دینی تعلیم نہ ہوسکی تھی، اب چھوٹے صاحبزادے سید سلمان سلمہ اللہ تعالےٰ کا نمبر تھا حضرتِ والاؒ نے دل و جان سے یہ کوشش کی کہ تلافی مافات ہوجائے، پہلے ندوہ میں پھر گھر پر متداول دینی درس کی تقریباً ساری کتابیں ختم کروائیں، صاحبزادے کی وضع قطع بالکل عالمانہ رکھی، بھوپال کے دورانِ قیام میں میں نے خود دیکھا کہ فرزندِ رشید کے لباس میں اپنے والد ماجد کی پوشاک کا رنگ قائم تھا، یعنی جسم پر شیروانی، سر پہ صافہ اور شرعی پاجامہ، شریعت کی اس ظاہرہ پابندی کے ساتھ حضرتِ والاؒ کی کڑی نظر تربیتِ اخلاق پر رہتی تھی، اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے میں صاحبزادے کی ایک ایک حرکت نگاہِ تربیت سے فیض یاب تھی،

اس ساری توجہ کے بعد دلخواہ نتائج کو نہ دیکھ کر حضرت والاؒ کچھ غیر مطمئن سے

رہے، بارہا ارشاد فرمایا کہ میں نے ان کو (صاحبزادہ سلمہ کو) ہر فکر سے بے نیاز رہ کر عالم بننے کی کوشش کی مگر ان کو شوق نہیں، ان کا رجحان انگریزی تعلیم ہی کی طرف ہے"۔ —— چنانچہ ایسا ہی ہوا، کراچی کے قیام میں حضرتِ والاؒ نے جب میٹرک کا امتحان دینے کی اجازت مرحمت فرمائی تو ہم لوگ حیران تھے کہ صاحبزادے سلمہٗ نے مہینوں کی محنت میں یہ امتحان پاس کر لیا، پھر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد بی۔اے کا امتحان امتیاز سے پاس کیا، اور اب جون ۱۹۵۸ء میں ایم۔اے ابتدائی کے امتحان سے فارغ ہوئے ہیں —— مگر یہ حضرت والاؒ کی تربیت کا اثر اور ان کے اصولِ تربیت کی کامیابی ہے کہ صاحبزادہ کا اخلاق ایسا ہی بلند ہے جیسا ہونا چاہیئے تھا۔ کبائر سے مجتنب، فرائض کے پابند، دین کی وضع صحیح سے آراستہ، اس پر سنجیدگی، تمکنت اور تواضع کے مزدوجی اوصاف مستزاد!! پھر مستقبل کی مزید دینی رفعتوں کی ضمانت یہ ہے کہ اپنے والد ماجدؒ کی رحلت کے بعد سے حضرت مفتی صاحب دام فیوضہم، جیسے صاحب ارشاد سے نیازمندانہ تعلق برابر قائم ہے![1]

حضرت والاؒ کی اہلیہ محترمہ (مدظلہا) تو خدا کے فضل و کرم سے موجودہ مسلم معاشرہ کی ان مثالی خواتین میں سے ہیں جو فہم و فراست، قناعت و ہمت، مروّت و ہمدردی، خاص سلیقہ خانہ داری اور تقوے و طہارت کے اوصاف عالیہ سے آراستہ و پیراستہ ہوں، فرائض و واجبات سے گزر کر نفلی عبادتوں خصوصاً روزہ جیسی شاق عبادت کی کثرت موصوفہ محترمہ کا امتیاز ہے، پھر یہ بھی حضرت مرشدی (رحمہ اللہ) ہی سے سُنی ہوئی بات ہے کہ دعا میں قبولیت کی تاثیر سے بھی سرفراز ہیں۔ کثر اللہ تعالےٰ امثالہا۔

---

[1] اور آج تو ماشاء اللہ وہ ڈاکٹر سید سلمان ندویؒ صدر شعبۂ اسلامیات ڈربن یونیورسٹی (افریقہ) ہیں اور ضابطہ ارادت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں جلال آبادی مدظلہٗ (خلیفہ حضرت تھانویؒ) سے رکھ کر اپنے والد ماجد کے حسبِ منشا بن چکے ہیں،

رفقائے دارالمصنّفین کی طرف توجّہ

یہ مروّت وکرم کا عین تقاضا تھا کہ باطنی دولت کی تقسیم میں نگاہِ سلیمانی گھر کے بعد سب سے پہلے ان ہی لوگوں پر پڑتی جن کو علم وقلم کا سلیقہ بخش کر برسوں سے اپنی رفاقتِ علمی کے لئے پسند فرمالیا تھا، حضرتِ والا رح نے چاہا اور پوری کوشش فرمائی کہ جو اپنے ہو چکے تھے وہ کسی مرحلہ پر اور کسی حیثیت سے بھی بیگانے نظر نہ آنے پائیں، چنانچہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے موسومہ ایک مکتوب میں بہ صراحت تحریر فرماتے ہیں :۔

"میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ رفقاء (دارالمصنفین) میں وہ فضا پیدا ہو جس کی تمنّا آپ کو ہے، مگر ظاہر ہے کہ مجھ ہی میں کیا ہے جو دوسروں پر اثر ہو، حضرت (تھانوی رح) کی باتیں ان کو سناتا ہوں اور ان کی تصانیف کی طرف متوجہ کرتا ہوں!

برادرم، دعا کیجئے کہ دارالمصنّفین کی یہ چھوٹی برادری صراطِ مستقیم کو پاکر اس پر قائم رہے اور ہم لوگوں کی عمر بھر کی محنت ہمارے لئے وبالِ آخرت بننے کے بجائے، باعثِ برکات وخیرات ہو!"

کیسی خشیت، فکرِ آخرت اور اپنوں کی خیر اندیشی ایک ایک لفظ سے نمایاں ہے ــــــ مگر بہ تمام ادب یہ کہنا پڑتا ہے کہ رفقائے دارالمصنّفین نے حضرت والا رح کی ان توجہات کی قدر نہ جانی، ان کو حضرتِ والا رح کی صفتِ علم وتحقیق سے تو بے پناہ شغف تھا، مگر انہوں نے مشاہدہ کو محدود رکھا۔ اگر وہ نظر کو وسعت دیتے تو دیکھتے کہ حضرت والا رح کی شخصیت جامع کمالات تھی اور ایسی جامعیت اللہ تعالےٰ نے ان کو عطا فرمائی تھی کہ آج اس کی جیتی جاگتی نظیر پیش کرنا دشوار ہے۔

لہ سلیمان نمبر معارف ص۹۷۔

مگر نہیں، رفقائے دارالمصنفین کو کمالاتِ باطنی سے استفادہ کی اہمیت ہی سمجھ میں نہ آئی اور سید الطائفہ کی دعوتِ صلاح و تقوے کو انھوں نے باتوں میں ٹال دیا، ذرا دارالمصنفین کے رفیق خاص مولانا شاہ معین الدین احمدؒ ندوی ہی کی قیل و قال سنیئے اور خود انہی کی زبانی سنئے تاکہ بات کی صحت میں کوئی شک و شبہ نہ رہ جائے تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس سلسلہ میں ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا، راہِ سلوک میں آنے کے بعد اکثر اپنے تلامذہ اور متوسلین کو بھی اس کی (یعنی حصولِ تقویٰ و احسان کی) تلقین فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو سارے کام ختم کرنے اور جو حاصل کرنا اور دینا تھا، اس کو حاصل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے بعد یہ راہ اختیار فرمائی ہے[1]۔ اگر ہم خدام ابھی سے اس راہ پر لگ گئے تو ہمارا کیا انجام ہوگا۔ میرا اشارہ سمجھ کر فرمایا میں یہ نہیں کہتا کہ علمی کام بے کار ہیں یا ان کی ضرورت نہیں رہی یا ان کو چھوڑ دیا جائے بلکہ تالیف و تصنیف کا مقصد اور نقطۂ نظر بدل جانا چاہیئے، اور اس کے لئے خود اپنے میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے! میں نے عرض کیا، اور ان خالص علمی کاموں کے متعلق کیا ارشاد ہے جس کے لئے تبدیلی کی ضرورت نہیں اس کے جواب میں حسبِ عادت معنی خیز مسکراہٹ سے فرمایا کہ شوق سے کیجئے، اس سے کون روکتا ہے، یہ بھی ایک کام ہے اور اس دلآویز مسکراہٹ پر بات ختم ہوئی۔" [۵۵]

---

[1] گویا حضرت والا رح نے کوئی پروگرام بنا رکھا تھا کہ جب پچاس پچپن کی عمر کو پہنچ لیں گے تب تقویٰ اور احسان کی منزل میں قدم رکھیں گے، اس سے پہلے نہیں، حالانکہ آپ پڑھ چکے کہ حضرت کو اس کا بڑا قلق تھا

یقیناً دلآویز مسکراہٹ[۵] حضرت والارحمہ کے ہونٹوں پر کھیل گئی۔ مگر یہ تو سوچیئے کہ ان کے دل پر کیا کچھ گذری ہوگی ــــــ خیر جو کچھ ہونا تھا ہو گیا، ماضی پر افسوس اور مستقبل کا انتظار جویائے حق کے لئے دونوں ہی حجاب ہیں۔

ع ماضی و مستقبلت پردہ خداست (رومی)

حضرتِ والارحمہ کی دعوت اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ ذاتِ حق سے قرب پیدا کرنے کے لئے تھی، ان کا یہ منشا اب بھی پورا کیا جا سکتا ہے اور جب بھی اس کی تکمیل

کہ اتنی دیر بعد اس طرف کیوں توجہ ہوئی، اور اس راقم آثم سے کئی بار فرمایا کہ "آپ اس پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کیجئے کہ جوانی میں ہی اِدھر (راہِ سلوک) کا خیال آیا، ورنہ اکثر اس کا خیال آتا بھی ہے تو اس وقت جب عمر کا بہترین حصہ گذر جاتا ہے۔

[۲] اس ارشاد سے دو باتیں مترشح ہوتی ہیں (۱) یہ کہ اپنی عمر کا اندازہ متیقن ہے (۲) یہ کہ سارا خوف قلم ہاتھ سے چھوٹ جانے، کسبِ معاش کے معرضِ خطر میں آجانے اور تعلقات واجبہ کے ترک ہو جانے کا لاحق ہو گیا تھا، حالانکہ اپنی اس تحریر میں اس سے پہلے ہی کے پیرگراف میں حضرتِ والارحمہ سے اس الزام کو بحسن و خوبی اٹھا چکے ہیں کہ راہِ سلوک میں آنے سے حضرت کے علمی و تحقیقاتی کارنامے بند نہیں ہو گئے ــــ کیا یہ محض برائے جواب تو نہیں تھا؟

[۳] اس جامع و مانع اور صاف و صریح جواب میں کسی اشکال کی گنجائش تھی؟ مگر دیکھیئے پھر بھی ایک سوال پیدا کیا گیا ہے!

[۴] مولانا کی زبان سے علم برائے علم کے تمامتر مغربی اور سراسر غلط نظریہ کی یہ ترجمانی کس قدر حیرت انگیز ہے! کوئی خاص علمی کام" بھی کیا بلا تعین مقصد اور بغیر کسی نقطۂ نظر کے انجام دیا جاتا ہے؟

[۵] یہ عین مقتضائے حکمت تھا، کیونکہ جب ایک بلیغ جواب پر پورے غور و فکر کے بغیر ایک اشکال وارد کر دیا گیا (جس کا جواب اسی میں آچکا) تو اب معنی خیز مسکراہٹ ہی کافی تھی!!

[۶] سلیمان نمبر معارف ص ۲۱۳

ہو گی۔ سید الطائفہ کی روح کو اس سے بڑا سرور و نشاط حاصل ہوتا ــــــ یہ باتیں میری زبان و قلم سے گستاخانہ محسوس ہوں گی مگر سید والا مرتبت سے جو ادنیٰ نسبت حقیر کو حاصل ہے وہ امید ہے کہ ظاہر کلام سے صرفِ نظر کرنے اور منشا سخن تک رسائی کا ذریعہ بن جائے گی ؎

نظر کردن بدرویشاں بزرگی را منافی نیست
سلیمان با ہمہ حشمت نظرہا بود با مور ش

عام شاگردوں کا خیال

رفقائے دار المصنفین تو حضرت والاؒ کی توجہات کا مرکز تھے مگر عام شاگردوں پر بھی ان کی نگاہِ مہر برابر پڑتی ہوئی تھی اور وہ دل و جان سے چاہتے تھے کہ جو جتنے قریب ہیں قربِ الٰہی کی راہ پر اُتنے ہی جلد آجائیں

شاگردوں کے زمرہ میں حضرت والاؒ کی نگاہ میں مولانا مسعود عالم ندوی کو خاص جگہ حاصل تھی حضرت والا ان کے مسلکِ اجتماعی کو پسند نہ فرماتے تھے، اس کے باوجود، ان کی وفا شعاری اور حسنِ ادب کے ہمیشہ مداح رہے اور پوری شفقت و دل سوزی سے اپنے اس شاگرد عزیز کو احسان و تقویٰ اور تزکیہ و اخلاص کی طرف کھینچنا چاہا مگر وہ بہت کچھ مان کر بھی اس مسلک سے کھچے ہی رہے، البتہ حضرت والا کی رحلت پر جو مکاتیب مرتب کر کے وہ وقفِ عام کر گئے[1]، اس کا تبلیغی پہلو آج بھی اہلِ نظر اور ... جویائے حق کے لئے عبرت و بصیرت کا ایک باب ہے اور امید ہے کہ یہ مولانا مسعود عالم مرحوم کے لئے صدقہ جاریہ کا موجب ہو گا۔ رحمہا اللہ تعالیٰ۔

دار المصنّفین میں خلفائے اشرفیہ کا تاریخی اجتماع

حکیم الامّت کی رحلت سے انکے

---

[1] "مکاتیب سلیمان" مرتبہ مسعود عالم ندوی مرحوم شائع کردہ مکتبۂ چراغ راہ لاہور۔

خلیفہ ارشد خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کے اندر بقول حضرت والا کے! "دو جذبے قوی پیدا ہو گئے تھے، ایک یہ کہ شیخ کے علم اور تعلیم کو جس طرح بھی ممکن ہو پھیلایا جائے اور دعوت الی اللہ دی جاتے۔ دوسرا یہ کہ حضرت شیخ کے اکابر خدام سے مل مل کر طلب کی پیاس کو بجھایا جائے۔ چنانچہ اس ایک سال کے اندر[1] انہوں نے اپنے وطن کے اندر بہت کم قیام کیا لکھنؤ، کانپور، دہلی، جونپور، اعظم گڑھ، بہرائچ وغیرہ شہروں میں پھر پھر کر اخوان طریق دوستوں سے ملا کیے"۔[2]

خواجہ صاحب محبت ومحبوبیت کا پیکر، جدھر جاتے تنہا تھوڑے ہی جاتے تھے، اہلِ نسبت کا ایک قافلہ ان کے جلو میں چلتا تھا، چنانچہ جب لکھنؤ آئے تو ان کے اطراف حضرت تھانویؒ کے کئی خلفاء اور مریدین خاص جمع تھے اور جب یہاں سے غالباً مارچ سنہ ۱۹۴۴ء کو حضرت سلیمان ندوی کے مستقر اعظم گڑھ کا قصد فرمایا تو دارالمصنفین میں ایک ایسا یادگار اجتماع ہو گیا، جو اس سے پہلے یا اس کے بعد پھر نہ ہو سکا "مُلکِ سلیمانی" کا

---

[1] یعنی حکیم الامت کی مفارقت کا ایک سال جو خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دارِ فانی میں گذار سکے۔

[2] حضرت مجذوب کی جو حالت اپنے پیر و مرشد کی رحلت سے ہو گئی تھی، اس کا اندازہ اس سرتاسر سوز وحسرت غزل سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے فراقِ شیخ میں کہی تھی، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کوئی مزہ مزہ نہیں کوئی ہنسی ہنسی نہیں
تیرے بغیر زندگی موت ہے زندگی نہیں

پیرِ مغاں کا دم کہاں اس کی وہ بزمِ جم کہاں
بادہ نہیں تو ہم کہاں زیست یہ زیست ہی نہیں

ہجر کی شب عجب ہے شب حال یہ ہے کہ للعجب
تارے ہیں روشنی نہیں چاند ہے چاندنی نہیں

اے میرے باغِ آرزو! کیسا ہے باغ ہائے تو؟
کلیاں تو گو ہیں چار سو کوئی کلی کھلی نہیں

دل میں لگا کے ان کی لَو کر دے جہاں میں نشر ضو
شمعیں تو جل رہی ہیں سَو بزم میں روشنی نہیں

[3] یادِ رفتگان ص ۲۵۵۔

تفوق اس حیثیت سے بھی ثابت ہی رہا محترم ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب جو اس مقدس انجمن کے ایک رکن تھے، فرماتے ہیں کہ سترہ خلفائے اشرفیہ یہاں جمع ہو گئے تھے، اور دارالمصنفین اہلِ دل کے انوار سے معمور ہو گیا تھا، اس مبارک انجمن کی شمع خواجہ صاحب کی دلآویز شخصیت تھی، شرکائے محفل میں سے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں: مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری مولانا محمد حسن صاحب کاکوروی، مولانا عبدالحق صاحب (ہردوئی) ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب ڈپٹی سید علی سجاد صاحب۔

ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ نے بتایا کہ صبح سے دوپہر تک اور سہ پہر سے شام تک نشستیں ہوتی رہیں اور خواجہ صاحب مجذوبؒ اپنے عارفانہ کلام اور بابرکت انفاس سے اہل محفل کے قلوب کو گرماتے اور حبِ الٰہی کو ان کے سینوں میں بھڑکاتے رہے۔ خود میزبان عالی مقامؒ کی زبانی بھی اس کی تصدیق سنیئے:

"ابھی چند ماہ ہوئے کہ خواجہ صاحب ہمارے دارالمصنفین مین آئے تھے، کئی دن رہے، اہل شہر اور اطراف شہر کا ہجوم ان کی زیارت اور ان کے کلام کو سننے کے لئے جمع ہو رہا تھا، جو کچھ بھی کہا تھا اور جو کچھ بھی کہتے تھے سب نوکِ زباں تھا، جب وہ اپنے شعر پڑھتے تھے تو خود بیخود ہو جاتے تھے اور دوسروں کو بیخود بنا دیتے تھے، ایک جوش تھا جو ان کے سینہ سے باہر آتا تھا"۔[1]

جہاں تک خود دارالمصنفین کے رفقاء کار کا تعلق ہے، وثوق سے سنا ہے کہ بعضوں نے اہلِ درد و محبت کے اس اجتماع کا اثر قبول کیا اور ایمان کی حلاوت محسوس کی، بعض غیر متاثر رہے اور ایک دو نے اس کی آڑ لے کر سید عالی مقام کے خلاف اپنے بغض و حسد کے اظہار کا موقع پایا کہ مرکزِ علم و فن میں یہ شورِ تسبیح اور شورشِ اذکار!!

---

[1] یادِ رفتگان ص ۳۴۱ "فراقِ مجذوب"

دار المصنفین سے ہجرت یا صبر کا تلخ ترین گھونٹ

حضرت سید العلماء والصلحاء[1] کو اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ میں جو عزت و سربلندی عطا فرمائی تھی اس کو دیکھ کر یہی رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ حیاتِ سلیمانی عطا وشکر کا وہ جام شیریں ہے جس میں ابتلاء وصبر کی تلخی کا شائبہ تک نہیں ـــــ اور تو اور اکثر وہ بھی جو قریب سے دیکھ سکے انھوں نے بھی یہی جانا اور پہچانا مگر یہ غلط فہمی حضرت والا کے کمال صبر وضبط کا نتیجہ تھی[2] خود راقم حقیر بھی اس غلط فہمی کا شکار رہا اگر کبھی کوئی کھٹک بھی محسوس ہوئی اور اس کا اظہار میں نے حضرت کی خدمت میں کیا بھی تو اس کو وہ تحمل نے اس کا ازالہ اس بشاشت سے فرمایا کہ پھر مزید تجسس کو جی بھی نہ چاہا ـــــ یہی وجہ ہے کہ جب بعد وفات معارف کے سلیمان نمبر کے لئے مضمون لکھنے بیٹھا تو صبر کا علیحدہ عنوان قائم کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی اور یہ جملہ قلم سے نکل گیا کہ :

"حیاتِ سلیمانی کا بڑا حصہ "شکر" ہی کا آئینہ دار ہے، علم وفضل، عزت و عظمت، دولت وثروت ہر اعتبار سے ہمیشہ سرفراز رہے، مگر آخر عمر کے دس برس میں اپنوں کی ناقدری وناسپاسی اپنے محبوب ادارہ دار المصنفین سے جدائی، تقسیم ہندوستان کے بعد کراچی کا قیام اور یہاں کی مالی وذہنی پریشانیاں یہ سب ایک مستقل مجاہدۂ اضطراریہ تھا۔"[3]

---

[1] حضرت مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ جب حضرت علامہ کو تحریراً خطاب فرماتے تو یہ کلمات ان کے القاب کا لازمی جزو ہوتے تھے، [3] سلیمان نمبر معارف۔

[2] چنانچہ مولانا گیلانی کا قول تو آگے آ ہی رہا ہے، یہاں پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ) کا بیان بھی سنیے جنہوں نے حضرت کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی سعادت پائی ہے لکھتے ہیں :۔

"سید صاحب کا تعلق دار المصنفین سے تقریباً ۳۰-۳۲ سال تک رہا، ان کی قیادت

(باقی صفحہ آئندہ پر)

اور حضرت مولانا گیلانیؒ نے بھی اپنے ایک مکتوب گرامی مورخہ ۱۵ فروری ۱۹۵۴ء میں میری رائے کی تصدیق ان الفاظ میں فرمائی :-

"ہمارے سیدالملت قدس سرہ العزیز کی صباریت کے جن حالات کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے[1] ان کا تعلق سچ پوچھیے تو اس جہان سے زیادہ نہ تھا ان کی زندگی کا بڑا حصہ "شکوریت" کے زیرِ اثر گذرا تھا۔ "صباریت" کی منزلیں رہی جاتی تھیں، زندگی کے آخری دور میں ان منزلوں سے وہ گذر گئے اور خوب گذرے صرف علامہ، ڈاکٹر اور اعظم المصنفین ہی ہونا ان کے لئے مقدر نہ تھا۔ سیدالعارفین بن کر رفیق اعلیٰ میں قدرت نے ان کو بلانا چاہا، اسی کا نظم کیا گیا۔"

یہ غلط فہمی رہی مولانا گیلانیؒ تک کو جو حضرت والاؒ کے قریبی رفقا میں سے تھے لیکن جب میری اور مولانا گیلانیؒ کی یہ رائے مولانا عبدالباری ندوی مدظلہٗ کے زیرِ نظر آئی تو موصوف نے اظہار واقعہ کے لئے ازراہِ کرم ایک مکتوب سے سرفراز فرمایا جس کا متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے اور لفظ بہ لفظ توجہ کا محتاج :-

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ) میں اس ادارہ کا یہ زمانہ کامرانی اور کارگزاری کے اعتبار سے بڑا شاندار رہا۔ مجھے یقین نہیں کہ مستقبل قریب میں دارالمصنفین کو یہ درجہ حاصل ہوسکے گا۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے سید صاحب نے کچھ دنوں کے لئے دارالمصنفین سے علیحدہ ہوکر بھوپال میں ملازمت کرلی!!! (معارف سلیمان نمبر صا ۱۲۱)۔

[1] مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا اشارہ میرے مضمون شائع شدہ سلیمان نمبر ریاض (کراچی) کی طرف ہے جس میں محض قیامِ پاکستان کے چند صبر آزما مراحل کا ذکر تھا جو اُن مراحل صبر کا پاسنگ بھی نہیں جو بعد کو میرے علم میں آتے اور خود مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مخفی تھے۔

بسم اللہ　　　　　　　　　　　　　　　ہارڈنگ روڈ۔ لکھنو

۲۰ - ۶ - ۵۵ء

مخدوب مکرم سلمہٗ۔ السلام علیکم، معارف کے "سلیمان نمبر" سے استفادہ کی نوبت بیمنۃ آں حضرت "سید العارفین" اعلی اللہ مقامہٗ سے اپنی گوناگوں نیازمندیوں قدامت و طوالت کی بنا پر کچھ نہ کچھ ان کے "عرفانی پہلو" کی "معرفت" کا دعویٰ بھی زبانی ہی تھا، مگر آپ کی ترو تازہ عقیدت و ارادت کے تاثرات و معلومات اس پہلو کے پڑھ کر یہ دعویٰ نرا دعویٰ ہی نکلا، ماشاء اللہ وجزاک اللہ۔

کسی "حال" سے تو یہ سراپا بدحال خود ہی محروم ہے تو حضرت مرحوم کے "احوالِ عالیہ" کو کیا پہچانتا، البتہ ان کے "مقاماتِ عالیہ" میں جس مقام کی معرفت سے تھوڑا بہت تعلق رکھنے والا بھی غیر متعلق نہیں رہ سکتا تھا اور جس کا میرے اوپر ہمیشہ بہت زیادہ اثر رہا وہ ان کا "مقامِ صبر" تھا چالیس سال کے بے شمار مواقع و تجربات میں کبھی شاذ ہی خفیف لغزش کا مشاہدہ ہوا ہوگا وہ بھی بس لب و لہجہ کے خفیف "تغیر" کی حد تک!

مولانا گیلانی مدظلہٗ ذرا دور کی اور آپ صرف آخر دور کی واقفیت کی بنا پر خیال فرماتے ہیں کہ "سید العارفین" کی زندگی کا بیشتر حصہ "شکوریت" کی راہ تھا اور "صباریت" کی منزل سے صرف آخر زمانہ میں گذار دیا گیا۔

کیا کہوں سنی سنائی نہیں، آنکھوں دیکھی سناتا ہوں کہ ان کے امتحان "صباریت" کی بڑی کڑی کڑی منزلیں خود دارالمصنفین کے دوران قیام میں آئیں اور اس کا خاتمہ جیسی ٹریجڈی (المیہ) پر ہوا کہ جس ادارہ کو انہوں نے تینتس ۳۳ پینتیس ۳۵ برس خونِ جگر پلا پلا کر پالا تھا اس سے دودھ کی

مکھی کی طرح علیحدگی، بس سید عالی مقام ہی کا ظرف تھا جو خون کے اس گھونٹ کو بھی صبر و سکون ہی کے ساتھ پی گئے!

ان کی عظیم الشان زندگی کے اس سب سے المناک المیہ کی طرف خود انہی کے مکاتیب سے بعض ہلکے اشارے اپنے مضمون[1] میں کر دیئے تھے، مگر یاران "مصلحت اندیش" نے ان کو بھی بلا اجازت ہی نہیں عدم اجازت پر بھی سرے سے حذف[2] ہی فرما دیا جس سے نہ صرف ان کے ایک بڑے کمال "سیرت و سلوک" کی سب سے بڑی شہادت کا جرم اخفا ہوا، بلکہ ڈھونڈنے والوں کو "سید السوانح" کے سب سے بڑے تاریخی سانحہ و حادثہ سے تاریکی میں چھوڑ دیا گیا کہ آخر جو ادارہ ان کی عمر بھر کی علمی و تعلیمی کمائی کا سب سے گراں قدر خزانہ تھا اور جس کی خاطر وہ ہمیشہ ہر طرح کی جاہی و مالی ترغیبوں اور تحریصوں کو ٹھکراتے رہے کیا اس کو محض بھوپال کی تنخواہ اور نوکری کے لئے چھوڑ بھاگے؟"

میں کہتا ہوں کہ نہیں، حاشا و کلا نہیں! دلیل مطلوب ہو تو کلیجہ تھام کر حضرت والاؒ کے ایک مکتوب موسومہ شاہ معین الدین احمد ندوی کا یہ اقتباس پڑھئے؛ ۳؍جولائی ۱۹۴۶ء کو بھوپال پہنچ کر تحریر فرما رہے ہیں:-

یہاں سرکاری مہمان خانہ میں ہوں، بہترین موسم، بہترین منظر اور بڑا خوش آئند مستقبل ہے، مگر خدا جانتا ہے کہ ان سب سے بہتر شبلی منزل میری نگاہ میں ہے، اے کاش کہ مجھے وہاں سکون میسر آتا اور خلافِ مزاج

---

[1] شائع شدہ سلیمان نمبر معارف

[2] ملاحظہ ہو ماہنامہ فاران (کراچی) بابتہ دسمبر ۱۹۵۵ء جس میں یہ حذف کردہ مضمون میرے ایک نوٹ کے ساتھ چھپا ہے!

حالات سے میں بچا رہتا، وہاں کا فقر یہاں کی شاہی سے بہتر ہے۔

حب الوطن از ملک سلیماں خوشتر　　خارِ وطن از سنبل و ریحان خوشتر
یوسف کہ بمصر بادشاہی میکرد　　می گفت گدا بودن کنعان خوشتر

ایک ہزار تنخواہ، سو ؍ ی کا الاؤنس اور پانچسو (۵۰۰) ماہوار سلسلۂ دار التصنیف کے لئے اور تمام دفاتر و محاکم شرعیہ اور تعلیماتِ شرقی کی امارت، اس جاہ و اعزاز سے نہ دل میں فرحت اور نہ قلب میں انشراح، استاذ مرحوم نے اخیر زندگی میں مولانا حمید الدین صاحب کے نام ایک خط میں لکھا تھا:۔

مرا گر تو بگذاری اے نفس طامع　　بسے بادشاہی کنم در گدائی

بحمد اللہ تعالیٰ و بفضلہ طمع نفس سے خالی ہوں مگر دل بعض کاموں کو چاہتا ہے جن میں سے ایک دار التکمیل کا خیال ہے جو مجھے یہاں لایا ہے!"

اور یہ مفارقت کسی وقتی اختلاف اور فوری فیصلہ کا نتیجہ بھی نہیں تھی، کامل سترہ سال تک قلب وجگر کا خون کرنے کے بعد جب "دل میں طاقت" اور "جگر میں حال" باقی نہ رہا تو مجبور و لاچار ہو کر گوارہ فرمائی گئی تھی، بڑھے مولانا عبد الباری صاحب کو کس بے کسی سے لکھ رہے ہیں:۔

"برادرِ من! میں جس طرح بسر کر رہا ہوں، میرا دعوے ہے کہ بہت سے احباب اس طرح چند سال بھی بسر نہیں کر سکتے، تاہم میں نے سترہ سال بسر کئے اور چاہتا ہوں کہ کسی دوسرے کو مجھ سے ٹھیس نہ لگے اور جس طرح یہاں میں جسمانی اور روحانی آلام میں رہتا ہوں ان سے نجات کی ہر وقت آرزو ہے!

برادرِ من! میری حالت ہمدردی کے لائق ہے، ملامت و عتاب کے لائق نہیں، میں اپنے رونے کا بھی آپ مالک نہیں۔

ع :۔ یاد آئے گی تمہیں میری وفا میرے بعد"

یہ اذیت کس کے ہاتھوں پہنچی اور پہنچتی رہی؟ مولانا مسعود علی (مرحوم) کے ذریعہ جو کبھی حضرت والا کے بڑے مخلص دوست تھے اور دارالمصنفین کی عمارات اور مطبع و مصنفین کے انتظام کے کامیاب نگران مگر بقول حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ اب ان میں یہ پندار پیدا ہو گیا تھا کہ دارالمصنفین ان کی ذات سے عبارت ہے!!

حضرت والاؒ نے اپنی طبعی شرافت و عالی حوصلگی کے تحت مظلوم ہو کر بھی عذرخواہانہ پہلو سے کام لیا کہ فتنہ فرو ہو جائے چنانچہ ثبوت میں مولانا عبدالباری صاحب کے موسومہ ایک اور مکتوب کا اقتباس ملاحظہ ہو :۔

"جس تاریخ برادر موصوف تھانہ بھون گئے ہیں اسی دن ان کے طرزِ عمل سے یقین تھا کہ میری ہزار برائیوں کے باوجود میری طرف سے انھیں کوئی شکایت نہیں ہے اور ہو بھی تو وہ معافی مانگ چکے اور میں بھی مسجد میں معافی مانگ چکا، اب اس کے بعد کوئی حرکت ہوئی تو میں ہر طرح طلب عفو کے لئے تیار ہوں، چنانچہ باوجود برادر موصوف کی خاموشی کے میں نے ان کو تھانہ بھون خط لکھا، انہوں نے ویسا ہی جواب دیا، جیسا وہ دے سکتے تھے[1] اور اس کے باوجود آج ان کو خط لکھ رہا ہوں اور مشورہ مانگ رہا ہوں، جیسا جواب آئے۔"

مگر اس بذلِ خُلق و ایثارِ منزلت سے مخالفت کی آگ نہ بجھ سکتی تھی نہ بجھی، میری کیا حقیقت مگر امام قشیریؒ کی بات کا اعتبار تو ضروری ہے، اپنے مشہور اور مستند "الرسالہ" کے باب "حسد" میں امام نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے :۔

"کُلّ انسانٍ اقدر علیٰ ان ارضیہ الا الحاسد فانہ لا یرضیہ

---

[1] یعنی طنز آمیز و دل آزار۔

الازدال النعمۃ"۔

یعنی میں ہر انسان کو راضی و موافق کر سکتا ہوں بجز حاسد کے کہ وہ تو اپنے محسود کے شرف (علمی، عرفانی، جاہی، مالی جو کچھ بھی ہو) کے مٹے بغیر راضی ہی نہیں ہو سکتا۔

بہر کیف اس سترہ سالہ کرب واذیت کی تفصیل اور حضرت والا کی بے مثل صابریت کی تشریح پیش کرنا ارباب دارالمصنفین کے ذمہ ہے اور اس سے گریز بانی ادارہ کے احسانات کی صریح ناسپاسی ہے، امید ہے کہ دارالمصنفین سے جو حیاتِ سلیمانی مرتب ہو گی تو اس علمی واخلاقی المیہ کا بیان ورد اس میں ضرور کھُل کر آئے گا، اس نیت سے نہیں کہ دوسرے کی رسوائی ہو بلکہ اس جذبہ کے ماتحت کہ حضرت سلیمانؒ سے متعلق مخلوق میں کوئی بدگمانی نہ رہ جاتے اور آئندہ مورخین اپنی قیاس آرائیوں سے حقیقت کو افسانہ نہ بنادیں۔

خدا کا شکر ہے کہ مدّت دراز کے بعد حیات سلیمانی ۱۹۷۳ء میں دارالمصنفین سے جس معیار کی بھی سہی شائع تو ہو گئی اور اس کے شائع ہونے تک مولانا مسعود علی صاحب مرحوم ہو چکے تھے شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے اپنی اس تالیف میں اس تلخ حقیقت کا ذکر اجمالی طور پر کر دیا ہے گو بات کو موقع سے ہٹا کر یعنی ان واقعات کو دارالمصنفین سے علیحدگی کے اسباب کے تحت بیان کرنے کے بجائے ترکِ قیام بھوپال کے بعد دارالمصنفین دوبارہ نہ تشریف لا سکنے کے وجوہ کے تحت ذکر کیا ہے بہر حال بات مبہم نہیں بالکل صاف اور واضح آگئی ہے، ملاحظہ ہو:

"حقیقت یہ ہے کہ بھوپال سے علحدگی کے بعد سید صاحب کی اصلی جگہ دارالمصنفین ہی تھی، مگر یہاں ان کو امن وسکون حاصل نہ تھا، انکے اور مولوی مسعود علی صاحب کے اختلافات اس درجہ کو پہنچ گئے تھے کہ ان

کی اصلاح کی کوئی شکل باقی نہیں رہ گئی تھی، ایک زمانہ میں ان دونوں کا اتحاد ضرب المثل تھا اور دونوں نے مل کر دارالمصنفین کو پروان چڑھایا تھا[1]، لیکن پھر اختلاف بھی اسی درجہ کا ہوگیا، اس کا سبب دونوں کا اختلاف مزاج تھا، سید صاحب نرم خو، حلیم الطبع اور متحمل مزاج تھے، اختلاف اور جنگ و مقابلہ سے گھبراتے تھے، ان کی ایک سطح تھی جس سے کسی حال میں نیچے اتر نہ سکتے تھے، مولانا مسعود علی صاحب کا مزاج اس کے بالکل برعکس تھا، اب اس کی تفصیل کیا لکھی جائے ......
وہ کسی معاملہ میں ادنیٰ اختلافِ رائے کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے دارالمصنفین کے معاملات میں بھی استبداد اور مطلق العنانی سے کام لیتے تھے اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان کو کسی بات میں تامل نہ تھا اس لئے دونوں میں اختلاف بڑھتا گیا جس کا اثر دونوں کے گھروں سے لے کر دارالمصنفین کے معاملات تک پہنچ گیا۔ سید صاحب گو اپنی طبعی بُردباری اور دارالمصنفین کے مصالح کی خاطر برداشت کرتے رہے لیکن آخر میں ان کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور ان کا دارالمصنفین میں سکون کے ساتھ رہنا مشکل ہوگیا۔ اس کی تفصیل بڑی طویل اور ناخوشگوار ہے اور اب دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں اسلئے قلم انداز کرنا ہی بہتر ہے"۔ (ص ص ۵۶۸ و ۵۶۹)۔

ایک شدید مرض اور اعلیٰ ترین کرامت

پے در پے جو چوٹیں قلب سلیمانی کو پہنچیں ان کا طبعی اثر و نتیجہ

---

[1] یعنی دارالمصنفین کا عمارتی قالب مولانا مسعود علی مرحوم کے ہاتھوں اور اسکی روح اور علمی و تحقیقاتی منزلت حضرت علامہ نور اللہ مرقدہٗ کے طفیل قائم تھی۔

سمجھئے یا غیبی حکمتوں کا تقاضا، بہرحال قیامِ اعظم گڈھ کے اسی دورِ آخر میں حضرتِ والا کو سخت ترین مرض لاحق ہوگیا جس کا اثر تا دمِ آخر باقی رہا۔ مئی ۱۹۴۵ء میں وہ استقائے قلبی (Dilation of Heart) کا شکار ہوگئے تنفس کی شکایت پہلے ہی تھی، اب دل کے پھیل جانے سے سانس لینا اور مشکل ہوگیا، اسی گھٹن کی وجہ سے نہ لیٹ سکتے تھے نہ بیٹھ سکتے تھے، خود ارشاد فرماتے تھے کہ آٹھ دن ایسے گذرے کہ لیٹنا تو درکنار بیٹھنا بھی محال تھا بس دیوار کا سہارا لے کر آٹھ دن اور آٹھ راتیں کھڑے کھڑے گذارنی پڑیں، پاؤں ورم کر آئے ـــــــــ اس دردانگیز واقعہ کو سنا کر مسکراتے ہوئے فرماتے تھے :-

"بھئی مجھ سے اختیاری مجاہدات تو کچھ بھی نہ ہوسکے تھے، اللہ تعالیٰ نے اضطراری مجاہدات میرے لئے مقدّر فرمائے، یہ بھی اس کا کرم ہے !!

یہ ہے ایک عارف مومن کی یافت اور اس کا ایقان کوئی غیر عارف اس مقامِ رفیع کو کیا سمجھ سکتا ہے؟ اور اس کی کیا قدر کر سکتا ہے؟ اس کو تو سمجھنا ہو تو کسی عارف کامل سے ہی پوچھنا چاہیئے، دیکھئے حضرت عارف تھانوی اس کی یوں تشریح فرماتے ہیں :-

" اہل اللہ کو مصائب میں الم تو ہوتا ہے گھٹن نہیں ہوتی، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر تمہارے زخم پر نشتر لگائے، اس وقت تم کو الم تو ہوگا مگر رنج وغم نہ ہوگا گو ظاہر میں تم ہائے ہائے بھی کروگے مگر دل اندر سے خوش ہوگا، کیونکہ تم اس نشتر کو حکمت کے موافق سمجھتے اور اپنے لئے نافع خیال کرتے ہو، یہی حال اہلِ اللہ کا ہے، زمانہ کے حوادث کے ساتھ کہ وہ ان کو عین حکمت اور سر تا پا مصلحت سمجھتے ہیں، اس لئے ہر حال میں خوش ہیں[1]!"

---

[1] ملاحظہ ہو "خیر الحیات وخیر الممات"۔ وعظِ حضرت مولانا تھانوی۔

غرض یہ حضرت والاؒ ہی جیسے اہل اللہ کا کمال تھا کہ کامل آٹھ دن پیکرِ رضا و تسلیم بن کر کھڑے رہے اور اپنے رب کے اس معاملہ پر مطمئن بھی!! ع ہر چہ آن خسرو کند شیریں کند!
مگر اہل و عیال تو حضرت کی اس تکلیف و بے چارگی کو دیکھ کر رو پڑتے تھے ——— حضرت والاؒ بکمال صبر ان کی دلجوئی فرماتے اور ان کی نظر کو حقیقت تک پہنچانے کی کوشش فرماتے تھے، ارشاد فرماتے تھے کہ پریشانی کی کیا بات ہے صحت کے لئے دعا کرو اور راضی برضا رہو، حق تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا ——— گویا چاہتے تھے کہ حق تعالیٰ کے "حاکم و حکیم" ہونے کا استحضار ہر فرد خاندان میں پیدا ہو جائے جو راحت و سکون کی ایمانی کلید ہے۔

غرض یہ صبر و استقامت خود ایک کرامت تھی، مگر اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ایک اور کرامت کا ظہور ان آٹھ دنوں کے ہر دن میں پانچ مرتبہ برابر ہوتا رہا اور قریب کے لوگ محوِ حیرت بن کر اس کا بار بار مشاہدہ کرتے رہے ——— وہ کرامت یہ تھی کہ جب نماز کا وقت آجاتا تو حضرت والاؒ کی چھوٹی صاحبزادی سلمہا وضو کرواتیں، ہاتھ منہ تو حضرت خود دھو لیتے، پاؤں دھلانے کی سعادت صاحبزادی کو حاصل رہتی، پھر حضرت والاؒ کو بدقتِ تمام مصلے پر کھڑا کر دیا جاتا اور لوگ ہٹ جاتے ———
اب اللہ کا بندہ اپنے رب کے حضور میں کھڑا ہے۔ اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لئے گئے، اب نہ جانے قرب کے کن منازل میں وہ گم ہے کہ اپنے مرض کا خیال ہے نہ بے طاقتی ارکانِ نیاز مندی میں حائل ہے، چشمِ حیرت دیکھ رہی ہے کہ وہ عبدیت کا پیکر اب رکوع میں جھکا پھر کھڑا ہو گیا، پھر بے تکلف سجدے پہ سجدے کیا جا رہا ہے۔ نہ کوئی آہ ہے نہ کراہ ہے!
فرض نماز اسی طرح پوری ادا ہو گئی البتہ دوسرا سلام پھیرتے ہی ایک دل گداز چیخ سنائی دیتی تھی، اور حضرت والاؒ گر پڑتے تھے، اعزا فوراً اٹھا کر دیوار کے سہارے کھڑا کر دیتے ——— اس طرح آٹھ دن میں چالیس بار دیکھنے والوں نے اس اعلیٰ ترین کرامت

کا مشاہدہ کیا اور خود اپنے ایمان وایقان میں تقویت پائی ہوگی۔

"قرب فرائض" کے سرفرازوں کی کرامات بھی فرائض ہی میں دیکھی جا سکتی ہے اور صاحب نظر ہی ان کے مقام ارفع کا اندازہ لگا سکتا ہے ورنہ عام لوگ تو" قربِ نوافل" والوں ہی کو صاحب کرامات جانتے ہیں !!

دارالمصنفین سے جُدائی کا فیصلہ

سترہ سالہ روحانی اذیت نے اب ضبط و تحمل کی طاقت بھی نہ چھوڑی، دو ہی صورتیں حضرت والارح کے لئے اب ممکن تھیں، یا تو اس ہاتھ کو قطع کیا جاتا جو مسلسل بغلی گھونسے لگائے جارہا تھا، ـــــــ مگر یہ ان کے لئے بہت مشکل تھا طبعی مروت و شرافت کی وجہ سے بھی اور ادارہ کی بدنامی کے خوف سے بھی! ـــــــ یا پھر خود ہی چپ چاپ وہاں سے نکل جاتے، حضرت والارح کے حلم وایثار نے دوسری ہی شق کو پسند کیا، تاکہ ادارہ بدنامی سے محفوظ رہے، چنانچہ مولٰنا عبدالباری صاحب نے لکھا ہے کہ:

"سید صاحب اپنی علمی ودینی خدمت ومحنت کے ایک بڑے سرمائے کو جس طرح برباد ہوتے دیکھ رہے تھے، اس کا قلق خود ان کو جتنا ہوگا دوسرا اندازہ بھی کیسے کر سکتا ہے اور اس میں ان کو اشخاص کے ذاتی تعلقات سے بھی کہیں زیادہ ادارہ کے اصلاح کی فکر تھی۔"

چنانچہ حضرت کو بڑی فکر یہ دامن گیر ہوئی کہ علحدگی کی کیا شکل اختیار کی جائے کہ شرِّ حاسد اور شماتت ہمسایہ سے حفاظت رہے، ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ جو اس دوران میں حضرت والارح سے اعظم گڈھ میں ملے تھے ان کا ارشاد ہے کہ:۔

"ایک روز مجھ کو دیر تک اپنے ساتھ لے کر ٹہلتے رہے، سارا ماجرائے درد سنایا اور فرمایا کہ تین مقامات ہیں جہاں بہ آسانی قیام کر سکتا ہوں، اپنا وطن دیسنہ، لکھنؤ اور لاہور، مگر وطن میں وہ علمی ماحول نہیں، لاہور

کے احباب گو وہاں کے قیام پر مصر ہیں مگر دارالمصنفین سے دوری ہوجائیگی البتہ لکھنو کا قیام نسبتاً مناسب معلوم ہوتا ہے، مگر اب تک اس بارے میں یکسوئی نہیں!"[1]

غرض اب تو یہ طے تھا کہ شبلی منزل کی جُدائی گوارا کر لی جائے، اور خندہ پیشانی سے مفارقت کا یہ زہر آلود جام پی لیا جائے، البتہ یہ تمنا اب بھی ضرور تھی کہ الگ ہو کر بھی ادارہ سے زیادہ فصل نہ رہے۔

---

[1] ہمارے حضرت مولانا گیلانی بھی اپنے وطن پہنچ کر اس علمی فقدان کی وجہ سے ماہی بے آب بن گئے تھے! مگر یہ صرف انہی کی سمجھ میں آنے والی بات ہے جو بحرِ علم کے ساکن ہوں!

قیامِ بھوپال

(جون ۱۹۴۶ء تا اکتوبر ۱۹۴۹ء)

علامہ سید سلیمان ندوی جیسی فرید العصر شخصیت کے لئے یوں تو ہر علمی و تعلیمی ادارہ، ملک و بیرون ملک کا، اپنی آنکھیں فرشِ راہ کئے ہوئے تھا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مدت سے ان کے لئے اپنا دامن بچھائے ہوئے تھی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے بارہا ان کو خوش آمدید کہنے میں فخر محسوس کیا، بلکہ آخر زمانہ میں تو استنبول یونیورسٹی سے تک بہ اصرار دعوت پہنچی تھی، مگر حضرت علامہ دارالمصنفین اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کو چھوڑ کر کسی تعلیمی یا علمی ادارہ سے تعلق جوڑتے ہوئے اس لئے تامل فرما رہے تھے کہ اس کی وجہ سے پھر لوگوں میں شک وشبہ پیدا ہونے کا قوی امکان تھا، کہ اگر علمی ہی خدمات انجام دینی تھیں تو اپنے ادارہ کو چھوڑ کر پرائے ادارہ سے تعلق کیسا؟ اللہ اللہ کتنا خیال تھا دارالمصنفین کی نیک نامی اور استحکام کا!

حیدرآباد کی پیش کش غرض حضرت علامہ ابھی کوئی تصفیہ نہ کر پائے تھے کہ ریاستِ حیدرآباد نے "صدر الصدور" کا عہدۂ جلیل (جو مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سے خالی تھا) خدمتِ عالی میں پیش کیا بلکہ جب اواخر ۱۹۴۴ء میں وہ حیدرآباد تشریف لائے تو وزیر تعلیمات اور وزیر امور دستوری حضرت کی قیام گاہ پر تشریف لا کر اس پیش کش کو قبول کرنے پر اصرار کرتے رہے مگر ادھر سے انکار ہی رہا ——— یہ وزراء ابھی گئے ہی تھے کہ راقم آثم خدمتِ عالی میں حاضر ہوا تو حضرت نے واقعہ سنا کر ارشاد فرمایا کہ "جو لوگ عہدہ و منصب کے پیچھے پھرتے ہیں وہ ان کو ملتا نہیں، اور جن کو اس کی خواہش نہیں

ان پر اصرار کیا جاتا ہے کہ یہ اعزاز ہوگا، اتنی تنخواہ ہوگی ـــــ بس دنیا کا یہ حال ہے!"

یہ ارشاد راقم آثم کی موعظت کے لئے تھا،

نواب بھوپال کا کامیاب اصرار

اسی زمانہ میں خدا کا چاہا یہ ہوا کہ نواب حمیداللہ خاں والئ ریاست بھوپال نے اپنی دیرینہ دعوت پھر ایک مرتبہ پوری قوت سے خدمت سلیمانی میں پیش کی، اب کی مرتبہ ذہین نواب نے اصرار کا ایسا پیرایہ اختیار فرمایا کہ وہ موثر ہوکر رہا، نواب صاحب نے جو کچھ لکھا، اس کا حاصل یہ تھا کہ میں نے اپنی ریاست کے دارالقضاء اور یہاں کے مدارس عربیہ کی اصلاح کا عزم کیا اور اس کام کے لئے میری نظر میں علامہ سید سلیمان ندوی سے موزوں شخصیت کوئی نہیں تھی لیکن میری دعوت کو آپ قبول نہیں فرماتے ہیں، اب میں بری الذمہ ہوں، اگر اللہ تعالیٰ قیامت میں مجھ سے اس بارے میں پوچھے گا تو صاف عرض کردوں گا کہ بارِ الٰہا میں نے اس کام کے لئے جس ہستی کو موزوں سمجھا، بہ اصرار اس کو بلاتا رہا مگر میرا اصرار کارگر نہ ہوا۔

یہ روایت میں نے خود حضرت والاؒ سے سنی ہے، فرماتے تھے کہ نواب صاحب کے اس (خط کشیدہ) جملہ نے مجھ کو مجبور کردیا، اور میں نے ان کی دعوت قبول کرلی!

اس طرح جون ۱۹۴۶ء کو ریاست بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ احمدیہ بھوپال کے صدر کے دوگانہ عہدوں پر فائز ہوکر حضرت والا بھوپال کے مقیم بن گئے۔

نواب صاحب کی قدردانی

یہاں حضرت والا کو وسیع اختیارات، ایک ہزار ماہوار کا مشاہرہ سرکاری رہائش اور ہر طرح کا اعزاز واکرام حاصل رہا، حضرت والاؒ نے بارہا فرمایا کہ قیام بھوپال کے تین سال میری زندگی کا بہت ہی پُرسکون زمانہ گذرا ـــــ نواب صاحب کی قدردانی میل ملاپ ہی میں نہیں بلکہ سرکاری کارروائیوں میں بھی بہت ہی نمایاں رہی، ان کی قدرشناسی کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت والا نے ایک سرکاری مثل (فائل) احقر کو دکھائی تھی جس میں حضرت نے کسی بات کی

منظوری کی سفارش فرمائی تھی اور منظور کرنا نواب صاحب کا اختیار تھا، نواب صاحب نے بجائے صرف ایک لفظ "منظور" کے یہ جملہ لکھ کر دستخط ثبت فرمائے تھے: "حسب سفارش حضرت قاضی صاحب منظور"۔

خاطرداری اور پاسِ مرتبت کی ایک اور مثال دیکھئے کہ ملکہ بھوپال نے ہماری پیرانی صاحبہ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ حضرت والارحنے معذرت کی کہ ہم لوگ پردہ کے زیادہ پابند ہیں اور محل شاہی میں مرد ملازمین اور خدام بھی ہوتے ہیں، حضرت کے اس اعتذار پر ملکہ ممدوحہ نے پردہ کے پورے اہتمام کا وعدہ فرمایا چنانچہ سنا ہے کہ جب پیرانی صاحبہ تشریف لے گئیں تو سارے مرد ملازمین کو نہ صرف زنانہ حصّہ سے بلکہ محل کے کمپونڈ سے باہر کردیا گیا تھا۔

اس واقعہ میں اہل ریاست وامارت کے لئے تو یہ درس ہے کہ وہ اپنی آنی وفانی شوکت کی وجہ سے دین اور بزرگانِ دین کی عظمت کو فراموش نہ کر بیٹھیں اور علمائے کرام کیلئے بھی یہ درس بصیرت ہے کہ وہ استغناء کو اپنا شعار بنائیں اور دینی معاملات میں مداہنت نہ برتیں، اور اللہ کے اس اٹل فیصلہ کو یاد رکھیں کہ

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ	عزّت اللہ، اسکے رسول اور
وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ۔	مومنین ہی کا حصّہ ہے!

عوام کی گرویدگی پہلی مرتبہ جب راقمِ احقر حضرت شیخ کی خدمت میں بھوپال حاضر ہوا تو حضرت کو بھوپال آتے ابھی مشکل سے ڈیڑھ ماہ ہوا تھا، اخبارات میں بڑی بڑی سرخیاں نظر پڑیں کہ "ریاست میں غیر ملکیوں کی در آمد شروع ہوگئی" ــــــ "ملکی افراد کی حق تلفی" وغیرہ ــــ لیکن جب دوسرے سال پھر حاضری کا شرف پایا تو حالت بالکل برعکس دیکھی، پڑھے لکھے اور عوام سب حضرت علامہ کی مرتبت کے قائل اور ان کے تقدس کے معتقد تھے۔ میں نے بعض لوگوں سے پچھلے سال کے اخبارات کا تذکرہ کیا

تو ہر شخص کو نادم پایا، اور کھلے بندوں اس امر کا معترف کہ حضرت علامہ جیسی شخصیت کا قیام بھوپال کے لئے باعث افتخار ہے! ــــــــ ایک مرتبہ ایک تانگہ والے سے یہی ذکر چھیڑا تو اس کا کھرا جواب بے حد پسند آیا، اس نے کہا کہ شور تو بہت اٹھا تھا اور ہم بھی اسی کو ٹھیک سمجھتے تھے مگر جب قاضی صاحب کے چہرہ کو دیکھا اور ان کی تقریریں سنیں تو سارا ہنگامہ ختم ہو گیا وہ تو بڑی بزرگ ہستی ہیں!!

خانقاہ سے ربط بھوپال میں حضرت شاہ ابو احمد مجددیؒ (جو اپنے وقت کے قطب الارشاد تھے) کی خانقاہ قبولیت عام حاصل کئے ہوئے ہے، امراء اور عوام سب ہی اس کو نگاہِ عقیدت سے دیکھتے ہیں اس خانقاہ کی رونق اب حضرت شاہ قدس سرہٗ کے چھوٹے صاحبزادے شاہ محمد یعقوب صاحب سے ہے جو پیر ننھے میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔ ہمارے حضرت والا رحؒ کے بڑے بھائی شاہ ابو حبیب صاحبؒ چونکہ اسی خانقاہ کے بانی سے خلافت رکھتے تھے، اس لئے حضرت والا اور پیر صاحب میں دلی ربط اور ادب واحترام کا تعلق قائم تھا، اور دونوں حضرات کو دیکھا کہ ایک دوسرے کی تکریم میں مسابقت کی سعی فرماتے تھے، حضرتِ والا رحؒ نے ایک مرتبہ شاہ یعقوب صاحب سے فرمایا کہ سلمان میاں پر نظرِ شفقت رکھیں، اس ارشاد کا پیر صاحب نے اس درجہ خیال رکھا کہ وقتاً فوقتاً حضرت والا رحؒ کی قیام گاہ پر تشریف لاکر صاحبزادہ کو نصیحت وارشاد سے فیض یاب فرماتے رہے۔

پاکبازوں اور اللہ والوں کی ملاقاتیں بھی عجیب دیکھیں کہ ان کو دیکھ کر اہلِ جنت کی ملاقاتوں کا ایک تصور نگاہ میں آجاتا اور ناتمام ہونے کے باوجود دل کو شوق وتمنا سے معمور کر جاتا ہے۔

رشد وہدایت کی مساعی دارالقضا اور جامعہ احمدیہ کی اصلاح سے متعلق جو اقدامات حضرت والا رحؒ نے کئے وہ ان کے فرائض

منصبی سے متعلق تھے اور ہمارے موضوع سے راست ان کا کوئی تعلق نہیں، البتہ اس کے علاوہ جو انفاس بابرکات عام رشد وہدایت میں صرف ہوتے رہے ان کا اظہار ضروری ہے۔

حضرت والارحؒ کے افادی معمولات جو بھوپال کی حاضری میں احقر نے دیکھے وہ یہ تھے کہ نمازِ اشراق کے فوراً بعد ناشتہ کر کے دفتر دارالقضاءکے برآمدہ میں تشریف لے آتے یہاں بیس پچیس فیض قرآنی کے طالب جمع رہتے تھے، حضرت والا کے جلوہ فرما ہوتے ہی سب لوگ قرآن پاک کھول کر بیٹھ جاتے اور پھر حضرت علامہ کوئی پون گھنٹہ تک درس قرآن پاک سے مستفید فرماتے تھے، بالعموم بیضاوی شریف حضرت کے سامنے ہوتی تھی، مخاطب چونکہ اہل علم ہوتے تھے اس لئے صرفی ونحوی نکات، بلاغت واعجاز، کے کمالات اور ربطِ آیات ومعانی کی دقیق بحثیں پیش کی جاتی تھیں، کبھی کبھی ذوقی نکات زیادہ تر اپنے شیخ قدس سرہٗ کے بیان فرمودہ اور کچھ اپنی طرف سے بھی بیان فرماتے تھے:

> ان مجلسوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ حضرت والارحؒ کو علومِ قرآنی پر کس درجہ تبحر حاصل تھا[1]۔

تفسیر ختم کر کے اپنے صاحبزادے کو عربی ادب اور بیضاوی شریف سبقاً سبقاً پڑھاتے تھے یہاں حضرت والارحؒ کا معلمانہ امتیاز اور نفسیات تعلیمی سے باخبری کا اندازہ ہوتا تھا۔

اس کے بعد دفتری مصروفیات شروع ہوتیں، جو قبل عصر تک جاری رہتیں عصر اور مغرب کا درمیانی وقت "احسانی مجلس" کے لئے وقف تھا اس وقت حضرت والارحؒ کے مسترشدین اور بعض پیر بھائی جن میں مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی مرحوم اور ماسٹر

---

[1] حضرت والارحؒ کے قرآنی افادات ان کے شاگردِ رشید مولانا اویس نگرامی (شیخ التفسیر دارالعلوم

شفیق احمد صاحب ایم۔ اے (علیگ) خاص تھے؎، روزانہ شریک محفل رہتے تھے۔ اس محفل میں گفتگو کا موضوع تو کوئی خاص نہ ہوتا تھا، بلکہ ضرورت کے مطابق شیخ قدس سرہٗ اپنے ملفوظات سے مستفید فرماتے تھے اور وہ بھی کوئی مستقل تقریر کی صورت میں نہیں بلکہ مجلسی گفتگو کے انداز میں تاکہ دوسروں کو بھی عرض و معروض کا موقعہ مل سکے۔

خوب یاد آیا، ایک صاحب حکیم الامتؒ کے دست گرفتہ، جواں عمر اور ظاہری اعتبار سے خستہ حال بڑے ذوق و شوق سے حاضر ہوتے اور پیکرِ عجز بن کر اس محفل میں بیٹھتے تھے مگر نہ جانے کمالات باطنی کا کیا خزانہ چھپائے ہوئے تھے کہ حضرت والا ان کا بڑا خیال فرماتے تھے، ایک دفعہ تو ان کی طرف محبت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے مسکرا کر فرمایا "مولوی صاحب آپ کا تو ہاتھ چومنے کو جی چاہتا ہے!"

شام کی یہ محفل بڑی دلچسپ اور اثر آفریں ہوتی تھی، اس محفل کے صاحب وجد و حال رکن ماسٹر شفیق احمد صاحب تھے، حضرت والا رحؒ قدس سرہٗ کے ایک ایک جملہ پر مچل جاتے اور کبھی کبھی چیخ تک نکل جاتی تھی حالانکہ حضرت کی گفتگو میں ظاہرہ جوش و خروش کبھی نہ ہوتا تھا البتہ سادگی میں بھی سوز و درد کچھ ایسا ہوتا تھا کہ اہل محفل بے قابو ہو جاتے تھے۔ ـــــــ ایک واقعہ سے اس کا اندازہ ہوگا جواب بھی چشم تصویر میں ایسا حاضر ہے کہ گویا اس کو ماضی سے کوئی تعلق ہی نہیں، ایک روز مولانا اشفاق الرحمٰن مرحوم نے تذکرۃً فرمایا:۔

"ہمارے حضرت (یعنی مرشد تھانوی قدس سرہٗ) کبھی آنکھ میں آنکھ ڈال کر نہیں

ندوہ) جمع فرما رہے تھے جب یہ ذخیرہ اہلِ نظر کے سامنے آئیگا تو دنیا حضرت والا کی قرآنی بصیرت کا اندازہ لگا سکے گی؎ یہ دونوں حضرات حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے مجازین صحبت میں سے تھے مولانا اشفاق الرحمٰن صاحب کو حضرت والا رحؒ نے مدرسۂ امینیہ (دہلی) سے جامعہ احمدیہ (بھوپال) میں معلمِ حدیث کی حیثیت سے لیا تھا اور ماسٹر صاحب غالباً کسی انگریزی ہائی اسکول کے اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر تھے۔

دیکھتے تھے، بلکہ ہمیشہ کَن انکھیوں سے نظر فرمالیتے تھے"۔

اس پر صدر نشین محفل (رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ وجد آفریں اضافہ اپنے دلآویز تبسّم کے ساتھ فرمایا کہ:۔

"مگر اس سے کسی کو محروم نہ فرماتے تھے، چنانچہ میں نے اسی کیفیت کو ایک شعر میں ادا کیا ہے ؎

اس کی دُزدیدہ نگاہی کے نثار"

بس ابھی مصرعۂ اولیٰ ہی ادا ہوا تھا کہ ماسٹر شفیق احمد صاحب نے ایک چیخ لگائی اور زار و قطار رونے لگے، ساری محفل اس کے زیرِ اثر آگئی، حضرت والا رح کی آنکھ سے بھی ایک درِ شہوار ڈھلک کر ضبطِ محبّت کے راز کو فاش کر گیا، اور وہ گردن جھکائے بیٹھ گئے، جب ماسٹر صاحب کے وجد کو ذرا سکون ہوا تو مولانا اشفاق الرحمٰن نے عرض کی کہ حضرت دوسرا مصرعہ تو رہ ہی گیا۔ حضرت والا رح نے فرمایا کہ

"اب تو میں خود ہی بھول گیا، پھر کسی وقت سن لیجیے"۔

حالانکہ اصل مصرعہ تو دوسرا ہی ہے اگر ادا ہو گیا ہوتا نہ معلوم اہلِ جوش کے ہوش کہاں گم ہو جاتے۔ ——— پورا شعر یہ ہے ؎

اس کی دزدیدہ نگاہی کے نثار　　　آج ہی آغاز کا انجام ہے

بہرحال یہ تو ایک دن کی محفل کا ایک واقعہ ہے، ورنہ کوئی مجلس بھی ذوق و محبّت کے اثر و تاثیر سے خالی نہ ہوتی تھی۔

یہ افادی معمولات ہفتہ کے چھ دن یعنی ہفتہ سے جمعرات تک کے تھے، جمعہ کا پروگرام ذرا مختلف تھا، کیونکہ یہ چھٹی کا دن بھی تھا اور عید المومنین بھی! ——— آج درسِ تفسیر بند رہتا تھا، البتہ کچھ تاخیر سے مغلیہ دور کی یادگار جامع موتی مسجد میں رشد و ہدایت کا ایک اجتماع عام ہوتا تھا، میں نے یہاں کے شریک ہونے والوں کی تعداد چالیس پچاس کے

لگ بھگ دیکھی، ممکن ہے بعد میں اور بڑھ گئی ہو، اس میں اعلیٰ عہدہ دار اور عوام یکساں ذوق وعقیدت سے شریک ہوتے تھے۔ حضرت والا ٹھیک نو بجے مسجد پہنچ جاتے اور صحن مسجد کے شرقی شاندار دروازے کے متصل قبلہ رُخ تشریف فرما ہوتے تھے، سب لوگ سامنے باادب بیٹھ جاتے تھے ــــــــــ اس محفل میں حضرت شیخ کسی ایک موضوع پر گفتگو فرماتے اور سب لوگ ہمہ تن گوش گھنٹہ بھر تک ارشاداتِ عالیہ سے فیض یاب ہوتے۔

ع یار ہے گرمِ سخن محفل سراپا گوش ہے

مضامین سب تزکیۂ نفس وتصفیہ قلب ہی سے متعلق ہوتے تھے مگر ان میں عام قصص وروایات نہیں بلکہ قرآن وحدیث اور اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا تذکرہ اور اسی سے استناد ہوتا تھا، درمیان درمیان میں عصری فتنوں اور ان کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کا بڑی قوت سے رد فرماتے تھے، ساتھ ہی اکابرین صوفیاء ــــــ جیسے امام غزالیؒ شیخ اکبرؒ اور مجدد الف ثانیؒ وغیرہ کے دقیق فلسفیانہ مضامین کو مصطلحات سے الگ کرکے اس قدر سلیس اور یقین پرور پیرایہ میں بیان فرماتے تھے کہ بات بلا تکلف سننے والوں کے دل میں اتر جاتی تھی، دورانِ بیان میں کہیں کہیں اپنے شیخ عالی مقامؒ کے کمالِ تحقیق اور فنِ احسان میں ان کی تجدیدی شان کا ذکر بھی آجاتا تھا، مگر اس ادب کے ساتھ کہ کسی بزرگ سے تقابل یا کسی کی تنقیص کا ادنیٰ شائبہ بھی طرزِ بیان میں آنے نہ پاتا تھا ــــــــــ یہ کمالِ احتیاط وہیں دیکھا جاسکتا ہے جہاں مزاج کا اعتدال اور علم ونظر کی وسعت موجود ہو، اور کون انکار کرے گا کہ یہ عطائے ربّانی عام نہیں!!

اس ہفتہ وار "مجلسِ احسانی" کا نفع، اللہ کے فضل وکرم سے گہرا اور عام رہا، بیسیوں غافل چونک گئے بے راہوں نے راستہ پایا، کمزوروں میں چلنے کی سکت پیدا ہوگئی، اور وہ چل پڑے۔ راقم حقیر نے تو جن عہدہ داروں تک کو اپنی پہلی حاضری میں حدود شریعت

سے آزاد دیکھا تھا۔ انہی مجالس کی برکت سے ایک سال بعد ان میں عظیم تغیر پایا کہ ان کے باطن کا انقلاب ان کے چہرے بشرے اور وضع قطع پر پوری طرح اثر انداز تھا، بس یہ فرق ہے صوفیانہ اور مولویانہ طریق اصلاح میں، مولوی ظاہر سے باطن کی طرف جاتا ہے وہ جبر و تکرار سے عادت اور عادت سے طبیعت صالح پیدا کرنا چاہتا ہے اور صوفی دفعۃً باطن میں اتر آتا، فطرت صالحہ پر جو گرد و غبار پڑ گیا ہے اس کو جھاڑ دیتا ہے، انسان کی فطرتِ اصلی اب خود بخود مطالبات شریعت (جو کہ عین فطرت بشری کا مقتضا ہیں[1]) کے لئے تڑپ اٹھتی ہے اور ان کی تکمیل ہی میں اس کو چین و سکون ملتا ہے!! اب خود غور فرمالیجئے کہ اصلاح کی کون سی راہ اقرب اور اس کی کون سی صورت پائدار ہے؟

یہ تو ایک ضروری جملہ معترضہ درمیان میں آگیا، بات یہ ہو رہی تھی کہ ان ہفتہ وار مجالس سے اہل بھوپال کو بڑا نفع پہنچا، راقم آثم کا خیال تو یہ تھا کہ غالباً سلیمانی ارادت رکھنے والوں کی اکثریت بھوپال ہی میں ہوگی، مگر دو چار بار حضرت والارح کی زبانِ مبارک سے یہ جملہ سُن کر اپنا خیال بدلنا پڑا کہ میرے حصّہ میں توحید رآبادی ہی زیادہ ہیں۔"

فیض سُلیمانی کا کرشمہ، یا دارالعلوم تاج المساجد

مرحومہ شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال نے اپنی حیات میں ایک عالیشان جامع مسجد، جو جامع مسجد دہلی سے بھی وسیع و شاندار ہوتی، بنانی شروع کی تھی مگر عمر وفا نہ کر سکی اور بعد والوں نے اس کی تکمیل پر توجہ نہ دی حضرت والارح کی نگاہ میں یہ مسجد تھی اور اس کی معموری کا خیال ذہنِ مبارک میں تھا، قاری عبدالرؤف صاحب بھوپالی ثم مکی نے بتایا کہ ایک مرتبہ جب محکمۂ تعلیم کی طرف سے ایک کمیٹی بلائی گئی اور اس میں یہ مطالبہ اہلِ مدارس سے کیا گیا تھا کہ وہ اپنی تعلیمی ضروریات اور ان سے متعلق رقمی تجاویز پیش کریں تو حضرت والارح نے اس کمیٹی میں شرکت کی غرض سے ایک پرزہ پر چند سطریں لکھ کر قاری صاحب

[1] اس موضوع کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ۔ از شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ۔

موصوف کو جو حضرت کے منشی تھے، دیں کہ ان کی تبییض کر دیں۔ اس میں یہی لکھا تھا کہ تاج المساجد ہمارے سپرد کر دی جائے اور پچیس ہزار روپیہ، گو اس مسجد کی ضروریات کیلئے بہت کم ہے، فی الوقت ہم کو دیا جائے تو ہم اس میں ایک دارالعلوم قائم کر سکیں گے۔ یہ حضرتؒ کی معرفت نگاہی کی گویا کرامت تھی ـــــــ تجویز کمیٹی میں پیش ہوئی مگر نتیجہ برآمد نہیں ہوا، اور بظاہر بات آئی گئی ہو گئی مگر نہیں ـــــــ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید، یہ تجویز تقدیر بن چکی تھی، بھوپال کی ریاست جب ختم ہوئی اور مدارس دینیہ کی امداد بند ہو گئی ـــــــ تو مسلمانوں کو اپنا بار آپ اٹھانا تھا، مدرسوں کو انتشار سے بچانے کے لئے حضرت والا رحمہ نے حفظ و تجوید و قرأت کے تمام مدارس کا مرکز موتی مسجد کو قرار دیا، قاری عبدالرؤف صاحب کو اس تنظیم کا نگراں قرار دیا گیا اور موتی مسجد کے وسیع دالانوں میں زور شور سے کام شروع ہو گیا۔ اعلیٰ مدرسہ کے قیام کے لئے پھر حضرت نے اسی تجویز کو دوبارہ پیش کیا کہ تاج المساجد کو قبضہ میں لے کر یہاں ایک دارالعلوم قائم کر دیا جائے، چنانچہ جامع مسجد میں ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا اور حضرت نے اپنے فاضل اور منتظم شاگرد مولانا عمران خان صاحب ندوی بھوپالی کے ساتھ اس میں شرکت فرمائی، پہلے حضرت نے اس تجویز کی اہمیت کو واضح فرمایا، پھر مولانا عمران خاں صاحب نے اس پر مزید تقریر فرمائی اور ہزاروں روپے فوراً جمع ہو گئے، مولانا عمران خاں صاحب کے حسن تدبیر سے قانونی طور پر تاج المساجد پر قبضہ حاصل ہو گیا اور حضرت والا رحمہ کے ہاتھوں دارالعلوم کی بنیاد پڑ گئی ـــــــ

اس کے کچھ عرصہ کے بعد حضرتِ والا نے تو بھوپال کا قیام ترک فرما دیا مگر حضرت مولانا عمران خاں صاحب کی مستعدی اور اعلیٰ تنظیمی و علمی صلاحیتوں کی برکت سے بہت جلد ایک دارالعلوم بن گیا جو آج تک علمی سیرابی کر رہا ہے، یہ چشمۂ فیض سلیمانی کی کرامت ہے، ـــــــ محترم قاری عبدالرؤف صاحب راقم عاجز سے فرماتے تھے کہ جب حضرت سید صاحب قدس سرہٗ کو اس دارالعلوم کے فروغ کی تفصیل لکھی تو حضرت نے جواب میں یہ سرور افزا جملہ

تحریر فرمایا تھا کہ "جب ریاست پر خزاں آئی تو شاہجہاں بیگم کی تاج المساجد میں بہار آگئی ہے!"

تبلیغی جماعت کی سرپرستی

حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت کا ایک بڑا مرکز بھوپال بھی تھا، اور تبلیغی حضرات کئی وجوہ سے حضرت والارحمہ سے خاص تعلق رکھتے تھے، اس لئے جب تک حضرت بھوپال میں مقیم رہے، تبلیغی کاموں کی گویا سرپرستی فرماتے رہے، اور غالباً حضرت ہی کے ایماء سے مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی بڑی گرم جوشی سے تبلیغی وفود میں حصہ لیتے رہے اور اپنے مواعظ حسنہ کے ذریعہ ریاست کے چپہ چپہ تک اسلام خالص کی دعوت پہنچائی،

ادعائے ملحد کی شکست

حضرت والارحمہ کی سیرت میں یہ بات تو شروع ہی سے نمایاں اور ممتاز رہی ہے کہ ان کا قلم ہر باغیٔ اسلام کے خلاف شمشیر براں کا کام کرتا رہا ہے، دین کے جس پہلو پر بھی دنیا کے کسی گوشے سے کسی نے وار کرنے کی جرأت کی اور شبلوی فوج کے اس سپہ سالار نے بڑھ کر ادعائے باطل کا سر قلم کر دیا۔ اسی جلالت ایمانی کا ایک فاتحانہ مظاہرہ بھوپال کے دوران قیام میں بھی دیکھا گیا۔

شعرائے بھوپال نے ایک محفل شعر و سخن بڑے پیمانہ پر منعقد کی اور اس میں ملحد شاعر جوش ملیح آبادی کو بھی مدعو کیا، بھوپال کی عام دینی فضا میں معلوم یوں ہوتا ہے کہ جوش کی بغاوت منتہا کو پہنچ گئی اس نے نظم کی سحر کاری میں تاریخی مغالطوں سے مدلل کر کے وجود باریٔ تعالیٰ کے عقیدہ کا مذاق اڑایا، اس کی یہ نظم دوسرے روز (۳۱ جنوری ۱۹۴۹ء کو) مقامی اخبار "ندیم" میں چھپی، حضرت والارحمہ کی نظر جب ملحد کے اس مغالطہ آمیز ادعاء پر پڑی تو چل گئے، پیکر جمال پر شان جلال غالب آگئی، خود فرماتے تھے کہ دن تو ضروری مصروفیتوں میں جوں توں گذر گیا، رات آئی اور فرصت ملی تو اس نظم کا کلمہ بہ کلمہ فی البدیہہ جواب لکھ کر ہی بستر پر لیٹ سکے، صبح یہ جوابی نظم اخباروں کے حوالہ کر دی گئی اور دوسرے دن سارے اردو اخبارات نے اس کو پورے آب و تاب سے چھاپا، پھر ہندوستان کے اور جرائد و رسائل نے

بھی اس کو شائع کیا۔

یہ جوابی نظم حسانی شان[1] اور اثر لئے ہوئے ہے، اس میں جوش کے ہر دعوے کا ایک ایک کر کے دندان شکن جواب دیا گیا ہے، اور آخر میں ایک شعر زائد لکھ کر اس کی جہالت پر ضرب کاری لگائی گئی ہے، ایسی ضرب کہ وہ پھر سر نہ اٹھا سکا —— پہلے ادعائے الحاد کو دل پر جبر کر کے سن لیجئے تاکہ پھر نعرۂ حق کی صداقت و قوت کا اندازہ ہو سکے کیا کیا جائے مجبوری ہے کہ اس عالم کون و فساد میں اضداد ہی کو پیشِ نظر لا کر ان کے فرق و امتیاز کو سمجھا جا سکتا ہے، ورنہ نقلِ کفر کس اہلِ ایمان کو گوارا ہو سکتا ہے؟

ہفواتِ جوش

جبکہ بچے خواب کے ہنگام تھے گرمِ خروش
باپ کی صرف ایک "ہوں" نے کر دیا سب کو خموش

"ہوں" بزرگِ خانداں کی آہنی دیوار ہے
ہر فساد و غلغلہ کو ایک "ہوں" درکار ہے

سنتے ہیں انسان کا ہے باپ ربِّ کائنات
اس لئے اے دوست تجھ سے پوچھتا ہوں میں یہ بات

جب ہلاکو نے بہائی تھیں لہو کی ندیاں
کوئی "ہوں" اس وقت کیا گونجی تھی زیرِ آسماں؟

تحفتہً آئے تھے جب مقتول انسانوں کے سر
پھٹ پڑی تھی کیا کوئی "ہوں" خیمۂ چنگیز پر؟

شعلہ ہائے حکم نیرو جب کہ تھے بھڑکے ہوئے
ڈانٹ کی کوئی صدا آئی تھی بالا عرش سے؟

لے اڑا تھا جبکہ راون ایک دیوتا کا "گھر"
کوئی ہوں گرجی تھی کیا اس وقت اوجِ چرخ پر؟

جب بہا تھا کربلا کی خاک پر دریائے خون
دہر پر نازل ہوئی تھی کوئی ہیبت ناک "ہوں"؟

کر رہا تھا زہر جب سقراط کے دل پر اثر
عرش سے اتری تھی "ہوں" کوئی بساطِ فرش پر؟

عیسیٰ مریم کو جب کھینچا گیا تھا دار پر
ہو گئی تھی کیا کسی "ہوں" سے زمیں زیر و زبر؟

---

[1] میرا اشارہ بارگاہ نبوت کے شاعر اعظم حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی طرف ہے جن کے اشعار کو نطق نبوی نے مجاہدوں کے تیروں سے زیادہ موثر قرار دیا تھا۔

آتم نے رکھ دیا تھا بھون کر جب ایک شہر — قلزمِ تنبیہہ میں آئی تھی کیا اسوقت لہر؟
ہستیاں غلطیدہ تھیں جب موت کے گرداب میں — کوئی "ہوں" کڑکی تھی کیا بنگالہ و پنجاب میں؟
جب ہوئے تھے آخری اوتار گاندھی جی ہلاک — آئی تھی کوئی ندائے خشمگین و قہرناک؟

اتنی چپ سادھے ہوتے ہے کس لئے عرشِ بریں
کیوں ہمارا آسمانی باپ "ہوں" کرتا نہیں؟

نعوذ باللہ واستغفر اللہ اس نقلِ کفر پر۔ اب سنیئے نیستان توحید کے نَیہ کی للکار۔

جوابِ عارفِ ندویؒ

باپ کی ہوں سے سنبھل جاتے ہیں فرزندِ سعید — ناخلف جو میں نہیں سنتے ہیں تہدید و وعید
اس جہاں میں جو مصیبت پیش آئی ہے کہیں — وہ بجز تنبیہہ رب العالمین کچھ بھی نہیں
تازیانہ غافلوں کو فتنۂ چنگیز تھا — راہوارِ نظمِ ملت کے لئے مہمیز تھا
نسل سے چنگیز کی سلطانِ دیں پیدا ہوا — ظلمتِ تاتار سے نورِ مبیں پیدا ہوا
ظلمِ نیرو سے کھلیں آنکھیں عوامِ روم کی — ہل گئی بنیاد اس کی عظمتِ موہوم کی
راونِ بدکیش ظلم و جور کا فرماں روا — ہند کے دیوتا کا "جو گوہر" اڑا کر لے گیا
اس سے جوہر کھل گیا سیتا کے پاک اخلاق کا — رام کی عزمِ بلند و شہرۂ آفاق کا
کربلا کی خاک سے اُمڈا تھا جو سیلِ بلا — ظلم پیشہ بادشاہوں کو بہا کر لے گیا
جو پیالہ زہر کا سقراط پی کر مر گیا — عقل کے وہ تا ابد جینے کا ساماں کر گیا
عیسئِ مریم کی مظلومی کا یہ اعجاز دیکھ — روم کے ظالم ہوئے یوں حق سے سرافراز دیکھ
آٹم بم سے ہوا جو شہر کل ویران دیکھ — چین کی آہوں کا شرارہ اندروں جاپان دیکھ

خرمنِ پنجاب و بنگالہ پہ جو بجلی گری — اس سے جل کر خاک ہے سامانِ فرقہ پروری
کشتۂ بیدادِ گاندھی کے بدن کا سرد خون — ہے زبانِ فطرتِ خاموش کی خاموش "ہوں"
جاگ اٹھی اس "ہوں" کے پیہم شور سے خوابیدہ روح — رو پڑی چشمِ ستمگر ہنس پڑی غمدیدہ روح

بے بصر کو کیا خبر! ہوتا رہا ہے بار بار!
"تیرگی" سے "نور"، "شر" سے "خیر" یونہی آشکار!

ــــــــــ ندیم بابت ۲ر فروری ۱۹۴۹ء

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔

بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں اور حق باطل کو کچل دیتا ہے اور باطل ناگہاں مٹ جاتا ہے۔

چنانچہ پھر حق اور حقانیت کا غلغلہ تو ہر طرف بلند ہوا مگر جوشِ باطل کچھ ایسا ٹھنڈا پڑ گیا کہ اس کا ہونا مشتبہ ہو کر رہ گیا۔

بھوپال سے دل برداشتگی

اگست ۱۹۴۷ء میں ریاست بھوپال ہندوستان میں ضم ہو گئی، اب یہاں کا نظام کار بدلا، افرادِ کار نئے آ گئے۔ جن اعلیٰ کرسیوں پر مسلمان فائز تھے۔ ہندوؤں نے اب ان پر قبضہ جما لیا۔ افراد کی یہ تبدیلی فکر و نظر اور اقدارِ حیات کی تبدیلی تھی۔ حضرتِ والا جیسی غیور ہستی کے لئے ان حالات میں تعاون ناممکن ہو گیا اور وہ دل برداشتہ ہو گئے۔ بدلے ہوئے نظام کی مجبوریات کے تحت دو مہینے طوعاً نہیں بلکہ کرہاً گذار کر اکتوبر ۱۹۴۹ء میں حضرت والا رحؒ نے استعفا پیش کر دیا[1] اور بھوپال کے عہدہ اور قیام کو ترک کر کے عازمِ حج ہو گئے۔

حضرت والا رحؒ کے ترکِ قیام سے اہلِ بھوپال نے بڑی بے سہارگی محسوس کی، اور

---

[1] سلیمان نمبر معارف ص۲۹۔

بہت سوں نے ترک وطن کا ارادہ کر لیا۔ خود پیر صاحب (شاہ محمد یعقوب مجددی مدظلہ) بھی ہجرت کی سوچنے لگے تھے مگر جب حضرت والا کے سامنے یہ خیال ظاہر فرمایا تو حضرت کی رائے اس کے خلاف رہی، حضرت نے فرمایا کہ آپ کا وجود مسلمانانِ بھوپال کے لئے ایک سہارا ہے ــــــــ ایک مخلص بزرگ کے اس مشورے اور بعض اور حالات کے ماتحت پھر پیر صاحب مدظلہ نے ہجرت کا خیال ترک فرما دیا اور آج تک وہیں مقیم ہیں[1]۔

سفرِ حج ، ہجرت پاکستان اور رحلت

۱۹۴۹ء تا ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء

آخری سفرِ حج

۱۳۶۸ھ م ۱۹۴۹ء

یوں تو حضرت والا رح کو دو مرتبہ زیارت حرمین کا شرف مل چکا تھا، مگر یہ دراصل ملّی خدمات اور وفودِ خلافت کے سلسلہ کی حاضریاں تھیں، خیال مدّت سے یہ پرورش پا رہا تھا کہ اللہ کے گھر اور اس کے نبیؐ خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خوابگاہ پر حاضری ہر مقصد و مدعا سے الگ ہو کر محض انھیں کو مطلوب و مقصود بنا کر کم از کم ایک بار تو ضرور ہی ہونی چاہیئے کہ یہ اس ارض پاک کی عظمت و تقدّس کا حق بھی ہے اور خود اپنے جذبۂ عشق و فدویت کی تسکین بھی اسی میں ہے! چنانچہ اسی باطنی تقاضے کے تحت ۱۹۴۸ء میں سفرِ حج کے سارے انتظامات فرما لئے، حضرت کی اس آمادگی کو دیکھ کر ان کے داماد سید حسین صاحب نے بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ اس مقدس سفر کا تہیہ کر لیا، مگر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ روانگی کے عین قریب سید حسین صاحب کے فرزند کو شدید علالت لاحق ہو گئی اس کی وجہ سے نہ وہ جا سکے اور نہ حضرت والا رح کیونکہ حضرت کے ساتھ پیرانی صاحبہ بھی تشریف لے جا رہی تھیں اور ان کو فریضۂ حج کی ادائیگی کی زیادہ فکر تھی کہ اب تک ان کو اس کا موقعہ نہیں ملا تھا، اس التوائے سفر کا حضرت والا رح کو بے حد صدمہ رہا۔ فرماتے تھے کہ میں اس قابل کہاں کہ اس بارگاہ میں بلایا جا سکوں۔

ایک موسم حج گذر گیا، دوسرا آیا، حضرت والا تو کب کے منتظر اور پا بہ رکاب بیٹھے تھے اکتوبر ۱۹۴۹ء م ۱۳۶۸ھ کو اپنی اہلیۂ محترمہ اور صاحبزادہ سلمان سلمہٗ کو ساتھ لے کر بمبئی پہنچ گئے اور یہاں سے خسرو نامی جہاز پر بیت اللہ کی زیارت کو روانہ ہو گئے، عاشقانِ النبی

کا جو قافلہ اس جہاز سے جا رہا تھا حضرت والا رح کو اس کا امیر بنایا گیا ـــــــ قسمت اس قافلہ کی جس کو ایسے صاحب نسبت عاشق ربانی امیر کی سرکردگی نصیب ہوگئی!

مکہ مکرمہ کی حاضری

حضرتِ والا رح مکہ مکرمہ پہنچ گئے، اپنی طرف سے انتظام رباطِ بھوپال میں قیام کا فرمالیا تھا، مگر کریموں کے کریم کی فیاضی دیکھئے کہ شکوہِ سلیمانی کو یہاں بھی دوسروں پہ فائق رکھا۔ شاہ ابن سعود مرحوم نے حضرت کو اپنا مہمانِ خاص بنایا، اور کئی بار اپنے ساتھ کھانے پر مدعو بھی کیا[1] ـــــــ سلیمان ذی شان نے کبھی دنیوی جاہ و حشمت کی طرف نظر نہیں اٹھائی تھی مگر یہ چیزیں خود بخود زیرنگیں آتی گئیں۔

بندہ کا حال اپنے رب کی بارگاہ میں

بہرحال مَلِک کا یہ اعزاز و اکرام ہم اہلِ دنیا کی نظر میں جو وقعت و اہمیت بھی رکھتا ہو مگر جو بندہ کسی مُلک کا نہیں بلکہ ملک الملوک کا مہمان بن کر آیا تھا اور محض اسی بارگاہِ عطا کا بھکاری بن کر آیا تھا، اس کے لئے یہ باتیں قابل التفات نہیں تھیں۔ وہ پیکرِ عبدیت ہمہ تن متوجہ بحق تھا، دیکھنے والوں نے جو کچھ بیان کیا اور حضرت والا رح سے جو کچھ سنا گیا اس کا حاصل یہ ہے کہ مکۂ مکرمہ پہنچ کر حضرت پر شکستگی ہی شکستگی طاری رہی جو نگاہِ تحقیق میں قرب اور وصول الی اللہ کی قریب ترین راہ ہے[2]۔ نہ کھانے میں دل لگتا تھا نہ پہننے

---

[1] سلیمان نمبر معارف ص۳۷، [2] سلسلۂ رفاعیہ کے بانی حضرت سید احمد کبیر قدس سرہٗ کا ارشاد ہے:

سلکت کل الطرق الموصلة فما رأيتُ اقرب ولا اسهل ولا اصلح من الافتقار والذل والانكسار۔

ان ساری راہوں پر میں چلا جو خدا تک پہنچاتی ہیں مگر سب سے قریب آسان اور مناسب ترین راہ مجھے محتاجی، نیازمندی اور شکستگی کے علاوہ کوئی نظر نہیں آئی۔ (ملاحظہ ہو مقالات احسانی از مولانا گیلانی رح بحوالۂ شذور)۔

اوڑھنے کو جی چاہتا تھا، طبیعت کی ساری نفاست اور مزاج کی ساری نزاکت معلوم ہوتا تھا کہ کبھی کی رخصت ہو چکی ہے، سر پر دوپلی ٹوپی، کبھی کرتہ پاجامہ، کبھی تہمد اور کرتہ، برہنہ پا حرم پاک میں نکل آتے اور اسی وارفتگی کے ساتھ طواف کرتے، یا صحنِ حرم میں نماز پڑھتے یا پھر خانۂ کعبہ پر ٹکٹکی جمائے بیٹھے نظر آتے، وہ گرد و اطراف سے بے خبر، خیالِ غیر سے پاک کبھی ساکت و صامت اور کبھی گریاں و بریاں دکھائی دیتے تھے، محویت کا ایک عالم تھا اور فنائیت کی ایک شان!

پروفیسر عبدالمنان بیدل (سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی) کی عینی شہادت سنیئے:

"کئی بار صحنِ حرم میں مشغولِ نماز یا محوِ دیدار کعبہ نظر آئے، دو ایک بار سعی کرتے کوہِ صفا پر دعا مانگتے اور آنسو بہاتے ہوئے بھی دیکھا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آنکھ والوں کو یہ بھی کہتے سنا کہ

"ایمان و احتساب کی جلوہ ریزیاں، ان کی ہر نقل و حرکت سے ظاہر ہیں"۔[1]

اس دوران میں حضرت والا کے لئے التفات غیر نہایت ہی شاق تھا، اگر کوئی ان کو اپنی طرف متوجہ کرنا بھی چاہتا تو وہ خود اس کی توجہ کو اپنے مرکز توجہ کی طرف پھیر دیتے تھے، چنانچہ اس وقت کے پاکستانی وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین صاحب نے (جو پاکستانی وفد لے کر اسی سال موسم حج میں وہاں حاضر تھے) حضرت سے مل کر حکومتِ پاکستان کی دعوت کی تجدید کرنی چاہی تو حضرت والا نے اس کا جواب دیئے بغیر خود ان کے ذہن کو اس مقام کی برکات اور ان برکات کے حصول کی طرف پھیر دیا، اور خواجہ صاحب کو خاموش ہونا پڑا۔ اسی طرح معتقدین اور مسترشدین کے خطوط بھی وہاں برابر پہنچتے رہے لیکن وہ کسی کا جواب نہ دے سکے، حالت کچھ ایسی تھی کہ قلم کا دھنی آج دو حرف لکھنے سے بھی خود کو عاجز پا رہا تھا!!

---

[1] سلیمان نمبر معارف ص ۳۴۵۔ [2] معارف بابتہ ماہ مئی ۱۹۵۶ء

چنانچہ مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے عمِ محترم کو جن سے اپنا کوئی حال نہ چھپاتے تھے تحریر فرماتے ہیں:

"اس دفعہ طبیعت کا رنگ یہ رہا کہ قلم چھونے کو جی نہیں چاہا، کہیں خط نہیں لکھا، کوئی روزنامچہ بھی نہیں لکھا، غرض ایک صفحہ کا بھی تحریری سامان اس سفر میں ہاتھ نہیں آیا۔" [1]

یہ بھی ارشاد فرماتے تھے کہ "دُعا تو سب کے لئے دل سے کی مگر ہاتھ میں قلم پکڑنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا" چنانچہ پھر ہندوستان پہنچ کر سب خطوط کے جوابات عطا فرمائے۔

ایک نجدی عالم کا اقرار تصوف

یہ بات احقر نے خود حضرت مرشدی نور اللہ مرقدہٗ سے سنی کہ ایک روز وہ صحنِ حرم میں بیٹھے ذکر میں مشغول تھے اور ہاتھ میں تسبیح بھی تھی، کہ ایک نجدی عالم نے "السّلام علیکم" کہہ کر حضرت کو محویتِ حق سے نکالا اور اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ عالم حضرت والا رحؒ کی علمی عظمت کے قائل تھے، انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ اے شیخ! میں نے سنا ہے کہ آج کل آپ تصوّف کا شغل رکھتے ہیں؟ ــــــ حضرت والا رحؒ نے اقرار فرمایا اور تعجب کی وجہ پوچھی، عرب عالم نے کہا یہ تو بدعت ہے! حضرت والا رحؒ نے ان کو بٹھا لیا اور آدھے گھنٹے تک حقیقت تصوّف پر قرآن وحدیث کی روشنی میں ایسی مدلل تقریر فرمائی کہ اس کو سُن کر مخاطب عالم نے اعتراف فرمایا کہ اگر اسی کا نام تصوف ہے تو اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔

میں نے حضرت سے اس تقریر کی تفصیل پوچھی تو ارشاد فرمایا کہ مجھے خود حیرت ہے کہ بلا تکلف وہ آیات واحادیث جن میں رذائلِ اخلاق کی مذمت اور ان پر وعید اور فضائلِ اخلاق کی تاکید اور ان پر انعام وارد ہے مسلسل زبان پر آتی چلی گئیں اور میں نے مختصر تشریح کے ساتھ ان کو پیش کر دیا، اور پھر حصول تقویٰ واحسان کی ترغیب اور اس کے ثمرات جو قرآنِ پاک اور اقوالِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں آئے ہیں

---

[1] معارف بابتہ ماہ مئی ۱۹۵۶ء۔

وہ سنا دیئے۔ یہ محض اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل وکرم تھا کہ اس نے سینہ کھول دیا اور زبان رواں کر دی!

غزلِ عارفانہ غرض اب کسی کو کیا معلوم کہ عبد اور معبود میں کیا علاقہ رہا۔ کتنے حجابات اٹھے، تجلیاتِ جلالی کے کیسے کیسے مشاہدے ہوئے، مگر ہاں اتنی بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ مانگنے والے کو بہت کچھ نوازا گیا اور رونے والے کو ہنسا کر بارگاہِ عطا سے رخصت کیا گیا، اس کا ثبوت حضرت والا رح کے وہ اشعار ہیں جو اس ارضِ مقدس پر شوق وذوق کی فراوانی میں زبان سے نکل گئے تھے، یہ غزل حضرت کی بیاض میں جس عنوان وانداز سے لکھی ہے ذیل میں درج ہے:

بوقت حاضری مکہ مکرمہ

ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ۔ مناسک حج

دیدۂ دل اگر ہو باز، راز رہے نہ راز میں — جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینۂ مجاز میں

انکے کرم کے ہم نثار، انکی عطا کا کیا شمار — دیدیا عاصیوں کو بار، اپنے حریم ناز میں

حبش وتتار وہند وشام، سرخ رخ وسیاہ فام — عشق نوازِ ہر مقام، آئے ہیں سب حجاز میں

عرش سے یام تک کہاں وسعتِ دستِ انس وجاں — شانِ کرم ہوئی عیاں، ہو کے نہاں مجاز میں

سنگِ سیاہ رحجر تھا، دست مصافحہ[1] بنا ق — اب نہ رہا وہ راز میں، وہ جو چھپا تھا راز میں

روز نیا نیا مقام، صبح کہیں کہیں ہے شام — عشق کی منزلیں تمام، راہِ خم ودراز میں

دل کو نصیب ہو گداز، جاں کو عطا ہو سوز وساز — ہے یہ دعا بصد نیاز، ورگہِ بے نیاز میں

دل جو ملا سیاہ کار، آنکھ عطا ہوا اشکبار
دھوئے جو دل کو بار بار، خلوت خاص راز میں

---

[1] الحجر یمین اللہ یصافح بھا المؤمنین۔ (الحدیث)

علمائے حجاز سے ایک استفتاء

سب جانتے ہیں کہ برسوں سے مکہ معظمہ میں آلۂ مکبر الصوت پر نماز ہوتی ہے ہمارے حضرت والا رح نے علم و بصیرت کی روشنی میں آلۂ مکبر الصوت پر نماز کے جواز کا فتوےٰ اس وقت دیا تھا جب کہ ہندوستان کا کوئی مشہور عالم اس کا قائل نہ تھا، مگر حضرت والا رح جانتے تھے کہ علماء حجاز جو اس کے جواز کے قائل ہیں وہ کچھ زیادہ مستحکم دینی بنیاد پر نہیں بلکہ اس میں عصری تقاضے اور دباؤ کی آمیزش ہے، مرکز اسلام میں فقہی امور میں یہ سطحیت حضرت والا رح کے لئے تکلیف دہ تھی چنانچہ اس صورت حال پر متنبہ اور اس کی اصلاح کا حکیمانہ طرز یہ اختیار فرمایا گیا کہ خود حضرت والا رح نے آلۂ مکبر الصوت پر نماز کی ادائی سے متعلق ایک استفتاء مرتب فرما کر علماء حجاز سے اس پر فتوےٰ طلب فرمایا۔ فتوے جواز کے آئے۔ مگر دلائل حضرت کے گمان کے مطابق نہایت ناقص تھے، فرماتے تھے کہ بعضوں نے اس کے استعمال کو نماز میں عینک کے استعمال پر محمول کر کے انہی دلائل سے جواز کا فتویٰ دیا۔

غرض اب حضرت والا رح چونکہ خود مستفتی تھے، اس لئے ان کا فتویٰ لکھنا تو مناسب نہ تھا اس لئے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی[1] سے فرمایا کہ وہ جواب تحریر فرمائیں۔ مولانا نے جواز کا فتوےٰ اس کے فقہی دلائل کے ساتھ لکھا، حضرت والا رح نے اس کو علمائے حجاز کی خدمت میں پیش کر کے ان سے ارشاد فرمایا کہ آپ حضرات مرکز اسلام میں رہتے ہیں، عالم اسلام کی نظریں آپ کے عمل پر لگی رہتی ہیں، اس لئے فقہی مسائل میں آپ حضرات کو زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی جب حج سے واپس تشریف لائے اور میں بعض احباب کے

---

[1] مولانا مدظلہٗ پاکستانی وفد کے رکن رکین کی حیثیت سے خواجہ شہاب الدین صاحب کے ساتھ اس حج میں شریک تھے۔

ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو مولانا نے یہ واقعہ ان الفاظ کے ساتھ سنایا کہ حضرت سید صاحب نے تو علمائے حجاز میں تہلکہ مچادیا۔

دو تقریریں مکہ معظمہ پہنچ کر حضرت والا رح پر جو فنائیت اور عبدیت طاری تھی اس کا ہلکا سا نقشہ پیش کیا جا چکا ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف بالکل یکسو ہو کر لوگوں سے میل ملاپ اور تحریر و تقریر سے گریزاں تھے، مگر اس حال کا صحیح اندازہ دوسروں کو کہاں ہو سکتا تھا اور جس عظمت و شہرت کے مالک حضرت والا رح تھے، اس کے ہوتے ہوئے لوگ ان کو کیسے چھوڑ سکتے تھے، خواہی نخواہی دو بار اہلِ عرب اور عام مسلمانانِ عالم کو مخاطب کرنا پڑا۔ موقف اس قدر نازک تھا کہ قومی اعتبار سے حضرت ہندوستانی تھے اور ہمدردیاں فطرۃً پاکستان کے ساتھ تھیں، ادھر پاکستان کی دعوت سال بھر سے ان کے زیرِ غور تھی اور ہندوستان اس سے بے خبر نہ تھا پھر جن اجتماعات کو مخاطب کرنا پڑا۔ ان میں دونوں ملکوں کے وفود کے ارکان موجود تھے اور تقریروں کا موضوع واعظانہ نہیں، بلکہ مسلمانانِ عالم کی فلاح و بہبود سے متعلق تھا، مگر حضرت والاؒ کے لئے یہ کوئی پہلا مرحلہ نہیں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ سیاسی مراحل پر وہ پوری جرأت وصداقت اور حزم و احتیاط کے ساتھ کامیاب گذر چکے تھے، ان کا کمال یہ تھا کہ بات نہایت مختصر لفظوں میں مگر بہت گہری کہہ جاتے تھے، اور پیرایۂ بیان اس قدر محتاط اور محفوظ ہوتا تھا کہ مخالف گھات لگا کر بھی گرفت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ یہاں بھی وہی وصف نمایاں رہا۔ دو تقریریں فرمائیں اور بلادِ اسلامیہ کے اتحاد کی ضرورت و اہمیت اور اس کی ضرورتوں کو پوری قوت سے واضح فرمایا اور نوزائیدہ مملکت پاکستان سے خصوصی ہمدردی بھی ظاہر فرمائی، مگر طرزِ خطاب کچھ ایسا رہا کہ پاکستانی اور ہندوستانی سرکاری خبر رسانوں (رپورٹروں) نے اپنی اپنی حکومتوں کو جو رپورٹیں بھیجیں وہ سنا ہے کہ دونوں جانب نہایت تشفی بخش تھیں ——— یہ تقریریں اتنی موثر اور فکر افزا تھیں

کہ علما اور اہلِ سیاست سب ہی نے سیّد الملّت علیہ الرحمۃ کی پختہ فکری اور فراستِ ایمانی کی داد دی۔ خود عزّت مآب خواجہ شہاب الدین جو پہلے ہی سے حضرت والا رح کو علامہ اور متقی کے علاوہ مفکرِ اسلام بھی مانتے تھے، ان تقریروں کو سُن کر فکرِ سلیمانی کے اور زیادہ معترف بن گئے۔

مدینہ منوّرہ کی حاضری اور تغیّرِ حال

بہرحال بارگاہ جلال کے فیضان سے سینہ کو شفاف فانوس اور دل کو تابندہ چراغ بنائے حضرت والا رح اب تجلّیات جمال کے مرکز یعنی رحمۃٌ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وطن ہجرت اور مدفن اقدس میں آپہنچے، فضا کی تبدیلی سے دفعۃً حالت بھی بدل گئی، دل کا چراغ وہی، محبت کی تو وہی، مگر ماحول کی خنکی نے اس کے کرنوں کی تمازت جذب کر لی، وارفتگی جاتی رہی، پاسِ ادب غالب آیا ———— موقعہ کی نزاکت بھی خود اسی مبارک انقلاب کو چاہتی تھی۔

ع باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

حضرت والا رح خود فرماتے تھے مدینہ طیبّہ پہنچتے ہی طبیعت ایک گونہ سکون پر آگئی خوراک و پوشاک کے ذوق کی بے رغبتی اب باقی نہ رہی، حسبِ معمول صافہ باندھے اور شیروانی پہنے بغیر گھر سے نکلنے کو اب جی نہ چاہتا تھا، آغازِ سفر کے بعد معمول کے مطابق لباس گویا مدینۃ الرسول پہنچ کر ہی پہنا گیا، اور کھانا رغبت سے کھایا گیا۔

لہ مکرمی جناب احمد عبداللہ المسدوسی (لکچرر قانون اردو کالج کراچی و مصنف "مذاہبِ عالم کا معاشری و سیاسی جائزہ") جو خالص سیاسی ذہن و فکر کے مالک ہیں، جب حضرت کا ذکر آتا ہے تو فرماتے ہیں کہ بھئی میں تو سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے اور فضائل و کمالات کے علاوہ ایک گہرا سیاس مانتا ہوں، وہ ایک ایک جملہ میں ایسی گہری بات فرماجاتے تھے کہ عام ذہن اس کے عمق کو پہنچ بھی نہیں سکتا تھا۔

حصولِ تمکین

سکینت کا جو اثر اب تک مرتب ہوا وہ تو مدینہ طیبہ کے عمومی انوار و برکات کا اثر تھا، قلبِ سلیمانی میں جو التہابی کیفیت مدت سے پیدا تھی اور بیت اللہ کی حاضری میں جس کی تپش احتراقی نقطہ کو پہنچ چکی تھی، وہ اب بھی موجود تھی، سید عالی مقام کو جب بارگاہِ نبوی میں حاضری کا شرف ملا تو انھوں نے اپنے جذباتِ محبت کا ہدیہ ان اشعار کی صورت میں بکمالِ ادب پیش کیا۔

آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے — مکّی، مدنی، ہاشمی و مطلبی ہے

پاکیزہ تر از عرش و سما جنت و فردوس — آرامگہِ پاکِ رسولِ عربی ہے[1]

آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست صدا ہو — خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربی ہے

اے زائرِ بیتِ نبوی یاد رہے یہ — بے قاعدہ یاں جنبشِ لب بے ادبی ہے

کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبی کی — محبوبِ خدا ہے وہ جو محبوبِ نبی ہے

اس کے بعد آخری شعر میں اپنے دل کا درد اور اس کی درمانی کی درخواست پیش کر کے زبانِ عشق و ادب کو خاموش کیا گیا ؎

بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابرِ کرم آج
جو آگ مرے سینے میں مدّت سے دبی ہے (مدینہ منورہ محرم ۱۳۶۹ھ)

---

[1] "عرش کو محلِ استقرارِ حق کی وجہ سے فضیلت نہیں ہے کہ بقعۂ شریف سے وہ افضل ہوتا بلکہ اس کو صرف اسی وجہ سے اور اماکن پر فضیلت ہے کہ وہ ایک تجلّی گاہ ہے اور ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون تجلّی گاہ ہوگا۔ پس اس حیثیت کے اثر سے بھی بقعۂ شریف خالی نہ رہا، اس لئے ہر طرح وہ جگہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں سب سے زیادہ اشرف ہوئی کیونکہ تجلیاتِ حق بواسطۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ تمام اماکن سے زیادہ فائض ہوتے ہیں، بہرحال اس مسئلہ میں تمام علماء کا اتفاق ہے۔"

(الحبور النور الصدور۔ از حضرت تھانویؒ)

عاشق صادق وجاں نثار جس نے اپنی ساری صلاحیتیں سیرتِ نبوی کی خدمت اس کے احیاء اور اظہار میں صرف فرمادیں اور محبوبؐ ایسا کریم کہ جس کے نطقِ مبارک سے لا (نہیں) کا کلمہ کسی کان نے کبھی سنا ہی نہیں، آج جب زبانِ درد و محبت سے ایک التجا نکلی، تو اس کی ناکامی کا تصور بھی آخر کس بنیاد پر کیا جاسکتا ہے؛ مداح نبوی کی اور استدعاء نے قبولیت کا شرف پایا، ـــــــ رات آئی تو حضرت والارح کے لئے مطلع انوار اور مشرقِ سعادت بن کر!! سوتے تھے کہ خواب میں سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے، دفورِ شوق میں اپنے آپ کو قدم رسالت پر ڈال دیا، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شیدائی کو شفقت سے اٹھالیا، پھر ایک طویل دعا پڑھ کر سینہ پر دم کر دی۔ یہ گویا نفخ سکینت تھا، طریق نبوت کے سالک کی تمکین کا سامان کیا گیا اور یوں عاشقِ صادق کو منھ مانگی مراد عطا کی گئی۔

حضرتِ والارح کی آنکھ جب کھلی تو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلماتِ دعا ذہن میں تازہ اور محفوظ تھے۔ حضرت نے اپنی اہلیۂ محترمہ کو بلاکر وہی دعا ان پر دم کر دی اس کے بعد وہ دعا ذہن سے محو ہوگئی، مقصود غالباً یہی تھا کہ جو برکت ذاتِ رسالتؐ سے راست حضرت والارح کو میسر آئی تھی، حضرت کے واسطہ سے ان کی رفیقۂ حیات بھی اُس سے بہرہ یاب ہوجائیں، یہ کمال دلنوازی کا برتاؤ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی کے ساتھ ظہور میں آیا۔

اس واقعہ کے بعد ہی حضرت والارح کو تمکین کامل و عبدیتِ مطلقہ نصیب ہوگئی۔ اب ان کو ایسا نزولِ تام حاصل ہوگیا کہ اس کی وجہ سے ان کی باطنی عظمت اور نسبت مع اللہ کی قوت کو پہچاننا عام لوگوں ہی کے لئے نہیں بلکہ اچھے اچھے سالکین کے لئے بھی دشوار ہوگیا، ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ میں نے حضرت سید صاحب کو جونپور میں بہت قریب سے دیکھنے کا شرف پایا۔ بڑی پُرسوز گفتگو

فرماتے تھے مگر کراچی کی صحبتوں میں اس سوز و گداز کی جگہ سکینت ہی سکینت طاری نظر آئی، پیچیدہ سے پیچیدہ سوالات اور روحانی اشکالات میں نے پیش کئے مگر فوراً ایک جملہ میں اس کا تسلی بخش جواب مل گیا۔ اب حضرت کے مرتبے اور مقام کا پہچاننا بہت مشکل ہوگیا تھا" ______ اسی طرح مولانا محمود الغنی صاحب سہارنپوری جو قدیم خلفائے اشرفیہ میں سے ہیں حضرتِ والا رح کے متعلق ان کی حیات میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ______ "لوگ مولانا.......... (ایک جلیل القدر خلیفۂ حضرت تھانوی رح) کو تو پھر بھی پہچان لیں گے مگر حضرت سید صاحب کے کمال کو پہچاننا بہت دشوار ہے!" ______ اس کی وجہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی زبانی سنیئے، فرماتے ہیں:۔

"جس کو انبیاء کے ساتھ جس قدر زیادہ تشابہ ہوگا، اسی قدر وہ کامل ہوگا چونکہ یہ حالت بظاہر عوام کی حالت کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہے۔ اسی واسطے عام لوگ محققین کو درویش نہیں سمجھتے، ایسے لوگوں کو اتنا کہتے ہیں کہ صالح اور متقی ہیں۔ باقی درویشی تو چیز ہی دوسری ہے، درویش اسکو کہتے ہیں کہ ہُوحق بہت کرے، کسی کو ایک نظر میں گرادے، کسی کو پچھاڑ دے، کسی پر چھُو کر دیا اور وہ اچھا ہوگیا، حالانکہ گرا دینا اور پچھاڑ دینا تو پہلوان بھی کر سکتا ہے، درویشی اور بزرگی میں اس کو کیا دخل ہے، یہ تصرف کہلاتا ہے اور تصرفات واللہ کمال نہیں ______ کمال تو یہ ہے کہ خدا کا بندہ بن جائے۔ ولایت شعبہ نبوت کا ہے پس ولی جتنا نبی کے مشابہ ہوگا، اتنا ہی زیادہ کامل ہوگا۔[1]"

---

[1] ملاحظہ ہو وعظ الغضب ۱۲۔

حضرت کا اعتراف

یہ تو ایک ضروری جملہ معترضہ درمیان میں آگیا، ورنہ بات یہ کہی جارہی تھی کہ سید السالکین کو دربارِ نبویؐ سے بامراد کرکے لوٹایا گیا، اس کی طرف اشارہ خود حضرت والاؒ کے ایک ملفوظ عرفانی سے بھی ملتا ہے جس کو پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ نے نقل کیا ہے۔ بیدلؔ نے مدینہ منوّرہ میں حضرت سے اپنے متعلق عرض کی کہ ابھی تو "صورت ہی صرف بدلی ہے" یعنی باطن میں کوئی تغیّر پیدا نہیں ہوا، اس پر وہ لکھتے ہیں:-

"مسکرا کر فرمانے لگے، انشاء اللہ اس دربار سے جاتے جاتے سیرت بھی بدل جائے گی۔ اس جملہ کے ساتھ ہی ساتھ ان کی آنکھوں سے چند قطرے بھی نکل پڑے ____ کہنے لگے بیدلؔ صاحب کیا عرض کروں، جلال و جبروت والے کے دربار میں بھی بہت کچھ ملتا ہے، مگر رافت و رحمت والے کے دربار میں سب سے بڑی چیز یعنی محبت ملتی ہے، آنا شرط ہے آئے نہیں کہ ہدیۂ محبت ملا نہیں، ہاں ایک بات اور عرض کروں، کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کو یہاں آئے بغیر بھی بہت کچھ دے دیا جاتا ہے، اللہ رے ان کی قسمت[1]"

اس بلیغ ملفوظ کے علاوہ خود وہ نعت جس پر حضرت کے عارفانہ تغزل کا خاتمہ ہے اور جو زیارتِ حرمین سے واپسی میں کہی گئی، اس کا مطلع حضرت کی بامراد مراجعت کا پتہ دیتا ہے، فرماتے ہیں ؎

عشقِ نبویؐ دردِ معاصی کی دوا ہے
ظلمت کدۂ دہر میں وہ شمعِ ہُدا ہے

پہلا مصرعہ صاف طور پر اپنے حال کی ترجمانی کر رہا ہے!!

---

[1] سلیمان نمبر معارف صفحہ ۳۴۶، مضمون سفر حجاز۔

واپسی زیارتِ حرمین سے فیض یاب و سرشار ہو کر حضرت والا ۲ جدہ سے ۱۵ ار دسمبر ۱۹۴۹ء کو اسی جہاز خسرو پر بمبئی کے قصد سے سوار ہو گئے، اس سفر میں حضرت نے بہ اصرار اپنے آپ کو قافلہ سالاری سے الگ رکھا، اور ان کے حسبِ ارشاد پروفیسر بیدکل کو سالار مقرر کیا۔[1]

حضرتِ والا دورانِ سفر ہی شدید بخار میں مبتلا ہو گئے اور بمبئی پہنچ کر بالکل صاحبِ فراش ہو گئے یہاں اعظم گڑھ کے سیٹھ عبدالعزیز انصاری نے حضرت کی تیمارداری اور مہمانی کی سعادت حاصل کی، جب شفایاب ہوئے تو جنوری ۱۹۵۰ء کے وسط میں پھر بھوپال تشریف لے گئے، کیونکہ گو سرکاری تعلق اب وہاں باقی نہ تھا، مگر سامان و اسباب اب تک وہیں پڑا ہوا تھا یہاں اپریل تک قیام فرمایا، اور پھر اہل و عیال اور اسباب کو لے کر اپنے داماد سید حسین صاحب کے ہاں کانپور منتقل ہو گئے۔

---

[1] سلیمان نمبر معارف ص ۳۴۹

قیامِ پاکستان کے تین (۳) سال پانچ (۵) ماہ

(جون ۱۹۵۰ء تا نومبر ۱۹۵۳ء)

آنے کی تمہید ۱۹۴۲ء ۱۹۴۳ء کی بات ہے، مسلم لیگ ترقی کے آخری مراحل طے کر رہی ہے، مگر حصولِ مقصد میں کھٹکا اب بھی لگا ہوا ہے کیونکہ عام مسلمانوں کا دماغ توان کے ساتھ ہے مگر دل اب بھی دینی اعتبار سے علماء کی عظمت کا قائل اور علماء کی اکثریت ان کے مخالف محاذ پر مورچہ جمائے ہوتے ہے، کبھی مقابلہ پڑ جائے تو لیگی فوج کا "میمنہ اور میسرہ" جتنا بھی قوی سہی مگر "قلب" نہایت کمزور ہے۔ لیگی ہائی کمان نے اس ضرورت سے جب غیر جانب دار علمائے کرام کی صف کا جائزہ لیا تو لامحالہ ان کی نظر معرکہ خلافت کے کامیاب جرنیل علامہ سید سلیمان ندویؒ کی جامع شخصیت پر مرکوز ہوگئی ——— مگر ۱۹۲۶ء کے بعد سے وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہوچکے تھے چنانچہ لیگ کے بہی خواہ ان کو دوبارہ اس میدان میں نہ لا سکے۔ یہاں تک کہ خالص اہلِ سیاست کی ناکامی کے بعد مولانا ظفر احمد عثمانی نے بھی جب مجبور کرنا چاہا تو علامہ نے ان کو اس جواب سے لاجواب کر دیا کہ:

> "آپ ہی کے بزرگ (یعنی حضرت مولانا تھانویؒ) مجھ کو جلوت سے خلوت میں لے آئے اور اب آپ چاہتے ہیں کہ مجھے اس خلوت سے نکال کر پھر جلوت میں لے آئیں"۔

غرض یہاں سے مایوس ہو کر پھر اربابِ فکر کی نظریں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ پر پڑیں اور کچھ تامل کے بعد وہ ان کو لیگ کی باقاعدہ شمولیت اور "جمعیۃ علمائے اسلام" کی تشکیل پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ مولانا کی آمد سے "جمعیۃ علمائے ہند" کے مدمقابل ایک وزنی جماعت لیگ میں اُبھر آئی، اور اب لیگی فوج کو کسی صورت سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا، چنانچہ

میدان اس کے ہاتھ آکر رہا،

پاکستان جب بن چکا تو مولانا عثمانی رح صوبہ بنگال کی طرف سے مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور مولانا اور ان کے رفقائے کار کی کوشش سے مارچ ۱۹۴۹ء میں وہ "قرارداد مقاصد" پاس ہوئی جس کی رو سے دستور پاکستان کا کتاب وسنت کے چوکھٹے میں لانا ضروری ہوگیا، لیکن یہ کام نہ تنہا اسمبلی کے افراد سے ہوسکتا تھا، نہ محض علمائے کرام ہی اس کو انجام دے سکتے تھے، اب تو ان ماہرینِ قانون کی ضرورت تھی جو جدید دستور و قانون سے بھی باخبر ہوں اور کتاب وسنت کے بھی پختہ عالم ——— اس ضرورت کے تحت طے یہ پایا کہ پانچ علماء پر مشتمل ایک بورڈ قائم کیا جائے جو اسمبلی کے پاس شدہ دستوری سفارشات کو اصول شرع پر پرکھ کر ان کو کتاب وسنت کے مطابق کرسکے، اس بورڈ کی رہنمائی کے لئے ارباب حکومت میں سے وزیراعظم لیاقت علی خان مرحوم اور وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کی نظریں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کو مرکز نگاہ بنائے ہوئے تھیں ادھر جب اس معاملہ میں انہوں نے مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے مشاورت کی تو مولانا نے بکمال بے نفسی خود اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ طبقۂ علماء میں صرف مولانا ندوی رح ہی کی شخصیت موزوں ترین ہوسکتی ہے کیونکہ وہ جدید و قدیم کا سنگم ہیں، اس طرح اہل حکومت اور مولانا عثمانی رح کے اتفاق رائے سے حضرت علامہ ندوی رح کا اسم گرامی اس مجوزہ بورڈ کی صدارت کے لئے طے ہوگیا، یہ جو کچھ ہوا علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے بلا ایما اور محض بامید منظوری تھا، اس بورڈ کے اور ارکان ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی پروفیسر عبدالخالق مرحوم اور مجتہد جعفر حسن (نمائندہ اہل تشیع) منتخب ہوتے ڈاکٹر صاحب پیرس سے آگئے، باقی حضرات تو پاکستان ہی میں تھے۔ اگست ۱۹۴۹ء سے بورڈ نے صدرِ مجوزہ کی آمد کی توقع پر کام شروع کر دیا۔

حضرت علامہ قدس سرہ کے نام حکومت پاکستان کی طرف سے دعوت نامہ جاری

ہوا، اس وقت حضرت والا قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز تھے، اور ہجرت پاکستان کا کوئی خیال ان کے ذہن میں نہ تھا، کیوں؟ اس لئے کہ دار المصنفین وہاں تھا، محبوب استاذ کی دائمی خوابگاہ بھی وہیں تھی، ارض پاک بطحا کے بعد جو زمین اپنی خوابگاہ کے لیے محبوب تھی وہ بھی تو اسی کے قریب صحن مسجد کے سامنے درخت کے نیچے والی تھی۔ اس قلبی انجذاب کے علاوہ عقلی طور پر بھی ترکِ قیام کچھ مناسب نہ تھا، پریشان و لاچار بھارتی مسلمانوں کی ڈھارس جن دو چار عظیم شخصیتوں سے بندھی ہوئی تھی، ان میں سے ایک حضرت علامہ کی ذاتِ اقدس بھی تھی اور وہ پورے عزم و استقامت سے اپنی ہمت، اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت میں صرف بھی فرما رہے تھے، قلمی جہاد کی شہادت تو معارف کے شذرات دیں گے، باطنی ہمت جو کچھ صرف فرماتے رہے اس کو جاننے والے ہی جانتے ہیں!! اس سب کے علاوہ خود حکومتِ ہند بھی ان کے وزن اور اہمیت سے باخبر تھی اور کسی قیمت پر اس گرانمایہ شخصیت کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نہ تھی اسی طرح حضرت والا کے مخلص احباب بھی ان کے قیام ہندوستان پر مصر تھے۔

غرض ان حالات میں جب حکومتِ پاکستان کا دعوت نامہ پہنچا اور علمائے کرام کے خطوط سے اصرار پر اصرار کیا جانے لگا تو حضرت والا رح ایک کشمکش میں مبتلا ہو گئے چنانچہ راقم حقیر کے ایک عریضہ کے جواب میں یہ تحریر فرمایا تھا:

> "حالت یہ ہے کہ ہر دو جگہ میرے وجود کے لئے احباب مصر ہیں، اپنی حالت یہ ہے کہ عدم صحت اور ضعف قویٰ سے بھی اور طبیعت کے اقتضا سے بھی اختلاف و منازعت سے گھبراتا ہوں[1]۔ (۱۸ جنوری ۱۹۵۰ء)

---

[1] خط کشیدہ جملہ میں بڑی گہرائی ہے اور اس کے منشا کی کچھ وضاحت یہاں ضروری ہے حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ بہ کمالِ فراست اس بات کے قائل تھے کہ پاکستان بن جانے کے بعد اب یہاں کے مسلمانوں میں کوئی طبقاتی یا جماعتی نزاع باقی نہ رہنا چاہیئے وہ اس شعور کی پرورش اور فرائض کو ہر اصلاح (باقی آئندہ صفحہ پر)

یہی بات ان حضرات کو بھی لکھی جو بلانے پر مصر تھے، البتہ حکومت کے دعوت نامے کے جواب میں بورڈ کے کام کی تفصیل اور اپنے اختیارات کا تعین اور تیقن طلب فرمایا حکومت نے پہلو بچا کر صرف مشاہرہ کا لالچ دلانا چاہا کہ ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار مشاہرہ ہوگا۔ اس کے جواب میں حضرت والارحؒ نے صاف طور پر لکھ دیا اور سخت لب و لہجہ میں لکھا کہ مشاہرہ کا تیقن کوئی جاذبیت نہیں رکھتا، حکومت کا مقصد واقعی کام کرنا ہے یا محض نام سے فائدہ اٹھانا؟ اس جواب کے بعد سلسلہ مراسلت بند ہو گیا ــــــ
دن گذرتے چلے گئے، یہاں تک کہ ریاست بھوپال بھی ختم ہو گئی۔ اگست ۱۹۴۹ء میں حضرت والا عازمِ حج ہو گئے۔ ادھر پاکستان میں ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو شیخ الاسلام مولانا عثمانیؒ نے رحلت فرمائی، علماء کا شیرازہ جاہ طلبی کے ہاتھوں بکھر گیا۔ جمعیت علمائے اسلام کی صدارت و نظامت کے مدعی کئی کئی افراد بن گئے ــــــ
۲۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو حضرت والارحؒ حج سے فارغ ہو کر جب ہندوستان پہنچے تو ــــــ مولانا احتشام الحق تھانوی کو نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم نے بھوپال روانہ کیا مولانا نے حضرت والارحؒ کی خدمت میں پہنچ کر پاکستان کے سب احوال سنائے حکومت کی نیک نیتی کا یقین دلایا اور ملک میں حضرت علامہ کی موثر شخصیت کی ضرورت واضح

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) کی بنیاد قرار دیتے تھے جس کے ماتحت مختلف عناصر مملکت ایک دوسرے کو اعضائے جسمانی کی طرح باہم مدد و معاون سمجھیں۔ اسی لئے وہ سیاسی اصلاح میں بھی ہر ایسی کوشش کو جو مصالحت و تعاون کے تیقن کے بجائے مخالفت و تنازع کی بنیاد پر قائم ہو ملک کے استحکام اور قوم کی سالمیت کے منافی تصور فرماتے تھے ــــــ قیام پاکستان کے کچھ ہی عرصہ بعد جماعتِ اسلامی نے چونکہ تنازع کے طریق پر اصلاح کی جد و جہد شروع کر دی تھی جو حضرت والارحؒ کی رائے میں مضر نتائج رکھتی تھی۔ اس لئے اس نوعیت کے کام میں خواہ وہ کسی جماعت کی طرف سے ہو وہ تعاون کے لئے آمادہ نہ تھے۔ غرض اختلاف و منازعت سے حضرت والارحؒ کی مراد یہاں یہی غلط طریقہ کار ہے اور اسی سے دل برداشتگی کا اظہار فرمایا گیا ہے۔

کی، ــــــــــ حق تعالیٰ نے جو فراستِ ایمانی حضرت سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کو عطا فرمائی تھی اسکے پیشِ نظر انہوں نے حتمی وعدہ تو نہیں فرمایا، البتہ عارضی طور پر آنے کا یقین دلایا، مولانا واپس آگئے اور حضرت علامہ کی آمد کا مژدہ سنایا۔

آمد غرض خارجی دباؤ تو بڑھ رہا تھا مگر اس کے علاوہ خود اندرونی تقاضا بھی حضرت والاؒ کو کچھ دن کے لئے پاکستان آنے پر اُبھار رہا تھا حضرت کے بڑے داماد سید ابو عاصم صاحب ایڈوکیٹ ۱۹۴۸ء ہی میں کراچی آچکے تھے، حضرت کو اپنی چہیتی صاحبزادی، جوان دنوں علیل بھی تھیں، اور نواسوں سے ملے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا تھا اور محبتِ پدری جوشِ زن تھی، چنانچہ راقم حقیر کو اپنے اس اشتیاق واضطراب سے مطلع فرماتے ہوئے لکھا تھا:

"ان کے لئے دل بے چین رہتا ہے، کیونکر ان کے پاس پہنچوں؟"

غرض اس جذبہ سے مجبور ہو کر اور اہلِ پاکستان کا خیال فرما کر جون ۱۹۵۰ء میں چند روزہ قیام کی نیت سے صرف چند جوڑے کپڑے اور ایک بستر کے ساتھ حضرتِ والاؒ ہندوستان سے چل نکلے، ساتھ صاحبزادہ سلمان سلمہ بھی تھے جن کو یوں بھی ہمیشہ اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے، حضرت والا رح دہلی سے براہ لاہور ۱۴ جون ۱۹۵۰ء کی صبح کراچی وارد ہوئے اسٹیشن پر بلا کسی اہتمام کے خاصا اژدہام "اہلاً وسہلاً مرحبا" کہنے والوں کا ہوگیا تھا، اس میں عوام سے زیادہ علماء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہی تھے اور ان میں کے بعض تو عزم لئے ہوتے تھے اب سید العلماء کو واپس جانے نہیں دیں گے اور بہت سے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ حضرت والا ہجرت ہی کر کے آئے ہیں۔ یہ عقدہ اس وجہ سے بھی لاینحل رہا کہ پریس والوں کے استفسارات کے جواب سے حضرت نے انکار فرمایا چنانچہ جب موٹر کار پر گھر تشریف لے جارہے تھے تو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب بھی ہم نشین تھے، ڈاکٹر صاحب نے مشورہ دیا کہ پہلے اسمبلی تشریف لے چلیں اور بورڈ کی صدارت کو تحریراً قبول فرما کر پھر

گھر تشریف لے جائیں مگر حضرت والا نے اس کو قبول نہیں فرمایا اور سیدھے اس مکان پر پہنچے جو چند روز ہی پہلے حکومت کی طرف سے ان کے لئے محفوظ کر دیا گیا تھا، اور حفاظت کے خیال سے عاصم صاحب مع اہل وعیال کے اسی میں مقیم تھے ــــــــ

مہمان ذی شان کے لئے یہ جو کچھ اہتمام ہوا تھا وہ اس کے علم واطلاع میں قطعاً نہ تھا مگر قدرت کو جو کچھ منظور تھا اس کا سامان وہی کرتی چلی جا رہی تھی،

مستقل قیام کی صورت

حضرت علامہ جن دنوں کراچی تشریف لائے، وزیر اعظم لیاقت علی خان مرحوم اپنے تاریخی دورہ پر امریکہ گئے ہوئے تھے۔ حضرت والا رح چاہتے تھے کہ پہلے ان سے راست گفتگو ہو جائے تو پھر تعلیمات اسلامی بورڈ میں شرکت یا عدم شرکت کا فیصلہ ہو، اور اگر شرکت ہی کی ٹھہرے تو پھر ہندوستان جا کر اہل وعیال کے ساتھ ہجرت کا عزم کیا جائے ــــــ

اب وزیر اعظم مرحوم کی آمد کا انتظار تھا، پہلے تو ان کی واپسی میں کافی دیر لگی اور جب آئے بھی تو مہینہ بھر تک کسی کی دو رویہ روش کی وجہ سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ اس دوران حضرتِ والا رح کو حالات کے سمجھنے کا کافی موقع مل گیا اور جو کھٹک پیدا تھی اس کا مشاہدہ ہو گیا کہ یہاں مصالحانہ خدمت کے لئے زمین ہموار نہ تھی بلکہ مخالفانہ اور منازعانہ جدوجہد فروغ پا رہی تھی اس کے لئے حضرت والا شروع ہی سے تیار نہ تھے۔ چنانچہ کئی بار مختلف محفلوں میں لوگوں سے فرمایا:

"مجھے چیمبر پریکٹس تو آتی ہے مگر پبلک پریکٹس نہیں آتی"۔

فضا کی اس عدم موافقت اور ویزا کی معیاد قریب الختم ہونے کی وجہ سے حضرت والا رح نے واپسی کا عزم فرمایا اور پوری تیاری کر لی مگر ایک طرف بعض مخلص محبین کا اصرار اور دوسری طرف بعض دفتری کارروائیوں کی تکمیل کے سلسلہ میں ہندوستانی ہائی کمشنر آفس کی بے التفاتیوں اور ترتیب ناشناسیوں کی وجہ سے بندھا ہوا اسباب کھول دینا پڑا۔

انہی ایام میں حضرت علامہ نے انجمن ترقی اردو کی جانب سے منعقدہ ایک جلسہ عام جس کی صدارت ڈاکٹر محمود حسین (اسٹیٹ منسٹر حال صدر شعبۂ تاریخ کراچی یونیورسٹی) نے کی تھی، ایک محققانہ مقالہ "ہندوستان کے نومسلم حکمراں" کے زیرِ عنوان پڑھا جس کے بعد پہلی مرتبہ صدرِ جلسہ نے تالیوں کی گونج میں پوری ذمہ داری سے یہ اعلان فرمایا کہ اب حضرت علامہ پاکستانی بن چکے ہیں اور ہندوستان واپس نہیں جائیں گے۔ یوں غیر اختیاری طور پر یہ صورت پیدا ہوگئی ——— ویسے پھر برسوں تک وزیراعظم ہند کی طرف سے غیر سرکاری طور پر یہ کوشش جاری رہی کہ کسی طرح یہ عظیم شخصیت ان کو واپس مل جائے اسی بنا پر حضرت والاؒ فرماتے تھے کہ:۔

"میری ہجرت غیر اختیاری بھی ہے اور اختیاری بھی!"

یعنی قیام تو غیر اختیاری طور پر ہوگیا، البتہ یہ بات ہر وقت ممکن تھی کہ اگر چاہتے اور ارادہ میں تخلف فرماتے تو ہندوستان کے دروازے کسی وقت بھی بند نہ تھے!! مگر یہ گفتگو اختیار و عدم اختیار کے حدود سے متعلق تھی اور محض نظری حیثیت سے ورنہ جس لمحہ بندھا ہوا بستر کھول دیا تھا، اسی آن واپسی کے خیال کو حرفِ غلط کی طرح مٹا چکے تھے چنانچہ اس کے بعد عاصم صاحب کو بھیج کر اپنے اہل و عیال کو بھی حضرت والاؒ نے بلوا لیا اور وہ دسمبر ۱۹۵۰ء میں کراچی پہنچ گئے۔

شدائدِ ہجرت اور توکّل و استغناء

ایک انسان سوچ سمجھ کر، خاکہ بنا کر ہجرت اختیار کرے تب بھی وہ مصائب و شدائد سے بچ نہیں سکتا، چہ جائیکہ وہ جو چند روز کے لئے کہیں چلا جائے اور وہاں پہنچ کر اس کو بے وہم و گمان ترک وطن کی نیت کرنی پڑے اور اس بے سرو سامانی کے عالم میں قصد و ارادے سے اپنے سامان کو ٹھکرانا پڑ جائے۔ ایسے مہاجر کے شدائد کا اندازہ کوئی کیا کر سکتا ہے خصوصاً جب کہ وہ مہاجر، مہاجر الی اللہ اور عارف کامل ہو جس کی نظر ہر تکوینی تصرّف و تغیر میں دست ازل کے ہر اشارہ کو صاف دیکھ رہی ہو اور اس کو عین لطف و کرم جانتی ہو، وہ تو ہر افتاد پر ضَربُ الحَبِیبِ ذَبِیبٌ کی لذت سے کچھ ایسا سرشار ہوگا کہ نہ تو اس کو کسی کی ہمدردی کی پروا ہوگی اور نہ کوئی اس کے استغنا کو دیکھ کر صحیح اندازہ بھی لگا سکے گا کہ وہ کن صبر آزما مراحل سے گذر رہا ہے

حضرت سیّدی و سیّد الملت قدس سرہٗ نے پاکستان کی سہ سالہ مدّت شانِ توکّل و استغناء سے گذار دی، جو کچھ چھوڑ آئے اسے اپنے ارتقائے روحانی کا محض سفر خرچ جانا اور اس پر کبھی رنج و ملال ظاہر نہیں فرمایا اور نہ اس کے معاوضہ کے متمنّی رہے بلکہ اگر کوئی موقع ایسا آیا بھی تو اس سے بے رغبتی برتی۔ ۱۹۵۱ء میں نہرو لیاقت پیکٹ کے تحت بہار کے مہاجرین کو بہت سہولتیں دی گئیں تھیں اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے لوگ حضرت والا کو اصرار کرتے رہے لیکن غایت استغناء سے جواب انکار ہی کا عطا فرمایا چنانچہ اپنے عزیز سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہندوستان چھوٹنے پر جائداد و مکانؒ کی محبت دل سے نکل گئی۔

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا　　اس کی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے"

اس کے بعد کا جملہ حضرت والاؒ کی عرفانی بصیرت کو جو توکل و استغناء کی علت تھی کسقدر نمایاں کر رہا ہے

"سلوک کی وہ منزل جو تصوف کی راہ سے شاید برسوں میں طے ہوسکتی ہے
اس مہاجرت میں دم کے دم میں طے ہوگئی"[۱]

چھوٹنے پر صبر کرنے والے پھر بھی ملیں گے، ٹھکرا کر مسکرانے اور شکر ادا کرنے والوں کی مثال ملنا آسان نہیں۔ یہ حضرت والا جیسے عارف ربّانی ہی کا حوصلہ تھا۔

یہ تو سلیمانی استغنا کا پہلا منظر تھا، اب آگے قیام پاکستان کے بعد کے شدائد کا سرسری شمار اور ہر مرحلہ پر توکل و استغناء کا اعلیٰ مظاہرہ دیکھتے چلیے۔

معاشی پہلو سے قیام پاکستان کے ارادہ کے بعد مسئلہ فکر معاش کا یقیناً پیدا ہوا، بعض درسی اور تصنیفی اداروں نے پانچ سو اور ہزار روپیہ ماہوار تک کی پیشکش کی مگر حضرت والا نے ہر ایسی صورت سے احتراز فرمایا کہ خانگی ملازمت تمام عمر کبھی کی نہ تھی اور جانتے تھے کہ اس میں نباہ کس قدر مشکل ہوتا ہے ـــــــ اسی طرح بعض تجار "خدمت دین و ملت" کی اسکیمیں لے کر آئے اور حضرت والا کے ساتھ ایسا ہی سودا کرنا چاہا جیسے پاکستان میں عام طور پر اور علماء کے ساتھ وہ کرتے ہی رہتے

---

[۱] اور مکان بھی کیا عالی شان ڈیوڑھی جس کی تعمیر کے لئے لکڑی اور ضروری اسباب اور مزدور اعظم گڈھ سے گئے تھے، اور حضرت نے اپنے حسن مذاق کی اس میں پوری رعایت رکھی تھی اور یہ سب اہتمام اس نیت سے کیا تھا کہ آخری عمر میں خلوت گزینی کو جی چاہے گا تو یہاں راحت حاصل رہے گی ـــــ مگر قضا و قدر کی نگاہ میں یہ حویلی سلیمان ذی جاہ کے التفات کے لائق نہ تھی۔ اس لئے اس میں قیام کی مہلت ہی نہ ملی۔

ہیں لیکن ایک ہی دو ملاقات میں ان کو یہاں مایوسی ہو گئی حضرت والا رح نے صاف فرما دیا کہ۔

بر و ایں دام بر مرغِ دگر نہ   کہ عنقا را بلند است آشیانہ

پھر تا دمِ آخر ان اربابِ خیر کی صورت دکھائی نہ دی۔

یہ صورتیں، اس لئے پیش آئی رہیں کہ حضرت علامہ نے بورڈ کی صدارت قبول نہیں فرمائی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ جوبات مراسلت کے ذریعہ تشنہ رہ گئی تھی وہ وزیراعظم سے بالمشافہ بھی طے نہ پا سکی، یعنی شرائط تقرر اور تفصیلات کار کا تحریری تیقن!! البتہ زبانی وعدے بہت کئے جا رہے تھے اور اسی بنا پر اصرار پر اصرار تھا کہ جلد بورڈ میں شرکت فرمائی جائے مگر حضرت علامہ خوب جانتے تھے کہ جمہوری نظامِ حکومت میں شخصی اور زبانی تیقن کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ اس لئے اپنی بات پر جمے رہے اور پورے سوا دو برس بورڈ کی شرکت سے الگ رہے اور اس دوران میں ذرائع معاش کے فقدان کے باوجود توکل واستغناً اور وقار و تمکنت کی وہ مثال پیش فرمائی کہ اہلِ ثروت وارباب حکومت حیران رہ گئے دو وزراء نے تو اپنے سارے ذرائع تجسس صرف کر کے اس شان بے نیازی کے سبب کی تلاش کی اور شرافتِ نفس اور غیرت دینی کے نادر محرکات کو پا کر عظمتِ سلیمانی کے اور زیادہ معترف ہو گئے ــــــ کردار کی یہی عظمت تھی جس کا لوہا خاص و عام اور دوست دشمن سب ہی مانے ہوئے تھے ــــ ورنہ پاکستان آکر بہت سے نامی گرامی علماء و شیوخ نے حرص جاہ و مال کے جو کریہہ مناظر پیش کئے ہیں اور اعلیٰ واشرف علمی و روحانی عظمتوں کو جس قدر مجروح کیا ہے، اس پر اشکِ خون بہا کر بھی دل ہلکا نہیں کیا جا سکتا۔[1]

---

[1] مثلاً "کس قدر افسوسناک بات ہے کہ اہل افتاء نے "کتاب الحیل" کھول رکھی ہے حصول دولت کی مکروہ شکلیں جن کو دین تو دین لادینی معاشیات تک گھناؤنا سمجھتی۔ ان کو ادنیٰ "حیلوں" سے حدِ جواز میں لایا جا رہا ہے۔ پگڑی کا لین دین، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹنگ۔ ہر عیب ایک "حیلہ" کے بعد

بہرحال اس سوا دو سال کی مدت میں حضرت والارح کو سخت مالی دشواریاں پیش آئیں یہاں تک کہ مقروض ہو گئے، اور کیسے نہ ہوتے؟ وہ کوئی درویش کنج نشین نہیں تھے، ربط ضبط عوام، اہل حکومت اور عمائدِ ملک سب سے قائم تھا، پھر ملنے ملانے اور رکھ رکھاؤ کا جو معیار تھا، وہ بھی قائم تھا، اہل وعیال کی ذمہ داریاں الگ تھیں ـــــ ایک مرتبہ راقم حقیر سے، شفقت خاص کی بنا پر فرمایا:

"مجھ کو تنگ دستی کا خیال نہیں آتا۔
ع چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند
مگر گھر میں چونکہ آج تک ہاتھ خالی نہیں رہیں
اس لئے ان کو پریشانی رہتی ہے!"

اس دوران میں احقر کی موجودگی میں ایک "لیڈر مولانا" حضرت کی خدمت میں آئے اور انہوں نے دو ہزار روپے کے نوٹ پیش کئے کہ فلاں صاحب نے مجھ کو بھی اتنی ہی رقم ہدیۃً بھیجی ہے اور حضرت کو بھی! حضرتِ والارح نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا "اچھا" اور وہ رقم لے کر فوراً زنانہ دروازہ میں کھڑے ہوئے، اپنی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادیوں میں ایک ایک سے دریافت فرمایا:

"بھئی یہ دو ہزار مولانا ہدیۃً لاتے ہیں، تم کو ضرورت ہے؟"

ہر ایک نے بغیر ادنیٰ تامل کے انکار کر دیا، اس سوال وجواب کو راقم بھی سُن رہا تھا، اور وہ مولانا بھی، اس کے بعد حضرت نے وہ رقم ان کو واپس فرما دی کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بے عیب ہے اور یہ مسلک شکم متفق علیہ ہے۔

دوسری طرف جاہ پسندی کا نظارہ کرنا ہو تو شیخ الاسلام مولانا عثمانی رح کی رحلت کے بعد کی تاریخ ہی کے اوراق میں دیکھ لیجئے کہ جمعیت علمائے اسلام کی نظامت وصدارت اور اس سے بڑھ کر "شیخ الاسلامیت" (گویا یہ بھی ایک عہدہ تھا!!) اور اربابِ حکومت کی نگاہ میں مقام پانے کے لئے کیسی ریس بڑے بڑوں نے کھیلی اور علم دین کے وقار کو کس بے دردی سے روند ڈالا؟ انا للہ ثم انا للہ۔

"مجھ کو تو حاجت نہ تھی اور آپ نے دیکھ لیا کہ گھر میں بھی کوئی لینے کو آمادہ نہیں اس لئے اس کو واپس فرما دیجئے۔"

استغناء کی یہ اعلیٰ مثال حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے بعد اور کس کس جگہ نظر آئے گی۔ ہدیہ دینے والے سے بے تکلفی نہیں، اس کی نیت کا حال معلوم نہیں، جس ذریعہ سے بھیجا گیا اس کا اعتبار نہیں، آخر شریعت مقدسہ کے کس اصول کے ماتحت اس کو "دادۂ خداست" سمجھ لیا جاتا، پھر داد دیجئے اس تربیت کی جس کی وجہ سے گھر کے بچے بچے نے لینا اس کو غیرت و حمیت کے مغائر سمجھا،

ہاں ایک اور بات رہی جاتی ہے۔ حضرت والارحؒ کا کچھ روپیہ ہندوستان میں جمع تھا جس کو اب یہاں منتقل کروانا چاہتے تھے اور اس کے لئے حضرت کے پاس کئی محفوظ ذرائع موجود تھے مگر ایک "لیڈر مولانا" نے اس خدمت کا ثواب حاصل کرنا چاہا، اور اپنی خدمات پیش کر دیں۔ حضرتِ والا نے مروتاً یہ کام ان کے سپرد فرما دیا ______ یاد ہوگا کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بھارتی سکہ کی قدر پاکستانی سکہ سے کافی بڑھی ہوئی تھی، اور تبادلۂ زر میں بھارتی سکہ کے عوض پاکستانی روپیہ زیادہ مل رہا تھا "مولانائے موصوف" نے اول تو حضرت والارحؒ کی رقم کا تبادلہ برابر شرح پر طے فرمایا (اور یہ بھی انہی کا بیان ہے) پھر جب رقم منتقل ہو چکی تو کئی بار کے مطالبہ پر تھوڑا تھوڑا کر کے ادا فرمایا اور آخری قسط دو ڈھائی ہزار کم پر ختم فرما دی اور حساب تک نہیں دیا، گویا معاوضہ حسنِ خدمت خود ہی وضع کر لیا!۔ عاصم صاحب آخر ایڈوکیٹ ہیں چاہتے تو بہ آسانی معاملہ صاف ہو جاتا مگر حضرتِ والارحؒ نے سختی سے منع فرما دیا کہ اس میں ان کی اور ان کی وجہ سے طبقۂ علماء کی اہانت ہے، میں نے عرض کیا کہ کم از کم مجھے اتنی اجازت ملے کہ جن صاحب کے ذریعہ یہ رقم منتقل ہوئی ہے ان سے مل کر صحیح بات معلوم کر لوں کیونکہ ان سے میری

ملاقات ہے اور وہ واقعتہً ایک رئیس اہلِ ثروت ہیں مگر حضرت والا رحؒ نے اس پر بھی ناراضی ظاہر کی اور فرمایا:

"جب مجھ کو اس نقصان کی پروا نہیں تو آپ لوگ کیوں خواہ مخواہ اس کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، اس قصہ کو بس یہیں ختم کر دیجئے ورنہ مجھ کو سخت تکلیف ہوگی!"

اللہ اللہ، یہ عالی ظرفی اور یہ شانِ استغنا!! کوئی ڈھونڈ کے تو دیکھے کہ زہد و اتقاء کی مسند سجانے والوں میں بھی کتنوں کو حاصل ہے؟

خیر، کہنا یہ ہے کہ باوقار معاشی صورتوں کے فقدان کی وجہ سے اور اہل وعیال کی آئندہ کفالت کا خیال کر کے حضرتِ والا رحؒ کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ ایک علمی دینی مکتبہ قائم کیا جائے (اس خیال نے تقویت یوں بھی پائی کہ "دارالمصنفین" کی طرح ایک ادارہ کے قیام کی تجویز جو ذہن میں تھی جس کی تفصیل آگے آئیگی) اس کے لئے بھی ایک مکتبہ کی ضرورت تھی اسی مکتبہ سے وہ ضرورت بھی بآسانی پوری ہو سکتی تھی، اور گو یہ کام کثیر رقم کا طالب تھا لیکن اس میں سہولت کا پہلو نکل آیا کہ حضرت والا رحؒ کی کافی رقم دارالمصنفین اعظم گڈھ کے ذمہ واجب الادا تھی، اس رقم کی منتقلی کی آسان اور مفید صورت یہی تھی کہ اس لاگت کی کتابیں خرید لی جاتیں، چنانچہ یہی کیا گیا، مسجد باب الاسلام آرام باغ کے تحت جو دکانیں بن رہی تھیں ان میں سے ایک کے لئے حضرت والا رحؒ کے ایماء سے سلمان میاں نے درخواست دی اور دکان ملنے پر کتابیں منگوالی گئیں۔ اس طرح سے وہ مکتبہ قائم ہوا جس کا نام حضرتِ والا رحؒ نے "مکتبۃ الشرق" تجویز فرمایا تھا۔

اس مقام پر بھی حضرت والا رحؒ کے کردار کی عظمت کا یہ پہلو قابلِ دید ہے کہ وہ چاہتے تو ان کے ہلکے سے اشارے پر اچھی سی دکان نہیں "عمارت" الاٹ ہو جاتی، لیکن وہ اپنے اشارے کنایہ کی قیمت سے آگاہ تھے، ان کی عزتِ نفس پر یہ بات بہت گراں تھی کہ شخصی

مفاد کے لئے کسی سے کچھ کہا جاتے وہ بالکل شیخ سعدیؒ کے اس مسلک پر کاربند تھے کہ ؎

ہم رقعہ دوختن بہ والزام کنج صبر — کز بہر جامہ رقعہ برخواجگاں نوشت

آج "گلستان" پڑھانے والے تو پھر بھی مل جائیں گے مگر جن کو دیکھ کر خود گلستاں نظروں میں اتر آتے، ایسوں کا ملنا آسان نہیں اور یہ عقلاء عرفاء کا متفقہ مسلّمہ ہے کہ انسان "آنکھ" سے بنتا ہے نہ کہ کان سے ! [۱]

فرق ماحول کے اعتبار سے

مادی تکالیف سے کہیں زیادہ تلخ و تیز نفسیاتی آزار ہوتے ہیں کیونکہ ان کی زد جسم پر نہیں بلکہ دل و دماغ پر پڑتی ہے، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کو ہجرت کے بعد یہ تلخ گھونٹ بھی پینے پڑے ____ وہ ہستی جس کے عمر بھر کا مشغلہ بحر علم کی غواصی اور جواہر تحقیق کی برآمد تھا، جس کے علمی شغف پر آج بھی دار المصنفین کے عظیم الشان کتب خانہ کی ایک ایک کتاب گواہ ہے جس کے ذوق جستجو نے مشرق اور مغرب کے سفر میں کتب خانوں کی چھان بین کو اولین اہمیت دے رکھی تھی، کراچی کے نوزائیدہ تجارتی شہر میں آکر اس کی حالت ماہی بے آب کی سی ہوگئی !! بار بار ارشاد فرماتے تھے کہ:

"کراچی نے مجھے جاہل بنا دیا، یہاں نہ کوئی اچھی لائبریری ہے نہ لکھنے پڑھنے کی کوئی جگہ، میرے لئے تو کوئی عمدہ کتب خانہ ہو اور میں اس میں بیٹھ کر کام کرسکوں !"

اس اضطراب اور ذہنی کوفت کو صرف وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس کو دبستانِ علم کے سوا کسی اور جگہ کی آب و ہوا راس نہ آئی ہو۔[۲]

---

[۱] یعنی محض اقوالِ زریں کسی کی تعمیر سیرت کا کام نہیں کر سکتے، سیرت میں انقلاب جب ہی پیدا ہوتا ہے کہ کوئی صاحب کردار آنکھوں کے سامنے آجائے اور اس کی ایک ایک ادا دعوتِ صلاح پیش کرے۔

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" میں کیا یہی نفسیاتی امر موجود نہیں۔

(حاشیہ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

علمی ذخائر کی قلت کے علاوہ دوسری صبر آزما چیز اُن رجالِ کار کا چھوٹ جانا تھا جن کی رفاقت میں عمر گذاری تھی اور اب خواہی نخواہی ان افراد کا ساتھ دینا تھا جن سے طبیعت و مذاق کو کچھ مناسبت نہ تھی ـــــ یہ کوئی حسنِ عقیدت کی تعبیر نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہجرت سے قبل حضرت علامہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو جن ہستیوں کے ساتھ مل کر علمی و دینی ملی و قومی اور اجتماعی اور اصلاحی کاموں کے مواقع حاصل رہے وہ علم و تحقیق، فکر و نظر اور تجربہ و کردار ہر لحاظ سے اس دور میں ہندوستان کی صفِ اوّل کی شخصیتیں تھیں، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ۔ مولانا مدنیؒ، مفتی کفایت اللہؒ مولانا محمد سورتی ڈاکٹر محمد اقبال، راس مسعود، مولانا محمد علی جوہر، مولانا آزاد، گاندھی جی، موتی لال و جواہر لال نہرو، وغیرہ وغیرہ، انہی سے تو علم و حکمت اور سیاست کی پہلی صفیں قائم تھیں، اور یہ بھی حق تعالیٰ کی بے پایاں عطا کا کرشمہ تھا کہ ہر جگہ سید الملت کو امتیازی مقام حاصل تھا، دارالمصنفین میں نہ صرف علماء و فضلاء کا مرجع تھا، بلکہ رئیس دارالمصنفین کی جامع کمالات شخصیت نے اس کو مصلحین قوم و ملت اور عمائدین سیاست کی توجہات کا بھی مرکز بنا رکھا تھا، اپنے تو اپنے ہی ہیں، گاندھی جی، نہرو۔ مالویہ اور راجندر پرشاد تک وقت مقرر کر کے حضرت علامہ ندوی سے ملنے آیا کرتے تھے [1]

غرض کہاں یہ ماحول تھا اور کہاں پاکستان آکر ہر شعبۂ عمل کے ان افراد سے

(حاشیہ صفحہ سابق) [2] جیسے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کہ وہ بھی کراچی آکر اس بے چینی کا شکار ہوئے تھے یا مثلاً مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کہ جب آخر عمر میں ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے کی ممانعت کر دی تو مولانا نے اپنے خطوط میں لکھا ہے کہ ان کیلئے اس سے زیادہ سخت کوئی پرہیز نہ تھا، اسی لئے وہ اس پر قابو بھی نہ پا سکے۔

[1] اس کی تفصیل تو مکمل سوانح سلیمانی کا موضوع ہے، البتہ تفصیلی اشارات اس وقت بھی حضرت والا کی تصانیف یادِ رفتگان۔ بریدِ فرنگ اور سیرِ افغانستان سے حاصل کئے جا سکتے ہیں اور مزید مواد مکاتیب اقبال، مکاتیب ابوالکلام وغیرہ میں بھی موجود ہے!

واسطہ پڑا جو مذکورۂ صدر شخصیتوں کے آگے ثانوی حیثیت بھی مشکل ہی سے رکھتے ہیں، پھر ستم بالائے ستم یہ کہ انہیں میں وہ لوگ بھی تھے جو انقلابِ زمانہ سے فائدہ اٹھا کر چور دروازوں سے چھپ چھپا کر، علم کی، تقویٰ و تقدس کی، قیادت و سیادت کی مسندوں پر آ بیٹھے تھے اور اب اس خود ساختہ بڑائی کے قیام و بقا کی خاطر اپنی صلاحیتوں کو وقف کر رکھا تھا۔ ایسے ماحول میں آ کر حضرت والارح کی شخصیت "شاہدے درمیان کوراں" کا مصداق بن گئی تھی ان لوگوں کی دانستہ و نادانستہ حرکات سے حضرت والارح کو مسلسل اذیتیں پہنچتی رہیں، ہر "بڑا" چاہتا تھا کہ حضرت علامہ اس کا ساتھ دے کر اس کے وزن کو بڑھائیں اور دوسرے کی طرف ان کی نظرِ التفات کبھی نہ پھرے! یہ بات ایک عالمگیر شخصیت، ایک بے غرض محبِّ ملّت کے لئے کس قدر روح فرسا تھی!! حضرت کا مسلک ہمیشہ سے ملّت کی بہی خواہی اور اس کی خاطر ہر کارِ خیر میں شرکت رہا، وہ "تعاون علی البرّ" کے لئے کبھی کسی ادارہ یا گروپ کے پابند نہ تھے، یہاں کی حلقہ بندی اور تحزب سے ان کو سخت صدمہ پہنچا، ایک مرتبہ ایسی ہی صورت سے دلگیر ہو کر احقر سے فرمایا، اور یہ ان کی شفقتِ خاص کا ایک انداز تھا ______ کہ

"آپ نے مجھے ان لوگوں میں کہاں لا پھانسا"[1]

اور واقعی حرص و ہوا اور نام و نمود کے ماحول میں کسی اہلِ اخلاص کا پھنس جانا بڑا ہی تکلیف دہ موقف ہے۔ صرف دو مثالوں سے جو منظرِ عام پر آ چکی ہیں اسکا اندازہ لگائیے۔

---

[1] اس میں میری ذات حقیر کی اہلیت کا اشارہ نہیں بلکہ ایک نادانی پر تنبیہہ ہے! میں نے کسی کی باتوں میں آ کر اور انکے اصرار پر ایک عریضہ پورے آٹھ صفحوں کا خدمت سلیمانی میں لکھا تھا اس میں پاکستان کے حالات کا نقشہ کھینچ کر یہاں حضرت کی تشریف آوری کی ضرورت کو شدّت سے ثابت کیا تھا اور ماحول کی موافقت اور کام کرنے والوں کے اخلاص و طلبِ صادق کا بھی پورا پورا یقین دلایا تھا۔ یہ عریضہ حضرتِ والارح اپنے ساتھ لائے تھے، کبھی کبھی ازراہِ لطف فرمایا کرتے تھے کہ کہاں ہیں آپکے تیقنات؟

دو شرمناک مثالیں

غالباً ۱۹۵۱ء ہی تھا، موتمرِ عالمِ اسلامی کا سالانہ اجلاس پورے تزک و احتشام سے کراچی میں منعقد ہو رہا تھا، اس کے کرتا دھرتا ایک ...... "الازہری" تھے۔ اس اجلاس میں شرکت کے دعوت نامے اندرونِ ملک بھی تقسیم ہوئے اور بیرونِ ملک بھی دُور دُور تک بھیجے گئے ——— مگر علامہ سید سلیمان ندوی کو نظر انداز کر دیا گیا کہ آفتاب کا طلوع جگنو کی چمک کیلئے پیامِ فنا تھا۔ ——— خیر وقت پر عالمِ اسلام کی بعض ممتاز ہستیاں بھی آگئیں، ان میں ایک مفتیِ اعظم فلسطین سید امین الحسینی بھی تھے اجلاس شروع ہوا، مفتیِ اعظم کی نظریں متلاشی پا کر کسی نے وجہ دریافت کی، آپ نے فرمایا کہ ہم کو تو یہ معلوم ہوا تھا کہ علامہ سلیمان ندوی آج کل کراچی میں ہیں مگر وہ یہاں نظر نہیں آرہے ہیں، بات ٹالنے کو جواب یہ دیا گیا کہ رقعہ تو ان کی خدمت میں بھی گیا تھا نہ معلوم کیوں تشریف نہیں لائے۔ اب اس کو مفتیِ اعظم کی فراست کہیئے یا کشف کہ انہوں نے جواب پر یقین نہیں فرمایا اور فوراً اٹھ گئے کہ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے، ان کو ہم لے آئیں گے ——— یہ کہتے ہوئے مفتی صاحب وہاں سے اٹھ گئے، کار لے کر حضرتِ والا رح کی قیام گاہ پر پہنچے، مدت کے بعد ملاقات ہوئی تھی،

لہ اونچے اونچے نامی اداروں کی نسبتیں جس بے باکی سے یہاں استعمال اور بے دردی سے پامال کی جارہی ہیں اس کی نظیر ملنا دشوار ہے۔ یہاں کئی ہیں جو اپنے نام کے ساتھ (عثمانیہ) لکھتے ہیں حالانکہ جامعہ عثمانیہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں بلکہ بعضے تو میٹرک پاس بھی نہیں۔ بہت سے ہیں جو ندوی کہلاتے ہیں حالانکہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ ندوہ میں دو ایک برس گزارے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جنہوں نے خود کو "دیوبند" کا فارغ التحصیل مشہور کر رکھا ہے، حالانکہ وہ صرف زائرین دیوبند میں سے ہیں۔ یہ جسارتیں جب قریب کے اداروں کے ساتھ جانے پہچانے ماحول میں ہیں تو مصر، بغداد کے اداروں سے نسبت جوڑنا کیا مشکل ہے دجل و فریب کے اس ماحول میں کسی کو کیا پڑی ہے کہ دوسروں کی حقیقت کھول کر خود کی عریانی کا سامان کرے یہاں تو انگریزی کی مثل صادق آتی ہے کہ "ایک حمام میں سب ننگے"۔ الحذر والعیاذ۔

گرم جوشی و اخلاص میں طرفین نے مسابقت کی کوشش کی، مفتی اعظم نے اجلاس میں شرکت نہ فرمانے کا سبب پوچھا؟ حضرت والا رح نے جو حقیقت تھی بتا دی، مفتی صاحب نے فرمایا، جو کچھ ہوا، ہوا مگر آپ کے بغیر تو یہ اجلاس نہ ہوں گے، اصرار کر کے اپنے ساتھ لے گئے، خود صدر جلسہ تھے اپنے برابر بٹھایا، پھر دوسرے اجلاس کے لئے کرسی صدارت سپرد فرما دی، نتیجہ وہی ہوا، جس سے بانیانِ موتمر خائف تھے کہ سید الملت کے آنے سے ان کا نمود بے بود ہو کر رہ گیا، یا تو وہ نظر انداز کر دیئے گئے تھے یا اب وہ ہی وہ تھے مجد و شرف کا مرکز اور فضل و کمال کا قطب تارہ!! ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشآء۔!

اس سے بھی زیادہ شرمناک اور ملک و ملت کے لئے المناک ایک اور سانحہ پیش آیا۔

حضرتِ والا رح کی بڑی تمنا تھی کہ دار المصنفین کی طرح ایک ادارہ کراچی میں بھی قائم ہو جائے اور قرآنی علوم کی ایک اعلیٰ درسگاہ یہاں کھولی جائے اور اس کا ایک خاکہ "دائرۃ المصنفین" اور "مدرسہ دار القرآن" کے نام سے حضرتِ والا نے تیار بھی فرما لیا تھا (تفصیل آگے آئے گی) البتہ اس کی عملی تشکیل کے لئے جگہ اور مقام کا تعین ذہن میں موجود نہ تھا۔ اس کا سامان غیب سے یہ ہوتا نظر آیا کہ دفاتر معتمدی کے ملازمین کی ایک مرکزی کالونی کلیٹن کوارٹرز کے وسط میں ایک خاصہ وسیع خطۂ اراضی تھا، جس کے ایک گوشہ میں خس پوش مسجد تھی اور یہاں ایک وسیع مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بھی تھا، مسجد کمیٹی کے صدر ایک دیندار اعلیٰ عہدیدار جناب راحت علی رضوی (ڈپٹی ڈائرکٹر سول ایویشن) کو خوب سوجھی کہ حضرت علامہ کی خدمت میں پہنچ کر مسجد کی سرپرستی کی درخواست پیش کی اور اس کو "جامعہ مسجد سلیمانیہ" کے نام سے موسوم کرنے کی اجازت چاہی۔ پہلی بات تو حضرتِ والا رح نے بلا تامل منظور فرما لی، دوسری تجویز سے محجوب ہو گئے، نظریں جھکائے ہوئے بڑے تاثر سے فرمایا کہ اگر مسجد کا کوئی نام رکھنا ہی ہے تو ہمارے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ

کے نام پر "جامع مسجد اشرفیہ" رکھ لیجیے مگر راحت صاحب نے بڑی ذہانت اور حسن عقیدت سے عرض کی کہ حضرت تھانویؒ کی عظمت مسلم مگر ہم نے تو آپ کو دیکھا ہے، اور آپ کے عقیدت کیش ہیں اور ہم کو آپ سے ایسی ہی عقیدت ہے جیسی خود آپ کو حضرت مولانا تھانویؒ سے ہے ہم کو تو آپ ہی کے اسمِ گرامی سے منسوب کرنے کی اجازت عطا ہو۔ حضرت والا اس اصرار پر خاموش ہو گئے اور خاموشی بمنزلہ رضا سمجھ کر مسجد کا نام "جامع مسجد سلیمانیہ" طے پا گیا،

اب مسجد کمیٹی نے باضابطہ دستور تیار کر کے اس کو رجسٹرڈ کروا لیا۔ خس پوش مسجد کو عارضی طور پر (۱۰۰×۸۰) گز کے چبوترے کی صورت میں وسیع کر کے اسبسٹاس کی چادروں سے اس کو مسقف کر دیا گیا، کیونکہ لوگوں کا رجوع روز افزوں تھا۔ حضرت والا نے مسجد سے ملحق ایک تصنیفی ادارہ کی عمارت کی ضرورت مسجد کمیٹی پر واضح فرمائی، کمیٹی نے حضرتِ والا کے مشورہ سے مسجد اور ادارہ کی دو منزلہ شاندار اور خوبصورت عمارتوں کا نقشہ تیار کروا لیا اب صرف اس کی منظوری کا مرحلہ باقی تھا۔ ایسے میں کمیٹی کے دستور کے موافق سالانہ انتخاب کی تاریخ آ گئی، خیال یہی تھا کہ حضرتِ والا کی سرپرستی اور افرادِ کمیٹی پر اعتماد کے ہوتے ہوئے یہ انتخابات محض ایک تکمیلِ ضابطہ کی صورت میں انجام پا جائیں گے۔ کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ چیز مسجد کمیٹی اور حضرت علامہ کے عزائم کے لئے طوفانِ حوادث ثابت ہوگی۔ مگر افسوس کہ ہوا ایسا ہی۔

اربابِ کمیٹی کا موقف قانونی اعتبار سے بالکل مستحکم تھا، انہوں نے قانونی چارہ جوئی اختیار کرنی چاہی مگر حضرتِ والا نے اس کو وقار اور للّٰہیت کے یکسر خلاف سمجھا اور صبر کی تلقین فرمائی ——— ارشاد ہوا:

"سب کا جواب خاموشی ہے، آخر صبر کی تعلیم کس دن کے لئے ہے!"

مولانا محمود الغنی صاحب (خلیفہ حضرت مولانا تھانویؒ) جن کی نظروں کے سامنے یہ طوفانِ حوادث گذرا اور حضرتِ والا کے تحمل و ایثار کو جنہوں نے مشاہدہ فرمایا تھا۔

احقر سے فرماتے تھے کہ

"حضرت سید صاحب نے تو ٹھیک وہی کیا جو ان کے پیر و مرشد نے کیا تھا،
حکیم الامتؒ پر بھی مدرسہ کے سلسلہ میں (غالباً تھانہ بھون ہی میں) ایک مرحلہ
ایسا ہی آیا تھا، تو حضرت بھی بلا تامل مدرسہ سے دست کش ہو گئے تھے اور
معترضین اور معاندین کے لئے جگہ خالی کر دی تھی"۔

مگر قوم کے علمی و تعلیمی نقصان کے اعتبار سے سوچئے کہ یہ واقعہ کتنا بڑا سانحہ ہے!!

تصویر کا دوسرا رُخ ـــــــ یعنی اعزاز واکرام

شدائدِ ہجرت اور ماحول کی تلخیوں کے تذکرہ کے بعد انصاف کا تقاضا ہے کہ پاکستان میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی جو قدر و منزلت رہی اور خواص وعوام نے رتبہ شناسی کا جو ثبوت دیا اس کو بھی بیان کر دیا جائے۔

جمعیۃ علمائے اسلام کی طرف سے استقبال

حضرت والا کی آمد کا شدید انتظار جمعیت علمائے اسلام کو بھی تھا، کیونکہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ذاتِ سلیمانی ہی سب کی نگاہوں کا مرکز جاذبہ بنی ہوئی تھی، چنانچہ جب وہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جمعیت ہی کی طرف سے حضرتِ والا رح کے اعزاز میں ایک جلسہ استقبالیہ منعقد کیا گیا، جس میں علمائے کرام اور معززینِ شہر کے علاوہ بلادِ اسلامیہ کے تمام سفراء شریک تھے۔ یہ اجتماع نگار ہوٹل کے وسیع ہال میں منعقد ہوا تھا، مہمانوں کی کثرت سے برآمدے تک بھرے ہوئے تھے۔ میر مجلس کے جلوہ فرما ہونے پر جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ ظاہر قاسمی کی تلاوتِ قرآن کے بعد مولانا محمد یحییٰ ندوی نے عربی زبان میں خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ پھر سفیر حجاز محترم خطیب عبدالحمید اور سفیر مصر محترم عزام بے نے تقریریں کیں، ان کے علاوہ بعض اور حضرات نے بھی اس میں حصّہ لیا، ہاں ایک عالم نے عربی میں ایک قصیدہ بھی پیش فرمایا۔ اس کے بعد حضرت علامہ استادہ ہوئے اور عربی زبان ہی میں آدھ گھنٹہ تک فی البدیہہ ایک تقریر فرمائی جس میں بانیانِ جلسہ اور سفراء بلادِ اسلامیہ کا شکریہ بھی ادا فرمایا اور اتحادِ ملّت کی ضرورت واہمیت بھی واضح فرمائی۔

صدارت جمعیۃ کی پیشکش

عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی رح کے

بعد جمعیت کی صدارت پُر نہ ہو سکی تھی، حضرت علامہ کی خدمت میں یہ اعزاز پیش کیا گیا، مگر حضرت نے اس سے اس اظہار حقیقت کے ساتھ انکار فرمایا:

"پولیٹکس بڑی گندی چیز ہے، میں نے کبھی اس خرقہ مے آلود کو از خود نہیں پہنا، کبھی محمد علی نے پہنا دیا، کبھی شوکت علی نے اور جب کبھی کسی نے پہنایا بھی تو میں نے فوراً اُتار پھینکا۔ ؎

حافظ زخود نہ پوشید این خرقۂ مے آلود

اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا"

بات واقعی یہی تھی کہ حضرت والا رحؒ اپنی افتادِ طبع، فطرت صالحہ اور مذاق اعلیٰ کے اعتبار سے خالص علمی وفکری رہبری کے لئے موزوں تھے آج کی مروجہ سیاست خواہ وہ "جمعیت العلماء" ہی کی کیوں نہ ہو، ان کی طبع لطیف پر نہایت گراں تھی، چنانچہ ایک مرتبہ ایک سیاست زدہ کو مخاطب کر کے فرمایا بھی تھا کہ:

" ڈپلومسی (سیاست) کے معنی تو یہ ہیں کہ ہر ایک کو غیر دیانت دار سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے اور پھر اگر اس کی دیانت ثابت ہو جائے تو اس کو دیانت دار تسلیم کیا جائے اور میرا مسلک یہ ہے کہ ہر ایک کو دیانتدار اور اچھا سمجھا جائے اور پھر اس کی اگر بد دیانتی ثابت ہو تو اس سے قطع تعلق کر لیا جائے۔"

ایک طرف مسلک کی یہ پاکیزگی اور دوسری طرف ضعف قویٰ کی وجہ سے اب حضرت والاؒ پبلک پالیٹکس کے لئے واقعتہً موزوں نہ رہے تھے، چنانچہ مزاحاً یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ:

"مجھے چیمبر پریکٹس تو آتی ہے پبلک پریکٹس نہیں آتی"

اس سب کے باوجود علمائے کرام صدارت قبول کرنے پر اصرار کرتے رہے جب

بعض قابلِ اعتماد حضرات نے بھی اس کو رفعِ انتشار کا واحد حل قرار دیا اور تعاونِ عمل کا وعدہ فرمایا تو حضرت والا نے اواخر ۱۹۵۲ء میں جمعیت کی صدارت منظور فرمالی اور تا آخرِ حیات اس کے صدر رہے۔

علماء کی انفرادی قدر شناسی

اس اجتماعی عزت و منزلت کے علاوہ پاکستان کے ہر مکتبِ خیال کے علماء نے عموماً اور علمائے دیوبند نے خصوصاً حضرت والا کی عزت و مرتبت کا پورا لحاظ رکھا، جس محفل میں وہ مدعو ہوئے، مسندِ صدارت ان کے لئے خاص کردی جاتی، پاکستان کی کوئی اہم دینی درسگاہ ایسی نہ تھی، جس نے اپنے دستاربندی (تقسیم اسناد) کے جلسوں میں حضرت والاؒ کو خاص طور پر مدعو نہیں کیا۔ مشرقی پاکستان سے مولانا اطہر علی صاحب وغیرہ نے ہمیشہ باصرار بلایا، مگر دوریٔ مسافت اور خرابیٔ صحت کی وجہ سے حضرتِ والا عذر فرماتے رہے۔ مغربی پاکستان کے مدارس میں البتہ ہر جگہ تشریف لے جاتے تھے۔ دارالعلوم کراچی، دارالعلوم ٹنڈوالہ یار، خیرالمدارس ملتان، جامعہ اشرفیہ لاہور مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی وغیرہ کا کوئی سالانہ جلسہ ایسا نہیں ہوا جس میں حضرتِ والاؒ نے پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ شرکت نہیں فرمائی اور یوں تو گو ہر مدرسہ کے بانی نے سید العلماء کے احترام کا شرف پایا مگر جامعہ اشرفیہ کے شیخ عالی مقام پر کوئی سبقت نہ لے جاسکا، حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ اس قدر اہتمام فرماتے تھے کہ نجی صحبتوں میں بھی مسندِ خاص پر حضرت والا کو بٹھاتے نمازِ فجر کے بعد روزانہ حضرت والا سے درسِ تفسیر سارے علماء و طلباء کے ساتھ سنتے اور درس کے مطالب و حسنِ تعبیر پر بڑے ذوق و شوق سے دوسروں کو متوجہ فرماتے جاتے تھے ــــــ حضرت والاؒ کی خاطر دسترخوان اس قدر پُر تکلف چنا جاتا کہ جیسے کسی امیر کبیر کی طرف سے اہتمام ہوا ہے۔ ایک مرتبہ حضرتِ والاؒ نے فرمایا بھی کہ:

"میری غذا تو بہت مختصر ہے حضرت اس قدر اہتمام کیوں فرماتے ہیں"۔

تو حضرت مفتی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ:

"کہ یہ تو محض حضرت کا اکرام ہے"۔

راقم ہیچمدان نے شیوخ و علمائے پاکستان میں حضرت مفتی صاحب مدظلہ سے زیادہ حضرت والا کا قدردان و مداح کسی اور کو نہیں دیکھا ــــــ حضرت مفتی صاحب نے کراچی کی پہلی ہی ملاقات میں یہ عہد حضرت والارح سے لیا تھا کہ لاہور جب کبھی اور کسی سلسلہ میں بھی آنا ہو تو مہمانی کا شرف انھیں کو حاصل رہے، چونکہ لاہور میں حضرت کے قدیم احباب اور قدر شناسوں کی تعداد کافی تھی، اس لئے حضرت والارح نے فرمایا کہ شاید ہمیشہ قیام ممکن نہ ہوسکے مگر پھر حضرت مفتی صاحب کے اصرار اور ان کے اخلاص، احترام اور تقدس کے پیش نظر حضرت والا نے وعدہ فرمالیا اور اس "وعدۂ پیشین" کو "تاروز پسیں" نباہ لے گئے[1]۔

ہسٹاریکل سوسائٹی کی رکنیت

۱۹۵۱ء میں آل انڈیا ہسٹری کانگریس کی طرح پاکستان میں بھی ایک "آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" قائم ہوئی۔ حضرت علامہ اس کے مایۂ ناز رکن بنائے گئے اور مارچ ۱۹۵۲ء میں اس کے پہلے اجلاس منعقدہ کراچی کے شعبۂ تاریخ اسلام کی صدارت فرمائی، اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں سوسائٹی کے جنرل سشن (عمومی اجلاس) منعقدہ ڈھاکہ کی صدارت کو زینت بخشی[2]۔

---

[1] عارف شیراز کا شعر ہے ؎

آں نیست کہ حافظ را مہرش رود از خاطر

آں وعدۂ پیشینش تا روز پسیں باشد

[2] اسی اجلاس کے خطبۂ صدارت میں بنگلہ زبان کے رسم الخط کی تبدیلی پر حضرت والارح نے زور دیا تھا تاکہ پاکستان کے سب صوبے باہم قریب تر ہوسکیں۔ اس تجویز کی گہرائی کو پاکستان کے دشمن عناصر

یونیورسٹی سینیٹ کی رکنیت اسی طرح ۱۹۵۲ء میں جب کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو حضرت علامہ کو اس کی سینیٹ کا ممبر بنا دیا گیا اور مجوزہ شعبۂ اسلامیات کی صدارت بھی پیش کی گئی، مگر علامہ نے صحت کی خرابی اور ضعف کی بنا پر اس کو قبول نہیں فرمایا۔

بیرونِ ملک اکرام اندرون ملک کے علاوہ بیرون ملک سلیمان ذی جاہ کے اعزاز و اکرام کا سلسلہ آخر دم تک قائم رہا۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں حکومتِ عراق نے حکیم بوعلی سینا کی الفی تذکار (ہزار سالہ برسی) بڑے تزک و احتشام سے منائی، پاکستان سے حضرت علامہ کو بطورِ خاص شرکت کی دعوت آئی۔ حضرتِ والا جانا نہ چاہتے تھے، اس لئے خوش اسلوبی سے ٹالتے رہے[1]، مگر سفارت خانۂ عراق کی طرف سے

(بقیہ حاشیہ) پہنچ گئے، اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا نے ہندو پروفیسروں کا آلۂ کار بن کر علامہ کے خلاف نہایت تہذیب شکن مظاہرہ کیا۔ آپ کی موٹر جس میں آپ تنہا تشریف لے جا رہے تھے، سینکڑوں طلبہ نے گھیر لی اور اپنی تجویز واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ بنگالی مسلمان طلباء کے ماتھے پر یہ کلنگ کا ٹیکہ ہے کہ انہوں نے ایسے محترم و محسن بزرگ کے ساتھ یہ بدسلوکی کی، مگر اس "شر" سے "خیر" ہی نمودار ہوا اور ہونا بھی چاہیئے تھا کہ صاحب اخلاص ہستیوں کی ظاہری شکست سے بھی سو کامرانیاں پیدا ہو جاتی ہیں چنانچہ اس ہنگامہ کا ردِ عمل یہ ہوا کہ مولانا اطہر علی صاحب اور دوسرے علماء و عمائد نے جگہ جگہ جلسے کر کے اس کی مذمت کی اور حضرت علامہ کی تحریک کی تائید اس زور و شور سے ہوئی کہ بعض گوشوں سے اس کے مطابق عملی اقدام فوراً شروع ہو گیا اور بنگلہ زبان کے بعض جرائد عربی رسم الخط میں چھپنے لگے۔ سچ کہا ہے ریاض مرحوم نے ؎

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشت خوں رکھدیں ٭ جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم اُبلتا ہے

[1] راقم حقیر سے فرمایا کہ "میں نے بوعلی سینا کے فلسفہ کا رد کیا ہے اور اب بھی اسکو غلط سمجھتا ہوں۔ اہل عراق اس کا ہزار سالہ جشن منا رہے ہیں، جشن کا مقصد ہی شخصیت کی تعریف و توصیف ہوتا ہے ایسی صورت میں وہاں جاکر کیا حصہ لے سکوں گا" بعد میں اصرار زیادہ ہونے پر اس شرط کے ساتھ شرکت کا وعدہ فرما لیا کہ کوئی مقالہ نہ پڑھیں گے۔

پیہم اصرار پر پھر وعدہ فرمالیا مگر انجام کار تشریف نہ لے جاسکے کیونکہ وزیر تعلیم حکومت پاکستان مصارف سفر پر سودا کرنا چاہتے تھے، جس کو حضرت والاؒ کی حمیت کبھی بھی برداشت نہ کرسکتی تھی۔

عالم اسلام کا اعلیٰ علمی اعزاز مصر میں ایک لغوی اکاڈمی "مجمع فواد الاول" قائم ہے جو ممالک عرب بلکہ کل عالم اسلام کا سب سے عظیم الشان علمی ادارہ ہے ۱۹۵۲ء کے آغاز میں اس ایکڈمی نے حضرت علامہ کو اپنا "عضو" (رکن) منتخب کیا۔ یہ اعزاز برصغیر پاک وہند میں بقول مولانا مسعود عالم مرحوم اس سے پہلے کسی اور کو نہیں ملا تھا۔

حضرت والاؒ کی بعض خدمات

---

۳۱ علماء کی کمیٹی حکومت پاکستان نے دستور سازی کے سلسلہ میں بنیادی اصولوں کی ایک کمیٹی قائم کی تھی، اس نے اپنی رپورٹ ۵۰ء میں شائع کی جس میں بورڈ تعلیمات اسلامی کی سفارشات کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا تھا ضروری تھا کہ پاکستان کے ہر مکتب خیال کے علماء کو جمع کرکے اسلامی دستور و آئین کا ایک متفقہ خاکہ حکومت و عوام کے سامنے پیش کرکے علماء اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہوں چنانچہ دسمبر ۱۹۵۰ء میں حضرت والاؒ کی رہبری اور صدارت میں ۳۱ علماء کا ایک اجتماع کراچی میں منعقد ہوا جس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ علماء نے شرکت کی اور تین دن کی کوشش میں ایک دستوری خاکہ تیار کر دیا، علماء کے اس متحدہ کارنامے پر اہل حکومت حیران تھے اور سب نے یہ اعتراف کیا کہ یہ کارنامہ

حضرت علامہ کی مرکزی شخصیت کا رہینِ منّت ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ کے نام مبارک باد کے برقیوں اور خطوں کا تانتا بندھ گیا تھا ——— یہی وہ ایٹم بم تھا جس نے حکومت کی رپورٹ کو تباہ کر دیا۔

علمائے کرام پر حضرت والاؒ نے جس طرح کنٹرول (قابو) رکھا اس کا لطیفہ بھی قابلِ شنید ہے۔ اجلاس کے ختم پر حضرت مفتی محمد حسن صاحب مدظلہٗ کی قیام گاہ پر ایک نجی محفل میں اس کا ذکر آگیا تھا، راقم حقیر بھی وہاں موجود تھا حضرت مفتی صاحب نے فرمایا کہ:

"آج حضرت سید صاحب نے علماء کو خوب جھنجوڑا، جب حکومت کی رپورٹ پر تنقید شروع ہوئی تو فرمایا کہ یہ عوام کا نہیں علماء کا اجتماع ہے اور حضرات علماء کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہیئے جن حضرات نے اس رپورٹ کو پڑھا اور اس پر غور نہ کیا ہو ان کو اظہارِ خیال کا کوئی حق نہیں پہنچتا ——— چنانچہ اس کے بعد صرف ان ہی حضرات نے اس بحث میں لیا جو اس کے لئے تیار ہو کر آئے تھے، اس طرح کام بہت تیزی سے ہوا۔"

لا کمیشن کا قیام حضرت والاؒ کا دوسرا کارنامہ لا کمیشن کا قیام ہے حضرتِ والا کی نظر بڑی غامض تھی، وہ اربابِ فکر سے فرمایا کرتے تھے کہ نہاد دستور سے نہ تو مملکتِ اسلامی بن سکتی ہے نہ اس میں کوئی انقلابی شان نمایاں ہو سکتی ہے انقلاب تو جب پیدا ہوگا کہ وہ قانون جس سے رعایا شب و روز دوچار ہوتی ہے اسلامی بن جائے۔ یہی نکتہ حضرت والا نے لیاقت علی خان مرحوم کو بھی سمجھایا اور حضرت کو خوشی ہوئی کہ وہ اس کی گہرائی کو پاگئے۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء کے اواخر میں وزیر اعظم مرحوم نے لا کمیشن کا اعلان کیا، جس کے تین ارکان جسٹس رشید، جسٹس میمن اور علامہ سید سلیمان ندوی قرار پائے

اس کمیشن کا فریضہ یہ تھا کہ مروجہ قانون پر نظر ثانی کرکے اس کو حدود شرع کے مطابق ڈھالا جائے۔

یہ حضرت علامہ کا ایک ٹھوس کارنامہ تھا اور اسی کے بعد علاّمہ نے بورڈ تعلیمات اسلامی میں بھی شرکت فرمائی کہ اب ایک مستقل کام کی صورت نکل آئی تھی۔

اس کمیشن کے قیام کے بعد حضرتِ والا رح نے اس خیال سے کہ قانونِ اسلامی کی تمام تر ذمہ داری تنہا انہی پر عائد نہ رہے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے لا کمیشن میں لئے جانے کی تحریک فرمائی اور اس کو منوالیا[1]۔ــــــ یہ حضرت والا رح کے احساس ذمّہ داری اور حزم و احتیاط اور خشیت و تقویٰ کی ایک کھُلی نشانی ہے۔

مولانا مفتی صاحب ممدوح سے احقر نے کئی بار سنا کہ لا کمیشن میں حضرتِ والا کی شخصیت اس قدر وقیع اور وزنی تھی کہ ان کے چند جملے ججوں کو ساکت اور مطمئن کر جاتے تھے۔ ساتھ ہی نفسِ جواب کی اصابت و ایجاز کے بھی مفتی صاحب بہت مداح ہیں۔

احتفالِ علماء

حضرت والا رح ممالکِ اسلامیہ کے ربط و اتحاد کی اہمیت پر بہت زور دیتے تھے، اور ایسے باہمی رابطہ کے جویاں تھے جس کی وجہ سے ملّتِ اسلامیہ "بنیان مرصوص" بن جائے اس کے لئے وہ ان ممالک کے مشاہیر علماء اور مفکرین کا اتحاد ازبس ضروری سمجھتے تھے اور اپنے اس خیال کا اظہار اجتماعی کارکنوں کے سامنے اکثر فرمایا کرتے تھے چنانچہ بعض حضرات اس کام کیلئے مستعد ہو گئے حضرت والا رح نے "احتفال علماء اسلام" کے نام سے بلادِ اسلامیہ کے مشاہیر علماء کے نام اپنے دستخطی دعوت نامے جاری فرمائے۔

اس احتفال کا پہلا اجلاس ۱۴ فروری ۱۹۵۲ء کو دارالخلافہ کراچی میں عالیشان پیمانہ پر منعقد ہوا، بلادِ اسلامیہ کے اکثر اکابر علماء شریکِ اجلاس رہے، عراق کے

---

[1] ادھر حکومت کی طرف سے خلیفہ شجاع الدین کو کمیشن میں شامل کیا گیا۔

مقبول ترین عالم محمد امجد زہاوی اور دوسرے مجاہد عالم محمد محمود صواف، ایران کے مشہور شیعہ عالم کاشف الغطاء اور فلسطین کے مفتی اعظم محمد امین الحسینی، اس اجلاس سے قبل ہی کراچی پہنچ چکے تھے، اور سب نے یہی کہا کہ دعوت نامہ پر دستخط جس ہستی کے ثبت تھے اس کو دیکھ کر عذر کی گنجائش نہ تھی، ان کے علاوہ پاکستان کے اکثر اور ہندوستان کے بعض علماء اور بلادِ اسلامیہ کے تمام سفراء شریک رہے، البتہ الجزائر کے نامی گرامی عالم و خطیب و ادیب محمد البشیر الابراہیمی وقت پر تشریف نہ لاسکے بلکہ احتفال کے بعد کراچی پہنچے۔

احتفال کے اجلاس تین دن (۱۴-۱۵-۱۶ فروری کو) ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے، دوسرے کی مفتی اعظم فلسطین نے اور تیسرے کی جہاں تک خیال پڑتا ہے ایرانی عالم کاشف الغطاء نے فرمائی۔ ان اجلاسوں کی کارروائی عربی زبان میں انجام پائی جو ملتِ اسلامیہ کی مشترک اور دینی زبان ہے۔

اس "احتفال علمائے اسلام" کی افادیت خود حضرت والا رح کی زبانی سنیے، ایک مکتوب میں اپنے شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو تحریر فرمایا ہے:

"میرے نزدیک تو علمائے اسلام کا یہ اجتماع بجائے خود ایک تاریخ تھا حضرت شیخ کو اکبی نے سجل جمعیۃ القری میں جو خواب دیکھا تھا اس کی حقیقت یہاں عیاں تھی، اگرچہ اس بنا پر کہ یہ پہلا اجتماع تھا نقائص تھے، تاہم افادہ سے خالی نہ رہا، خصوصاً ایران و نجف کے علماء کی آمد سے مذاہبِ مختلفہ کے درمیان ایک خوشگوار حد تک دلداری و فرق کی راہ میں منزل طے ہوئی۔"

مگر اس کام کو انجام دینے کے لئے حضرتِ والا رح کو بے حد تعب اور ذہنی کلفت اُٹھانی

پڑی، بعض مقامی علماء کی خودغرضیوں اور جاہ پسندیوں اور جذبۂ مسابقت کی وجہ سے قدم قدم پر جو رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں اور ان کو دور کرنے میں حضرت والا رحؒ کو جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، ان کی بنا پر وہ یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ

"یوں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے اجتماعی کام کی صلاحیت جاتی رہی ہے، خودغرضی، نام و نمود اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ کوئی اجتماعی کام مشکل ہے۔"

چنانچہ اس کے بعد پھر حضرت علامہ نے نہ کوئی اجتماعی مہم اٹھائی نہ لوگوں نے ان کی عالمگیر شخصیت اور خداداد فراست و صلاحیت سے کچھ فائدہ اٹھایا۔

دیکھنے کی بات ہر واقعہ میں یہ ہے کہ سارا نقصان نفس کی کھوٹ سے ہے اور ہر نفع کا مدار نفس کی پاکی پر! ـــــ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی!!

مدرسۃ القرآن اور دائرۃ المصنفین

حضرت علامہ کی آرزو تھی کہ قدیم درسگاہوں کے فارغ التحصیل طلباء اور جدید کالجوں کے ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ طلباء جنہوں نے عربی یا اسلامیات میں ایم اے کیا ہو اور جن کو علومِ دین سے شغف بھی ہو، ان دونوں قسم کے طلباء کو ملا کر ایک باضابطہ درس کا سلسلہ قائم کیا جائے، جس میں صرف علومِ قرآنی کی اعلیٰ تعلیم ہو اور کلام اللہ سے استفادہ کے طریقوں کی تفہیم کی جائے ـــــ دوسری آرزو یہ تھی کہ دارالمصنفین (اعظم گڈھ) کی طرح کراچی میں بھی ایک اعلیٰ تصنیفی ادارہ قائم کیا جائے تاکہ صحیح اور مستند اسلامی لٹریچر سے قوم کو بہرہ مند کیا جا سکے، حضرت نے اس کا ایک خاکہ بھی بنایا تھا اور اس کے ارکان کی ایک فہرست[1] بھی تیار کر لی تھی جس میں علماء اور جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کا ایک خوش آئند امتزاج تھا ـــــ مگر سب سے بڑی رکاوٹ

---

[1] اس فہرست کے یہ چند نام ایسے ہیں جو اس وقت ذہن میں ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ مولانا ظفر احمد عثمانی

اس سلسلہ میں جگہ اور عمارت کی تھی۔ مسجد سلیمانیہ کے قیام، اس کی متعلقہ وسیع اراضی کے پیش نظر یہ دونوں تمنائیں پوری ہوتی نظر آرہی تھیں، اور حضرت والا پوری گرمجوشی سے اس جانب متوجہ تھے، مگر بُرا ہوا اہل ہوا و ہوس کا کہ یہ کارِ خیر بھی ان کے ہاتھوں مسدود ہو گئے ــــــــ اب حضرتِ والاؒ کی وہ عمر اور قویٰ میں وہ استحکام تو نہ تھا جس کے ساتھ ایسے کاموں کی بنیاد رکھی جاتی اور راستہ کے ہر سنگِ گراں کو پاش پاش کیا جاسکتا ہے۔ یہ توانائی وہ دارالمصنفین (اعظم گڈھ) کی تاسیس میں صرف فرما چکے تھے!!

نشرِ فیض اب تک حضرت والا کی جو خدمات گنائی گئیں، ان کا تعلق مسلمانوں کی عمومی اصلاح سے ہے۔ گو ان کا محرک محض امت اسلامیہ پر شفقت اور محبت کا جذبہ تھا جو ایک باطنی خلق ہے اور خلق بھی وہ جو "سلوک نبوت" کے رہرووں کے لئے مخصوص ہے، مگر نگاہ ظاہر بیں چونکہ صرف مظاہر کو دیکھتی ہے اور انہی پر حکم لگاتی ہے اس لئے ایسی صاحبِ اخلاص ہستیوں کے کارناموں اور قائدین قوم کے کاموں میں وہ امتیاز نہیں کرسکتی، اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ حضرت والاؒ کی مذکورہ خدمت اصطلاحی "ملی خدمات" میں شمار کی جائیں اور مصنف حقیر پر اعتراض ہو کہ ان کا ذکر اس کے موضوع سے خارج تھا خیر اب ہم خاص طور پر حضرت والا کے اس کارنامہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو انفرادی نفع تام یعنی تزکیہ اور باطنی تربیت کی صورت میں جاری رہا۔

بھوپال میں اور کراچی کے دورانِ قیام میں حضرت نے عصر و مغرب کا درمیانی وقت خاص طور پر ان تشنہ کاموں کے لئے وقف فرما رکھا تھا جو اپنی باطنی پیاس بجھانا چاہتے ہوں اور محبت و معرفت الٰہی سے سرشار ہونا چاہتے ہوں، اس روزانہ کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مولانا مفتی محمد شفیع۔ مولوی محمد شفیع (اورینٹل کالج لاہور) ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی وغیرہ۔

محفل کا جو رنگ تھا اس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا، یہاں یہ بتانا ہے کہ یہ وقت تو خاص اسی کام کے لئے تھا، مگر اس کے علاوہ سفر حضر میں بھی طالبین اور سالکین کا رجوع برابر قائم رہتا تھا اور کراچی کے بعد لاہور اس حیثیت سے خاص تھا، ـــــــ ایک مثال سے حضرت کے فیض جاریہ کا اندازہ ہوگا۔

لاکمیشن میں شرکت کے لیئے لاہور تشریف لے جایا کرتے تھے، دفتر کے ایک چپراسی نے اپنی بعض خانگی پریشانیوں کا ذکر کر کے دعا اور تلقینِ دعا کی درخواست کی، حضرت والا رح نے اس کے لئے بھی دعا فرمائی اور خود اس کو بھی کوئی دعا بتلا دی ، دوسری بار جب لاہور تشریف لے گئے تو اس چپراسی نے فرطِ مسرت اور عقیدت سے قدم پکڑ لئے اور بتلایا کہ ساری الجھنیں رفع ہوگئیں۔ ساتھ ہی درخواست کی کہ حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا جائے۔ حضرتِ والا نے خلاف معمول فوراً اس صاحبِ اخلاص کو بیعت فرما لیا، اور اس پر اس درجہ مسرور تھے کہ جب کراچی تشریف لائے اور یہ ناکارہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو پہلی بات یہی ارشاد فرمائی اور اس انداز سے کہ سننے والے کو اس درویش دل چپراسی پر رشک آگیا،

اہلِ جہان کے نقطۂ نظر سے اس "عامی" کے بعد ایک دوسری مثال اہل تخصیص کی بھی سنیئے، راقم حضرت والا رح کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک مشہور متبحر عالم اور صاحبِ اجازت بزرگ تشریف لائے، سلام و مصافحہ کے بعد کچھ دیر تو خاموشی رہی، پھر ان عالم نے فرمایا کہ "حضرت اضطراب نہیں مٹتا، دل ہمیشہ بے چین رہتا ہے!" حضرت والاؒ نیچی نظر کئے تشریف فرما تھے، ان جملوں کو سن کر حضرت والا رح کی نظریں ان کے چہرے پر جا پڑیں اور زبانِ فیض سے کلام اللہ کی صرف یہ پانچ لفظی آیت پاک بڑے اثر و گداز سے نکلی۔

"الا بذکر اللہ تطمئن القلوب!"

بس اتنا ہی فرمایا اور چُپ ہو گئے، ______ مگر اس کا اثر معلوم ہے کیا ہوا؟ جیسے کسی بخار کے مریض کو صحیح دوا پلا دینے سے پسینہ آکر بخار اتر جاتا ہے، اسی طرح یہ تیر سننے والے کے دل پر ایسا لگا کہ پہلے گریہ طاری ہوا اور پھر طبیعت کھُل گئی، اور

ع تا نہ گرید ابر کے خندد چمن

کا منظر آنکھوں نے دیکھ لیا!

غرض ان دو مثالوں سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ نشر فیض کا سلسلہ قیام خانقاہ کے بغیر اور بلا کسی مشائخانہ ظاہر داری کے کس طرح جاری تھا، اور دامنِ فیض میں کس طرح عامی و عالم، رند و زاہد سب کو پناہ مل جاتی تھی۔

میرے اس بیان کی تصدیق حضرت کے خواجہ تاش مولانا عبدالباری ندوی مدظلہ کے ایک جملے سے بھی صاف طور پر ہو جاتی ہے ______ حضرت والاؒ کی رحلت کے بعد جب میں نے اصلاح کا تعلق حضرت مفتی صاحب مدظلہ سے قائم کیا اور اس کی اطلاع مولانا عبدالباری صاحب کی خدمت میں کی تو موصوف نے جواب میں یہ تسلی عطا فرمائی تھی کہ:

> "یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ حضرت مفتی صاحب مدظلہ سے وابستہ ہو گئے۔ ع تا دمِ آخر دمِ غافل مباش! ______ ماشاءاللہ حضرت کا دامنِ فیض بھی حضرتِ مرحوم کی طرح وسیع ہے۔ ہر رنگ والے کو پناہ مل جاتی ہے!" ______ (۱۲/ اپریل ۵۴ء)

واقعہ یہ ہے کہ یہ بات نہ میرے پوچھنے کی تھی، نہ میں نے کبھی ایسی جسارت کی کہ خود حضرت والاؒ سے یہ معلوم کر لیتا کہ فیضِ سلیمانی کی وسعت کتنی ہے؟ البتہ خطوط جو آیا کرتے تھے ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ طالبین اور مریدین کی تعداد دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی، برصغیر ہند و پاکستان کے طول و عرض سے خطوط آتے میں نے خود دیکھے، بلکہ

رنگون سے بھی بعض طالبین کے خطوط آیا کرتے تھے ، ــــــــــ یہ وسعتِ فیض روز افزوں رہی اور اسکی عظمت اور بڑھ جاتی ہے جب زندگی کی اس مختصر مہلت کو پیشِ نظر رکھا جائے جو خلافت باطنی کے بعد حضرتِ والاؒ کے حصہ میں آئی ۔

حضرتِ اقدس کی وسعتِ فیض کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ غیر سلسلوں کے سالک بلکہ شیوخ تک کو بھوپال اور کراچی میں حضرت کی خدمت میں آتے اور مستفیض ہو کر لوٹتے خود اپنی آنکھوں نے دیکھا ، حضرات نقشبندیہ کو خصوصیت سے حضرتِ والا کی طرف کشش تھی اور خود حضرت کو بھی اس سلسلۂ عالیہ کے حضرات سے خاص انس تھا ،

بہرحال ع "متحد جانند مردانِ خدا"

کے مناظر بھی حضرت والا ہی کی بابرکت صحبتوں میں دیکھے ورنہ آج کل تو افتراق سے صوفیا کی مجالس بھی خالی نہیں ۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس وسعتِ فیض کے باوجود حضرت والاؒ نے اس عاجز و محجوب کے سوا کوئی خلیفہ نہیں چھوڑا۔[1] حالانکہ بھوپال ، حیدر آباد اور پاکستان کے بعض علاقوں میں ان کے دست گرفتہ ایسے ایسے لوگ بھی دیکھنے میں آئے جو تقویٰ و طہارت اور ان میں کے بعض فن دانی کے اعتبار سے بھی شاید اور جگہ خلافت کے ہر طرح مستحق ٹھہرتے۔

---

[1] دفع دخلِ مقدر کے طور پر بھی اور رفعِ سوئے ظن کی نیت سے بھی یہ وضاحت یہاں ضروری ہے کہ اپنی بے بضاعتی اور اس سے بڑھ کر "تنہا موقفی" اب جس استثنیٰ کا اظہار ہوا ہے اس کو چھپائے رہی اور چھپائے ہی رکھتی مگر جب حضرت مرشدیؒ کے وصال کے آٹھ نو برس بعد بعض بزرگوں خصوصاً حضرت مولانا عبد الباری ندویؒ جیسے انتہائی محتاط پیرِ طریقت کی طرف سے خلافت کی نوازش (جو نہ پہلے کسی پر ہوئی تھی نہ بعد میں) ہوئی تو یہ خاکپائے سلیمان عجب مشکل میں پڑ گیا تو اب قبل خلافت سلیمانی کو چھپا کر یا چھوڑ کر کسی اور بزرگ کی نسبت سے خود کو اس منصب کا حامل بتلانا ممکن ہی نہ

رہا۔ سراپا شفقت شیخ اقدس کی ۱۹۵۲ء ہی سے تاکید رہی تھی کہ

"یہ چیز اپنی ہی حد تک کب تک رہے گی اس کو دوسروں تک پھیلانا چاہیئے۔"

پھر مرض الموت سے قبل یہ وصیت فرمائی کہ

"میرے بعد اپنے ساتھیوں کا خیال رکھنا۔"

اور میری اس عرض پر کہ میرے پلّے تو کچھ بھی نہیں، یہ ارشاد کہ

"مجھ کو جو کچھ دینا تھا دے چکا۔" (تفصیل زیر عنوان "کلمۂ آخر" پہلے ہی سے موجود ہے)

اتنی تصریحات کے باوجود احتیاطاً اپنی مشکل کو بے کم وکاست محدث جلیل حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامبلپوریؒ (جو حکیم الامت کے اجل خلفاء میں سے تھے) کی خدمت میں پیش کر کے قولِ فیصل کی التماس کی، جواب ملا کہ اپنے شیخ اقدس سے خلافت صریح ہے اور دوسرے بزرگوں کی خلافتیں تائیدی و تاکیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ فالمنت للہ الکریم۔

اور ہاں جب اظہار ہی کی ٹھیری تو یہ بھی عرض کر دوں کہ حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ احقر کے اس موقف سے خوب واقف تھے، چنانچہ حضرت والاؒ کے حینِ حیات خود حضرت کے سامنے اور بعد وصال احقر کے غیاب میں، نیز میں ہو یا کہ محفل میں، جب احقر کا ذکر فرماتے تو نام کے بجائے ہمیشہ ہمیش "حضرت سیّد صاحب کے خلیفہ" ہی کے پُر شفقت اور بندہ نواز لفظوں سے یاد فرمایا کرتے تھے، حضرت کے سب منتسبین اسی لئے اس حقیقت سے واقف ہیں ؎

ما مئے بیانگ چنگ نہ امروز می کشیم
بس دَور شد کہ گنبدِ چرخ ایں صدا شنید

؎ ہندوستان کا پورا حال معلوم نہیں کہ حضرت والاؒ کی رحلت کے بعد ان کے کفش برداروں میں کون کون خلافت پا گئے۔ ایک میر علیم الدین صاحب حیدرآبادی اور دوسرے علی مَلّیا صاحب کرناٹکی کا معلوم ہے کہ جلد ہی حضرت مولانا ابرارالحق صاحب (خلیفۂ حکیم الامت) کے اجازت یافتہ بنے۔ پاکستان میں مولانا محمد اشرف خاں صاحب پشاوری کو اولاً تبلیغی جماعت کے مشہور بزرگ شاہ عبدالعزیز دعاجو رحمۃ اللہ علیہ نے اور پھر حضرت مولانا فقیر محمد صاحب مدظلہٗ (خلیفۂ حکیم الامت) نے بھی اجازت بیعت دی۔ حکیم امداداللہ صاحب حیدرآبادی ثم کراچوی نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ (خلیفۂ حکیم الامتؒ) سے خلافت پائی۔

رودادِ علالت

حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی صحت مدّت ہوئی کہ گر چکی تھی، کئی برس سے کام قوتِ جسمانی سے زیادہ ہمتِ باطنی ہی پر چل رہا تھا، خوراک برائے نام تھی، جوانی میں نیند کے کچے تھے[1]۔ اس کی تلافی برسوں کی کم خوابی نے کردی ـــــــــ کام میں اس قدر منہمک رہتے تھے کہ کبھی اپنی صحت یا بے صحتی کے خیال کی مہلت ہی نہیں پائی تھی، مگر اب "مرکز کار" سے دوری، تصنیف و تالیف سے مجبوری اور ہجوم افکار نے بڑھاپے کا احساس پیدا کردیا تھا،

حضرتِ والا رح کی علالت کا آغاز دراصل استسقائے قلبی کے عارضہ سے ہوا جو ۱۹۴۵ء میں اعظم گڈھ میں لاحق ہوا تھا، جس کی تفصیل اپنے مقام پر گذر چکی ہے کہ آٹھ دن تک لیٹنا تو درکنار بیٹھنا بھی محال ہوگیا تھا، دیوار کے سہارے کھڑے ہی کھڑے آٹھ دن گزارنے پڑے تھے، پھر رفتہ رفتہ بیٹھنے اور لیٹنے کے قابل ہوسکے، مگر اس مرض نے بعض مستقل اثرات چھوڑے، مثلاً تنفس کی شکایت ہمیشہ کے لئے رہ گئی کراچی میں قلب کے ماہر ڈاکٹروں نے بتایا کہ مدّت سے صرف نصف قلب کام کررہا ہے، بقیہ نصف معطل ہے، اسی طرح بے خوابی کی شکایت بھی تقریباً قائم ہوگئی تھی۔ ان عوارض کا لازمی نتیجہ ضعفِ اعصاب تھا،

---

[1] یہ مولانا دریابادی مدظلہٗ سے معلوم ہوا۔

ان مستقل اثرات کی تخفیف کے ساتھ بھوپال کے دورانِ قیام حضرتِ والا کی صحت عموماً ٹھیک ہی رہی البتہ دسمبر ۱۹۴۹ء میں سفر حج سے لوٹتے ہوئے جہاز ہی پر طبیعت بگڑی اور بمبئی پہنچ کر صاحب فراش ہو گئے تھے بخار اور تنفس قلبی نے شدت اختیار کر لی تھی، مگر علاج معالجہ سے پھر طبیعت سنبھل گئی۔

اس کے بعد جون ۱۹۵۰ء میں کراچی تشریف آوری ہوئی، یہاں کا موسم یوں بھی تندرست کو بیمار بنا دیتا ہے، حضرت والا کو جو عوارض لاحق تھے اور جن افکار میں یہاں کا ابتدائی زمانہ گذرا اس سے صحت بہت جلد گر گئی، خون بے حد کم ہو گیا اعصاب کمزور تر ہو گئے، حالت یہ تھی کہ جاڑوں کے موسم میں موٹی موٹی لحافوں میں بھی سردی لگتی تھی اور باہر جانا ہوتا تو اس قدر اہتمام فرماتے کہ بنیان پر کرتا، اس پر اُونی سوئٹر، اس پر گرم شیروانی اور پھر اس کے اوپر گرم لانبا کوٹ یا اونی شال اوڑھتے تھے۔ پاجامہ بھی گرم فلالین کا اور موزے بھی گرم پہنتے تھے، اس کے باوجود سردی کا اثر ہو کر رہتا، اور ہوا کے ہلکے جھونکے سے بھی تنفس تیز ہو جاتا تھا۔

انہی جاڑوں میں خس پوش جامع مسجد سلیمانیہ میں نمازِ فجر کے بعد درس قرآن کا سلسلہ جاری تھا جو محض ہمت و عزیمت کا کرشمہ تھا۔ راقم کی درخواست پر تفسیر کے ساتھ ساتھ ہفتہ میں دو دن (جمعرات وجمعہ) درس حدیث کا بھی آغاز منظور فرمالیا تھا پہلا ہی درس تھا مشکوٰۃ شریف کھول کر حدیث شریف "انما الاعمال بالنیات" کی تلاوت فرمائی اور اس کی تشریح فرمانے لگے، نومبر ۱۹۵۱ء کا آغاز کھلی مسجد اور سرد ہوا، یکایک ہم لوگوں نے دیکھا کہ آواز پست ہو گئی، اور غنودگی سی طاری ہونے لگی یہاں تک کہ الفاظ ناقابلِ فہم ہو گئے، مگر بیان جاری تھا میں نے گھبرا کر مشکوٰۃ شریف حضرت کے دستِ مبارک سے کھینچ لی، محفل برخاست ہو گئی رضوی صاحب[1]

---

[1] راحت علی رضوی صدر مسجد کمیٹی جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ انہی کی قسمت میں یہ سعادت لکھی تھی کہ روزانہ نمازِ فجر کے لئے حضرت والا کو اپنی کار پر مسجد لے آتے اور بعد درس قیام گاہ پر چھوڑ جایا کرتے تھے!!

اور دوسرے حضرات نے بغل میں ہاتھ دے کر حضرت علامہ کو اٹھایا اور بہ دقت تمام پاؤں گھسیٹتے ہوئے حضرت والا موٹر تک تشریف لائے، آج اتفاقاً سلمان میاں بھی موجود نہ تھے، موٹر کی پچھلی سیٹ پر حضرت کو لٹا دیا گیا۔ شیخ کا فرق مبارک اس مرید بے استحقاق کے زانو پر تھا، عجیب پریشانی کا وقت تھا لیکن جونہی موٹر کار "ڈار منزل"[1] پہ رُکی حضرت نے آنکھیں کھول دیں، مسکرا کر خادم کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ آپ نے تو مجھ کو بیمار سمجھ لیا حالانکہ نیند کا غلبہ ہو گیا تھا۔ بس یہ فرماتے ہوئے صافہ درست کرتے موٹر سے ایسے اترے کہ ہم لوگ سہارا بھی نہ دے سکے اور سیدھے اپنے کمرے میں جا بیٹھے۔ مگر دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ چہرۂ مبارک پر لقوے کے کچھ آثار ہیں، گو بہت خفیف!!

سلمان میاں اور عاصم صاحب کو واقعہ کی تفصیل علیحدگی میں بتا دی گئی فوراً ڈاکٹر میجر حسن کو بلوا لیا گیا، انہوں نے یہی بتایا کہ لقوہ کا ہلکا سا حملہ ہوا تھا مگر زائل ہو گیا۔ مگر آئندہ کے تحفظ کے خیال سے انجکشن کا ایک کورس تجویز کیا گیا اور مکمل آرام کی ہدایت کی گئی ـــــــ یہ سب کچھ ہوا مگر حضرت والارح کی ہمت عالی کا اثر دیکھئے کہ خود ان پر پریشانی کی پرچھائیں بھی نہ آنے پائی، ڈاکٹر جب انجکشن دے رہا تھا نواز راہِ مزاح حضرت نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب انجکشن پٹھے کا ہے یا رگ کا؟ پھر فرمایا کہ "رگ زدن" ایک فارسی محاورہ ہے اور اس پر فارسی کا ایک شوخ شعر سنایا، جس کو میرا ذہن محفوظ نہ رکھ سکا، اس کے بعد جب ڈاکٹر نے بتایا کہ انجکشن رگ کا نہیں پٹھے کا ہے تو اس پر ایک اور مزاحیہ جملہ ارشاد فرمایا کہ

"ڈاکٹر صاحب یہ پٹھے کچھ ٹھیک بھی ہوں گے یا یوں ہی اُلو کے پٹھے رہیں گے"۔

غرض ہفتہ عشرہ میں بات بالکل آئی گئی ہو گئی چہرۂ پُر جمال پر اثر تو تین ہی

---

[1] حضرت کی قیام گاہ۔

چار روز بعد ایسے زائل ہوا جیسے دیکھنے والوں کی نظروں نے دھوکہ ہی کھایا تھا ____

میں نے چونکہ حالتِ اضطراب میں دعائے صحت کے لئے ایک عریضہ حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ کی خدمت میں بھی لکھ دیا تھا جو اس وقت خود بھی صاحبِ فراش تھے اور شدید تعلقِ خاطر کی بنا، پر اس عریضہ نے حضرت ممدوح کو بے حد مضطرب بھی کر دیا تھا[1]، اس لئے سب سے پہلے صحت کا مژدہ بھی انہیں کی خدمت میں پہنچنا چاہیئے تھا، چنانچہ احقر نے حضرت والا رحؒ کی صحت یابی کی تشفی بخش تفصیل حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں لکھ بھیجی، اس سے حضرت ممدوح کو جس درجہ راحت و مسرت پہنچی اس کا اندازہ ان کے اس خود نوشتہ جوابی والا نامہ سے لگا لیجیئے، اور دیکھئے کہ اہلِ اللہ کے قلوب اخلاص و حب فی اللہ سے کس قدر پیوستہ ہوتے ہیں اور ان حضرات میں ایثار نفس اور تواضع کس درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ مکتوب پیش ہے:

مخدومی و محترمی ۔ السّلام علیکم

آپ کے اس عنایت نامہ سے حضرت سید صاحب کی صحت معلوم کر کے دل بہت خوش ہوا، حق تعالیٰ عافیت کے ساتھ ہم خدام پر ان

---

[1] حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ کے داہنے پاؤں میں ایک ناسور کوئی بیس بائیس برس سے گھر کئے ہوئے تھا، اس طویل مجاہدہ اور ہر طرح کے علاج معالجہ سے مجبور ہو کر بالآخر نومبر ۱۹۵۱ء میں پاؤں گھٹنے کے اوپر سے قطع کر دیا گیا، اس سانحہ کو شاید چند ہی روز ہوئے تھے کہ میرا عریضہ حضرت کی خدمت میں ہسپتال میں پہنچا اور سنا دیا گیا، حضرت صاحبِ فراش تھے، جواب انکے بھتیجے مولوی عرفان صاحب نے تحریر فرمایا کہ آپ کا خط سن کر حضرت اس درجہ مضطرب ہوئے کہ شدّت اضطراب سے بار بار پہلو بدلتے جاتے تھے اور زبانِ مبارک سے بے تابانہ صرف یہ نکل رہا تھا کہ "یا اللہ خیر، یا اللہ خیر" حضرت سید صاحب کی خیریت سے جلد مطلع کیجئے۔

مخدومی و محترمی السلام علیکم

آپکے اس عنایت نامہ سے حضرت حمید صاحب

کی صحت معلوم کرکے دل بہت خوش ہوا حق تعالیٰ

عافیت کیساتھ ہم خدام پر انکا سایہ رکھے

مکرر التماس یہ ہے کہ دل بہت خوش ہوا عجیب گھڑی

خوشی ہوئی کہ احقر نظر پڑکر حضرت صاحب

کیطرف ایسے دیکھتا کہ نظر بد کا اثر نہ ہو حق تعالیٰ

کمالات معنوی باطنی کیساتھ ظاہری صورت

بھی ایسی عنایت فرمائی کہ جسکی نظیر نہ ملے

حضرت کی خدمت میں ادب سے سلام و دعا و زیارت

اور یہ کہ احقر اسے الوداع پر گھر آگیا ہے

دو دن بھی صحت میں ترقی معلوم ہوتی ہے تو ابھی

درد لہر ضعف ہے محمد حسن

کا سایہ رکھے، مکرر التماس ہے کہ دل بہت خوش ہوا، سب گھر میں خوش ہوئے احقر نظر بھر کر حضرت سید صاحب کی طرف نہیں دیکھتا کہ نظر بد کا اثر نہ ہو، حق تعالیٰ نے کمالاتِ معنوی باطنی کے ساتھ ظاہری صورت بھی ایسی عطا فرمائی ہے کہ شاید نظیر نہ ملے۔

حضرت کی خدمت میں ادب سے سلام و درخواستِ دعا، اور یہ کہ احقر ۷، ا، نومبر سے گھر آگیا ہے، دن بدن صحت میں ترقی معلوم ہوتی ہے، گو ابھی درد اور ضعف ہے۔ محمد حسن۔

بات ذرا دور نکل گئی، اس علالت کے بعد سب عقیدت مندوں کے اصرار پر درس حدیث و تفسیر کا سلسلہ جاڑوں تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

اس کے چند ماہ بعد یعنی ۱۹۵۲ء کی گرمیوں میں حکومت کی قائم کردہ بنیادی کمیٹی کا اجلاس نتھیا گلی میں منعقد ہوا، حضرت والا کو بھی اس میں شرکت کرنی پڑی، آٹھ ہزار فٹ کی بلندی ان کے قلب و اعصاب کے لئے ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی، تنفس کا شدید دورہ پڑا، خون کا دباؤ بہت بڑھ گیا (حالانکہ عام حالت میں وہ نارمل سے کم ہی رہتا تھا)، خان عبدالقیوم خان[1] اور میاں ممتاز دولتانہ[2] کی خصوصی توجہ سے حضرت کو فوراً راولپنڈی کے ہسپتال میں پہنچایا گیا، یہاں کرنل سرور کی تشخیص بھی وہی رہی، پھر جب کراچی تشریف آوری ہوئی تو یہاں کے ماہرینِ قلب نے بھی اس تشخیص کو صحیح بتایا اور یہ بھی بتایا کہ صرف نصف قلب کام کر رہا ہے ——— میں تو حیران اس ہمت عالی پر رہتا تھا کہ مرض اور اس کی نوعیت معلوم ہونے کے باوجود حضرت والا کبھی مشوش نہ ہوتے تھے، چنانچہ یہ بات خود حضرت ہی نے مسکراتے ہوئے مجھے سنائی تھی کہ:-

---

[1] جو اس وقت صوبہ سرحد کے گورنر تھے۔ [2] جو حکومت پنجاب کے وزیر خزانہ تھے۔

"ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ ہمارا صرف آدھا قلب کام کر رہا ہے غنیمت ہے آدھا تو ابھی چل رہا ہے، کچھ دنوں میں پوری مشین گھس جائیگی۔ یہی تو ہوتا ہے۔"

یہ جملے اس طمانیت سے فرمائے گئے کہ گویا "مشین کے گھس جانے کا کوئی رنج ہی نہیں، بلکہ وہ گھس جانے کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔ کُلُّ شَیٔءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ کی قولی تفسیریں تو بہت پڑھی اور سنی تھیں مگر اس کو حال کے آئینہ میں دیکھنا اور سمجھنا شیخ عالی مقام کی صحبت ہی میں میسر آیا!

بہر کیف مرض کی یہ نوعیت جان لیوا ہی ثابت ہوئی، گو علاج بہت ہوتے رہے، ڈاکٹری بھی، یونانی بھی اور ہومیوپیتھک بھی!! ڈاکٹری علاج خاص طور پر کرنل رحمٰن مرحوم نے کیا جو بھوپال سے حضرت والا کے واقف و شناسا تھے، ہومیوپیتھی علاج محترم ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب مدظلہ کا ہوا اور کچھ خدمت کی سعادت راقم الحروف کے حصے میں بھی آئی، لیکن بعد کو سب سے بڑھ کر خدمت پوری فدویت و جاںنثاری کے جذبہ سے حکیم محمد نصیرالدین صاحب ندوی اجمیری نے انجام دی، جو گو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے باضابطہ مرید نہیں، لیکن عقیدت و محبت میں مریدوں پر بھی سبقت رکھتے ہیں اور خود حضرت شیخ بھی ان پر غایت درجہ شفیق و مہربان تھے، ——— حکیم نصیرالدین صاحب کی تجویز ڈاکٹروں سے مختلف نہ تھی مگر اتنی بات وہ پورے وثوق سے فرمایا کرتے ہیں کہ قضا و قدر سے ہٹ کر محض طبی نقطۂ نظر سے اس نیم جان قلب میں اتنی قوت و سکت تھی کہ کم از کم دس برس تک اس کے افعال باقی رہتے، مگر جو جراحتیں اپنوں کی احسان فراموشی، ناقدری اور ایذارسانیوں سے اس کو پہنچتی رہی تھیں اور وہ بلا آہ و کراہ سہتا چلا گیا تھا، اس سے وہ بہت جلد تھک کر رہ گیا، ——— ٹھیک ہے حکیم صاحب کا ارشاد، آخر

ع دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت !!

آخری سفرِ ہند یا زخموں کی تازگی

اسی آخر زمانہ (مارچ ۱۹۵۳ء) میں حضرت والا ہسٹاریکل کانگریس کی صدارت کے لئے تشریف تو ڈھاکہ لے گئے تھے جس کا ذکر چند صفحوں پہلے آچکا ہے مگر کانگریس کے اجلاس سے فارغ ہو کر واپسی کا سفر بری راستے سے اختیار فرمایا اور درمیان میں چند دنوں کے لئے اپنے داماد جناب سید حسین صاحب[1] کے ہاں فتحپور میں بھی قیام فرمایا اور ندوہ بھی تشریف لے گئے۔ اس مختصر قیام نے پچھلے زخموں کو ہرا کر دیا ـــــــ مہمان بھی متاثر اور میزبان بھی دلگیر!!

یہ روئدادِ درد ایک شریک بزم سوز کی زبانی سنیئے :۔

"ڈھاکہ سے کراچی واپس جانے لگے تو ہندوستان میں اپنے منجھلے داماد جناب سید حسین صاحب ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ[1] فتحپور ہنسوہ کے یہاں آکر ٹھہرے، یہیں دارالمصنفین کا ایک چھوٹا سا قافلہ سراپا محبت بن کر ان کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا۔ وہ اپنے کفش برداروں کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوئے، بڑے لطف و محبت سے پیش آئے اور وعدہ فرمایا کہ اس سال رمضان المبارک کے بعد دو مہینے دارالمصنفین میں آکر گذاریں گے جس سے دارالمصنفین میں ان کی روحانی اولادیں بہت خوش ہوئیں، اسی سفر میں دارالمصنفین کی مقناطیسی قوت نے ان کو اپنی طرف کھینچا اور وہ فتحپور سے کھنچ کر ندوہ چلے گئے، وہاں کے طلبا اپنے بچھڑے ہوئے باپ سے والہانہ انداز سے ملے اور وہ بھی اپنے مہجور فرزندوں سے مل کر اشکبار ہوئے، ان کے اعزاز میں

---

[1] حال ڈپٹی سکریٹری گورنمنٹ یو۔پی، لکھنؤ۔

جمعیۃ الاصلاح کی طرف سے جمالیہ ہال میں ایک جلسہ ہوا تو پورا بھر گیا
جب سید صاحب نے ہال کے زینہ پر قدم رکھا تو عمارت پر حسرت
بھری نگاہ ڈالی اور درد بھری آواز میں یہ شعر پڑھا ؎

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
میں اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

اس کے پڑھنے پر اُن کی طرح اور لوگوں کی بھی آنکھیں اشکبار ہو گئیں
جلسہ کی کارروائی تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوئی۔ قاری نے
شروع میں یہ آیت پڑھی :

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ	جب قافلہ چلا تو ان کے باپ
قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ	(یعنی حضرت یعقوبؑ) نے فرمایا کہ
رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ	میں یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں
تُفَنِّدُوْنَ (سورۂ یوسف)	اگر تم مجھ کو بے وقوف نہ بناؤ۔

اس کو سُن کر تمام حاضرین متاثر ہوئے۔ خود سید صاحب ضبط نہ فرما
سکے، بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا، ایک
طالب علم نے عربی میں سپاس نامہ پڑھا، جس کے بعد سید صاحب
نے بڑے درد بھرے انداز میں اپنی تقریر شروع کی، پوری تقریر
سوز و درد کا مرقع تھی، اس میں پاکستان کی ہجرت کے اسباب بیان
فرمائے اور آخر میں اپنے عزیز طلبا کو یہ پیام دیا ؎

سبق پڑھ پھر صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ندوہ کے طلباء کے نام ان کا یہ آخری پیام تھا" [1]

---

[1] سلیمان نمبر معارف ص۴۵۔ ص۴۶

مرض الموت اور اسکے دوران میں!

اپریل ۱۹۵۳ء میں حضرت والاؒ کراچی واپس تشریف لائے اور کچھ ہی دنوں بعد تنفس کا پھر دورہ پڑا اور مہینوں اس کا اثر رہا، جب کچھ کم ہوتا نظر آرہا تھا تو اگست میں نزلوی تحریک کے ساتھ پھر اس کا اعادہ ہوا اور ساتھ ہی حرارت بھی آگئی۔ اب کی مرتبہ کرنل رحمٰن اور حضرت کے فیملی ڈاکٹر فاروقی مرحوم کے علاوہ ڈاکٹر کرنل شاہ بھی شریک علاج ہو گئے۔ از سرِ نو قلب کا ایکسرے، کارڈیوگراف اور خون کا امتحان وغیرہ ہوا، تشخیص جو پہلے ہو چکی تھی وہی قائم رہی۔

اب حضرت والاؒ نے اپنا پلنگ ڈرائنگ روم میں ہی بچھا رکھا تھا اور وہیں لیٹے رہتے تھے اور باوجود ساری تکلیف کے آنے والوں کو محروم زیارت نہ فرماتے تھے، بلکہ طاقت و توانائی نہ ہونے کے باوجود دقیق دقیق مسائل پر بھی کسی کی طلب دیکھ کر طول طویل گفتگو فرماتے تھے اور دورانِ گفتگو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اپنے مرض کو بھول گئے ہیں مثلاً دو تین واقعات درج ذیل ہیں:۔

(۱) ایک مرتبہ راجشاہی یونیورسٹی کے ایک لیکچرر تشریف لائے۔ سلام ومزاج پُرسی کے بعد انہوں نے وحدت الوجود کا مسئلہ چھیڑ دیا تھا حضرت نے معذرت فرمائی کہ میں اپنی صحت سے مجبور ہوں مگر تھوڑی دیر بعد خود ہی مسلسل ایک گھنٹہ تک اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے رہے، لیکچرر صاحب اُلجھتے رہے اور انکی تسلی نہیں ہو پاتی تھی، چنانچہ انہوں نے پھر سوال کیا تو ارشاد فرمایا کہ بھائی بس اب دم نہیں رہا، ہاں اس سلسلہ میں سعدی کے دو شعر سن لیجیے۔

یکے قطرہ از ابرِ باراں چکید	خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من کیستم	گر او ہست حقا کہ من نیستم

ان اشعار کو سن کر لیکچرر صاحب جھوم گئے، کہنے لگے کہ ہزاروں مرتبہ یہ اشعار

سنے تھے لیکن ان کے مطلب کو نہیں سمجھا تھا. اب وحدۃ الوجود کا مسئلہ سمجھ گیا۔ اب صرف ایک گذارش یہ ہے کہ خط وکتابت کی اجازت عطا ہو۔ ارشاد فرمایا، بڑے شوق سے! [1]

یہ ہوتی ہے "صاحبِ نسبت" ہستیوں کی ضرب کہ جب مخاطب کی فہم کو عاجز پاتے ہیں تو زبان روکنے سے قبل ایک سادہ سی بات کے ذریعہ راست اس کے قلب میں اس مفہوم کو اتار دیتے ہیں!

(۲) اسی طرح کچھ دنوں کے بعد کراچی کے ایک پروفیسر آئے۔ غالباً فلسفہ یا تاریخ اسلام ان کا خاص موضوع تھا، وہ اپنی استعداد کے متعلق حضرت کی تصدیقی تحریر کے متمنی تھے۔ فرمایا کہ یہ تو ایک قسم کی شہادت ہے اور شہادت بغیر ذاتی واقفیت کے ہونا دیانت کے خلاف ہے اس جواب سے پروفیسر صاحب افسردہ سے ہو گئے۔ حضرت والارح سے ان کا یہ تاثر بھی دیکھا نہ گیا آخر چند سوالات فرمائے جس کا وہ جواب دیتے رہے، پھر ایک ذرا دقیق سوال کیا گیا جس کا تشفی بخش جواب نہ مل سکا اس کے بعد دریافت فرمایا گیا کہ اس موضوع پر جو خاص کتابیں زیر مطالعہ رہی ہوں ان کے نام بتائیں، انہوں نے اپنی حد تک بتا دیئے۔ اس کے بعد خود حضرت والا نے اردو، عربی اور میں حیران تھا کہ بیسیوں انگریزی کتابوں کے نام لے لے کر پوچھنا شروع کیا کہ یہ کتابیں کیا آپ نے نہیں دیکھیں؟ پروفیسر صاحب کا چہرہ عرق آلود ہو گیا اور ان کو اپنے کوتاہی علم کا پورا احساس ہو گیا، اس کے بعد حضرت والارح نے مناسب تحریر عطا کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے اصل مسئلہ کی خود وضاحت فرما دی۔

---

[1] یہ واقعہ میں نے محترم عاصم صاحب کے مضمون مندرجہ سلیمان نمبر سے نقل کیا ہے، میں خود اسوقت موجود نہ تھا۔

دراصل بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ " اسلام میں غیر اسلامی عناصر کہاں کہاں سے اور کب داخل ہوئے ؟" جب حضرت والا رح اس کی تشریح فرما رہے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس موضوع پر تیار ہو کر بیٹھے ہیں، گفتگو ٹھہر ٹھہر کر فرما رہے تھے مگر تسلسل کے ساتھ معلومات کا سیلاب تھا کہ امڈا چلا آتا تھا، فلسفۂ یونان سے لے کر حالیہ دور کے فلسفہ کی تاریخ ارتقاء اور ساتھ ساتھ اس پر نقد و تبصرہ اور مختلف یونانی، کلامی، اصطلاحات کی فن لسانیات (فیلالوجی) کے اعتبار سے تحقیق بڑے ماہرانہ اور محققانہ انداز کی بیان فرمادی اور دراصل ماہرانہ طرز تعلیم کا ڈھنگ سکھا دیا۔

(۳) ایک اور دلچسپ واقعہ جو اب تک ذہن میں تازہ ہے سن لیجیے"، رحلت سے صرف چار روز قبل (۱۹ نومبر ۱۹۵۳ء) مغرب کے فوراً بعد جب حضرت والا نماز سے فارغ ہو کر حسبِ معمول پلنگ پر لیٹے لیٹے ہم لوگوں سے مخاطب تھے کہ سفیر شام، ان کے مشیر ثقافت (کلچرل اٹیچی) اور دو افراد کے ساتھ تشریف لائے۔ حضرت والا رح اٹھ بیٹھے مگر سفیر صاحب نے باصرار لیٹے رہنے کی درخواست کی، اور خود سرہانے کے قریب کرسی پر بیٹھ گئے مزاج پرسی کے بعد سفیر صاحب نے فرمایا کہ مجھ کو ایک علمی الجھن ہے جو کئی علماء سے حل نہ ہوسکی، وہ یہ ہے کہ یہودیوں کے متعلق قرآنِ پاک میں یہ تصریح موجود ہے کہ

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (بقرہ)	دے ماری گئی ان پر رسوائی اور فقیری۔

اور احادیث نبوی سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم کبھی دنیا میں باآبرو حاکم قوم نہیں رہے گی پھر آج فلسطین میں ان کی حکومت کیسے قائم ہے؟

حضرت والا رح نے ایک لمحہ تامل کے بغیر فرمایا کہ اس کا جواب تو قرآن پاک ہی میں خود موجود ہے۔ راقم حقیر نے اشارہ پا کر حمائل شریف پیش کر دی اور حضرت والا رح

نے فوراً سورۂ آلِ عمران کی یہ آیتِ پاک نکال کر سنا دی کہ :۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ	ماری گئی ان پر ذلت جہاں کہیں
اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ	بھی پائے جائیں گے بجز اسکے کہ
مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ	وہ اللہ تعالیٰ کی رسی تھام لیں، یا
(آلِ عمران)	الناس کی رسّی ۔

اور اس کی تشریح میں فرمایا کہ حبل اللہ تو دین اسلام ہے اور "حبل الناس" سے مراد ورلڈ پاور (عالمی طاقت) ہے، یعنی وہ دین میں داخل ہو جائیں یا کسی عالمی طاقت کا سہارا لے لیں تو البتہ ان کی ذلت دور ہو سکتی ہے، چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ اسرائیل کی حکومت محض انگریز و امریکہ کے بل بوتہ پر قائم ہے!_______ اس جواب سے سفیر شام اچھل پڑے اور فرمایا کہ واللہ آج تک کسی نے اس آیتِ پاک کی طرف رہبری نہیں کی تھی، آج پوری تشفی ہو گئی۔

اس کے بعد سفیر مذکور نے جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت سے متعلق حضرت والا کی شخصی رائے دریافت فرمائی _____ ارشاد ہوا کہ

"جماعت اسلامی دین کی سیاسی تعبیر پیش کرتی ہے اور تبلیغی جماعت دینِ خالص کی داعی ہے۔"

سفیر صاحب کی ذہانت اس جواب کی گہرائی کو پا گئی اور انہوں نے اظہار مسرت و تحسین فرمایا، پھر عقیدت و محبت کے لہجہ میں ایک اور سوال کیا کہ مولانا مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی میں آپ کے نزدیک کون بڑا عالم ہے؟ جواب بغیر تقابلی طرز اختیار کئے ہوئے صرف یہ عطا ہوا کہ :۔

"مولانا ابوالحسن علی ندوی تو ایک بڑے عالم ہیں"۔

اس پر سفیر صاحب نے کہا، خوب خوب!!،

پھر تیسرا سوال یہ کیا گیا کہ سب سے بہترین تفسیر قرآنِ پاک کی کونسی ہے؟

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ کسی ایک تفسیر کا نام لینا دشوار ہے، اس لئے کہ ہر تفسیر اپنے اپنے وقت کے تقاضوں کے ماتحت لکھی گئی ہے اور لکھی جاتی رہے گی۔ قرآنِ پاک کے مطالب و معنی کبھی ختم نہ ہوں گے اس لئے کوئی تفسیر بھی سب سے بہترین تفسیر نہیں ہو سکتی۔

سفیر صاحب نے اس جواب سے بڑا حظ پایا اور حصولِ بصیرت کا اعتراف کیا۔

ادھر ان کے فاضل مشیر ثقافت ابوالخیر عرقسوسی بھی حضرت والا رح کے جوابات پر جھوم رہے تھے۔

اس کے بعد سفیر صاحب نے حضرت والا رح کی صحت کے لئے دعا کرتے ہوئے اجازت چاہی اور رخصت ہو گئے۔

آخری احوال حضرت والا رح کے آخری احوال شیخ الشیوخ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی طرح نظر آئے، بلکہ خود بھی دو ایک بار اس احقر سے حضرت نے ارشاد فرمایا کہ:۔

> "ہمارے حضرت والا رح پر آخر زمانہ میں یہ حال طاری ہو گیا تھا کہ اپنی تصنیفات کے اہم اہم مضامین کو یکجا فرما دیں، چنانچہ بوادر النوادر کی تالیف اسی جذبے کے تحت ہوئی تھی ——— میرا بھی جی بس اب یہی چاہتا ہے کہ میرے منتشر مضامین فن واری تقسیم کے ساتھ یکجا ہو جائیں۔" [1]

---

[1] الحمد للہ کہ اس آرزو پر مطلع ہو کر شاہ معین الدین صاحب (مدیر معارف) نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اطلاع ملی ہے کہ پہلا مجموعہ مضامین "علوم القرآن" پر مشتمل ہوگا۔ اللہ تعالے اسی طرح حدیث، فقہ، فلسفہ، کلام اور تاریخ وغیرہ کے مضامین کی جمع و ترتیب کروا دے کہ نقوشِ سلیمانی اسلامی علوم و فنون کے ہر باب کو مزین کئے ہوئے ہیں۔

پھر مسکراتے ہوئے ازراہِ لطف فرمایا کہ
"اچھا یہ بتایئے کہ میرے کل مضامین کی تعداد کیا ہوگی؟"
نادم ہوکر عرض کیا کہ میری نظر میں کل مضامین تو نہیں ہیں، البتہ قیاس یہ ہے کہ دو ڈھائی سو تو ضرور ہوں گے، ارشاد فرمایا:
"نہیں، اس سے بھی (یا بہت) زائد ہیں میرے مضامین مولانا شبلی علیہ الرحمۃ سے کافی زائد ہوں گے"۔

یہ تو تصنیفات سے متعلق توافقِ حال تھا شیخ الشیوخ کے حال سے!! اب جہاں تک ام الاحوال یعنی تعلق مع اللہ اور تعلق مع الخلق کی بات ہے، آخر زمانہ میں قلبِ مبارک ہر غیر سے بالکل منقطع اور ذاتِ رب کے ساتھ تمام تر وابستہ ہوگیا تھا۔ گویا "فَاِذَا فَرَغتَ فَانصَب" کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے تھے، گھنٹوں تنہا لیٹے رہتے اور اسی تنہائی کو پسند کرتے تھے۔ میل ملاپ اور ہر شغل غیر سے دل بیزار تھا۔ بس دو تین ہی خوش نصیب ایسے تھے جن سے طبیعت کو انشراح کامل حاصل تھا ان سے البتہ مل کر خوش ہوتے تھے اور ملنے والے کو مسرور فرما دیتے تھے چنانچہ ایک واقعہ سنیئے:

ایک روز ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ تشریف لائے، حضرت والا نے ارشاد فرمایا:
"ڈاکٹر صاحب ذرا میرے دل کی حالت تو دیکھئے!"
ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "الحمدللہ لاکھوں سے اچھا ہے"۔
معاً ارشاد فرمایا کہ "لاکھوں سے بُرا بھی تو ہے"۔
پھر فرمایا کہ "دیکھ بھی لیجئے!" ـــــــــ ڈاکٹر صاحب نے آلۂ سماع الصوت[1]

---

[1] حرکت قلب سننے کا آلہ جس کو انگریزی میں "اسٹتھس کوپ" کہتے ہیں۔

ساتھ نہ ہونے کا عذر فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ

"سنتا آلہ ہے یا انسان کا کان"

اس سوال کے ساتھ ہی اپنا گریبان کھول دیا اور ڈاکٹر صاحب سے فرمایا کہ کان لگا کر قلب کی حرکت سنیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے تعمیلِ ارشاد کی تو مسکرا کر فرمانے لگے کہ

"بس یہی چاہتا تھا کہ آپ کا کان مس کر جائے"۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ تلبس کی یہ سعادت تو خود مجھ کو بخشی گئی ہے۔ حضرت والا مسکرا دیئے!

بات ختم ہوگئی، کچھ دیر بیٹھ کر جب ڈاکٹر صاحب تشریف لے جانے لگے، تو معذرت فرمائی کہ میں نے حضرت کا کافی وقت لے لیا حضرت والارح نے فرمایا کہ میں تو دن رات بیکار پڑا رہتا ہوں، مجھے کام ہی کیا ہے؟

اس ارشاد پر ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے ایک مصرعہ کیا خوب موزوں فرمایا جو حضرت کی حالت کا آئینہ دار تھا، فرمایا کہ حضرت بیکار رہنے میں حضرت کا تو یہ حال ہے کہ ؎ "بہت مشغول رکھتا ہے دل با ماجرا مجھ کو"

حضرت والارح نے معنی خیز تبسم کے ساتھ فرمایا:

"کاش ایسا ہوتا!"

واقعہ بیان ہوچکا، اب اس کی ایک تصدیق بھی ملاحظہ ہو، انہی دو چار دنوں میں ایک روز شام کو احقر حاضرِ خدمت تھا حضرت والا آنکھیں بند کئے بلکہ ایک ہاتھ سے چہرۂ مبارک کو چھپائے ہوئے لیٹے تھے، گویا سو گئے ہیں، ایسے میں نقشبندیہ سلسلے کے ایک صوفی صاحب تشریف لائے اور چپکے سے بیٹھ گئے، ان کو ملنا عاصم صاحب سے تھا، مجھ سے حضرت کی خیریت دریافت فرمائی، مختصراً عرض کر دی

گئی، ایسے میں صوفی صاحب جو حضرت والاؒ کے روبرو بیٹھے ہوئے تھے، دفعتہً مراقب ہوگئے اور اس وقت تک رہے جب تک عاصم صاحب باہر نہ آگئے یعنی کوئی دس پندرہ منٹ!! ——— بات آئی گئی ہوگئی، حضرت کی رحلت کے بعد ایک روز جب ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے صوفی صاحب سے اس یکایک مراقبہ کی تفصیل پوچھی تو فرمایا کہ:۔

"میں یہ سمجھ کر کہ حضرت سیّد صاحب محوِ خواب ہیں آپ سے بات کر رہا تھا کہ ایسے میں مجھ سے کسی بزرگ نے فرمایا کہ بیٹھے کیا ہو یہ تو لوٹنے کا وقت ہے سید صاحب کی طرف متوجہ ہو جاؤ، چنانچہ میں ان کے قلب مبارک کی طرف متوجہ ہوا تو انوار کی بارش ہو رہی تھی۔"

لیجئے اب تو ڈاکٹر صاحب کے مصرعہ کا یقین آگیا کہ

ع "بہت مشغول رکھتا ہے دل با ماجرا مجھ کو"

بحمد اللہ سبحانہٗ کہ حضرت اقدسؒ کو انقطاع کامل اور ذاتِ حق کا حضور دائم حاصل تھا، ——— اور ان کے منتسبین میں جو جانتے تھے ان کا تو دستور یہی تھا کہ حضرت والاؒ متوجہ ہوں یا نہ ہوں، کلام فرمائیں یا نہ فرمائیں اپنے قلوب کو اس چشمۂ فیض کی طرف متوجہ رکھتے تھے اور بڑی سکینت پاتے تھے ——— وہ سکینت جو قیل وقال سے پیدا نہیں ہوسکتی!!

ایک اور خاص بات طبیعت کی لطافت اور احساس کی نزاکت کی تیزی تھی جو چیز سامنے آتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ حضرت اقدس سے اس کی اصلیت بلا قصد و ارادہ بھی چھپ نہ سکتی تھی، چنانچہ ایک واقعہ سے اس کا اندازہ ہوگا، ———

ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب مدظلہٗ کی دوا حضرت والا استعمال فرما رہے تھے، ——— ہومیوپیتھی اصول کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے چونکہ اونچی طاقت کی دوا دی تھی اس

لئے چند روز کا توقف ضروری تھا، نفسیاتی تشفی کے لئے البتہ چند پڑیاں سادہ گولیوں کی باندھ کر بھجوادی تھیں کہ روزانہ ایک پڑیا استعمال فرمایا کریں۔ حضرت والاؒ نے پہلی ہی پڑیا، ان میں کی جب استعمال فرمائی تو زبان پر گولیوں کے آتے ہی احقر سے فرمایا کہ :-

"ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیجئے کہ میں کوئی نادان بچّہ تو نہیں، اگر دوا کی ضرورت نہ تھی تو فرمادیتے کہ اتنے روز تک کسی دوا کی ضرورت نہیں یہ سادہ گولیاں باندھنے کی کیا ضرورت تھی، میں دیدہ ودانستہ تو ان سے تشفی نہیں پا سکتا۔"

مجھے اس نزاکتِ احساس پر حیرت ہوئی، دوسرے روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ بات پہنچادی تو ڈاکٹر صاحب بھی حیران رہ گئے اور فرمایا کہ یہی نہیں کہ سادہ گولیاں دی تھیں بلکہ ان میں صاف الکحل بھی جذب کردی تھی تاکہ کوئی شبہ ہی نہ پیدا ہوسکے[۱]۔ مگر اللہ رے لطافتِ احساس کہ پھر بھی پہچان ہی لیا!

اسی طرح کوئی شخص ادنیٰ انقباض یا کھوٹ لے کر خدمت والا میں حاضر ہوتا تو اس کا اثر قلبِ مبارک پر فوراً پڑجاتا تھا اور گو اظہار نہ فرماتے تھے مگر چاہتے یہی تھے کہ یہ غیر مخلصانہ صحبت جلد سے جلد ختم ہوجائے، اسی طرح عام طور پر میل ملاپ سے احتراز ہی فرمانے لگے تھے، میں نے ایک مرتبہ جرأت کرکے یہ بات عرض کر ہی دی کہ مجھ ناکارہ کا یہ احساس ہے کہ حضرت والاؒ کو اب لوگوں سے ملنے میں تعب ہوتا ہے تو اپنے ننھے نواسے عادل میاں سلمہٗ کو چھیڑتے ہوئے

---

[۱] ہومیوپیتھک دوا میں جو کچھ ذائقہ یا بو ہوتی ہے وہ الکحل اور شکر ہی کی ہوتی ہے ورنہ دوا تو اپنا کوئی ذائقہ نہیں رکھتی، اس لئے بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی محض چکھ کر بتا نہیں سکتا کہ کیا دوا ہے؟ یا یہ کہ ہے بھی یا نہیں؟۔

بکمالِ بلاغت فرمایا کہ:۔

"بس ہمارے دوست تو یہ اچھے ہیں، دل میں کچھ رکھتے نہیں،
بگڑتے ہیں تو نانا ابا کو مار بھی دیتے ہیں۔"

چنانچہ پھر اپنے اس معصوم نواسے کے ساتھ کھیلنے لگ گئے۔

حضرت اقدس کے اس جملہ اور حال سے اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ "فِطْرَۃَ اللّٰہِ الّتی فطر النّاس علیھا[1]" والی معصومیت کی طرف عود فرما چکے تھے اور اب اس دنیائے مکروفریب کا ایک ایک لمحہ ان کے لئے شاق تھا۔ بندہ کا نفس راضیۃً مرضیۃ کے نقطۂ کمال پر پہنچ کر اب مولیٰ کے اشارہ "ارجعی الی ربک" کا منتظر تھا۔

ع یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

---

[1] ارشاد قرانی ہے، مفہوم یہ کہ حق تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا فرمایا ہے۔

رحلتِ شیخ

یوم وداع کی کرامات انتظار کی مدت اب تمام ہوتی جارہی ہے اور کسی عارف کے بقول ؎

من ز تن عریاں شدم او از خیال
می خرامم در نہایات الوصال

کا مرحلہ اب قریب ہے، اتوار ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ (م ۲۲، نومبر ۱۹۵۳ء) کی شب بس آنکھوں ہی آنکھوں میں گذری، پچھلی رات کو قلب کا ایک دورہ پڑا، تنفس تیز ہوگیا، پیرانی صاحبہ پریشان ہوگئیں، عاصم صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو لانا چاہا مگر ارشاد ہوا:

"ابھی نہ جاؤ، ڈاکٹر صاحب سو رہے ہوں گے، نماز فجر کے بعد جانا"۔

صبح ہوئی ڈاکٹر صاحب بلائے گئے مگر ان کے پہنچنے تک حضرت والا کی طبیعت بہتر ہوچکی تھی، ڈاکٹر نے بھی تصدیق کردی کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے، لیکن دراصل طبیعت نے یہ آخری سنبھالا لیا تھا اور غالباً منشائے خداوندی یہ تھا کہ اہل و عیال سے آخری مرتبہ ضرورت کی گفتگو بھی ہوجائے اور خود کوچ کرنے والے کی بھی تشفی ہوجائے کہ قدرت کا دستِ کرم اس کے پسماندوں کے سر پہ قائم ہے ——
چنانچہ دونوں ہی باتیں پورے اطمینان سے ہوگئیں۔

پہلے حضرت والا نے تنہائی میں اپنے بھتیجے اور داماد جنابِ عاصم کو طلب فرمایا اور ان سے یہ گفتگو فرمائی :-

س۔ عاصم میاں!

ع۔ جی!

س۔ آپ کو والد صاحب کی خدمت کا موقع نہیں ملا!

ع۔ جی نہیں (کیونکہ تعلیم سے فراغت کے بعد پہلے تو مہلت ہی کم ملی اور جو وقت ملا اس میں بھی قرب بہت کم حاصل رہ سکا)

س۔ تمہیں والدہ کی خدمت کا بھی موقع نہیں ملا!

ع۔ جی نہیں! (وہی تعلیمی مشغولیت اور قیام علی گڑھ کی وجہ سے)

س۔ (حسرت بھری نگاہ اور لہجۂ درد میں) لیکن اس مرتبہ تمہیں موقع مل گیا!

ع۔ (بلبلا کر) میرے باپ! میں نے آپ کی کوئی خدمت نہ کی!

اس پر حضرت والا مسکرا دیئے ــــــ گویا زخم پر مرہم رکھ دیا اور رخصت فرمایا، عاصم صاحب سمجھ نہ سکے کہ یہ قیامت تک کے لئے وداعی پیام ہے۔

اس کے بعد اہلیہ محترمہ کی طرف خطاب کا رُخ ہوا، دریافت فرمایا گیا کہ :-

"آپ عاصم کے ساتھ مطمئن ہیں[1]؟"

اہلیۂ محترمہ نے بات ٹالنے کی کوشش کی کہ یہ بھی کوئی سوال ہے؟

مگر وہاں تو اتمام حجت اور اطمینانِ آخر مقصود تھا، اصرار ہوا کہ میرے سوال کا

---

[1] حضرت والا رح نے یہ بات پیرانی صاحبہ کی مرضی پر چھوڑ دی تھی کہ وہ خواہ عاصم صاحب کے ساتھ منتقل سکونت تجویز کر لیں یا سید حسین صاحب کے ساتھ، کیونکہ ابھی صاحبزادہ سلمان زیر تعلیم تھے اور گو بڑے صاحبزادے سید سہیل (انسپکٹر کسٹمس چاٹگام) اس خدمت کے پہلے حق دار اور اس سعادت کے دل سے خواہاں تھے، مگر چونکہ ان کی معاشی حالت اچھی نہ تھی اور ملازمت بھی ایسی ہے کہ کسی ایک جگہ قرار نہیں، اس لئے دونوں داماد ہی میں قرعہ پڑ گیا تھا اور یہ اسی کے نام اٹھا جس کو دوہری نسبت حاصل تھی،

جواب دیجیے، بیکار باتوں میں نہ الجھایئے۔ تب اہلیہ محترمہ کو فرمانا ہی پڑا کہ :۔

"بے شک" (عاصم کے ساتھ مطمئن ہوں)

اس جواب سے حضرت والارح بھی مطمئن ہوئے اور فرمایا۔ "الحمدللہ میرا قلب بھی بہت مطمئن ہے!" ———— گفتگو ختم ہو چکی۔[1]

اطمینان وسکون کے ساتھ اہل وعیال سے یہ آخری وداعی گفتگو خود ایک اعلیٰ کرامت ہے، جو اتباع سنت کے صدقہ میں کسی کو مل جاتی ہے۔ مگر اس کے علاوہ بھی ایک حسّی کرامت کا ظہور ہو گیا جس میں رخصت ہونے والے کو دکھایا گیا کہ اس کے غیاب میں قدرت کا دستِ کرم اس کے پسماندگان کا دستگیر رہے گا، ہوا یہ کہ اُسی آخری دن نماز ظہر کے بعد حضرت پیرانی صاحبہ حسبِ معمول حضرت کی صحت کے لئے دعا مانگ رہی تھیں کہ یکایک ایک سفید پوش ہستی دفعتہً نمودار ہوئی اور اس نے دودھیا رنگ کا گلاس محترمہ (مدظلہا) کی خدمت میں پیش کیا، محترمہ نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیئے، اور پیچھے مڑ کر حضرتِ والا سے (جو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے) عرض کیا کہ :

"آپ نے کچھ دیکھا ؟"

جواب ملا۔ "کیا ہوا ؟"

پیرانی صاحبہ نے اپنا مشاہدہ بیان کیا، تو خلافِ عادت اس کی تصدیق فرمائی، اور پورے اطمینان سے ارشاد فرمایا :۔

"یہ آپ کی تسکین کا سامان کیا گیا ہے۔"

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ بندہ اپنے رب سے کوچ کا اشارہ پا چکا[2] تھا۔ اب اندازہ لگایئے کہ کس راحت وسکون سے، کس یکسوئی اور اشتیاق سے بندہ کی روح

---

[1] تشریحی فقرات کے سوا اصل گفتگو سب محترم عاصم صاحب کے مضمون محولہ سابق سے ماخوذ ہے۔

[2] ورنہ از روئے احادیث یہ معاملہ حضرات انبیاء کے ساتھ خاص ہے!

اپنے رب کی طرف پرواز کر گئی ہوگی!

شامِ وداع کا منظر اتوار کا دن اب ختم ہونے کو ہے، عام دنوں سے آج صحت چونکہ زیادہ بہتر نظر آئی، اس لئے اہلیۂ محترمہ نے شام میں کچھ دیر کے لئے کسی عزیز کے ہاں جانے کی اجازت چاہی ــــــــ بہت دنوں سے جانا چاہتی تھیں، مگر حضرت والا کی طبیعت کے آثار چڑھاؤ سے ارادہ ملتوی ہوتا چلا جارہا تھا، آج اس کا اظہار قدرت کی طرف سے مقدر تھا حضرت والاؒ نے فرمایا :-

"ضرور جایئے، مگر جلد واپس آیئے، ایک گھنٹہ کا وقت ہے"۔

اس جواب کے آخری جزء پر سننے والوں کی توجہ ٹھیر نہ سکی، مگر جب وقت گذر گیا تو وہی بات یاد آآکر تیرِ پیوستہ کی طرح کھٹکتی رہی۔

بہرحال پانچ بجے پیرانی صاحبہ صاحبزادیوں کو لے کر چلی گئیں، حضرت والاؒ کے پاس صرف ان کے قابلِ رشک خدمت گذار فرزند سلمان میاں موجود تھے اور گھر میں عاصم صاحب بھی! ــــــــ عصر کے فوراً بعد میری حاضری کا وقت بھی تھا، مگر ہائے رے محرومی کہ آج ہی لہو ولعب میں کچھ ایسی دیر ہوگئی کہ میں برسوں کے معمول کے خلاف مغرب سے قبل پہنچ ہی نہ سکا، میرے ہم وطن پیر بھائی مشتاق جوہری آج قبلِ مغرب حاضر تھے، حضرت اقدس نے ان سے فرمایا کہ رات پھر تنفس کا دورہ پڑ گیا تھا مگر اب اچھا ہوں ــــــــ ایسے میں نمازِ مغرب کا وقت آگیا، سلمان میاں نے ضروری اہتمام فرمایا، حضرت والاؒ نے دوزانو بیٹھ کر اور سامنے دو تکیئے رکھ کر بیٹھے بیٹھے نماز ادا فرمائی، اور نماز سے فارغ ہوکر متبسم ہوئے، صاحبزادے نے جاں نثاری کے ساتھ تبسم کی وجہ پوچھی، فرمایا :

"آج میں نے شوکت علی مرحوم کی سی نماز پڑھی ہے"۔

سلمان میاں نے اس کی وضاحت چاہی تو ارشاد فرمایا :-

"وہ بھی اسی طرح بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے"۔[1]

اس کے بعد صاحبزادے نے عرض کی کہ "ابا سو جایئے، آپ رات کو بھی نہیں سوئے ہیں"۔

حضرت نے فرمایا "بہت اچھا"

یہ نطق سلیمانی کے آخری کلمات تھے۔

اس کے بعد داہنی کروٹ، قبلہ رُخ، دائیں ہاتھ کو گال کے نیچے دبائے اور پاؤں کو سکیڑے، حضرت عین مطابق سنت لیٹ گئے اور آنکھیں بند فرمالیں۔

ایسے میں راقم عاجز بھی پہنچ گیا، دیکھا کہ مشتاق صاحب اور عاصم صاحب کمرے کے باہر چبوترے پر باتیں کر رہے ہیں، میں بھی وہاں کھڑا ہوگیا، خیریت پوچھی تو عاصم صاحب نے فرمایا کہ رات کو تکلیف بڑھ گئی تھی، دن اچھا گذرا، ابھی لیٹے ہیں ــــــ جی بہت چاہا کہ پھر کمرہ میں جا کر دیکھوں، مگر اس خیال سے کہ کہیں آہٹ پا کر آنکھ نہ کھل جائے میں باہر ہی ٹھیرا رہا۔

ہم تینوں بالکل مطمئن ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ سلمان میاں کچھ پریشان سے باہر آئے اور مجھ سے فرمایا کہ ذرا جلد آکر دیکھئے، میں مضطربانہ کمرے میں داخل ہوا اور عاصم صاحب و مشتاق صاحب بھی لپک آئے، میں نے نبض دیکھی، ـــ چہرۂ مبارک کو دیکھا خطرہ کی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی۔

نہ تنفس ہی کچھ تیز تھا، نہ اضطراب کی کوئی کیفیت، البتہ نبض کمزور تھی مگر یہ ضعف تو مدت سے قائم تھا مگر سلمان میاں نے بتایا کہ چند ہی لمحے گذرے کہ حضرت پر شدت ضبط کے آثار پیدا ہوگئے تھے، اور مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر کو فوراً بلوالیا جائے۔

---

[1] اور اسکی وجہ یہ بھی کہ ان کا جسم آخر زمانہ میں بھاری ہوگیا تھا۔ رکوع و سجود سے معذور تھے۔

اب میں حضرت والاؒ کے مواجہہ میں اس طرح بیٹھ گیا کہ ان کا دست مبارک میرے ہاتھ میں تھا، میری انگلیاں ان کی نبض پر اور نظریں چہرۂ جمال پر جمی ہوئی تھیں مگر ہوش وحواس اُڑے جا رہے تھے۔ پاس ہی سلمان میاں تصویرِ وحشت بنے کھڑے تھے۔

عاصم صاحب نے فوراً ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کیا، مگر انہوں نے کچھ دیر بعد آنے کا وعدہ کیا تو پھر کسی اور ڈاکٹر کی تلاش میں دوڑ نکلے۔ ان کے جاتے ہی سلمان میاں نے کرنل رحمٰن وغیرہ سے ٹیلیفون پر بات کرنے کی کوشش کی، مگر بے سود ہوئی۔

میں اپنی جگہ ایک حالت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ہلکا سا جھٹکا تنفس میں ایسا محسوس ہوا جیسے ہچکی آگئی ہو، چہرہ پر دفعتہً خون کی لہر دوڑ گئی اور بس طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا تھا ـــــــ اتنا کٹھن مرحلہ اس آسانی اور اس سکنیت وسرعت کے ساتھ طے ہو گیا کہ گویا گرہ کھل گئی[1] ـــــــ اس وقت شام کے ۵½ بجے تھے[2]۔

اب میں اُٹھا، حضرت مرشد علیہ الرحمۃ کے پاؤں سیدھے کر ہی رہا تھا کہ سلمان میاں نے آبدیدہ ہو کر پوچھنا شروع کیا ـــــــ "کیوں غلام محمد صاحب کیا بات ہے؟ کہیئے کیا بات ہے"؟ میں کیا عرض کرتا، جو ہونا تھا، وہ ہو چکا، سلمان میاں بے تابانہ ڈاکٹر کرنل رحمٰن کو بُلانے کے لئے گھر سے نکل گئے، عاصم صاحب بھی ابھی تک واپس نہ آسکے تھے ـــــــ اس خادم حقیر نے اپنے مخدوم قدس سرہٗ کو چت لٹا کر ہاتھ پاؤں سیدھے کر دیے، نورانی پیشانی پر بوسہ دے کر پاؤں سے سر تک چادر

---

[1] حدیث شریف میں آتا ہے کہ مومن کی روح اس آسانی سے نکالی جاتی ہے کہ گویا گرہ کھول دی گئی ہو۔ اس سلسلہ کی ساری احادیث حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ "شوق وطن" میں جمع فرمادی ہیں، اس رسالہ کو پڑھ کر موت محبوب ہو جاتی ہے۔

[2] دن چھوٹے ہونے کی وجہ سے مغرب کوئی پونے چھ پر ہو رہی تھی۔

اُڑھادی، اور عاصم صاحب اور پیرانی صاحبہ کی واپسی کا منتظر ہی تھا کہ عاصم صاحب تشریف لائے، مجھے مغموم دیکھ کر وجہ پوچھی بے زبانی نے ماجرا سنا دیا۔ ان کی حالت دفعتہً متغیر ہو گئی، دل بیٹھنے لگا، ایسے میں پیرانی صاحبہ مع صاحبزادیوں کے لوٹ آئیں، ایک کہرام مچ گیا ــــــ اتنے میں سلمان میاں بھی ڈاکٹر رحمٰن کو لے کر آپہنچے مگر اب ڈاکٹر کا کام ہی کیا تھا، ایک نظر دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ بس جو ہونا تھا ہو چکا، سلمان میاں کی رہی سہی امید بھی ٹوٹ گئی، بے تحاشا رونے لگے۔

ہم لوگوں کو اس کا ہوش نہ تھا کہ اس سانحہ کی اطلاعِ عام کا فکر کرتے مگر کسی ذریعہ سے نشر گاہ والوں کو یہ خبر مل گئی اور آٹھ بجے شب کی خبروں میں نشر کر دی گئی، پھر تو کیا تھا، مختلف اخباروں کے دفاتر سے ٹیلیفون آنے شروع ہو گئے کہ کب انتقال ہوا انتقال کے وقت مولانا کے پاس کون تھا؟ کیا تفصیل رہی، مولانا کا سن پیدائش کیا تھا؟ کبھی میں نے اور کبھی عاصم صاحب نے جوابات دیے ــــــ ادھر غمگساروں کی آمد کا تانتا بندھ گیا تھا، متوسلین و منتسبین آئے، عمائدِ شہر و حکام آئے، علماء و اہل سیاست آئے، عام قدر شناس اور اہلِ محبت آئے ۹، ۱۰ بجے رات تک سیکڑوں کا اجتماع ہو گیا۔

پیرانی صاحبہ کی حالتِ رفیعہ

غمگین کون نہیں تھا؟ پر جو اندوہ و غم حضرت اقدس کی اہلیہ محترمہ کے قلبِ حزیں کو سہنا پڑا اس کا اندازہ کوئی اور کیا لگا سکتا ہے! ان کا سب کچھ لُٹ گیا تھا، وہ اگر اس سانحہ پر بے قابو ہو جاتیں تو معذور تھیں، مگر ایک ولی کامل کی رفاقت نے دین کا رنگ کچھ ایسا چڑھا دیا تھا کہ عین اس وقت جب قلب و جگر خون ہو چکے تھے دماغ پر شریعت غالب اور زبان سے حدود اللہ کی تلقین جاری تھی، آنکھیں اشکبار آواز بھرّائی ہوئی، مگر بات زبان سے وہی نکل رہی تھی جس کی ایک صاحب مقام اور خوگر عبدیت ہستی سے توقع کی جا سکتی ہے، ــــــ وفورِ غم میں صاحبزادیوں

کی زبان سے بعض کلمات ایسے نکل گئے جو خلاف شرع تو ہرگز نہیں تھے مگر صبر و ضبط کے منافی تھے، پیرانی صاحبہ نے ایک بار درد بھرے لہجہ میں للکار کر فرمایا:۔

"تم ایک ولی اللہ کی اولاد ہو خبردار جو تمہاری زبان سے کوئی کلمہ خلافِ ادب نکلا، تم سے اگر ضبط نہیں ہو سکتا تو کلامِ پاک کی تلاوت شروع کر دو۔"

ہمت کا یہ عالم تھا کہ ادھر عاصم صاحب کی حالت دیکھ کر انہیں خمیرہ گاؤزبان چٹایا، ادھر اپنے لختِ جگر سلمان میاں کو دلاسا دیا اور صبر کی تلقین فرمائی، پھر اس خادمِ حقیر کو یاد فرمایا گیا اور کواڑ کی آڑ سے ارشاد ہوا:۔

"دیکھو بیٹا! عاصم اور سلمان کا تو بُرا حال ہے اب تم ہی کو سب کچھ کرنا ہے، عاصم دل کے کمزور ہیں اور سلمان کم عمر، دونوں کا خیال رکھو!! ______ اور دیکھنا تمہارے مرشد ایک ولی اللہ تھے، عاشقِ سُنّت تھے، کوئی بات خلاف سنت نہ ہونے پائے، غسل میں کسی خراب عقیدہ والے کا ہاتھ نہ لگنے پائے۔"

اللہ اللہ سنت مقدسہ سے یہ شغف اور اس کا ایسا خیال!! اچھے اچھے زاہدوں و عابدوں کو رشک آجائے تو کیا عجب ہے! چنانچہ اس کے بعد عاصم صاحب کے ہاتھ سو روپے کا نوٹ بھجوایا اور اس خادم کو ہدایت فرمائی کہ کفن کا کپڑا عمدہ قسم کا ہو اور پہننے والے کے مزاج کی نزاکت و نفاست کا پورا لحاظ رہے!

انہی دو تین واقعات سے اندازہ لگائیے کہ عین اس قیامت خیز عالم میں پیرانی صاحبہ کی حالتِ ایمانی کس درجہ ارفع و اعلیٰ تھی اور یہ بھی دراصل حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولیت کی نشانی ہے کہ ان سے جو جتنا قریب تھا، اللہ تعالیٰ نے اتنی ہی اسکی دستگیری فرمائی!!

راقم کا حال

ادھر اس ناکارہ کا عجب حال تھا، ایسا جانکاہ حادثہ، مگر نہ گریہ وزاری اور نہ بدحواسی! بلکہ دل ودماغ دونوں پرسکون! جب تک حضرت شیخ کی روح نے پرواز نہیں کیا تھا۔ میرے ہوش وحواس اُڑے جارہے تھے لیکن جب وہ پرواز کرگئی تو گویا میرے ہوش ٹھکانے آگئے۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ حضرت عالم سُرور وراحت میں پہنچ گئے ہیں، دنیا کے بکھیڑوں سے نجاتِ کلّی میسّر آئی ہے، بڑی کش مکش کے بعد اب آرام کی نیند سو گئے ہیں ـــــــ موت ومفارقت کا عامیانہ تصوّر ذہن سے محو تھا اور اس کی وجہ محض حق تعالیٰ کا ایک کرم خاص تھا، یعنی عین رحلت کے ساتھ اس تصرّفِ الٰہیہ کی حکمتیں ذہن میں اُتر آئیں اور اس کے الطافِ خفیّہ مکشوف ہوگئے جن کے افشا کی نہ ہمت ہے نہ مصلحت اس کی اجازت دیتی ہے، بہرحال اس کا یہ اثر تھا کہ رحمتِ الٰہیہ کے غلبہ نے اپنی ذاتی غرض یعنی شیخ سے مفارقت کی تکلیف کو نامحسوس بنادیا۔

حق تعالیٰ کی اسی استعانت کا نتیجہ تھا کہ تجہیز وتکفین اور تدفین کے آخری مراحل میں اپنی حیثیت واستحقاق سے کہیں زائد خدمت کی سعادت حاصل رہی، اور یہ کیفیت اس وقت تک رہی جب تک کہ حضرت شیخ کے جسدِ مبارک کو پیوندِ خاک کرکے گھر لوٹ نہیں آگیا۔ پھر یہ کیفیت جاتی رہی اور جدائی کا خیال اور بے سہارگی کا احساس اتنا شدید ہونے لگا کہ معلوم ہوتا تھا کہ پسلیاں ٹوٹ جائیں گی اور دل بیٹھ جائے گا۔ اسی درد وکرب میں صرف ایک مصرعہ زبان سے نکلا کہ

ع واحسرتا کہ چارۂ درد دلم نماند

مہینوں بعد جاکر کہیں رفتہ رفتہ اس کیفیت میں تخفیف ہوئی۔

تجہیز وتکفین اور جنازہ

عرض کرچکا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے عالمِ حواس کی حفاظت فرمادی تھی اور پیرانی صاحبہ نے تجہیز وتکفین کا انتظام میرے سپرد فرمادیا تھا۔ ضروری سامان کی فراہمی تو ہاتھوں ہاتھ یوں ہوگئی

کہ حضرت والاؒ کے دست گرفتہ اور معتقدین موجود تھے۔ میں نے یہ کام ان کے سپرد کردیا اور بہت جلد وہ بدرجۂ احسن انجام بھی پاگیا۔ مگر میرے لئے اہم اور مشکل مسئلہ نماز جنازہ کی امامت کا تھا، ذہن کے پردہ پر کئی صورتیں سرکاری امام اور لیڈر مولویوں کی آرہی تھیں کہ وقت پر کہیں ان میں کا کوئی آگے نہ بڑھ جائے، یہ تو آخرت کا معاملہ ہے، اس میں شرط اخلاص ومحبت کی مقدم ہونی چاہیئے، اسی سوچ میں تھا کہ یکایک ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب مدظلہ تشریف لائے اور ایسے تشریف لائے کہ جے لے تقاضئے تو جواب ہر سوال ـــــــ کی حقیقت لئے ہوتے! بس عقدہ حل ہوگیا۔ دل نے کہا کہ حضرت اقدسؒ کے محبوب ومحب کے ہوتے ہوئے کسی اور کو امامت کا حق کب پہنچتا ہے، سلمان میاں کے ذریعہ اپنی اس رائے کی توثیق پیرانی صاحبہ سے کروالی اور ڈاکٹر صاحب کو اس فریضہ کے لئے راضی کرلیا، اس وقت رات کے کوئی نو بجے ہوں گے۔

یہ بات طے ہوئی ہی تھی کہ مولانا محمد حسن کاکوروی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا تمیزالدین خان صاحب آگئے، مولانا راغب احسن مولینا قدوس بہاری وغیرہ پہلے ہی آچکے تھے، ان نئے آنے والوں نے فرمائش کی کہ حضرت والاؒ کی زیارت کرائی جائے۔ احقر ان کو کمرہ میں لے گیا جب حضرت شیخ کے چہرۂ انور سے چادر اٹھائی تو اس کی چمک سے سب کی آنکھیں چندھیا گئیں، مفتی صاحب کی زبان سے سبحان اللہ کا کلمہ نکلا۔ مولوی تمیزالدین خان ٹھٹک کر رہ گئے، مولانا محمد حسن صاحب نے بڑھ کر ادب سے پیشانی پہ بوسہ دیا، ڈاکٹر صاحب لڑکھڑاتے ہوئے بڑھے اور بیٹھ گئے، پھر حضرتؒ کے دستِ مبارک کو لے کر چوما اور آنکھوں سے لگایا، غرض ہر ایک نے حد تعلق کے مطابق اثر لیا،

اس طرح کا سلسلہ تو خیر جاری ہی رہا مگر منتظمین کے سامنے اب دو باتیں طے شدنی تھیں، ایک تو یہ کہ جنازہ کب اُٹھایا جائے؟ دوسرے یہ کہ قبر کہاں بنے؟

پہلی بات کے متعلق تو سب کی یہی رائے رہی کہ جنازہ ۸ بجے صبح اٹھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ شرکت کر سکیں بلکہ مولانا راغب احسن کا تو خیال تھا کہ موٹریں دوڑا کر سارے شہر میں اس حادثہ کی منادی کر دی جائے، مگر راقم احقر نے اس کو حضرت مرحوم کے مذاق کے خلاف پا کر اس سے اختلاف کیا اور یہ صورت ظہور نہ پا سکی،

دوسرے مسئلہ سے متعلق عاصم صاحب نے سوسائٹی کے قبرستان میں جہاں عبدالرحمٰن صدیقی مرحوم دفن ہیں، جگہ پسند کر لی تھی، مگر اس کو کسی نے پسند نہیں کیا، مولوی تمیزالدین خان صاحب نے مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب (عامل کالونی کے ایک میدان میں) تدفین کی اجازت چیف کمشنر سے ٹیلیفون پر مانگی، انہوں نے صبح تک انتظام کا وعدہ کیا، اس کے ساتھ ہی طے یہ پایا کہ علی الصبح عاصم صاحب اور مختار احمد خان صاحب (مدیر مستقبل) مولانا محمد شفیع صاحب کی معیت میں چیف کمشنر سے مل کر اس کا فوری انتظام کروائیں ــــــــ رات آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئی، صبح تینوں حضرات نے اجازت لے کر مولانا شبیر احمد عثمانی کے قریب قبر سلیمانی کی جگہ متعین کر لی اور کھدائی کا بندوبست کر کے عاصم صاحب گھر تشریف لائے۔

اب ایک مسئلہ غسل کا رہ گیا، محترمہ پیرانی صاحبہ کی ہدایت یاد تھی، طے یہ ہوا کہ صوفی محمد ادریس صاحب (جو تبلیغی جماعت میں صرف صوفی صاحب کے نام سے معروف اور حضرت والا رحمہ کے پرانے عقیدت کیش ہیں) اور راقم حقیر غسل دیں اور حضرت محترم ڈاکٹر عبدالحی صاحب نگرانی فرمائیں کہ کوئی بات خلاف سنت نہ ہونے پائے۔

آٹھ بجے کے قریب غسل کا اہتمام شروع ہوا۔ میت مقدس کو چھ آدمیوں نے مل کر تختہ پر لٹایا اور وہی اس کمرہ میں موجود تھے جہاں غسل دیا گیا[1]۔ عاصم صاحب سلمان میاں

---

[1] جسم مبارک سے جو چیزیں جدا کی گئیں، ان میں کرتے پاجامہ کے علاوہ ایک چاندی کی انگوٹھی تھی جس میں عقیق جڑا ہوا تھا اور اس میں "سید سلیمان" کندہ تھا، کرتے کی جیب میں ایک سفید چھوٹی تسبیح اور ایک (جاری ہے)

اور سلمان میاں کے ایک ماموں جن کو وہ شموں ماموں کہتے ہیں، ڈاکٹر صاحب، صوفی صاحب اور یہ خادم حقیر، ________ ڈاکٹر صاحب بہشتی زیور[1] کھول کر کھڑے ہو گئے، سلمان میاں میری عرض پر تصویر حیرت بنے کھڑے تھے، عاصم صاحب اور شموں ماموں پانی بنا کر دیے جاتے تھے، میں لوٹا بھر بھر کر پانی ڈالتا جا رہا تھا اور صوفی صاحب دستانے چڑھائے جسم دھو رہے تھے، صوفی صاحب نے پیٹ کو دبا دبا کر ملا کہ کوئی شائبہ نجاست کا نہ رہ جائے، مگر دستانہ کی سپیدی پر ایک دھبہ بھی آنے نہ پایا۔ پاکی کا اہتمام مرنے والے نے پہلے ہی کر لیا تھا!! عجیب تر مشاہدہ احقر کو یہ ہوا کہ چہرہ کا وقار اور تبسّم کی جھلکیاں تو تھیں ہی مگر ہاتھ کے جوڑوں میں لچک تک باقی تھی! جسم ایسا نرم اور اور بے داغ تھا جیسے کسی زندہ صحت مند کا ہوتا ہے۔

غرض غسل ہو چکا، سفید براق سا کفن پہنا دیا گیا، سر اور ناک میں کافور لگایا گیا اور ریش مبارک معطّر کر دی گئی، جنازہ تیار ہو گیا۔

سفرائے مصر و حجاز اور ڈاکٹر محمود حسین وغیرہ نے زیارت کی تمنّا ظاہر کی، کرا دی گئی پھر کمرہ بند کر کے گھر کی مستورات نے زیارت کا شرف پایا،

اس وقت ڈار منزل کے باہر ہزاروں کا مجمع ہو چکا تھا، میّت کا ڈولا پھاٹک سے باہر رکھا گیا اور اس کے دونوں طرف خوب لانبے لانبے بانس باندھ دیے گئے تھے۔ کہ وقت واحد میں سینکڑوں آدمی کندھا دے سکیں۔

اب جنازہ کمرے سے باہر نکالا گیا، کہرام مچ گیا، گھر والے رو رہے تھے، باہر والے چیخیں مار رہے تھے، اس نالہ و فغاں کے ساتھ میّت کو پھاٹک سے باہر لا کر ڈولے

چھوٹا سا چاقو تھا ________ ان تبرکات کی تقسیم یوں ہوئی کہ چاقو تو غالباً گھر میں رکھ لیا گیا۔ انگوٹھی صاحبزادہ سلمہٗ کے حصہ میں آئی اور تسبیح پیرانی صاحبہ نے مدظلہا نے راقم حقیر کو عنایت فرمائی۔

[1] گیارہواں حصہ جس کا نام بہشتی گوہر ہے، اس میں ان مسائل کی تفصیل ہے۔

میں رکھا گیا اور یوں پورے وقار و تمکنت کے ساتھ ہزارہا شیدائیوں کے کندھوں پر جنازہ چلا۔

ع عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

زیر لب "سُبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر"
کی تسبیح کے ساتھ بصد ادب و احترام نیوٹاؤن کی جامع مسجد میں جنازہ پہنچا جہاں آخر دنوں میں حضرت والا رح نماز جمعہ پڑھا کرتے اور اپنے ارشادات سے لوگوں کو کچھ دیر کیلئے مستفید بھی فرمایا کرتے تھے۔ نیوٹاؤن کی مسجد ابھی تعمیر کے ابتدائی مراحل میں تھی، مسجد کے سامنے سارا میدان کھلا پڑا ہوا تھا۔ جنازہ کو مسجد کی درمیانی سیڑھیوں کے سامنے رکھ کر میدان میں لانبی لانبی صفیں (کہ ایک ایک صف میں چار چار پانچ پانچ سو آدمی ہونگے) بن گئیں، علماء، سفراء وزراء، حکام اعلیٰ اور عوام سے میدان پٹ گیا، مکبرین کے انتظام کے ساتھ ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

اب لوگوں کا اشتیاق تھا آخری بار حضرتؒ کی زیارت کرا دی جائے، مناسب بھی یہی معلوم ہوا کیونکہ یہاں زیارت کروانے میں زیادہ آسانی تھی، جنازہ کے قریب چند لوگ انتظام کے لئے کھڑے ہو گئے، عاصم صاحب اور سلمان میاں وغیرہ چہرۂ مبارک پر چادر تان کر کھڑے ہو گئے کیونکہ دس بج چکے تھے اور سورج کی شعاعیں تیز تھیں، زائرین نے قطار بندی کے ساتھ باری باری سے زیارت کی، اور کس کا دل تھا جو اس چہرۂ مبارک کی تابانی سے اس کے سکون و وقار اور اس پُر تبسم کی جھلک دیکھ کر متاثر نہیں ہو رہا تھا۔ جس نے دیکھا، اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اس کے دل نے تصدیق کی کہ وہ ایک ولی اللہ کی زیارت سے مشرف ہو چکا ہے!!

کوئی گھنٹہ بھر میں یہ سلسلۂ زیارت ختم ہو سکا۔

تدفین کا دل گداز منظر

جامع مسجد نیوٹاؤن سے میت اُٹھا کر مدفن پہنچائی گئی، قبر ابھی پوری طرح تیار نہ تھی، جنازہ چبوترہ پر

رکھ دیا گیا، اور مولانا عثمانیؒ کی قبر پر کسی نے مائیکروفون لگا دیا، عالم وفاضل اور شعلہ بار خطیب ابوالخیر عرقسوسی (کلچرل اٹیچی سفارت خانہ شام) خود ہی جوش عقیدت وحزن سے تقریر کے لئے کھڑے ہو گئے اور ان کے ساتھ ایک اردو ترجمان بھی تھے۔ ابوالخیر صاحب نے حضرت علامہ کی خدمات ملی وکمالات علمی کو اس دل گداز پیرایہ میں خراج تحسین ادا کی کہ سفراء، وزراء، عوام اور علماء سب دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور سارا ماحول ماتم کدہ بن گیا، جذبات کچھ ایسے مجروح تھے کہ اس بیس پچیس منٹ کی رواں دواں تقریر کا صرف ایک حصہ یاد رہ گیا کہ :-

"اے سلیمان، تیری مفارقت کا ایسا رنج نہیں، مگر آہ غم اس کا ہے کہ ایک گنجینۂ علم وعرفان آج اپنے ہاتھوں دفن کر دیا جا رہا ہے۔"

بے چارہ ابوالخیر صاحب ابھی دو تین روز قبل ہی تو اس گنجینۂ علم وفضل سے چند جواہر معانی حاصل کر چکے تھے، اسی کا تاثر ان پر زیادہ ہونا ضروری تھا۔

اس رقت انگیز تقریر کے بعد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ تشریف لائے، کھڑے نہ ہو سکتے تھے، کرسی پر بٹھا دیے گئے تھے مائیکروفون منہ کے قریب کر دیا گیا۔ پھر بھی آواز بہ دقت تمام نکل رہی تھی، درد بھرے لہجے میں بڑی موزونیت سے حضرت ابوہریرہؓ کا یہ شعر مفتی صاحب نے پڑھا۔

ؔ للناس ھمٌ ولی الیوم ھمان

فقد الجراب وقتل الشیخ عثمانؓ

اور فرمایا کہ ہم ابھی غم عثمانی (مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ) کو بھلانے نہ پائے تھے کہ رسول اللہ

---

[1] عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر حضرت ابوہریرہ رضؓ نے چند اشعار کہے تھے، اس میں کا ایک یہ ہے۔ عدیم یہ ہے کہ آج لوگوں کے لئے تو ایک غم ہے (شہادت عثمانؓ) اور میرے لئے دو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عطا فرمودہ توشہ دان کے کھو جانے کا اور دوسرے حضرت عثمانؓ کے رخصت ہونے کا۔

صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ نشانی (یعنی حضرت سید سلیمان رحمۃ اللہ علیہ) بھی ہم سے کھو گئے۔

مفتی صاحب ممدوح اپنے اظہار جذبات پر پوری طرح قابو نہیں پا رہے تھے، اور ادھر قبر بھی تیار ہو چکی تھی، اس لئے تقریر ختم کردی گئی، اب قبر میں سرہانے کی طرف راقم مہجور پائینتی کو عبدالمنان صاحب (مالک کتب خانہ اشرفیہ) اور وسط میں عاصم مغموم کھڑے ہو گئے، سلمان میاں بھی اس سعادت میں شرکت کے لئے بے تاب تھے، مگر ہم لوگوں کے عرض کرنے پر وہ سرہانے پیکرِ حسرت بنے کھڑے تھے، اب میت کو بہ تمام ادب ــــــ "بسم اللہ و علی ملۃ رسول اللہ" کہتے ہوئے اتارا گیا اور قبلہ رُخ کر کے کفن کے بندھن کھول دیے گئے، ہم لوگ اب اوپر آگئے، کیسی حسرت اور کس قدر الم کا موقع تھا، جس کے دل پر جو بھی گذری حیرت ہے کہ سہا کیسے گیا؟ کلیجہ پھٹ کیوں نہ گیا؟ دم آخر کیسے اٹکا رہ گیا؟ ــــــ بس اس ذاتِ صمدیت ہی کی اعانت تھی ورنہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں!

قبر پاٹ دی گئی اور سب شرکاء جنازہ نے مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ ــــــ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ ــــــ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ۔ کے تسکین بخش عقیدے کو دہراتے ہوئے مٹھیاں بھر بھر کر مٹی ڈالنی شروع کی اور بس قبر تیار ہو گئی، اب یاد نہیں کہ سرہانے اور پائینتی کھڑے ہو کر کن اصحاب نے مسنون طریقہ پر تلاوتِ کلامِ پاک کی؟ بہرحال اس کے بعد سارا مجمع گردن جھکائے، اُداسی کی خاک سر پر اڑائے منتشر ہو گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ماتمِ سُلیمانی

حضرت اقدس کے سانحۂ ارتحال پر پاکستان وہندوستان میں گہرے تاسف ورنج کا اظہار ہوا، دونوں حکومتوں کے صدور، وزرائے اعظم اور عمائد نے تعزیتی پیام جاری کئے اور ان کی عظمت اور گراں قدر خدمت کو سراہا، ملک کے سربرآوردہ افراد نے مضامین لکھے جلسے منعقد کرکے اظہارِ الم کیا، یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعزیتی قرار دادیں پاس کی گئیں، مدارسِ دینیہ نے چھٹی کرکے ملک کے طول وعرض میں ایصالِ ثواب کے لئے قرآنِ پاک کا ختم کیا پاکستان ریڈیو نے خصوصی پروگرام نشر کئے۔ مدت تک دونوں ملکوں کے علمی وادبی جرائد نے حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ پر خصوصی مضامین شائع کئے اور بعض رسائل نے سلیمان نمبر مرتب کرکے حضرت کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو محفوظ کیا، شعرائے کرام نے نوحے لکھے تاریخیں نکالیں، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں حضرت والا رح کی یادگار کے طور پر علمی ادارے اور لائبریریوں کی بنا ڈالی گئی، پاکستان کے دارالخلافہ میں بھی سلیمان اکیڈمی کا خاکہ تیار کیا گیا، مگر قوت محرکہ کی کمزوری کے باعث تصورِ ذہنی وجود خارجی کی حیثیت اختیار نہ کرسکا۔

پاک وہند سے باہر ممالک اسلامیہ میں بھی حضرت والا رح کی رحلت کو ملتِ اسلامیہ کا حادثۂ عظیم قرار دیا گیا، مصر وشام وحجاز کے علماء اور ادیبوں نے مضامین لکھے اور اس سے بڑھ کر مفید بات یہ ہوئی کہ حضرت والا رح کی مرتب کردہ سیرت النبی اور خطباتِ مدراس کے ترجموں کا کام تیز تر کر دیا گیا، چنانچہ خطبات مدراس کا عربی ترجمہ تو شائع بھی ہو چکا ہے سیرۃ کی جلدیں، عربی، ترکی، فارسی میں منتقل ہو رہی ہیں، کئی کئی جلدوں کے تراجم ہو چکے ہیں حضرتِ والا رح کے عربی دیوان کی اشاعت بھی مشرقِ وسطیٰ میں عنقریب ہونے والی ہے!

غرض لکھنے بیٹھتے تو "مرگِ سلیمان کا عالمگیر ماتم" ایک مستقل موضوع ہے۔ مگر یہاں سیکڑاوں میں سے صرف دو چار قطعات اور نوحے نقل کر کے قلم کو روک لیا جاتا ہے اور اس انتخاب کا معیار شاعر کی اپنے ممدوح سے حقیقی واقفیت اور اس کے رُتبے و منزلت سے سچی آگاہی ہے، نہ محض شاعرانہ کمال اور مبالغہ آرائی!!

تاریخی قطعات یوں تو بہت سوں نے لکھے مگر ہمارے ملک کے مشہور شاعر جناب حفیظ ہوشیارپوری سے آگے کوئی نہ بڑھ سکا۔ حفیظ کا قطعہ بالکل الہامی ہے، ملاحظہ ہو:-

قطعۂ تاریخ

کشودہ پر بہ تمنائے عالمِ باقی
زخاکدانِ فنا رخت زندگی بربست
نشانِ صاحب عرفاں بہ زیرِ خاک مجو
ببیں کہ "تختِ سُلیماں باوجِ فردوس" است
۱۹۵۳ء

اب حکیم الشعرا حضرت امجد حیدرآبادی کا ایک مقبول عرفانی قطعہ اور تین رُباعیات غم ملاحظہ ہوں۔

قطعۂ مقبول

سلیمانِ سریرِ علم و حکمت — رواں شد ہوئے عرش ربِّ اعلیٰ
بآب دیدۂ سالش نوشتم — علیہ رحمتہ اللہ تعالیٰ
۱۳۷۳ھ

اس قطعہ کے متعلق خود حضرت امجدؔ کا ارشاد ہے کہ:۔

"یہ قطعہ عالمِ خواب میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا گیا، اسے سُنکر سبحان اللہ فرمایا۔"

حکیم الشعراء نے اسی تاثر میں ڈوب کر تین رباعیات اور کہی ہیں، جو یہ ہیں:۔

رباعیات

اصلیت اگر نہیں تو دھوکا ہی سہی — اللہ! بہت نہیں تو تھوڑا ہی سہی
تسکین کی آخر کوئی صورت بھی تو ہو — رؤیت ممکن نہیں تو رویا ہی سہی

دل شاد اگر نہیں تو ناشاد سہی — لب پہ نغمہ نہیں تو فریاد سہی
ہم سے دامن چھڑا کے جانے والے — جا، جا، اگر تو نہیں تری یاد سہی

کیا جانئے وہ نور تھا یا سایہ تھا — شعلہ سا کسی نے دل میں بھڑکایا تھا
آیا کس وقت، یہ تو معلوم نہیں — جاتے ہوئے کہتا ہے کہ میں آیا تھا[1]

---

[1] ملاحظہ ہو معارف بابتہ مئی ۱۹۵۴ء

"دریغا سیّد سلیمان ندویؒ"!

(از حضرت حکیم اشفاق الحسین صاحب بریلوی ثم کراچوی مرحوم، مجاز صحبت حضرت حکیم الامّتؒ)

دریغا کہ سید سلیمان ندوی | کہ بودہ سرِ عالمانِ زمانہ
فقیہہ و مفسر، ادیب و محدث | مؤرّخ، محقق، یگانِ زمانہ
کلاہ سرِ افتخار و بزرگی | عمید و عمودِ سرانِ زمانہ
تقیؒ، نقیؒ، صفیؒ، ولیؒ | سبق بردہ بر صوفیانِ زمانہ
چہ صاحبدلے منبع علم و عرفاں | ستودند صاحبدلانِ زمانہ
قلیل الطعام و قلیل المنام | قلیل الکلام میانِ زمانہ
مفیضِ علوم و معارف بہ دنیا | کہ بُد اوستا، اوستانِ زمانہ
بہ اقوامِ عالم معرف مشرف | مکرّم بہ اسلامیانِ زمانہ
مخلّٰی ز سوء و محلّٰی باحسان | برومند از و محسنانِ زمانہ
حیات زماں طیبہ از علومش | زمان مثلِ جسم او روانِ زمانہ
چو رخت سفر بست بازاد و رحلہ | گلوگیر شد خاندانِ زمانہ
ازیں حادثہ عالمے دل گرفتہ | دریں فاجعہ عالمانِ زمانہ
گزیں آشیاں طیرِ روحش بہ سدرہ | پریدہ ازیں آشیانِ زمانہ
فلکیاں بگفتند اھلاً و سھلاً | بہ غم مبتلا فانیانِ زمانہ
بہ فردوس یابد سلیمانؒ سریرے | دعا از من و دوستانِ زمانہ

بہ محشر شفیعش شفیع الوریٰ کن
بجنّات با مخلصانِ زمانہ

۱۳۷۳ھ

نوحۂ سلیمانؒ

یا

"عقیدت کے چند آنسو"[1]

(از حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ)

اے سلیماں! آہ پیغمبرؐ کا وہ سیرت نگار
جس پہ نازاں ہند تھا اور فخر کرتا تھا بہار

آج محفلِ علم کی افسوس سونی ہو گئی
دین و دانش کے چمن کی لُٹ گئی گویا بہار

اب کرے گا کون ہم میں دین کے اسرار کو
کاوشِ تحقیق کی صیقل گری سے آشکار

خدمتِ بے مزد کرتا کون ہے اسلام کی
کس پہ ہوگا مفت کے اس عشق کا سودا سوار

ذوقِ علمی کی ترے عربی زبان ممنون ہے
ندوے کی تعلیم کا مانا گیا تو شاہکار

گو پڑھا ندوہ میں تھا لیکن علی گڈھ دیوبند
تیرے علم و فضل کا کرتے تھے دونوں اعتبار

خندہ زن یورپ تھا قرآنی قصص پر جہل سے
تیرے خامہ نے بتایا اس کا تاریخی وقار

ہند اور تاریخ اسلامی کے اسرار و رموز
سو رہو تم بھی جہاں سویا تمہارا رازدار

چاک پردوں کو کریگا کون استشراق کے
ان کی چالوں پر کریگا خود انہیں کو شرمسار

حوصلہ افزائیاں تیری خدا بخشے تجھے
کتنے ناکارے بنے انکی بدولت اہل کار

اپنی تحریروں میں خود میری نظر تجھ پر رہی
رائے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار

آج ہیں مبہوت تیری راہ کے سارے رفیق
گم وہی ہے ان میں جو تھا سب سے بہتر شہسوار

کھوئے کھوئے آجکل ہیں جوش بھی اور ہوش بھی
حضرت امجد بھی چپ ہیں اور جگر بھی دلفگار

خلق تیرا، حلم تیرا، تیرا شرمیلا مزاج
یاد میں انکی رہیں گی اپنی آنکھیں اشکبار

---

[1] یہ عنوان بھی خود مولانا گیلانیؒ کا اختیار فرمودہ ہے!

فتنہائے نَو بہ نو سے ہوگیا آزاد تُو — بیقراری میں یہی اک چیز ہے وجہ قرار

جن کے تو قابل نہ تھا ان سے ملی تجھ کو نجات — وہ بھی ہلکے ہوگئے جنکے دلوں کا تھا تو بار

اہلِ دنیا اب نہ آئیں گے ستانے کے لئے — ایک ہی مسئلہ کو پوچھیں گے نہ تجھ سے باربار

اب بیاں چاہیں گے نہ تجھ سے صحافت کے سفیر — وقت کو ضائع کریگی اب نہ پبلک کی پکار

کام کیا ہے اب خدا والوں کا ایسے عہد میں — خودنُمائی خودفروشی کی ہو جب دنیا شکار

پیری و بیماری میں اللہ رے چستی تری — جَست اک ایسی لگائی ہوگیا دنیا سے پار

بس گئے ہوں جسکے دل میں رحمۃ للعالمین ﷺ — گود میں اسکو نہ لے کیوں رحمتِ پروردگار

دل بھی کہتا ہے کہ تو مرحوم ہے مغفور ہے — مصطفیٰ ﷺ تیرے شفیع اور رب ترا آمرزگار

ہے یہی کافی کہ تجھ کو تھانوی دربار سے — جانشینی اور خلافت کا تھا حاصل افتخار

گرچہ تو تنہا گیا ہے پر دلاتا ہوں یقین — آرہے ہیں آگے پیچھے سب ترے احباب و یار

حق کی مرضی تھی وگرنہ آرزو اپنی یہ تھی — ہوتا اعظم گڈھ میں یا دسنہ ہی میں تیرا مزار

ہے جسد مدفون تو کیا روح تو آزاد ہے — اپنے تصنیفی ادارے کی تماشا کر بہار

قافلہ سالار اب بھی غمزدہ مسعود ہے — بعد تیرے پشت پر اپنے اٹھائے تیرا بار

رو رہے ہیں منہ چھپائے مولوی عبدالسلام — دل بھی اور آنکھیں بھی انکی آج ہیں خونبابہ بار

شاہ مولینا معین الدین احمد کو بھی دیکھ — چاک ہے جن کا گریباں اور دامن تار تار

اور عزیز خاص تیرا وہ صباح الدین غریب — تیرے ہی در پر پڑا ہے خستہ و زار و نزار

راہ میں آئے گا لکھنؤ اور دریاباد بھی — ہیں جہاں تھامے کلیجے تیرے کچھ یارانِ غار

ہو کبھی آنا جو دسنہ تو رہے اس کا خیال
ایک گیلانی[1] میں بھی ہے آرزوؤں کا مزار

---

[1] گیلانی نام اس قصبہ کا ہے جو مولانا مناظر احسن رحمۃ اللہ علیہ کا وطن تھا، مولانا بجائے گیلانوی کے اپنے نام کے ساتھ محض گیلانی تحریر فرماتے تھے جس پر بہت سوں کو یائے نسبت کا گمان رہا۔

"آہ سیّد صاحب!"

(از شاہ معین الدین احمد ندوی" مدیر معارف)

علم و اخلاق کی دنیا اُجڑ گئی

رفتی و از رفتن تو عالمے تاریک شد　　　تو مگر شمعی چو رفتی بزم برہم ساختی

آہ گذشتہ مہینہ ۲۲ نومبر کی رات کو کراچی ریڈیو اسٹیشن سے یہ جانکاہ خبر بجلی بن کر گری کہ حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۲ اور ۲۳ کی درمیانی شب کو ۷ بجے اس جہانِ فانی کو الوداع کہا، یہ خبر وابستگانِ دامنِ سلیمانی کے لئے ایسی ناگہانی اور ہوش ربا تھی کہ کچھ دیر تک سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہوگیا، مگر مشیتِ الٰہی پوری ہو کر رہی اور بالآخر یقین کرنا پڑا کہ اس مسیحا نفس نے بھی جان جانِ آفرین کے سپرد کردی، جو عمر بھر اپنی زبان و قلم سے مردہ دلوں میں روح پھونکتا رہا، اور امراضِ ملّت کا وہ ماہر طبیب اٹھ گیا، جس نے اس کے ناتواں جسم میں نئی طاقت و توانائی پیدا کی، وہ چشمۂ فیض خشک ہوگیا جس کی آبیاری سے دین و ملّت کا چمن سیراب تھا، وہ شیخ کامل اُٹھ گیا جس نے دلوں کی دنیا منوّر کی، وہ شمع خاموش ہوگئی جو نصف صدی تک علم و فن کی ہر مجلس میں ضیا بار رہی، وہ تاجدار رخصت ہوگیا جس کا سکّہ علم و فن کی پوری اقلیم میں رواں تھا، اسلامی علوم کا وہ امام و مجدّد اٹھ گیا، جس نے ان کو نئی زندگی بخشی مذہبِ اسلام کا وہ متکلم اور اسلامی تاریخ و تمدن کا وہ محقق اٹھ گیا جس نے اُن کو اُن کی اصل شکل اور نئے لباس میں جلوہ گر کیا۔ پیغامِ محمدی کا وہ شارح و ترجمان خاموش

ہوگیا، جس نے اپنی دینی بصیرت سے اس کے اسرار وحکم بے نقاب کئے، اور اس کی ذات جامع الصفات پر علوم کی جامعیت کا خاتمہ ہوگیا۔

لیس من اللہ بمستنکر　　　ان یجمع العالم فی واحد

وہ مذہب وسیاست، علم وفن، تالیف وتصنیف، تعلیم وتدریس، تقریر وتحریر، انشاء وخطابت، وعظ وپند، ارشاد وہدایت، ہر مجلس کا صدر نشین اور اپنے علمی کمالات میں آئمہ سلف کی یادگار تھا، تفسیر وحدیث، فقہ وکلام، مغازی وسیرت طبقات وتراجم، تاریخ وجغرافیہ، شعر وادب، جملہ فنون پر اس کی نظر مجتہدانہ، اور اس کے زبان وقلم کی روانی وحکمرانی یکساں تھی، اور ان میں وسعت ودقت نظر، فہم وبصیرت تلاش وتحقیق اور مہارت فن کی ایسی یادگاریں چھوڑیں جو مدتوں علمی دنیا کی رہنمائی کرتی رہیں گی، اس کے علمی کمالات کا لوہا دنیائے اسلام کے نامور علماء اور یورپ کے مستشرقین تک مانتے تھے،

وہ جدت وقدامت کا سنگم، اسلامی علوم کے ساتھ جدید افکار وتصورات، نئے رجحانات اور عہد حاضر کی تحریکات سے پوری طرح واقف اور تلاش وتحقیق اور نقد ونظر کے جدید طریقوں کا بھی ماہر تھا، اس دور کا وہ پہلا متکلم ہے، جس نے اسلامی علوم اور مذہبی عقائد وخیالات پر فکر وتدبر اور ان کی تعبیر وترجمانی کا ایسا حکیمانہ طریقہ اختیار کیا کہ دین ومذہب، نقل وروایت اور سلفیت وقدامت کی روح کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے ان سے عقل ودرایت اور جدت وروشن خیالی کی نقیض مٹادی اور ان کا معاون ومددگار بنادیا اور مذہب اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب وثقافت کے معترضین اور نکتہ چینوں کی جہالت کا پردہ چاک کرکے ان کو ایسے

حکیمانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا کہ مخالفین و منکرین بھی ان کی عظمت ماننے پر مجبور ہو گئے اور علمائے امت نے بھی اس کو تحسین کی نظر سے دیکھا، اور اس طرزِ فکر اور طریقۂ تعبیر کی ایسی شاہراہ قائم کر دی کہ آج اس راہ کے سارے راہ رو اسی راستہ پر گامزن ہیں۔

اس کی ذات میں روشن ضمیری و روشن دماغی ذوق کے تنوع، علوم کی جامعیت عقائد میں رسوخ و پختگی، اعمال میں استقامت، ثقاہت و متانت، قلب و نظر کی وسعت، مسلک میں اعتدال و توازن، لوچ اور نرمی، حسن مذاق، اور لطافتِ مزاج کا ایسا عجیب و غریب اجتماع تھا کہ طبقۂ علماء میں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی اور اس مسلکِ اعتدال کا وہ مبلغ بھی تھا، اس لئے مختلف مشرب و مسلک کے مسلمانوں میں وہ مقبول رہا۔

اس کا مزاج و مذاق ابتداء سے دینی تھا، کسی دور میں بھی اس کا قدم جادۂ مستقیم سے نہ ہٹا اور عمر کے ساتھ ساتھ یہ رنگ برابر گہرا ہوتا گیا، اور آخر میں تو سیرۃ النبیؐ کی برکت اور سلوک و تصوف کے فیض سے ہو بہو سلف صالحین کی تصویر، اور سراپا کیف و اثر بن گیا تھا، اس کی صحبت میں بیٹھ کر اس کی باتیں سن کر اور اس کی صورت دیکھ کر ایمان میں تازگی پیدا ہوتی تھی، اس کے اعمال و اخلاق "خلقِ عظیمؐ" کی عملی تفسیر تھے، وہ فطرۃً پاک دل، پاک طینت، سراپا شرافت و انسانیت، سراپا خلق و مروت، سراپا مہر و محبت اور سراپا جمال تھا، عزیزوں کا معاون و مددگار، دوستوں کا ہمدرد و غمگسار اور غریبوں اور بے کسوں کا ہمدم و غمخوار تھا، ضبط و تحمل کا پہاڑ، ایثار و قربانی کا پیکر اور عفو و درگذر کی تصویر تھا، اس کو خدا نے حقیقی بڑائی بخشی تھی، اس

لئے مصنوعی اور خود ساختہ بڑائی کے پیچھے کبھی نہیں پڑا، اور دنیاوی جاہ و اقتدار کی ہوس سے ہمیشہ دور اور کبر و نخوت سے نفور رہا۔

اس کی پوری زندگی ایثار و قربانی اور حلم و عفو کا نمونہ تھی، اور یہ وصف حدِ اعتدال سے بڑھ گیا تھا، اس کا سینہ بے کینہ، اور اس کا دل ایسا شفاف و مجلی آئینہ تھا، جس میں دشمن کے لئے بھی گرد کدورت کی گنجائش نہ تھی، اس نے قدرت و اختیار کے باوجود کبھی دشمنوں سے بھی انتقام نہیں لیا اور بداندیشوں کے ساتھ بھی ہمیشہ بھلائی کی، اور اس کے لئے ہر نقصان گوارا کیا اور بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا، اس لئے وہ محبوب القلوب تھا اور اس کی عزت و محبت دلوں میں جاگزیں تھی جو عند اللہ اس کے مقبول ہونے کی سب سے بڑی سند ہے، قلم اس کے کمال و جمال کی مصوری سے عاجز و درماندہ ہے، اس کی جو تصویر کھینچی جائے گی، وہ ناقص و ناتمام ہی ہوگی،

ع ہر چند مدحت می کنم لیکن ازاں بالاتری

ملک و قوم، دین و ملت اور علم و فن کا کوئی رُخ اور کوئی پہلو بھی اس کے خدمات سے خالی نہیں ہوتا اس راہ میں اس کے کارنامے بڑے عظیم الشان اور گوناگوں ہیں، اس لئے اس کی موت درحقیقت ایک حادثہ نہیں مجموعۂ حوادث ہے اور اس کا ماتم ایک شخص، ایک وصف، ایک کمال، ایک قوم اور ایک ملک کا ماتم نہیں بلکہ دین و مذہب کا ماتم ہے، ملک و ملت کا ماتم ہے، فضل و کمال کا ماتم ہے، علم و فن کا ماتم ہے، خلق و شرافت کا ماتم ہے اور پوری مِلّت اسلامیہ اس کے غم میں سوگوار ہے، کہ آج غزالی و رازی، ابن تیمیہ و ابن قیم، رومی و سنائی شاہ عبدالحق اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی یادگار دنیا سے اُٹھ گئی اور شبلی کی مسند ویران ہوگئی، ایسی ہستیاں صدیوں

میں پیدا ہوتی ہیں،

سر دو رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید
برفت از بزم عرفان آن حکیمے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

اُس نے علم وادب کی ہر شاخ اور ہر موضوع پر ہزاروں صفحات لکھے، مگر اس کی عمر عزیز کا بڑا اور بہترین حصہ آستانِ نبوی کی خدمت گزاری میں بسر ہوا، اس کا سب سے بڑا علمی و دینی کارنامہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہے، جو سوانح نبویؐ کے ساتھ پیغامِ محمدی کا بھی خلاصہ وعطر ہے، دارالمصنفین کی تصنیفی زندگی کا آغاز اسی مبارک کام سے ہوا تھا، اور ابھی جلد ہفتم زیر تالیف تھی کہ اسی پر اس کا خاتمہ ہوگیا، اور رحمۃ للعالمین کا مداح وسیرت نگار یہ سوغات لے کر خود اس کے حضور میں حاضر ہوگیا

ع : خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا،

بارِ الٰہا! تیرے دین متین کا خادم، تیرے پیغام کا شارح و مبلغ، تیرے محبوب نبیؐ کا جگر گوشہ وسیرت نگار تیرے حضور میں حاضر ہے، اسؐ کے طفیل میں اِس کو اپنے دامنِ رحمت سے ڈھانک لے، اس کو شہدا و صدیقین کا درجہ عطا اور اس کی تربت کو اپنے انوارِ رحمت سے معمور و منور اور جنت الفردوس کے پھولوں سے معطر فرما۔ اللّٰھم صبب علیہ شآئبیب رحمتک ورضوانک یا ارحم الرّاحمین، آمین،

اے خدا کے مقبول بندے الوداع اے استادِ شفیق الفراق۔

(معارف دسمبر ۱۹۵۳ء)

چند مبشرات

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ ذوق اور ارباب بصیرت کے لئے چند رویائے صادقہ جن کی تبشیری حیثیت نص حدیث سے ثابت ہے پیش کئے جائیں جو حضرت اقدس کی رحلت پر بعض اہلِ دل اور اہل محبت بزرگوں نے دیکھے، سب سے اہم، صاف وصریح اور سچا خواب اس سلسلہ میں حضرت پیرانی صاحبہ مدظلہا کا ہے جو موصوفہ نے ۱۳ر دسمبر ۵۳ء (یعنی رحلت کی ساتویں شب) کو دیکھا اور مکرر دیکھا ہے،

خواب حضرت ممدوحہ کے الفاظ ہی میں سُنیئے۔

مقامِ اُخروی

"وہ کسی جگہ سبز چادر اوڑھے کھڑے ہیں، میں بھی وہاں اتفاق سے پہنچ گئی تو تعجب سے کہنے لگے، اچھا آپ بھی یہاں آگئیں، دیکھئے میں آپ سے کہا کرتا تھا کہ بچوں سے زیادہ اُنس نہ رکھئے، مجھ سے تعلق رکھئے، مگر آپ نے نہیں سنا ــــــ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو[1] حکم دیئے "رہو" یا "آجاؤ"[2] تو میں نے "آجاؤ" کو پسند کیا اور پھر کراچی میں زیادہ رہنا مناسب نہیں معلوم ہوا، اس لئے میں جلدی سے یہاں آگیا اور اب حضرت نوحؑ کے ہاں قیام ہے[3]!

---

[1] اس معاملہ کا انبیاء کے ساتھ خاص ہونا تو نصِ حدیث سے ثابت ہے۔ باقی مشاہدہ یہ ہے کہ اتباعِ سُنّت کے طفیل میں غیرِ نبی کے ساتھ بھی اکرام کا یہ سلوک بارگاہِ رب العزۃ سے ہو جاتا ہے۔

[2] گویا صوفیاء کی زبان میں حضرت والارح قدم نوحؑ پر تھے۔ عملی پہلو بھی اس کا صاف مؤید ہے حضرت نوح علیہ السلام کا امتیازی وصف خود حضرت والارح کی زبان میں "جوشِ تبلیغ" تھا اور ان کی زندگی "کفر کے خلاف غیظ و غضب کا ولولہ پیش کرتی ہے"۔ (خطبات مدراس)، ادھر حضرت والاؒ کا اصلی کارنامہ دورِ حاضر کے محاذِ کفر کے

جب میں آنے لگی تو پوچھا کہ کیا آپ جارہی ہیں؟ میں نے کہا ہاں! ـــــــ ایک لوح کی طرف اشارہ کرکے کہا، اس کو پڑھ لیجیے، مگر میں اس کو پڑھ نہ سکی، پھر آنکھ کھل گئی۔

تھوڑی دیر میں آنکھ لگی تو پھر یہی خواب دوبارہ دیکھا[1]"

وسعت برزخ مولانا سید عبدالجبار صاحب حیدرآبادی جن کو رویائے صادقہ کا خاص ملکہ حاصل ہے اور حضرت والا رحمہ سے ارادت بھی حاصل ہے، انہوں نے عالم برزخ میں حضرت رحمہ کی حالت کا مشاہدہ فرمایا، مولانائے ممدوح کا خواب خود انہی کی زبانی سنیئے، فرماتے ہیں:۔

"میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ سفید لباس میں ملبوس ایک وسیع میدان میں آرام فرما ہیں، میں قریب جاکر قدموں سے متصل بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ حضرت رحمہ کو یہاں (عالم برزخ میں) کوئی کمرہ علیحدہ مل گیا ہے، تو سکوت اختیار فرمایا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ حضرت رحمہ کو بہت وسیع جگہ مل گئی ہے تو ارشاد فرمایا ـــــــ

"بہت وسیع جگہ مل گئی ہے!"

میں نے عرض کیا یہاں بھی عبادت ہوتی ہے؟ فرمایا: "کیوں نہیں" ایسے میں عشاء کی اذان سنائی دی، میں نے پوری اذان سنی اور حضرت رحمہ سے

(بقیہ صفحہ گزشتہ) خلاف معرکہ آرائی ہی رہا! جس کا اظہار خود حضرت رحمہ کے قلم سے یوں ملتا ہے":

"یورپ کے مذہبی وعلمی حملوں کے مقابلے میں اسلام کی خدمت کا ولولہ ہے اور اب تک پچیس[۲۵] برس کا زمانہ انہی مشاغل میں گذرا" اس محاذ کفر سے چونکہ اکثر اہل دین طبقہ میں بے خبری ہے اسلئے عام طور پر اندازہ نہیں کہ حضرت علامہ رحمہ نے دین کی کیا خدمت انجام دی، مگر علام الغیوب پر تو سب کچھ آشکارا ہے اور وہی بڑا شکور اور قدردان بھی ہے!!

[1] روایت حضرت پیرانی صاحبہ مدظلہا کے ذریعہ بتوسط سلمان میاں سلمہ مجھ کو ملی تھی بنظر احتیاط مکرر دریافت کرکے اب میں نے یہاں نقل کی ہے۔

عرض کیا کہ اتنی جلد عشاء کا وقت ہو گیا؟ فرمایا "ہاں" اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔"

برزخ میں نماز سے شغف

اُوپر کے خواب میں آپ نے دیکھا کہ نماز کا ذکر آیا ہے بلکہ اس سے شغف کا اشارہ بھی موجود ہے، اور یہ بات احادیث نبویؐ سے ثابت ہے کہ جس بندہ کو جس عمل سے مناسبت خاص اور تعلق خاص ہوتا ہے اللہ تعالیٰ عالمِ برزخ میں اس کو اسی عمل کی توفیق عطا فرماتے ہیں حضرت والارحؒ سلوک نبوت کے راہی اور قرب فرائض سے ممتاز تھے اور فرائض میں اُم الفرائض یعنی "نماز" سے خاص شغف تھا، نتیجہ یہ کہ برزخ میں بھی صلوٰۃِ دائم سے سرفرازی ہے، اور اس پر بہت سے حضرات کے خواب شاہد ہیں، چنانچہ حضرت مولانا محمد ہاشم مجددیؒ مدظلہٗ (المعروف بہ پیر ہاشم جان) اپنے ایک مکتوب میں احقر کو تحریر فرماتے ہیں:-

"سید صاحب قدس سرہٗ کو خواب میں دیکھا، ضعف و ناتوانی تو کجا چہرہ انور پر جوانی کی رونق ہے، محاسن سیاہ ہیں، نماز کے لئے سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں، میں سید صاحب سے کہتا ہوں کہ آپ نماز پڑھائیں، آپ فرماتے ہیں کہ "اب تو تمہیں نماز پڑھانی ہے۔"

خود اس راقم آثم کے خوابوں کی گو کوئی اہمیت نہیں مگر بیسیوں مرتبہ یہی دیکھا کہ کبھی عصر اور کبھی مغرب کی نماز سے قبل حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہے، حضرتِ والارحؒ نے شفقت و انبساط سے کچھ گفتگو فرمائی اور ایسے میں نماز کا وقت آ گیا تو فرمایا کہ چلیئے نماز پڑھ لیں، امامت کے لئے احقر کو آگے بڑھایا، جماعت ہو چکی تو آنکھ کھل گئی، اس بار بار کے یکساں مشاہدہ کا ذکر حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ کی خدمت میں کیا گیا تو جواب یہ شرف صدور لایا کہ

"حضرتؒ کو نماز سے ایسا ہی شغف تھا۔"

ؔ تعارف پچھلے باب میں کرایا جا چکا۔

اس یقینی اور پُرقوت جواب سے پوری طرح تشفی ہوگئی کہ حضرت سیّدی قدس سرہٗ کو اصل دولت "معراج المؤمنین" ہی کے رسوخ کی صورت میں حاصل تھی، اور اسی میں وہ اپنے دیدہ و دل کی ٹھنڈک پاتے تھے !!۔ اس سے ارفع واسلم بندہ کے لئے اور کون سا قرب ہوسکتا ہے؟

حیاتِ ناسوتی کی منزلت

حضرت مفتی صاحب دام فیوضہ، نے فرمایا کہ مرحوم عبدالمجید قریشی کی اہلیہ محترمہ نے خواب میں دیکھا کہ آفتاب غروب ہوگیا ــــــ صبح جب آنکھ کھلی تو پہلی خبر ممدوحہ کو حضرت والارحؒ کے رحلت ہی کی ملی اور خود ان کے دل نے بھی یہی تصدیق کی کہ حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ "آفتاب" تھے۔

یہ خواب سنا کر حضرت مفتی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ حضرت سید صاحبؒ ایک آفتاب تھے!

حیاتِ ناسوتی ہی میں نیابت رسول اکرمؐ کی بشارت

سیکڑوں مبشرات میں چند رویائے صادقہ جو اوپر نقل کئے گئے ہیں وہ سب حضرت اقدسؒ کی رحلت کے بعد کے ہیں، اب ایک اور خواب بھی ایک اور سلسلہ کے سالک کا اور تصدیق بھی خود انہی کے پیر و مرشد کی نقل کی جاتی ہے جو حضرتِ والارحؒ کی حیات میں دیکھا گیا تھا اس سے حضرت سیّدی قدس سرہٗ کی عنداللہ مقبولیت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت کا شرفِ خاص بالکل عیاں ہے، ملاحظہ ہو:۔

"مولوی سید خلیل صاحب مرید شاہ وارث علی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے، حضرت شاہ صاحب سے درخواست کی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوجائے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ پڑھنے کیلئے بتایا، مولوی صاحب پڑھتے رہے مگر تین رات مسلسل حضرت مولانا سید سلیمان

ندویؒ ہی کی زیارت ہوئی _______ مولوی خلیل صاحب حیران رہ گئے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ بجائے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی زیارت ہو رہی ہے"۔

شاہ صاحب نے بلیغ پیرایہ میں فرمایا کہ:۔

"غنیمت ہے کہ تم نے ان کو دیکھ لیا"۔

مراد یہ ہے کہ ان کی رویت حضورِ اکرمؐ کی زیارت کے قائم مقام ہے، اور یہ کہ اس دور میں وہ نائبینِ رسولؐ میں سے ہیں۔

ع یہ رتبۂ بلند مِلا جس کو مل گیا

ایک اور تصدیق

حضرتِ والاؒ کے رتبۂ خاص کی ایک اور تصدیق پیش کر کے اس مبارک موضوع کو مجبوراً ختم کرتا ہوں، اس سے خاصانِ حق اور اہلِ معرفت کی نگاہ میں حضرتِ والاؒ کے مقام کا پتہ چلے گا۔

حضرت پیر غلام محمد صاحب مجددی[1] قدس سرہٗ جنہوں نے حضرتِ والاؒ سے پہلے ہی

---

[1] ملا شور بازار (افغانی) کے قریبی رشتہ کے بھائی تھے، برسوں سورت میں قیام فرما رہے پھر تقسیم ہند کے بعد کراچی آ کر ملیر میں رہ گئے تھے، شب زندہ دار اور زہد و تقویٰ کا مرقع تھے اور اوراد و اشغال کے علاوہ ان کا یہ معمول تھا کہ ۱۵ پارے رات میں اور ۱۵ پارے قرآن پاک کے دن میں ختم فرماتے تھے، آخر زمانہ میں خون کا دباؤ بہت بڑھ گیا تھا، ڈاکٹروں نے آرام کرنے پر زور دیا مگر بقول حضرت والاؒ کے ان کی راحت تو اسی مشقت میں تھی شب بیداری سے پرہیز نہ ہو سکا اور آخر اسی عارضہ میں رحلت فرمائی۔ ان کی نماز جنازہ حضرت والاؒ نے پڑھائی۔

حضرت والاؒ کے نادیدہ معترف برسوں سے تھے، کراچی میں ملاقات ہوئی تو حضرتؒ کے دست مبارک کو چوما آنکھوں سے لگایا اور بے انتہا تکریم فرمائی۔ حضرت والاؒ جوابی ملاقات کے لئے ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے تو باوجود علالت کے کوٹھے سے اُتر کر موٹر تک لینے اور چھوڑنے تشریف لائے۔ پھر جب کسی سے حضرتؒ کی علالت کی خبر پائی تو ازراہِ محبت کئی مقوی دوائیں جو اپنے تجربہ میں آئی تھیں ہدیۃً لا کر دیں، حالانکہ عام طور پر وہ کسی کے ہاں آتے جاتے

رحلت فرمائی متعدد علماء (مثلاً مولانا سید بدر عالم صاحب اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب وغیرہ) اور دوسرے زائرین سے فرمایا کہ اس وقت حضرت سیّد صاحب بہت ہی ارفع اور خاص مقام پر فائز ہیں، فرماتے تھے کہ میں حضرت سیّد صاحب سے واقف نہ تھا، مگر ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں بھی بمبئی میں مقیم تھا اور وہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے، گو ہماری ملاقات نہیں ہوئی مگر میں نے ایک عجیب خواب دیکھا، جس سے ان کی عظمت مجھ پر کھل گئی اور معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے رتبے کے بزرگ ہیں ـــــــــ بعض حضرات نے خواب معلوم کرنا چاہا مگر پیر صاحب نے اس کے اظہار سے انکار فرمایا اور بس یہی فرمایا کہ ان کی زیادہ سے زیادہ قدر کرو اور ان سے بیش از بیش استفادہ کرو ـــــــــ

ایک مرتبہ ملک غلام محمد جو اس وقت گورنر جنرل بن چکے تھے پیر صاحب کی تعریف سُن کر ان کی زیارت کے لئے ملیر حاضر ہوئے اور دستورِ عام کے مطابق دعا کی درخواست کی پیر صاحب نے کیا عجیب اور بے لاگ جواب دیا، فرمایا کہ :-

"دُعا تو خیر ہوگی، مگر اصل بات یہ ہے کہ انسان کو جو اختیار اور قوت حاصل ہو وہ اس کو دین کی راہ میں خرچ کرے، آپ گورنر جنرل ہیں، اگر آپ واقعۃً کچھ دین کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت آپ کے ہاں ایک نہایت گراں قدر ہستی مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کی موجود ہے، ان سے کام لیجئے میری ان سے ملاقات نہیں[1]، مگر ان کی عظمت و منزلت سے واقف ہوں!"

نہ تھے، اُن کا سرخ و سفید نورانی چہرہ براق سی ڈاڑھی بڑی بڑی آنکھیں جن میں سرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے پاک و صاف سفید لباس سب اس وقت تصور کے پردہ پر اس طرح کھنچ آیا ہے گویا سامنے موجود ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

[1] اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ملاقات ہوگئی تھی۔

زائرینِ مرقدِ سلیمانی کے تاثرات

حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ

حضرتِ والا کی رحلت کے بعد جب پہلی مرتبہ حضرت مفتی صاحب کراچی تشریف لائے تو اس ناچیز سے فرمایا کہ "حضرت سید صاحب کے مزار پر حاضری دینی ہے اور آپ کے ساتھ چلوں گا۔" چنانچہ دوسرے دن عصر کے بعد احقر کے ساتھ تنہا مزارِ سلیمانی پر تشریف لائے۔ دیر تک مراقب کھڑے رہے، پھر دفعتہً کھلکھلا کر ہنس پڑے اور ہنسی کا اثر چہرہ پر دو ایک منٹ رہا پھر استغراقی اثر چھا گیا۔ جب مراقبہ سے فارغ ہو چکے تو میری طرف دیکھ کر مسکراتے جاتے تھے اور بار بار زبان سے "سبحان اللہ۔ ماشاء اللہ" کے کلمات نکلتے رہے واللہ اعلم ع بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۵۹ء میں حضرت ممدوح جب کراچی تشریف لائے اور سعادتِ میزبانی اس بے مایہ کو بخش رکھی تھی تو احقر کو لے کر حضرتِ والاؒ کے مزارِ مبارک پر پہنچے، مواجہ میں دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور دیر تک مراقب رہے جب مرقدِ سلیمانی سے ہٹے تو احقر سے فرمایا:

"جو بات یہاں ہے اور جگہ نہیں ہے"

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۵۹ء میں پہلی اور آخری بار جب مولانا دریابادی کراچی تشریف لائے تو ازراہِ ذرہ نوازی

اس عاجز کو گھر سے لے کر مرقدِ سلیمانی پر پہنچے۔ مزارِ پُر انوار پر دیر تک ساکت وصامت کھڑے رہے، جب مراقبہ سے فارغ ہو کر لوٹنے لگے تو احقر سے فرمایا:

"یہاں قلب پر وہی اثر رہا جو تھانہ بھون میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر حاضری میں حاصل رہا تھا۔"

حضرت مولانا سعد اللہ چشتی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت والاؒ کے مرقد سے دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر ایک غیر معروف مگر عالم و عارف بزرگ ۔ وطناً سرحدی، مذہباً حنفی اور مشرباً چشتی ــــــ مولانا سعد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھے اور اس دور کے مشہور چشتی بزرگ سلیمان نور اللہ مرقدہ کے خلیفۂ مجاز تھے۔ حضرت والاؒ کی رحلت کے مہینہ دو مہینہ بعد ہی انہوں نے ادھر ادھر پوچھ پاچھ کر پتہ چلایا کہ حضرت والاؒ کا خادم خاص کون ہے اور کہاں ہے؟ اور پھر اس ناچیز کو کہلوائے وہ ملنے کے مشتاق ہیں۔ جب میں حاضر ہوا تو بڑی محبت اور شفقت سے ملے احترام کا معاملہ فرمایا پھر گلۂ محبت کے طور پر فرمایا:

"ہم تو کچھ بھی نہیں مگر ہاں بزرگوں کو دیکھا ہے اور بزرگوں کے قدردان ہیں۔ آپ کے حضرت شیخ کو ہم جانتے ہیں کہ وہ کیا تھے اب بھی یہ ناچیز اکثر ان کے مزارِ مبارک پر حاضری دیتا ہے، مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ مزار کے احترام وحفاظت کا جو اہتمام حدودِ شرع میں کیا جا سکتا ہے، وہ نہیں کیا گیا ہے میں نے اپنے ہاتھ سے مزار کے قریب سے گندگی ہٹائی ہے یا تو آپ کریں ورنہ اجازت دیں تو یہ ناچیز اتنا تو کر سکتا ہے کہ مزار کے اطراف ایک چار دیواری بنوا دے تاکہ کوئی جانور قریب نہ آسکے۔"

اس ارشاد کو سُن کر یہ خادم غرقِ ندامت ہو گیا اور وعدہ کر لیا کہ انشاء اللہ یہ کام ہو جائیگا

چنانچہ محترم سید ابو عاصم صاحب سے التجا کر کے ضروری بندوبست کروادیا۔

السیّد محمد امین الحسینی مفتی آعظم فلسطین رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۶۹ء میں جب مفتی اعظم کراچی تشریف لائے ہوئے تھے تو دوچار احباب کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ تجدیدِ تعارف کے ساتھ ہی مفتی اعظم نے شفقت سے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"علامہ سیّد سلیمان تو ہمارے بڑے بھائی تھے، اُن کے مزار پر حاضری لازمی ہے اور کل عصر کے بعد آپ ہی کے ساتھ ہوگی۔"

چنانچہ دوسرے دن ——— باوجود اس کے کہ مفتی اعظم کی ایڑی میں زخم تھا، اور بہ مشکل چند قدم چل لیتے تھے ——— راقم الحروف اور مولانا جمال میاں فرنگی محلی کے ہمراہ وہ سید عالی مقام کے مزار پر تشریف لے گئے فاتحہ پڑھی اور کچھ دیر خاموش کھڑے رہے پھر مزارِ مبارک سے ہٹ کر صاحب مزار کے فضائل کا ذکر فرماتے رہے۔

صدر مملکت برآستانہ سیّد الملّت علیہ الرحمۃ

پاکستان کی تاریخ میں فضیلت مآب جنرل محمد ضیاء الحق (ایدہ اللہ بنصرہ العزیز) پہلے صدرِ مملکت ہیں جو حضرت والاؒ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے مزارات پر حاضر ہوئے اور حکم دیا کہ ان مزارات کے تحفظ کا مناسب سامان کیا جائے چنانچہ (اس وقت یعنی اگست ۱۹۸۳ء تک) ان مزارات کے اطراف خوبصورت او ربلند محراب دار چودیواری (بلا چھت کے) بنا دی گئی ہے، سنگِ مرمر کا فرش کر دیا گیا ہے، اور دونوں بزرگوں کے مزارات کی متصلہ دیواروں پر انکی تصانیف اور کارناموں کا تذکرہ سنگِ مرمر پر کندہ کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ صدر ضیا کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

خانوادۂ سلیمانی

حضرتِ والاؒ کا پہلا عقد غالباً ۱۹۰۴ء[1] میں ہوا، اور تیرہ برس لطف و محبت کی رفاقت رہی، ۱۹۱۷ء میں جب دستِ اجل نے اس رشتہ کو منقطع کردیا تو حضرتِ والاؒ پر اس کا غیر معمولی اثر ہوا، جس کا اظہار "فراقِ یار" کے عنوان سے چند اشعار میں برملا فرمایا، یہ نظم آئندہ باب ہشتم میں آئے گی ——— اکبرالہ آبادی مرحوم نے شاعرانہ زبان اور اپنے مخصوص حکیمانہ پیرایہ میں اس غم کو ہلکا کرنے کی کوشش فرمائی، چنانچہ پہلے تعزیتی خط میں یہ شعر لکھا ؎

اگرچہ تلخ ملا جامِ عمرِ فانی کا　　مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

پھر ایک اور خط میں چند متفرق اشعار دلجوئی کے لئے لکھ بھیجے، جو یہ تھے، ———

صدیوں فلاسفہ کی چناں اور چنیں رہی　　لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

ساتھی جو تھے رنج وراحت کے اس موت کے ہاتھوں چھوٹ گئے
اب یاس گرائے دیتی ہے، سب دل کے سہارے ٹوٹ گئے

مرنے والا مرچکا اور رونے والا رو چکا
وائے برہستی اگر مقصودِ ہستی ہو چکا

---

[1] حضرت والاؒ نے سنہ وفات (۱۹۱۷ء) تحریر فرمایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۳ سالہ رفاقت رہی (ملاحظہ ہو "یادِ رفتگان") اس حساب سے عقد ۱۹۰۴ء ہی میں ہوا ہوگا۔

ان اہلیہ نے دو اولادیں چھوڑیں، ایک صاحبزادی[1] اور ایک صاحبزادہ محترم ابو سہیل صاحب (کسٹم آفیسر مشرقی پاکستان)

حضرت والارح نے اپنی اسی اولاد سے دل بہلا کر بقیہ زندگی گزارنے کا تہیہ کیا تھا، مگر اپنے والد ماجد کے اصرار پر ۱۹۲۰ء میں عقدِ ثانی فرمایا، یہ اہلیہ مشکل سے ڈیڑھ برس تک حقِ رفاقت ادا کر کے سدھار گئیں، اس سانحہ نے پچھلے زخم ہرے کر دیے، چنانچہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"دیسنہ اور اس کے مکان کی ایک کوٹھڑی میرے لئے تاریخی غم کی یادگار بن گئی اور میرے احساس کو صدمہ پہنچتا رہتا ہے۔"

اس کے بعد ایک لطیفہ پیش آیا جس کا ذکر خود حضرتِ والارح نے اس حقیر سے فرمایا تھا خواجہ حسن نظامی دہلوی نے ایک رشتہ حضرتؒ کی خدمت میں بھیجا، مگر کس کا؟ سکندرآباد (دکن) کے سب سے بڑے تاجر کروڑپتی احمد علاؤالدین (جو بعد کو احمد نواز جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے) کی صاحبزادی کا! بلاشبہ احمد علاؤالدین مرحوم نہایت نیک سرشت، دین دوست اور صاحبِ خیر امیر تھے لیکن رشتہ ناتہ میں تو سب سے بڑی چیز ماحول کی یگانگت معاشرت کی یکسانیت اور ذہن و فکر کا توافق ہے، محض مال و دولت تو زندگی کو خوشگوار نہیں بنا سکتے، مگر ع

فکر ہر کس بقدر ہمّت اوست!

مصوّرِ فطرت نے فطرت کے سارے تقاضوں سے صرف نظر کر کے نہ صرف یہ رشتہ بھیجا بلکہ اس پر پُرزور اصرار بھی کیا، حضرتِ والارح نے اس کے جواب میں صرف ایک جملہ تحریر فرما کر اس قصہ کو ختم فرما دیا۔

---

[1] ان صاحبزادی اور انکے خاوند کی جواں مرگی کا غم بھی حضرتؒ کو سہنا پڑا۔ البتہ ان کی اکلوتی اولاد اور یادگار سید نقی اشرف صاحب اس وقت اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں کسی عہدہ پر فائز ہیں۔

"سکندر آباد کے سب سے بڑے امیر کی صاحبزادی اعظم گڑھ کے سب سے بڑے فقیر کے گھر کیسے آسکتی ہے؟"

غرض اس کے بعد پھر تیسرا نکاح، جنوری ۱۹۲۳ء کو خانوادۂ سادات بہار ہی میں کیا، ان اہلیہ محترمہ (مدظلہا) سے چار صاحبزادیاں اور ایک فرزند سید سلمان سلمہٗ ہیں، دو صاحبزادیوں کا عقد حضرت کی حیات ہی میں ہوچکا تھا، بڑے داماد محترم سید ابوعاصم صاحب (ایڈوکیٹ کراچی) ہیں، اور ان سے چھوٹے محترم سید حسین صاحب ڈپٹی سکریٹری حکومت یوپی (لکھنؤ) ہیں۔ دو صاحبزادیاں جو صاحبزادہ سلمان (متعلم ایم اے) سے چھوٹی ہیں ابھی ناکتخدا ہیں۔

حضرت والا رح کی خانگی زندگی شفقت و محبت سے معمور تھی، اپنے تمام بچوں سے بڑی محبت فرماتے تھے، سلمان میاں کو تربیت کی خاطر سفر و حضر میں ہمیشہ حضرتؒ نے ساتھ ہی رکھا ——————— بچوں کو کبھی ڈانٹتے یا جھڑکتے نہ تھے غصہ آتا تو صرف یہ فرما دیتے کہ یہ طاغوتی حرکت مجھ کو پسند نہیں، البتہ نماز میں ان کے تساہل پر حضرت رح کا لہجہ ترش ہوجاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ حضرت والاؒ پر رحمتوں کی بارش فرمائے اور ان کے پسماندوں میں تعمیرِ باطن اور تعلق مع اللہ کا وہ شعور اور اس کی وہ تڑپ پیدا فرمائے جس کے لئے وہ مضطرب رہتے تھے! آمین!

قیام "یادگارِ علمی" کی کوششِ ناتمام

پہلی کوشش حضرت علّامہ کا سانحۂ ارتحال ایک ملی علمی خسارہ تھا، کراچی کے اعلیٰ علمی حلقوں میں حضرت کی یادگار کے طور پر ایک علمی ادارہ کے قیام کا خیال جوش زن تھا، انتقال کے مہینہ بھر کے اندر ہی اندر جناب شعیب قریشی صاحب وزیر حکومتِ پاکستان کی صدارت میں "سلیمان ندوی اکیڈمی" کے قیام کی غرض سے چند اہلِ علم کی مشاورتی مجلس ہوئی اور طے پایا کہ اس اکیڈمی کے بنیادی اراکین حسب ذیل ہوں گے :۔

۱. جناب شعیب قریشی وزیر حکومت پاکستان (صدر)
۲۔ ہزاکیلینسی عبدالوہاب عزام بے، سفیر مصر متعینہ پاکستان۔
۳۔ " السیّد عبدالحمید الخطیب، سفیر سعودی عرب متعینہ پاکستان۔
۴۔ " جناب جواد المراتب، سفیرِ حکومت شام متعینہ کراچی
۵۔ ڈاکٹر محمود حسین، (سابق وزیر تعلیم حکومت پاکستان)
۶۔ حاجی وجیہہ الدین صاحب۔
۷. ڈاکٹر حمید اللہ، (پیرس)
۸۔ پروفیسر محمد شفیع
۹۔ پیر غلام محمد سرہندی
۱۰۔ پیر ہاشم جان (مولانا محمد ہاشم مجددی)
۱۱۔ مولانا راغب احسن (ڈھاکہ)

۱۲۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی۔

۱۳۔ حکیم محمد نصیر الدین احمد اجمیری ندوی۔

۱۴۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔

۱۵۔ مولوی انوار ندوی۔

۱۶۔ سیّد ابو عاصم (ایڈوکیٹ) سکریٹری۔

مگر یہ کام کسی محرک و فعال شخصیت کی عدم موجودگی کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔

دوسری کوشش

اس کے ایک آدھ سال بعد مولانا راغب احسن مرحوم (سابق ممبر پارلیمان) نے جن کو واقعتہً اس کام کا بڑا احساس تھا اس اکیڈمی کے قیام کا ایک مکمل خاکہ تیار فرمایا اور اس کا اصل نام "سید سلیمان ندوی دائرۃ المعارف اسلامیہ" اور مختصر نام "سلیمان ندویؒ اکیڈمی آف اسلام" تجویز کیا۔ یہ خاکہ انگریزی ٹائپ میں فُل اسکیپ کے ۲۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس کی ایک کاپی احقر کے پاس اسوقت تک محفوظ ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد میں وقت کے جملہ علمی فتنوں کی مدافعت اور ضرورتِ حاضرہ کے جملہ مسائل کا صحیح تحقیقی اسلامی لٹریچر تیار کرنا تھا، مولانا راغب احسن نے اس خاکہ میں یہ ثابت کرتے ہوئے کہ حضرت علامہ نور اللہ مرقدہٗ کے اصولِ تحقیق ٹھیک وہی تھے جس کی بنا امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ڈالی تھی، اس بات پر زور دیا ہے کہ اکیڈمی میں علمی و تحقیقی کام کرنے والے علماء اور جدید اہل علم کے پیشِ نظر وہی اصول رہنے چاہئیں اور وہ خود بھی اپنے آپکو دنیوی لالچ اور حکومت کے دباؤ سے الگ رکھ کر کام کریں۔

اس ادارہ کے ابتدائی عہدہ داروں کے نام یہ تجویز ہوئے تھے:۔

۱۔ صدر، ڈاکٹر محمد حمید اللہ (مقیم پیرس)

۲۔ مقامی صدر، ڈاکٹر محمد محمود احمد، (صدر شعبہ فلسفہ و ڈین آف آرٹس کراچی یونیورسٹی)

نائب صدر، علّامہ سیّد عمیم الاحسان (مفتی اعظم و صدر مدرسۂ عالیہ ڈھاکہ) (برائے مشرقی پاکستان)

۴۔ ناظم ، مولانا راغب احسن (ڈھاکہ)
۵۔ چیف ریسرچ اسکالر ، مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی (تلمیذ حضرت علامہ ندویؒ)
۶۔ معتمد اعزازی ، جناب ابراہیم احمد باوانی (کراچی)
۷۔ نائب معتمد ، مولوی غلام محمد بی۔ اے (عثمانیہ) (کراچی) مسترشد حضرت علامہ ندویؒ
۸۔ ریسرچ اسکالرز اور

اراکین :۔

۱۔ ڈاکٹر افضال حسین قادری۔ ایم۔ اے، پی ایچ ڈی (کنٹب) ڈی، ایس سی (علیگ)
۲۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی۔ ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی (مصنف "اسلام اور سود")
۳۔ ڈاکٹر علیم الرضی۔ ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی، بار ایٹ لا، (لندن) و فاضل و کامل مدرسہ
۴۔ مولانا ڈاکٹر عبدالباری۔ ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی (آکسن) صدر جمعیت اہل حدیث مشرقی پاکستان
۵۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی۔ ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی
(مصنف "مجدد الف ثانی کا نظریۂ توحید")
۶۔ ڈاکٹر محمد احسان اللہ، ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی (علیگ)، (پشاور یونیورسٹی)
۷۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان۔ ایم۔ اے، پی۔ ایچ، ڈی (پیرس) وائس چانسلر علیگڑھ یونیورسٹی (ہند)۔
۸۔ جناب شجاعت علی صدیقی، ایم۔ اے (مصنف "اسلامک پبلک فنانس")
۹۔ جناب امیر الدین قدوائی۔ ایل ایل بی (علیگ)
۱۰۔ سید ابو عاصم صاحب (ایڈوکیٹ) ایم، اے، ایل ایل بی۔

مگر یہ کارروائی بھی آگے بڑھ نہ سکی، اب جہاں تک یاد ہے مولانا راغب احسن، جن کی

شخصیت تنہا فعال بھی تھی اور عملاً مرکزی بھی، وہ سیاسیات عملی میں خواہی نہ خواہی پھنس گئے اور زیادہ تر ڈھاکہ ہی میں مقیم رہے، اس لئے، یہ منصوبہ بھی تجویزی یادگار بن کر رہ گیا۔

اس کے بعد سناٹا ہے اور اب توان افراد کو ڈھونڈنا پڑے گا جو اس عظیم کام کا شایانِ شان منصوبہ بھی تیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

باب ہفتم

بعض خصوصی کمالات اور اصولِ تربیت

ضروری بات

حضرت والا رحمہ کے ظاہری و باطنی، اخلاقی و ایمانی محاسن کا مشاہدہ آپ کرتے آئے ہیں کہ ابتدائے حیات سے آخری لمحات تک ہر دور میں کس قدر گوناگوں اور نمایاں ہیں ان خوبیوں کو واقعاتِ زندگی سے الگ کر کے دکھانا، ان کی آراستگی کو مجروح کرنا ہوتا، اس لئے ہر تجلیِ حیات کو اسی زمان و مکان میں دیکھا اور دکھایا گیا ہے، اس میں ایک افادیت یہ بھی پیدا ہو گئی ہے اب کتاب جس جگہ سے کھولی جائے گی، نگاہ انشاء اللہ صاحبِ تذکرہ علیہ الرحمۃ کے کسی نہ کسی جمالی پہلو سے ضرور بہرہ اندوز ہوگی۔

مگر اس اہتمام و التزام کے باوجود پھر یہ باب جو کھولا جا رہا ہے تو اس کی غایت بعض ایسے وہبی اور اکتسابی کمالات اور شیخ کے اصولِ تربیت کو پیش کرنا ہے، جو خصوصی نظر اور مرتکز توجہ ہی کے محتاج ہیں، میرا ارادہ اصولِ تربیت کی ترتیب کا نہ تھا کیونکہ منہاج سیلمانی کے باب میں اہلِ نظر ان کو تلاش کر سکتے تھے۔ مگر حضرتِ محترم مولانا عبدالباری ندوی مدظلہٗ نے اس کی اہمیت پر زور دیا اور جب ان کے ارشادِ گرامی کی تعمیل پائی تو اب اس کا اعتراف ہے کہ اگر ان اصولوں کو الگ الگ کر کے بیان نہ کیا جاتا تو بڑی کمی رہ جاتی۔ اب یہ اصولِ ہادیانِ طریقت کے لئے انشاء اللہ نہایت مفید ثابت ہوں گے۔

حلیہ میانہ قد، متوسط جسم، توازنِ مزاج کی دلیل محکم، پُرنور ماہتابی چہرہ، خوبصورت سفید گھنی داڑھی، تقدس کا ہالہ! فراخ دمکتی ہوئی پیشانی، عظمتِ سلیمانی کی نشانی، رُخسار اُبھرے اُبھرے، روشن کہ عین مرضِ موت میں بھی ضعف و نقاہت کو جھٹلاتے رہے آنکھیں بڑی بڑی، مگر دفورِ حیا سے اکثر جُھکی ہوئیں! ابرو بھرے بھرے خمدار محبت و دلداری کے ضامن! بینی و گوش توازنِ حسن کو قائم کئے ہوئے، اور کان کی لویں پیوستہ عقل و فراست اور قوتِ خطابت پر گواہ! ہونٹ پتلے پتلے اور دورِ دہن تنگ، احتیاط و ایجازِ کلام پر شاہد! رنگ کھلا ہوا مگر سفید نہیں، بلکہ "اَنَا ملیح" والی جاذبیت لئے ہوئے! ہاتھوں کے پنجے چھوٹے اور نرم قوت و حسنِ تحریر کی دلیل بنے ہوئے! پاؤں چھوٹے قدم چھوٹے رفتار پُروقار!

لباس خوش وضع، ثقہ، صاف اور ستھرا، حسنِ ذوق اور جمالِ باطن کا آئینہ، نشست و برخاست میں متانت، میل جول میں تواضع اور عزتِ نفس کا حیرت انگیز امتزاج!— سکوت میں وہ رعب کہ بلا امتیاز ہر اہلِ محفل کی تابِ سخن مسلوب ہوجائے اور تبسم میں وہ ترحم کہ ادنیٰ سے ادنیٰ حاضرِ مجلس میں بے تکلفانہ عرض معروض کا حوصلہ پیدا ہوجائے۔

ان کا مقامِ ولایت اور ان کی نسبت مع اللہ تعارفِ غیر سے بے نیاز، اجنبی بھی، ان کے چہرۂ انور کو دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھتے تھے کہ یہ تو فرشتہ معلوم ہوتے ہیں! اہلِ نظر کہتے تھے کہ نہیں یہ تو رشکِ فرشتہ ہیں، عبدیتِ کاملہ کا پیکر، صبغۃ اللہ کا مظہر!

فتبارک اللہ احسن الخالقین

بہ قسم کہتا ہوں کہ اپنی نظر جب جب ان کے چہرۂ حق نما پر پڑی، دل میں بے اختیار اللہ کی ہوک اٹھی اور کتنی ہی بار زبان سے بے اختیار "کرم اللہ وجہہ" کی دُعا نکل پڑی۔

لطیفہ کراچی کے چند روزہ قیام کے بعد یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو عشق مجسم حضرت مولانا مفتی محمد حسن مدظلہٗ لاہور مراجعت فرمارہے تھے، وداعی ملاقات کیلئے حضرت مرشدیؒ ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور یہ خادم بھی ساتھ تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت والاؒ

کی صحت بار بار خراب ہو جاتی تھی۔ حضرت مفتی صاحب نے ایک تعویذ حضرت مرشدیؒ کو عنایت فرمائی اور اس ارشاد کے ساتھ کہ

"حضرت اس کو اپنے پاس رکھ لیں نظرِ بد سے حفاظت رہے گی، حضرت کو بار بار نظر لگ جاتی ہے"۔

حضرت سیّدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ مجھ میں کیا رکھا ہے؟ مجھے کیوں نظر لگے گی؟

مفتی صاحب نے فرمایا "وہی ——— ع

بڑھاپے میں بھی جانِ جاں ہو رہا ہے[1]"

اس پر حضرت والاؒ نے فرمایا:

"مگر ——— ع دمکتا ہے چہرہ چمکتی ہیں آنکھیں[2] ——— والی بات کہاں؟"

صاحبِ نظر مخاطب نے فرمایا:

"وہ بھی ہے اور ہم کو دکھائی دیتی ہے، کسی اور کی نظر نہ لگتی ہو تو میری ہی نظر لگ جاتی ہو گی"۔

اس پر مسکراہٹوں کے انوار میں اخلاص و محبت کی بات ختم ہو گئی ——— اہلِ عشق و معرفت کی یہ محبت افزا باتیں اور ان کی یہ جنون نواز مجلسیں اب کہاں ملیں گی ؎

ایام ہمہ بود کہ با شیخ بسر رفت
باقی ہمہ بے حاصلی و بے خردی بود

لباس حضرت والاؒ لباس بڑے قرینے سے اور اپنے حسبِ حیثیت پہنتے تھے، صفائی، موقع و محل اور موسم کی رعایت بھی ضرور فرماتے تھے، عمومی لباس کی صورت یہ تھی کہ صاف ستھرا سفید کرتا گھٹنوں کو چھپائے ہوئے اور لٹھے کا پاجامہ ٹخنوں سے

---

[1] و [2] یہ حضرت مجذوب کے مصرعے ہیں جو انھوں نے اپنے شیخ با جمال رحؒ کے نشۂ عشق میں ڈوب کر کہے تھے۔

مجذوب صاحب کے اصل دو شعر یہ ہیں ؎

علانیہ اونچا، ڈھیلی ڈھالی مگر جسم پر موزوں اُتری ہوئی نصف ساق تک لانبی شیروانی جس کی اوپری بائیں جیب میں گھڑی اور فونٹین پن لگا ہوا، عید بقرعید کو شیروانی پر سیاہ رنگ کا عبا، پاؤں میں اکثر معمولی کام کا سلیم شاہی جوتا اور کبھی سیاہ پمپ شوز، سر پر براق سا سفید ململ کا صافہ، کہنے کو صافہ مگر بندش و موزونیت کے اعتبار سے تاج سلیمانی نج کی صحبت میں سفید دو پلیہ ٹوپی بھی بڑی دلکش نظر آتی تھی بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں خاتم سلیمانی چاندی کے بیضوی حلقہ میں عقیق پر "سیّد سلیمان ندوی" بخط ثلثؒ کندہ تھا۔

یوں تو حضرت والا رحمہ ہی جامہ زیب مگر سفید و سیاہ شیروانی اور سیاہ عبا میں تو ان کو دیکھ کر نظر سیر ہی نہ ہوتی تھی اور صافہ کی بندش و موزونیت تو ان پر ختم تھی، چھ ہاتھ کا صافہ باندھتے تھے، نہایت بے تکلفی اور ہلکے ہلکے ہاتھ سے مگر پیچ بہت صحیح آتے، اور آخری پیچ ختم کر کے صافہ کا سرا اس انداز سے لُوبتے تھے کہ چھوٹا سا طرہ اوپر نکل آتا تھا اور ایسا استادہ رہتا گویا اس میں شعور سرفرازی پیدا ہے۔ شملہ کو بھی اسی خوبی کے ساتھ پچھلے حصہؔ میں اُڑس کر دونوں شانوں کے درمیان لٹکاتے تھے ــــــــــ اس صافہ پر نہ جانے کتنوں کو رشک آکر رہا، مگر بندھ کسی سے نہ سکا، خود مولانا شبلیؒ نے بھی جو نہایت قیمتی عمامہ باندھتے تھے، اس معمولی صافہ کو دیکھ کر سر محفل اظہار رشک فرمایا کہ :-

"دیکھو میرے سر پر کتنا قیمتی عمامہ ہے مگر بندھا ایسا ہے کہ کسی دیہاتی کی پگڑی معلوم ہوتی ہے، اور تمہارا چھ ٹکے کا صافہ ہے، مگر اس قرینہ سے بندھا ہے کہ زیب دیتا ہے۔"

ڈھبی ہے کچھ ایسی کہ تیور تو دیکھو | جواں آج پیر مغاں ہو رہا ہے
دمکتا ہے چہرہ چمکتی ہیں آنکھیں | بڑھاپے میں بھی جانِ جاں ہو رہا ہے

؎ کرتہ بالعموم موٹے ساتر کپڑے کا ہوتا اور اگر ململ کا زیب تن فرماتے تو اس کے اندر نیم آستین لانبی بنیان ضرور ہوتی خواہ موسم کوئی ہو، یہ غایت حیا اور تہذیب کا اثر تھا۔

؎ عربی رسم الخط کا سب سے خوبصورت طرز!

(حیاتِ شبلیؒ ص۱۳۱)

حضرت والاؒ نے خود فرمایا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق کے بعد کبھی کبھی خیال آیا کہ لباس کی ہیئت بدل دی جائے، صرف کُرتے اور پاجامے پر اکتفا رہے، مگر فرمایا کہ پھر یہی خیال مانع رہا کہ جب حضرتؒ نے اس لباس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی تو اب اسکو بدلنے کی کیا ضرورت ہے!

درس :- خیر یہ تو لباس کی تفصیل ہوئی، سننے اور یاد رکھنے کی بات تو یہ ہے کہ یہ ساری نفاست اور ذوقِ تجمّل کس بے تکلفی سے دینی تقاضے پر قربان ہو جاتا تھا، ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ نے بتایا کہ جونپور میں ایک روز حضرتِ والاؒ کہیں سے پیدل چلے آرہے تھے اور حضرت والاؒ سر سے پیر تک سفید پوشاک پہنے ہوئے تھے، راستے میں مغرب کا وقت آگیا اور اذان ہونے لگی، ایک چھوٹی سی مسجد کا جس میں محض مٹی کا فرش تھا، حضرتؒ نے رُخ فرمایا۔ جب داخل ہونے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مٹی میں کپڑے خراب ہو جائیں گے، حضرتؒ نے ارشاد فرمایا:

"تو کیا ہوا، پھر بدل لئے جائیں گے، مگر جماعت چھوٹ گئی تو پھر کہاں ملے گی؟"

چنانچہ ڈاکٹر صاحب شاہد ہیں کہ حضرتؒ نے ادنیٰ تامل کے بغیر اسی مٹی پر نوافل تک پورے اطمینان سے ادا فرمائے، گو لباس اور پیشانی خاک آلود ہو کر رہی۔

جمالِ ظاہر کے دلدادہ، اس کمالِ باطن پر فریفتگی کا حوصلہ پیدا کریں، ورنہ انکی پسند ناقص رہے گی اور وہ عظمتِ سلیمانی کو پہچان نہیں سکیں گے۔

محاسنِ گفتار حضرت والاؒ کے بول بڑے انمول تھے اور ان میں محاسن کے کئی کئی پہلو جمع ہوتے تھے، ان کی تذکیری افادیت کے پیشِ نظر چند اہم اوصاف کو الگ الگ کر کے دکھانا زیادہ مفید ہوگا۔

(۱) وہ کم سخن تھے مگر ان کی زبان جواہر رولتی تھی، حضرتؒ کے چھوٹے چھوٹے صاف

وسادہ جملے اہل فکر کے لئے کلید علم وحکمت ہوتے تھے دوتین مثالیں پیش ہیں ذرا غور سے ملاحظہ ہوں۔

(ا) فرمایا کہ "لا الٰہ الا اللہ" "میں" الٰہ" کا لفظ ساری صفاتِ الٰہیہ کا جامع ہے، جب کبھی اس کے مفہوم کو کسی ایک صفت کے ساتھ خاص کر کے اس کلمہ کی توجیہہ کی گئی تو گمراہی کا دروازہ کھل گیا۔ جیسے صوفیاء نے لا اِلٰہ کی تعبیر "لا مَوجُودَ" سے کی، اس کا نتیجہ وحدۃ الوجود اور اس کی موشگافیوں کی صورت میں ظاہر ہوا اور آج مودودی صاحب لا الٰہ کی تعبیر لا حاکم سے کر رہے ہیں، لہٰذا ان کو سارا دین سیاست وحکومت ہی نظر آتا ہے!

(ب) فرمایا کہ علم کو علم کی خاطر چاہنا قلبی جہل ہے!

(ج) ایک عالم دین نے نصیحت کی درخواست کی تو فرمایا، ایک تو ہے "علمِ نبوت" جو قرآن اور حدیث کی صورت میں موجود ہے) اور دوسری چیز ہے "نور علم نبوت" علماء علم نبوت کے حصول پر مطمئن ہو جاتے ہیں حالانکہ اصل چیز "نورِ علمِ نبوت" ہے جس کے حصول کے بغیر علم لفظی تشنہ رہ جاتا ہے۔

(د) فرمایا کہ دارا شکوہ اگر تخت پر بیٹھتا تو مسلمانوں کی سلطنت تو باقی رہتی مگر اسلام ختم ہو جاتا۔ عالمگیر کے تخت پر بیٹھنے سے، اس کے بعد گو مسلمانوں کی سلطنت تو باقی نہیں رہی مگر اسلام باقی رہا۔

(۲) حضرت کی گفتگو کا خاص وصف مخاطب کے ذہن کی رعایت، اس کی سطح پر نزول اور اس کے محاورہ میں کلام فرمانا تھا، اس پر حسن تعبیر کا سلیقہ مستزاد، پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو باتوں باتوں میں حل فرما جاتے تھے، سننے والا حیران رہ جاتا تھا کہ جس کو پربت سمجھا تھا وہ تو رائی کا دانہ نکلا صرف دو مثالیں نمونۃً پیش ہیں:-

(ا) ایک سالک طریق جو معاشیات کے گریجویٹ تھے اور ذکر میں فائدہ محسوس

نہ کرتے تھے انہوں نے جب اپنی اس ناتشفی کا اظہار کیا تو حضرت والا رح نے ارشاد فرمایا کہ جب انسان کو پیاس لگتی ہے تو وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پیتا ہے پہلے دوسرے یا تیسرے گھونٹ میں اس کی کوئی تسکین نہیں ہوتی، لیکن بالآخر ایک نوبت پر وہ سیر ہو جاتا ہے مگر اسکے معنے یہ تو نہیں ہوتے کہ بس آخری ہی گھونٹ نے اس کو سیراب کر دیا اور پہلے سارے گھونٹ بے فائدہ رہے، نہیں بلکہ فائدہ آخری گھونٹ پر "محسوس" ہوا۔ گو اس نفع رسانی میں ہر گھونٹ کا مساوی حصہ ہے، پہلا گھونٹ نہ پیا ہوتا تو آخری کی نوبت کہاں آتی، یہی حال ذکر کا ہے مداولت ہو تو بالآخر یہ اثر دکھا کر رہتا ہے۔ گو اس کا نفع اول ہی روز سے شروع ہو جاتا ہے۔

سبحان اللہ قانونِ افادۂ مختتم[1] کی طرف توجہ کر کے معاشیات کے ایک طالب علم کی کیسی تشفی فرمادی کہ اب شبہ کی جڑ ہی کٹ گئی۔

(ب) غیر اللہ سے استمداد کی جو صورتیں مسلمانوں نے پیدا کر رکھی ہیں اس کا رد فرما رہے تھے اور حاضرین میں زیادہ تعداد نو تعلیمیافتہ حضرات کی تھی، مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

> "بدعتیوں نے اللہ میاں کی حکومت کو بھی بس شاہ انگلستان کی حکومت سمجھ رکھا ہے کہ نام بادشاہ کا اور اختیارات پارلیمان کے، زبان پر "لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه" باقی جو مانگنا ہے وہ بڑے پیر صاحب رح سے" خواجہ اجمیری رح اور دوسرے اولیاء اللہ سے!"

شرک کی قباحت کے اظہار کا اس سے بہتر، واضح تر اور موثر ترین پیرایہ، خصوصاً نو تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے؟

(۲) حضرت اقدس رح کی گفتگو کا تیسرا نادر وصف مخاطب کی دل نوازی اور اس کے حال پر شفقت تھا، وہ کسی کو ذلت کی نظر سے دیکھنا، یا تحقیر کے لب ولہجہ میں خطاب کرنا جانتے ہی نہ تھے، اسی لئے ہر طبقہ کے افراد کو ان سے اُنس محسوس ہوتا تھا اور وہ ان سے

---

[1] فن معاشیات کی ایک اصطلاح ہے!

مستفید ہوتے تھے، پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس وصف عالی کا ذکر کرتے ہوئے جو بات لکھی ہے وہ ہمارے علمار کرام کے سننے اور غور کرنے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت والارح کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ان کو دیکھ کر اور ان کو پا کر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے اور رسوانہ کریں گے"۔[1]

چنانچہ اس کے ثبوت میں گذشتہ ملفوظات کافی ہیں، مگر اس کے لئے بڑے حوصلے حلم اور ضبط کی ضرورت ہے جو حضرت والارح میں بہ تمام و کمال موجود تھا۔ رشید صاحب کی تصدیق سنیئے:

"مذہب کی بات ہو یا سیاست کی، علمی مسائل ہوں یا کوئی اور بحث، سید صاحبؒ بڑی سنجیدگی سے اظہارِ خیال کرتے تھے اور دوسروں کا نقطۂ نظر سننے میں بڑے تحمل سے کام لیتے تھے، بحث میں وہ کبھی جز بز نہ ہوتے بلند آواز سے گفتگو نہ کرتے، کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے، کوئی پھبتی، فقرہ، یا دل آزاری کی بات نہ کہتے، گفتگو میں کوئی کتنا ہی لب ولہجہ ناواجب اختیار کرتا، سید صاحب کے رکھ رکھاؤ میں ذرا فرق نہ آتا تھا"۔[2]

(۳) حضرتِ والارح کی گفتگو کا چوتھا وصف ظرافت ہے، اس کا اندازہ گزشتہ ملفوظات سے بھی کچھ ہو ہی گیا ہوگا، دو ایک شکر پارے اور حاضر ہیں:-

(ا) مرض الموت میں چند لوگ حاضر ہوئے اور دیر تک سناتے رہے کہ ہم لوگوں نے حضرتؒ کی صحت کے لئے خود بھی دعا کی اور فلاں فلاں اجتماعات میں بھی کروائی جب یہ لوگ چلے گئے تو حضرتؒ نے راقم حقیر کی طرف مسکرا کر دیکھا اور فرمایا:

"آپ کے میر عثمان علی خان (نظام حیدر آباد دکن) بعض بعض جملے بڑے مزے کے کہہ جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ مولانا! لوگ دعا کرتے ہیں اور مڑکر←

---

[1] و [2] سلیمان نمبر معارف! گنج گرانمایہ ص۱۱۴۔

دیکھتے بھی ہیں کہ حضور دیکھ بھی رہے ہیں یا نہیں!"

(ب) ایک مرتبہ ہندوستان کی ایک بلند پایہ شخصیت حضرت کی مہمان تھی، ایک روز یہ دونوں اکابر عصر شبلی منزل کے سبزہ زار (لان) پر ٹہل رہے تھے کہ ایسے میں ایک گدھا کمپونڈ میں گھس آیا، مہمان نے از راہ مزاح میزبان پر طنز کیا کہ

"اچھا یہاں گدھے بھی رہتے ہیں"۔

حضرتؒ نے نہایت سادگی سے فرمایا:

"جی نہیں، باہر سے آجاتے ہیں"۔

(ج) حضرت والاؒ کا شعر ہے

ہر ضربِ تیشہ ساغرِ کیفِ وصالِ دوست
فرہاد کی جو بات ہے مزدور کی نہیں

میرے ایک دوست نے عرض کیا کہ حضرت اس شعر کا پہلا مصرعہ کیا غالبؔ کا ہے؟

حضرتؒ مسکرائے اور فرمایا:

"جی نہیں، مغلوب ہی کا ہے"۔

(۵) پانچواں وصف خاص گفتگو کی سلاست و سادگی کے باوجود اس کا سوز و گداز تھا، خصوصاً دوران گفتگو کبھی کبھی زبانِ مبارک سے بے ساختہ "اللہ" یا "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" یا "استغفر اللہ" کے کلمات آہستہ مگر اس قدر پُر سوز نکلتے تھے کہ سننے والوں کے قلب پر بجلی سی گر جاتی تھی بلکہ بعضے اہلِ جذبہ افراد تو بے خود ہو جاتے تھے، دورانِ قیام بھوپال ماسٹر شفیق احمد صاحب (مجاز صحبت حضرت حکیم الامت) کو تو دیکھا کہ حضرت کے ایک ایک جملہ پر ان کی چیخ نکل جاتی تھی، یہاں ہمارے برادرانِ طریق میں مولوی محمد اشرف خان صاحب کو بھی بارہا دیکھا کہ وہ دورانِ گفتگو بار بار مچل جاتے تھے اور کبھی کبھی خود ان کی زبان سے بھی کوششِ ضبط کے باوجود لفظ "اللہ" ایک خاص انداز سے نکل جاتا تھا، اسی طرح حضرت والاؒ کے ایک اور دست گرفتہ جناب سید عبدالرحمٰن صاحب (اسسٹنٹ ڈائرکٹر

پاسپورٹ لاہور) نے جن کو شعر گوئی کا ستھرا ذوق تھا حضرت والا رحؒ کی زبان سے اسی لفظ "اللہ" کی صدا سُن کر اور اس کے کیف میں ڈوب کر ایک شعر کہہ دیا تھا، جس کا مصرعۂ ثانی سننے والوں کے تاثر کا صحیح ترجمان ہے، وہ شعر یہ ہے :

نام اُن (اللہ) کا اور جان (جانِ عزیز) کے ساز پر
ہر رگِ جاں پھڑ گئی آواز پر

ایک اور صاحبِ ارادت کا یہ حال تھا کہ پھُوٹ پھُوٹ کر رو دیتے تھے، نہ زبان سے کچھ کہتے تھے، نہ کہنا چاہتے تھے ـــــــ ایک دوسرے تھے جو مسکرا کر سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتے اور اپنے اس والہانہ انداز پر شرمندہ بھی ہوتے۔ غرض تاثر سے کوئی خالی نہ رہتا۔

عجیب کیفیت تھی کہ نہ گفتگو میں جوش تھا، نہ لہجہ میں زور، مگر جو بات نکلتی تھی وہ دل میں اُتر جاتی تھی! بقول عارف شیرازیؒ

جمالت معجز حسنست لیکن
حدیثِ غمزہ ات سحر مبینست

محاسنِ تقریر حضرت والا رحؒ کم گو اور کم آمیز ہونے کے باوجود اردو اور عربی زبان کے قادر الکلام مقرر تھے، بلکہ ان کی عالمانہ عظمت کا تعارف ہی وصفِ خطابت سے ہوا تھا، مگر ہر مقام کی طرح یہاں بھی حضرت سلیمانؒ کا ایک انفرادی رنگ تھا، حضرتؒ کا بیان جوش وخروش سے پاک مگر اثر وکیف سے مملو ہوتا تھا، انکی تقریر دلگداز نہیں دلنواز ہوتی تھی، وہ عام مقررانہ حربوں (ادّعا، تحکّم، تکرار، حرکاتؔ وانداز) کے استعمال سے مستغنی تھے، پھر بھی ان کی شخصیت چونکہ مجسّم وقار اور ان کی باتیں صداقت کا معیار تھیں، اس لئے وہ جو کچھ فرماتے تھے اس سے سننے والوں میں اعتماد و یقین کی پائیدار کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔

حضرتؒ کی تقریریں ان کی تحریر ہی کی طرح جاندار، رواں، مربوط، نہایت ذمہ دارانہ اور فصاحت وبلاغت کا آئینہ ہوتی تھی، یوں محسوس ہوتا جیسے پوری تقریر قلمبند ہے۔ کہیں رکاوٹ، نہ کہیں موضوع سے گریز، نہ آواز میں خواہ مخواہ کا اتار چڑھاؤ، مسطح، نرم میدان میں ایک بہتا ہوا دریا! کئی کئی گھنٹوں تقریر میں موقع کی مناسبت سے کل دو تین مرتبہ، "اے حضرات" کا کلمہ زبانِ فیض سے بڑی شفقت لئے ہوئے نکلتا تھا۔

خالص علمی تقریروں کا تو ذکر ہی کیا، تذکیری تقاریر میں بھی حضرتِ والاؒ قرآن و حدیث کی بنیاد اور مستند و محکم تاریخی روایات کے تذکرہ سے ہٹ کر کبھی قصص اعتبارات شطحیات، یا والہانہ اشعار سے کام نہ لیتے تھے نہ اس کی ان کو حاجت تھی، کیونکہ باطن شیخ کا فیضِ جاری اس سادگی اور بے رنگی کے باوجود سننے والوں کو کیفِ ایمانی میں غرق کر جاتا تھا۔

حضرتؒ کی صوفیانہ تقریروں کا محور رذائل و فضائلِ اخلاق کی توجیہہ و تشریح تھا باطنی تربیت کی نزاکتوں کو اس سہل ممتنع پیرایہ میں بیان فرماتے کہ اس قدرتِ بیان پر اہل فن سر دھنتے تھے، ان تقریروں میں شیخ کی نسبت باطنی کا اثر اس قدر نمایاں رہتا کہ سننے والے اپنے دلوں سے کدورت وظلمت مٹتی ہوئی اور ہدایت کا نور آتا ہوا صاف محسوس کر لیتے تھے۔ ـــــــــــــ ایسی تقریروں کے ختم پر شیخ اقدسؒ کی یہ سادہ اور مختصر دعا بھی بڑی ہی موثر ہوتی تھی، دونوں ہاتھ اٹھا کر کمال عجز سے عرض رسا ہوتے کہ:

"اے اللہ یہ جو کچھ بیان ہوا اس سے بیان کرنے والے اور سننے والوں کو مستفید فرما۔"

مزاج کا کمال توازن

توازنِ مزاج کا اندازہ وفورِ جذبات ہی کے موقع پر لگایا جا سکتا ہے اور سارے جذبات خیر میں محبت ہی کا جذبہ سب سے زیادہ نشۂ مردافگن کی تاثیر رکھتا ہے جو محبت کے شعلہ پر ٹھہر گئی وہی طبیعت

سیمابی ہونے کے باوجود قائم النار ہے اور نادر و نایاب! آیئے! اس معیار پر حضرت والاؒ کے مزاج کو دیکھیں!

شبلیؒ! کون شبلیؒ؟ حضرتؒ کے استاذ، مربی، محسن اور محبوب، زندگی کے آخری لمحات میں بھی جن کے احسان کا تذکرہ شاگرد سعید نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور بھرّائی ہوئی آواز میں یوں فرمایا تھا کہ "یہ دو لفظ لکھنا پڑھنا جو آگیا یہ سب انہی کی شفقت کا صدقہ ہے" انہی شبلیؒ نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات لکھنے کا مرحلہ آیا تو محبت کے بحرِ متلاطم کو کس کمالِ ضبط سے آب زیر کشتی بنا کے رکھ دیا۔ حیاتِ شبلیؒ کے تعارفی اوراق میں اپنے محبوب کے متعلق اس صفائی کا اظہار کہ

"بہر حال شبلی شبلی تھے، جنیدؒ و شبلیؒ نہ تھے"۔ (ص۹)

توازنِ مزاج کی کیسی مستحکم دلیل ہے!

اور آگے چلیئے شاگرد و استاذ کے تعلق میں محبت پھر بھی شرط لازم نہیں لیکن مرید و پیر کا ربط تو اسی جذبۂ مستحکم سے عبارت ہے، اسی لئے یہاں نشۂ محبت کے مدہوش ہر طرف نظر آجاتے ہیں، مگر وہ جو مستی و ہشیاری کا تناقص مٹاتے ہوئے اور جذباتِ ذاتی اور تقاضائے سنّت میں توازن قائم کئے ہوئے ہوں خال خال ہی ملیں گے۔ اس دَور میں حضرت حکیم الامت کے وابستوں میں ایسی کمیاب مثال حضرت والارحؒ ہی کی ذات گرامی تھی، شدّتِ عشق کا جو عالم تھا، اس کی تفصیل "پیر و مرید کے ربط و تعلق" کے زیرِ عنوان گزر چکی، اس زورِ عشق کے باوجود ضبط و توازن کا جو حال تھا اس کے ثبوت میں "جامع المجددین" کا دیباچہ بہت کافی ہے۔ پھر بھی عنوان کی مناسبت سے ایک واقعہ اور سنیئے،

ایک صوفی صاحب نے جو باضابطہ مولوی بھی تھے، حضرت سے اقطاب و ابدال کے بارے میں پوچھا کہ آیا ان کا وجود قرآن و حدیث میں مصرح ہے؟ جواب عطا ہوا کہ واقعۂ موسیٰؑ و خضرؑ (علیہم السلام) میں اس کا صرف اشارہ ملتا ہے، قطعیت نہیں، البتہ بہ کثرت

بزرگوں کی کشفی تصدیقات ملتی ہیں اور وہ کافی ہیں! اس پر مولوی صاحب نے مکرر سوال کیا کہ احادیث میں اس کا ذکر نہیں؟ حضرتؒ نے فرمایا کہ ایسی صحیح اور قوی حدیث ایک بھی نہیں ملتی! اس پر انہوں نے محض دباؤ ڈالنے کے لئے یہ نازیبا استدلال کیا کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے تو تعلیم الدین میں اس کی تائید میں حدیثیں لکھی ہیں! ــــــــ اب نزاکت مؤقف دیکھئے کہ ایک طرف شیخ عالی مقام کا پاس و لحاظ ہے اور دوسری طرف حدیثِ رسولؐ کی تحقیق کی ذمہ داری ــــــــــــ حضرتؒ کو مولوی صاحب کے اس طرزِ کلام پر بڑا رنج ہوا، ناراضی کے لہجہ میں صاف فرمادیا،

"حضرت نے لکھا ہے، میں نے تو نہیں لکھا"۔

جب وہ صاحب چلے گئے تو احقر سے مخاطب ہو کر حضرت والاؒ نے فرمایا کہ حدیث کے معاملہ میں میں تو بہت ڈرتا ہوں، میں کیا کروں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تنبیہہ سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ جو کسی غیر قول کو رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کرے اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا ــــــــــــ حضرت والاؒ جب یہ ارشاد فرمارہے تھے تو آثارِ خشیت چہرہ بشرہ سے عیاں تھے۔

محبّت وعقیدت کے بعد توازن مزاج کو پرکھنے کے لئے دوسری حساس ترازو دوسرے اہلِ کمال کے معاملہ میں عدل اور خصوصاً معاصرین کے حق میں انصاف ہے، اس اعتبار سے "حیات شبلیؒ" کے دیباچہ اور یاد رفتگاں کے سیکڑوں اوراق پڑھ جائیے اور دیکھئے کہ کس انصاف پسندی کے ساتھ ہر ہر خادم دین کو سراہا ہے ورنہ ادارتی حد بندیوں کا فرق کب کسی کو اس نقطۂ اعتدال پر قائم رہنے دیتا ہے۔ دل کو بہت تھام کر کسی کی تعریف پر اگر زبان کھلتی بھی ہے تو ایک لفظ "مگر" کے ساتھ پھر اندر کا اثر باہر آکر رہ جاتا ہے، حضرت والاؒ کی تحریریں اس "اگر" "مگر" سے پاک ہیں جو ان کے صفائیٔ باطن کا کھلا اثر ہے۔ علّامہ محمد یوسف بنوری مدظلہٗ، راقم عاجز سے فرماتے تھے کہ جب حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا انتقال

ہوا تو ان کے ذہن میں خیال گزرا کہ دیکھیں اب علامہ سید سلیمان ندویؒ معارف کے صفحات پر اس معاصر شہیر کا حق کس طرح ادا کرتے ہیں؟ مگر فرمایا، کہ جب وفیات کے حصہ میں حضرت والاؒ کا مضمون انہوں نے پڑھا تو پہلے سے زیادہ معترف و معتقد ہو گئے کہ حضرتؒ نے انصاف پسندی اور بے نفسی کی مثال قائم کردی!

مالی ایثار مالی ایثار میں حضرت والا عباد الرحمٰن کی جیتی جاگتی مثال تھے جن کی مدح قرآن پاک میں یہ آئی ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنفقوا لم يسرفوا و لا يقتروا وكان بَيْنَ ذالك قواما.	اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی، اور ان کا انفاق اسکے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

چنانچہ اس کی برکت حضرتؒ کو یہ حاصل رہی کہ آخرت کا سامان بھی کر گئے اور دنیا میں بھی استغناء حاصل رہا، آخر زمانہ میں ایک مرتبہ اہل و عیال کا ذکر آیا تو نہایت سکینت سے فرمایا:

"الحمدللہ ان کے لئے جو کچھ کرنا چاہیئے تھا، اس سے کچھ زائد ہی بندوبست کر چکا ہوں اب میرے ذمہ کچھ نہیں"۔

فراغت قلبی کی یہ دولتِ عظمیٰ اسی اعتدال پسندی کا نتیجہ تھی جس کی تعلیم قرآن پاک نے دی ہے۔

حضرتؒ کے ایثار مالی کا دوسرا وصف اخفا تھا، جو کچھ خرچ کرتے حتی الامکان چھپا کر خرچ کرتے تھے۔ حضرتؒ کے عزیز قریب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ حضرتؒ کی ایک عزیزہ اپنی لڑکی کی شادی میں خرچ کی کمی محسوس کر رہی تھیں، حضرتؒ نے چپکے سے دو سو روپے بھجوا دیئے، بعد کو ان عزیزہ نے اس حُسنِ سلوک کا تذکرہ اوراعزہ میں کر دیا اور اس کی خبر حضرتؒ تک پہنچی تو اس افشائے راز سے حضرتؒ کو دُکھ ہوا، اسی طرح ایک اور مقروض عزیز کی چار سو روپے سے اعانت کرنا چاہتے تھے تو ان کو تحریر فرمایا کہ:

"اگر وہ (یعنی قرض خواہ) چار سو روپے اسی وقت لینے پر مصر ہیں تو یہ بھی بفضلِ خدا ہو سکتا ہے، مگر اچھا ہو کہ اکتوبر کی تعطیل تک آپ مہلت لیں، یہ اس لئے کہ ڈاک سے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا اور یہ کچھ اچھا نہیں"۔

سبحان اللہ کیا جذبۂ اخلاص ہے!

جامعہ احمدیہ بھوپال کے تعلیمی معیار کی بلندی کی حضرتؒ کو خاص فکر تھی، اس کے لئے اعلیٰ اساتذہ کی فراہمی ضروری تھی، شعبۂ حدیث کے لئے حضرتؒ کی نظر انتخاب مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی پر پڑی۔ حضرتؒ نے ان کو سہارنپور سے بلا کر یہاں حدیث کا مدرس اول یا شیخ الحدیث بنا دیا، مولانا کے آجانے سے مقامی استادِ حدیث کا درجہ ثانوی ہو گیا، بعض اہل ہوا نے مقامی بزرگ کو ملکی و غیر ملکی کے مسئلہ کی آڑ لے کر اُکسایا اور انہوں نے مولانا کاندھلوی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ مولانا کاندھلوی معطل کر دیے گئے اور مقدمہ چلتا رہا اور اس میں سال بھر لگ گیا، حضرت والاؒ سال بھر تک اپنی جیب خاص سے مولانا کو تنخواہ دیتے رہے اور ان کی راحت میں فرق آنے نہ دیا اور کسی کو پتہ تک چلنے نہ پایا کہ مولانا کی رقمی اعانت کس سمت سے ہو رہی ہے۔ یہ بات تو راقم الحروف کو حضرتؒ کے وصال کے دس برس بعد قاری عبدالرؤف صاحب بھوپالی ثم مکی کی زبانی معلوم ہوئی جو حضرتؒ کی پیشی میں کام کرتے تھے اور ان کے منشئ خاص تھے ــــــ حضرت سلیمانؒ کی خاموش فیاضی بھی عجیب ہی تھی، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃً۔

غرض اس کی تفصیل بہت ہے، ان سے بہت کچھ عزیزوں نے بھی پایا، شاگردوں نے بھی اور مریدوں نے بھی، بس اپنا واقعہ لکھ کر قلم کو روک کر لیتا ہوں، میرا کوئی حال حضرتؒ سے مخفی نہ تھا چنانچہ میری مقروضیت سے بھی وہ واقف تھے، مگر مجھ سے بے خبر کو اس کا علم نہ تھا کہ علاوہ دعا کے وہ اس کی ادائیگی کا بھی خود ہی سامان فرما رہے تھے، حضرت اقدسؒ کی رحلت کے کچھ ہی دن بعد پیرانی صاحبہ نے ایک بڑا سا بند لفافہ اس ہدایت کے ساتھ مرحمت فرمایا کہ اس کو گھر جا کر کھولا جائے۔ میں یہی سمجھتا تھا کہ کوئی راز کے کاغذات ہوں گے، یا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات

مگر جب گھر جا کر اس لفافہ کو کھولا تو اس میں سَو سَو روپے کے دس نوٹ اور اس کے ساتھ پیرانی صاحبہ مدظلہا کا یہ شفقت نامہ

عزیز القدر سلمہٗ۔ السلام علیکم

مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ، بجز صبر کے انسان اور کیا کر سکتا ہے۔ حضرت مولاناؒ جب حیات تھے تو اکثر و بیشتر آپ کو ایک ہزار روپے ہدیہ دینے کو کہا کرتے تھے میں اپنی غفلت یا ان کی علالت کا الجھاؤ کہیئے کہ ان کی حیات میں اس کو پورا نہ کر سکی اب یہ ان کی خواہش کے مطابق آپ کو ہدیہ کر رہی ہوں، آپ اس کو قبول کر کے ممنون فرمائیں، آپ کو یہ رقم دے کر میرا قلب بہت مطمئن ہے اور اللہ پاک کی رحمت سے امید ہے کہ ان کی روح کو بھی مسرت اور سکون ہوگا، رب رحیم ان کو اعلیٰ مرتبہ عطا فرمائیں۔ میرے خاتمہ بالخیر کے لئے ہمیشہ دعا کیجیے۔

والدہ سلمان

مادرِ روحانی کے اس کرم نامہ کو پڑھ کر آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں اور دل بھر آیا کہ حضرت شیخؒ کو اتنا خیال اپنے ایک ایسے خادم کا تھا، جس سے کوئی بھی حقِ خدمت ادا نہ ہو سکا!

حُسنِ ذوق

حضرت والاؒ کی ایک ایک ادا ذوقِ جمال کی شاہد تھی اور ان کی ہر چیز ان کے حسنِ ذوق کا آئینہ! ـــــ لیٹر پیڈ کو دیکھئے تو سرورق داہنی طرف نہایت خوبصورتی کے ساتھ یہ آیت پاک چھپی ہوئی ملے گی۔

"اِنَّہٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّہٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ"۔ (نمل)

اسی طرح گھر میں ریڈیو کے لئے ایک عمدہ غلاف تیار کیا گیا، حضرتؒ سے درخواست کی گئی کہ اس پر کاڑھنے کے لئے کوئی عبارت تجویز فرما دیں، موزونیت اور حسنِ ذوق کا کمال دیکھئے کہ فوراً یہ آیت لکھ دی؛

اَنْطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ کُلَّ شَیْءٍ ـــــ (حم السجدہ)

ایک صاحب ارادت نے جو فونٹین پن کے تاجر تھے، اپنے کاروبار میں برکت کے لئے دعا کی درخواست کی، حضرتؒ نے دعا فرمادی اور ساتھ ہی مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اپنی دوکان میں یہ آیت لکھ کر آویزاں کردیجئے،

ن ۚ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ـــــــــــ (ن)

مذاق کا یہی نکھار بچوں کے ناموں کی تجویز میں بھی نمایاں رہتا تھا، بالعموم لڑکیوں کے نام والدہ کے اور لڑکوں کے نام والد کے نام کے ہم قافیہ تجویز فرماتے یا کبھی اس میں صرف آغازِ حرف کی رعایت ملحوظ ہوتی، مگر بہرصورت صوت و معنیٰ کا امتزاج نہایت دلکش ہوتا تھا۔

مدح و ذم ایک

مقاماتِ سلوک میں "تواضع" عبدیت کا ایک اعلیٰ مقام ہے مگر خود اس مقام میں بھی رسوخ کے اعتبار سے ادنیٰ و اعلیٰ کا فرق پیدا ہو جاتا ہے، "کامل متواضع" وہ ہے جو نفس کے انفعالات سے بلند و بالا ہو جائے، اسی کو حدیث شریف میں "ہجرت نفس" سے تعبیر فرمایا گیا اور "اصل ہجرت" قرار دیا گیا ہے۔ ایسے "مہاجرالی اللہ" یا کامل انسان کی شناخت یہ ہے کہ اس کے لئے اپنی مدح و ذم ایک سی ہو جاتی ہے، نہ واہ وا سے وہ پھولتا ہے اور نہ ملامت سے مرجھاتا ہے! اِخال خال ہستیوں کو اس مقام تک رسوخ میسر آتا ہے، مگر اللہ کی دین کہ سلیمانِ عالی بخت نے آن کی آن میں اس مقام کو بھی فتح کرلیا۔

ڈاکٹریٹ کے اعزازِ خاص پر آپ نے دیکھا کہ سلیمانی نفس نے اپنے اندر اتنا تغیر بھی محسوس نہیں کیا جتنا کہ ایک نیا کپڑا پہننے پر کسی میں پیدا ہو جاتا ہے اور شیخ الشیوخ حضرت تھانویؒ نے اس کی تصدیق بھی فرمادی کہ بے شک وہ اس انفعال سے برتر و بالا ہو چکے تھے ـــــــ اب ایک واقعہ تنقیص کی بے اثری اور عرفانِ نفس کا بھی ملاحظہ ہو:

ایک روز راقم کی موجودگی میں دو منکرین حدیث حضرت والاؒ کی خدمت میں آئے اور اپنے مسلک کی گفتگو آغاز کی، دعوےٰ یہ کیا کہ قرآن ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہت آسان بھی ہے اور تائید میں یہ آیت پڑھ دی کہ "ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر"

حضرتِ والا رحؒ مخاطب کی لیاقت کو تاڑ گئے، دریافت فرمایا کہ آیا عربی سے واقفیت ہے؟ جواب اثبات میں ملا تو فرمایا اسی آیت کا ترجمہ کر دیجیے! مخاطب نے مفہوم بیان کیا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے تو ترجمہ پوچھا تھا، پھر فرمایا کہ خیر یہی بتا دیجیے کہ یہ لفظ "مُدَّکِر" کیا ہے؟ اور اس کا مادّہ کیا ہے؟ مسئول نے فوراً کہا کہ یہ لفظ "درك" سے بنا ہے اور اس کے معنی سمجھنے کے ہیں! حضرتؒ نے فرمایا کہ مجھ کو ٹھیک اسی جواب کی توقع تھی، یہ تو آپ حضرات کی عربی دانی ہے اور اس پر قرآن فہمی کا دعوےٰ! پھر ان دونوں کو حضرتؒ نے نہایت شفقت سے سمجھایا کہ یہ لفظ "ذکر" سے مشتق ہے اور فلاں قاعدے کے تحت "ذ" "د" سے بدل گئی وغیرہ، اس کے بعد نصیحت فرمائی کہ پہلے عربی زبان، پھر متعلقہ علومِ قرآنی کے حصول کی طرف توجہ کی جائے اور پھر قرآنِ پاک میں غور وفکر کریں! ______ اس گفتگو سے بہ ظاہر وہ دونوں حضرات متاثر اور پشیمان بلکہ ممنون ہو کر گئے مگر یہاں سے جا کر اپنے مرشد جناب پرویز کو نہ معلوم کیا روئیداد سنائی کہ تازہ طلوعِ اسلام میں پرویز نے حضرتِ والا رحؒ کے اخلاق پر حملہ کرتے ہوئے نہایت سخت بازاری لب ولہجہ میں ایک نوٹ لکھا جس کا حاصل یہ تھا کہ ہمارے دو آدمی ان سے بات کرنے گئے تو وہ نہایت بداخلاقی سے پیش آئے، اصل گفتگو بالکل قلم انداز کر دی۔

اس شذرہ کو پڑھ کر حضرت والا رحؒ کے سب ہی جاننے اور ماننے والوں کے دل کو جراحت پہنچی، مگر صاحبزادہ سلمان سے رہا نہیں گیا، انہوں نے حضرتِ والا رحؒ سے عرض کی اس غلط بیانی اور اتہام کا جواب ضرور دیا جانا چاہیئے، حضرتِ اقدسؒ نے نہایت ناگواری کے لہجہ میں فرمایا:

> "کیوں دیا جانا چاہیئے، کسی ایک شخص نے کبھی کوئی بات خلاف لکھ دی تو اس پر اتنا غصہ! جب لوگ تعریف کے پُل باندھتے ہیں تو اس وقت بھی کبھی خیال آتا ہے کہ یہ لکھ دیں کہ ہمارے اباجان میں اتنے اوصاف تو نہیں ہیں؟"

اللہ اکبر! کس مقامِ ارفع سے فرما رہے تھے!! ______ غرض اس جواب کو سُن کر صاحبزادہ

لہ مکاتیب سلیمان مکتوب ۹۲

سلمہٗ خاموش ہو رہے اور گھر میں چلے گئے، پھر اس راقم حقیر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے حضرتؒ نے ارشاد فرمایا:

"لڑکپن ہے، اس لئے اس قسم کے خیالات ہیں، ہم بھی اپنی نوعمری میں بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ایک مضمون ایسا لکھ دیں گے کہ مخالف کو منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی ـــــ یہ سب طفلانہ باتیں ہیں، اب تو بحمداللہ نہ کسی کی واہ وا کا کچھ اثر ہے نہ کسی کے طنز و تشنیع کا، مخلوق کی مدح و قدح سے کیا ہوتا ہے۔ دیکھنا تو یہ چاہیئے کہ خالق و مالک ہم سے راضی ہے یا نہیں؟"

بات بظاہر آئی گئی ہوگئی مگر دو ہی تین ہفتے گذرے ہوں گے ملتان سے ماہنامہ "الصدیق" کا نیا شمارہ جو آیا تو مدیر فاضل کی طرف سے اس میں پرویز صاحب کا ترکی بہ ترکی جواب بھی تھا اور حضرت والاؒ کے اخلاقِ کریمانہ کی توصیف بھی۔ مرشدِ عارف کی نظر اس پر پڑی تو صاحبزادہ کو طلب فرمایا اور ہنستے ہوئے بہ کمال بلاغت ارشاد ہوا:

"لیجئے لیجئے سلمان میاں جلدی دیکھئے اس رسالہ میں طلوع اسلام کا جواب چھپا ہے اور آپ کے ابّا کی برأت اور بڑی تعریف چھپی ہے اب تو آپ کے ابّا اچھے ہو گئے اور آپ کی تمنّا پوری ہوگئی!"

اللہ اللہ، عارف کی نگاہ میں خلق کی تعریف یا مذمت کس درجہ مضحکہ خیز ہوتی ہے! ہم ہیں کہ فانی مخلوق کو پیمانۂ عزّت و ذلّت بنائے ہوئے ہیں ایک عارف ہے کہ ہر فانی کو "لا احبُّ" سے قطع کر کے صرف محبوبِ ازل پر ٹکٹکی لگائے رہتا ہے۔ ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

خلوت و جلوت کی یکسانی کامل سیرت وہی ہے جو ہر پہلو سے اور ہر مقام پر ایک سی حسین ہو، جلوت و خلوت کی دھوپ چھاؤں سے اس کی آب و تاب میں کوئی فرق نہ آنے پائے، حضرت والاؒ کے دس سالہ تعلق اور تین

برس کے کامل قرب میں اس خادم نے ان کو ایسا ہی دیکھا۔ وہ ہر جگہ یکساں اور ایک تھے، گھر میں اور باہر، خلوت میں اور جلوت میں، ایک سی متانت، حیا، شرافت، پاکی، صفائی، حلم عفو، خیراندیشی، مروّت، پاسداری، ترحم اور لایعنی سے گریز ــــــــ نہ زبان کی حلاوت اور طرزِ بیان کی شائستگی میں فرق، نہ رکھ رکھاؤ میں کوئی اونچ نیچ! یہی وجہ تھی کہ وہ نہ صرف اہلِ ارادت کے مرشد و آقا تھے، بلکہ اہل و عیال اور نوکر چاکر کی عقیدت کا بھی مرکز تھے وہ نہ صرف اہلِ علم و کمال کی نگاہ میں معظم تھے بلکہ اہلِ خاندان کے دلوں پر بھی ان کے شرف کا سکّہ قائم تھا وہ نہ صرف بیرونِ وطن اہلِ ملّت کے لئے باعثِ افتخار تھے، بلکہ خود اہلِ وطن کو بھی ان پر ایسا ہی فخر تھا، وہ نہ صرف دوستوں کی نظروں میں والاصفات تھے بلکہ ان کے مخالف بھی ان کے حُسن خلق کے معترف تھے ــــــــ یہ ہمہ جہتی عزت و کرامت ان کی کامل و مکمل سیرت ہی کا اثر تھا ورنہ اچھے اچھے پیر و مسند نشین اور بڑے بڑے اصول پرستی کے مدعی بھی تنہائی میں بالکل وہی نہیں ہوتے جیسے مسندوں پر اور مجلسوں میں نظر آتے ہیں، بلکہ جلوت کے متواضع اکثر خلوت کے فخور، مجلس کے بلند حوصلہ، نجی کے تنگ دل اور وہاں کے محتاط، یہاں کے بے احتیاط ہوتے ہیں، اسی لیے ان کی عزّت باہر تو ہو بھی جاتی ہے مگر اہلِ خانہ اور خاندان والوں میں ان کو کوئی مقام حاصل نہیں ہوتا، اور سیرت کا یہ اتار چڑھاؤ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ عام طور پر حسنِ اخلاق میں رسوخِ کامل میسر نہیں آتا کہ وہ ان کا مزاج اصلی بن جائے اسی لئے جب وہ اہتمام سے سنور کر نکل آتے ہیں تو کچھ اور رنگ ہوتا ہے اور جب بے تکلفانہ حالت پر نظر پڑتی ہے تو دیکھنے والا حیران ہو جاتا ہے کہ تصویر کا یہ رُخ کیسا؟ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت اور ان کا مزاج ہی حسنِ اخلاق کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، اس لئے ان کو جب بھی جس حیثیت میں بھی دیکھا گیا وہ ایک ہی نظر آئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

رنگ اور مذاق

حضرت والا کا مذاق اور ان کی طبیعت کا رنگ عالمانہ پہلو سے "محدثانہ" تھا، حزم و احتیاط، عدل و انصاف، حق جوئی و حق پسندی

ان کے مزاج کا خمیر تھا، ہر بات میں سنتِ نبوی اور خیر القرون کی سند کو حتمی قرار دینا یہاں تک کہ زبان و بیان میں بھی متکلمین، فلاسفہ اور صوفیاء کی پیدا کردہ اصطلاحات کے بجائے قرآنی اور حدیثی اصطلاحات کے اختیار اور ان کی ترویج کا عزم ان کے ذہن کا فیصلہ تھا۔ وہ اپنے نفس کے معاملہ میں سراپا حلم اور تمامتر عفو و درگذر تھے مگر دین کی مدافعت میں ایک بے باک مگر شائستہ قلم اور شستہ زبان مجاہد تھے، خلافِ حق بات کی گرفت میں وہ اپنے پرائے کے فرق سے ناآشنا تھے، یہی ان کا مذاق تھا،

باطنی نسبت کے اعتبار سے حضرتِ والاؒ کی ذات نقشبندیت و چشتیت کا سنگم تھی کیونکہ نقشبندی جوہر کا کشتہ چشتی آگ میں پھنک گیا تھا، حضرت والاؒ کی طبیعت میں سوز تھا مگر جوش نہ تھا، گداز تھا مگر بے خودی نہ تھی، مستِ وحدت تھے مگر ربودگی نہ تھی، شیخ اکبر قدس سرہٗ کے معارف کا انکار نہ تھا مگر دل کا میلان مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے ذوقِ اتباعِ سنت کی طرف زیادہ تھا، اور نسبت باطنی کا یہ رنگ ٹھیک وہی تھا جو شیخ الشیوخ مرشد تھانوی قدس سرہٗ کا تھا، ذیل میں حضرت تھانویؒ کے فیض یافتہ ایک سالک کاملؒ کا مکتوب جو حضرتِ والاؒ کو لکھا گیا تھا مع جواب نقل ہے، اس سے میرے معروضات کی صداقت معلوم ہوگی، ملاحظہ ہو:

مراسلہ	جواب
حیدرآباد دکن حامداً و مصلیاً	
۱۹ اپریل ۱۹۴۹ء	مکرم و محترم ادام اللہ تعالیٰ فیوضکم
(۱) حضرت مولانا قبلہ دام مجدکم	(۱) السلام علیکم و رحمۃ اللہ
السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'۔ سامی نامہ	الحمد للہ تعالیٰ بخیریت ہوں۔

لہ حضرت محمد عبد الرحیم صاحب حیدرآبادی مرحوم ہمارے حضرت والاؒ سے عمر میں زیادہ ہی تھے بڑی نورانی اور صاحب کرامات شخصیت تھی۔ شیخ اکبر قدس سرہٗ کا مسلک و مذاق انکا حال و قال تھا نیز اتباعِ سنت و تقویٰ انکی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی یہ مکتوب انہی کی عنایت سمجھ کو ملا تھا۔ اس سے پہلے مکتوب نگار نے صرف خیریت طلبی کا خط لکھا تھا۔

مورخہ یکم اپریل، شرف صدور لاکر صحتوری مزاجِ عالی سے مطلع کیا۔ اللہ جل شانہٗ اپنے فضل وکرم سے کھانسی کو بھی رفع فرمادیں آمین۔ بمصداق اس شعر کے ؎

چونکہ گل رفت و گلستان شد خراب
بوئے گل را از چہ جوئیم جز گلاب

(۲) حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف تصانیف اور آپ حضرات کا وجود باوجود مجھ جیسے عامی اور نارکارہ کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ بوجہ کبر سنی وخرابیٔ صحت حاضری سے قاصر ہوں مگر شوقِ مطالعہ میں کمی نہیں ہوئی، اس لئے جو باتیں مجھ ہیچ مداں کی سمجھ میں نہیں آتیں ان کی تفہیم وتوضیح کے لئے حضرت والاؒ کو کبھی کبھی تکلیف دوں گا امید ہے کہ میرے حال پر رحم فرما کر میری دستگیری فرمائی جائیگی چنانچہ کئی دن سے بوادر النوادر کے حصّہ دوم کا رسالہ "الارشاد فی مسئلۃ الاستعداد" کے صفحہ (۱۴۷) سطر (۲۱) کی یہ عبارت سمجھ میں نہیں آئی :۔

"میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں پر یہ استعداد

(۲) شوق مطالعہ کے ساتھ انشاء اللہ شوقِ عمل میں بھی کمی نہیں ہوئی ہوگی کہ اصل مقصود یہی ہے وھو معکم اینما کنتم تعملون (الآیہ) یعنی اللہ تعالیٰ کی محبّت وقربت وولایت۔ صحت عقائد کے بعد عمل سے حاصل ہوتی ہے۔

یہ مسائل اصل میں علمِ کلام کے ہیں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہی تحقیق ہے مگر حضرات صوفیہ نے ان مسائل میں اپنا خیال بھی ظاہر فرمایا ہے بہر حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اتباع میں اس فقیر ہیچمداں کو ان مسائل سے از راہِ تصوّف کوئی دلچسپی نہیں۔

حضرت والاؒ کے ارشاد کے معنی میرے خیال میں یہ ہیں،"استعداد" دو معنی میں

اور استعداد بمعنی امکانِ ذاتی مختلط ہو گئی
وہ امکانِ ذاتی قدیم اور غیر مجعول ہے اور
اس کے غیر مجعول ہونے میں کوئی محذور نہیں"

بولا جاتا ہے۔ ایک بمعنی قابلیت اور دوئم
بمعنیٰ امکانِ ذاتی اول معنی کی بنا پر استعداد
مجعول ہے اور ثانی معنی کی بنا پر استعداد
غیر مجعول ہے یعنی استعداد بمعنی اوّل مجعول ہے
کیونکہ وہ وجودی چیز ہے اور استعداد بمعنی
دوئم غیر مجعول ہے کیونکہ وہ عدمی ہے اور
عدمی غیر مجعول ہوتا ہے اور اس کے غیر مجعول
ہونے میں کوئی قباحت نہیں۔ مقصود یہ
ہے کہ اضافۂ نورِ ہدایت کے قبول کی یہ
صلاحیت بندوں میں اللہ تعالیٰ کی بنائی
ہوئی اور دی ہوئی ہے

اللہ تعالیٰ سے جبر کے الزام کے رفع کے لئے
بعض صاحبوں نے یہ راہ اختیار کی ہے کہ
بندوں میں اچھے اور بُرے اور سعید و شقی
ہونے کا بذات امکان ہے اور امکانِ ذاتی
غیر مجعول ہوتا ہے اور قدیم، اس لئے اچھے
اور بُرے ہونے اور سعید و شقی ہونے کا
بندوں کے طبائع میں امکان اللہ تعالیٰ
کے جعل سے نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ
امکانِ ذاتی قدیم کے مقتضیٰ کے خلاف
کرسکتا ہے اور نہ بدل سکتا ہے کیونکہ قدیم

تبدیلی سے پاک ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ پر جبر کا الزام نہیں آتا۔ حضرت مولانا اس تاویل یا نظریہ کو اس لئے نہیں مانتے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا مجبور ہونا لازم آتا ہے اور وہ قادرِ مطلق اس سے بری ہے یہ مجبوری اس لئے لازم آتی ہے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امکانِ ذاتی قدیم کے خلاف کرنے پر قدرت نہیں رکھتا

(۳) علاوہ ازیں کسی کتاب میں حضرت جامی علیہ الرحمۃ کہ یہ رباعی میری نظر سے گذری ؎

اعیاں بخصیص عین ناکردہ نزول
حاشا کہ بود بہ جعل جاعل مجعول
گر جعل بود افاضۂ نور وجود
تعریف عدم بہ آں نباشد معقول

براہ بندہ نوازی "امکان ذاتی" اور رباعی متذکرۂ صدر کا مفہوم سلیس الفاظ میں تحریر فرمادیں بشرطیکہ مزاجِ گرامی پر کسی قسم کا بار اور تعب نہ ہو،

لفافہ ٹکٹ چسپیدہ بغرض جواب ملفوف ہٰذا ہے،

خادم
محمد عبد الرحیم عفرلہٗ

(۳) مولانا جامیؒ کی رباعیات کی شرح مولانا شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ایک رسالہ میں کی ہے وہ مجھے نہیں ملا، میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔

بندہ ہیچمداں
سید سلیمان

دیکھ لیا آپ نے کہ کلامی مسائل پر عبور کے باوجود ازراہ تصوّف ان سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ نگاہ تمام تر قرآن پاک وسنت نبویؐ ہی کو معیار و سند بنائے ہوئے ہے !! اور ذوق قصری کا اثر یہ ہے کہ حضرت کا جواب پاکر محترم مراسلہ نگار نے کلامی مسائل سے توبہ کرلی اور اس کا اظہار خود راقم سے فرمایا۔

انہی بزرگ نے پھر ایک اور عریضۂ ذیل میں اپنے احوال لکھے جن کے جواب سے مذاقِ سلیمانی کا مزید اندازہ ہوگا

مراسلہ	جواب
حیدرآباد دکن ۲۹ اگست ۱۹۵۳ء حضرت اقدس دامت فیوضہم السلام علیکم، مزاجِ مبارک بہ عافیت ہوگا	مخترمی ومکرمی ادام اللہ فیوضکم وزادکم عرفاناً السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، الحمدللہ خیریت ہے،
(۱) اس ناکارہ کو آں محترم سے حب فی اللہ ہے، اسی جہت سے اپنے بعض احوال خدمتِ والا میں بغرض تصحیح وتصدیق پیش کر رہا ہوں۔	(۱) اللہ تعالیٰ اس حب فی اللہ کو طرفین کے لئے باعثِ خیر وبرکت بنائے۔
(۲) نماز تہجد کے بعد ذکر دوازدہ تسبیح کا معمول ہے۔ ذکر نفی واثبات کے بعد جب "اللہ اللہ" کا ورد ہوتا ہے تو اولاً اپنے لاشئے ہونے کا استحضار رہتا ہے، پھر نفی کلی ہوکر محض اثبات حق رہ جاتا ہے، بلا اتحاد وحلول، اور نہ صرف اپنی ذات کی نفی ہوتی	(۲) یہ معمول مناسب ہے، یہ کیفیت محمود ہے اور مبارک ہے بلکہ مقصودِ ذکر ہے۔ شکر فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دولت آپ کو عطا فرمائی۔

ہے بلکہ ہر شے معدوم نظر آتی ہے ہر طرف
محض وجود مطلق کا ظہور نظر آتا ہے۔ یہ اکثر
ذکر کے بعد بھی طاری رہتا ہے تا آنکہ خود کو
بلاقصد کسی کام میں مشغول نہ کرلوں،

(۳) علاوہ ذکر کے ہمہ وقت یہ حالت طاری
رہتی ہے کہ موجود صرف ایک ذات مطلق
ہے اور اسی کا ظہور ہر سو ہے، باقی سب
عدمات ہیں نہ معلوم یہ حالت کیسی ہے؟

(۳) یہ توحید افعالی ہے۔ اس سے توحید
کی تکمیل ہوتی ہے، یہ حالت بہت اچھی
ہے، مقصود ہے اور محمود ہے۔

(۴) حضرت سے بادب التماس ہے کہ اس
عاجز کے حسنِ خاتمہ کے لئے دعا فرمائیں

(۴) اپنے اور آپ کے دونوں کے لئے
حُسنِ خاتمہ کی دُعا ہے،

والسلام
سید سلیمان ندوی
یکم محرم الحرام ۱۳۷۳ھ

(۵) اپنی کیفیت عرصہ سے لکھوانا چاہتا تھا
مگر ایک طرف معذوری بصارت، دوسری
طرف کسی موزوں لکھنے والے کے نہ ملنے
سے تاخیر ہوگئی، دُعاخواہ
عبدالرحیم
بہ قلم غلام محمد[1]

---

[1] احقر پاکستان سے حیدر آباد گیا ہوا تھا حضرت عبدالرحیم صاحبؒ اس وقت تک ۸۴ برس کے سن کو پہنچ کر بصارت سے معذور ہو چکے تھے۔ اپنا حال کسی پر ظاہر نہ فرمانا چاہتے تھے، احقر کو دیکھ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو میرے لئے بھیج دیا اور یہ عریضہ فوراً لکھوایا۔

شانِ محبوبیت

ایسی ستودہ صفات ہستی کیوں نہ اللہ کی محبوبیت کا شرف پاتی! یقیناً وہ محبوبیت کی خلعت سے سرفراز تھی اور اس کے آثار ہر صاحب نظر پر عیاں تھے، ان سے رشتۂ محبت جوڑ کر اہلِ محبت نے حبِ الٰہی کے جو انعام پائے اور حسبِ محبت پا رہے ہیں اس کے تذکرہ کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ البتہ دو ایک واقعات بطور عبرت کے ایسے نقل کر دینا کافی ہیں جن میں ان کا احترام ملحوظ نہ رکھنے پر تنبیہہ اور ان کی مخالفت پر عتابِ الٰہی صاف نمایاں،

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ایک خلیفہ حضرت حافظ محمد یٰسین رحمۃ اللہ علیہ تھے، ان کے ایک مرید حافظ صاحب ہیں، پختہ سن اور بڑے بڑے بزرگوں کو دیکھے ہوئے مگر طبیعت کے آزاد اور کم ہی کسی کے معتقد ہوتے ہیں، ان کی رائے میں اب بزرگی تو رہی نہیں ہے، اس کا ایک نام رہ گیا ہے، بہرحال یہی حافظ صاحب ایک روز حضرتِ والاؒ کی خدمت میں آئے اور اپنے انداز میں ہنس ہنس کے اور قہقہے لگا لگا کر کافی دیر تک حضرتؒ سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور دورانِ گفتگو میں یہ بھی کہہ ہی ڈالا کہ "مولینا بزرگ تو مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور مولانا تھانویؒ تھے، اب بزرگ کہاں!" ——— حضرت والاؒ ایک تو اجنبیت اور پھر اپنی افتاد طبع کی بنا پر اکثر خاموش ہی رہے۔ کچھ دیر بعد حافظ صاحب رخصت ہوگئے، قصہ ختم ہوگیا، مگر دوسرے دن پھر حافظ صاحب آموجود ہوئے، مگر ادب سے بیٹھے اور لجاجت سے اپنی گزشتہ بے تکلفانہ گفتگو کی معافی چاہی۔ حضرت والاؒ نے فوراً فرمادیا کہ "دل سے معاف ہے، اس میں بات ہی کیا تھی" ——— راقم کو بڑی حیرت ہوئی خصوصاً حافظ صاحب کی طبیعت سے واقفیت کی بنا پر اور بھی تعجب ہوا کہ یہ کسی سے نہ دبنے والے آج خود بخود کس طرح اس قدر رام ہوگئے جب حافظ صاحب حضرتؒ سے اجازت لے کر بہ ادب رخصت ہوئے تو میں بھی باہر نکل گیا اور ان سے پوچھا کہ حافظ صاحب یہ کیا قصہ ہے، زور سے ہنستے ہوئے کہنے لگے:

"ارے کچھ نہ پوچھئے، رات خواب میں بڑی ڈانٹ پڑی، میں تو لرز گیا۔"

ہر چند میں نے خواب کی تفصیل پوچھی مگر انہوں نے بتانے سے انکار کیا اور صرف اتنا ہی

فرماتے رہے کہ "میں حضرت سید صاحبؒ کو اس رتبہ کا انسان نہ سمجھتا تھا، کہ ان کا ادب نہ کرنا آفت مول لینا ہے ،میں تو آج سے ان کا قائل ہوگیا۔"

یہ تو خیر خواب کی تنبیہ تھی جو معمولی بے ادبی پر ملی۔ اب ایک عین عالم شہادت کا واقعہ اس سے برسوں قبل (۱۳۶۲ھ۔ ۱۹۴۳ء) کا سنئے ۔ ندوہ جس کی آبرو اور جس کا علم افتخار ذات سلیمانی تھی، ۱۹۴۳ء میں ندوہ میں ایک اسٹرائیک کا طوفانِ خاص اسی ذات عالی کے خلاف بپا کیا گیا۔ اس ہنگامہ میں نمایاں حصہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بعض عزیز شاگردوں کا تھا اور اس کی قیادت انکے عزیز ترین ذکی و ذہین شاگرد علی احمد کیانی مرحوم کے ہاتھ میں تھی اور اس کا مقصود حضرت والاؒ کو معتمدی کے عہدہ سے ہٹانا تھا۔ ——— حضرت والاؒ کے قلب کو اس ناسپاسی و ناشائستگی سے چوٹ لگی اور ادھر علی احمد کیانی پاگل ہوگیا۔ مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں کہ "مرحوم کو جب رسیوں میں بندھا ہوا دیکھا تو آنکھ میں آنسو آگئے کہ یہ نوجوان جو اپنی ذکاوت اور صحیح الدماغی میں اپنے ساتھیوں کے لئے بھی قابلِ رشک تھا، اس حالت میں ہے" بہرحال پھر مولانا موصوف ہی کو خیال آیا کہ یہ سیّد عالی مقام کی شان میں گستاخی کا خمیازہ ہے، انہوں نے حضرتؒ کی خدمت میں جب بہ اصرار اپنی قلبی کھٹک کا اظہار کیا اور کیانی کی صحت کے لئے دعا کی درخواست کی تو حضرتؒ نے سکوت فرمایا اور پھر دوسرے یا تیسرے دن مولانا سے فرمایا کہ "مولوی علی صاحب میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کردی" ——— چنانچہ علی احمد کیانی بالکل صحت یاب تھا[۱]۔

اللہ اکبر، محبوبیت کا یہ کرشمہ کہ محبوب کی دلشکنی پر دفعتہً گرفت اور اس کی معافی پر فوراً رہائی

ایک مولوی صاحب جو پہلے حضرت سے بڑے عقیدت کا اظہار کرتے تھے، لیڈرانہ زعم میں مخالفت پر کمربستہ ہوگئے اور یہ سمجھ لیا کہ جیسے اور بڑوں سے جھگڑ چکے تھے ایک اور سے بھی پرخاش سہی، مگر کلیجہ پانی ہوتا ہے یہ لکھتے ہوئے کہ جب سے حضرت والاؒ کی انہوں نے دل آزاری کی ایک ایک سعادت سے محروم ہوتے چلے گئے، روزانہ صبح درس تفسیر کا سلسلہ تھا وہ ختم ہوگیا،

---

[۱] اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا علی میاں صاحب کی تالیف "پرانے چراغ" صفحات ۴۰ تا ۴۲۔

جماعت سے نماز کا التزام تھا، وہ رخصت ہوا، جاہ و مال کی حرص ایسی بڑھی کہ اس کی خاطر بدعات تک میں ملوث ہو گئے۔ مسلک حق چھوٹ گیا۔

وما بعد ذالک الا بضلال!

اور یہی ایک مثال نہیں، محترم عاصم صاحب نے بر سبیل تذکرہ فرمایا:۔

"ہم لوگوں نے تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ جس نے چچا جان (یعنی حضرت صاحب تذکرہؒ) کی دل آزاری کی، گو چچا جان نے کبھی کچھ نہیں فرمایا[1]، مگر وہ پھر پنپ نہ سکا"

یہ آثار صاف طور پر بتلاتے ہیں کہ حضرتِ والا محبوب سبحانی تھے، کیونکہ حدیث قدسی میں آتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کو ستاتا ہے اس کو حق تعالیٰ دعوت رزم دیتے ہیں!

---

[1] بلکہ اپنی طرف سے بالکل ہی معاف فرما دیتے تھے۔ (غ۔م)

حضرت شیخ کی نماز اور ذکر

نماز آثار و شواہد سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ حضرت والا رح کو قرب کی جو دولت ملی وہ نماز ہی سے ملی۔ نماز سے حضرت رح کو بڑا شغف تھا اور ہیئت و کیفیت کے اعتبار سے ایسی کامل نماز پڑھتے تھے کہ اگر کوئی کتاب الصلوٰۃ کھول کر بیٹھ جائے اور اس سے مقابلہ کرتا چلا جائے تو کتاب و عمل میں پوری مطابقت پالے۔ راقم حقیر نے قیام میں حضرت والا رح کے قدموں، رکوع میں ہاتھوں کی گرفت اور سجدہ میں ان کی انگلیوں کی سیدھ کو غور سے دیکھا تو کبھی سرِمو فرق نظر نہ آیا۔ جب قیام میں ہوتے تو محسوس ہوتا کہ صاحبِ احسان کا قیام ایسا ہوتا ہے، رکوع و سجود کی محویت واقعتاً ایسی ہوتی کہ معلوم ہوتا کہ اب یہ ہیئت نہ بدلے گی ——— زیادہ حیرت اس پر ہوتی تھی کہ نوافل تو خیر پھر بھی طویل پڑھتے تھے مگر فرائض و سنن تو ٹھیک ہر وقت ہی کے لحاظ سے مختصر و متوسط انداز کے ادا فرماتے تھے، لیکن دیکھنے والے کو ہر ہر رکن کی ادائیگی میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ بس اسی میں کھو گئے ہیں۔

دوسری خاص بات یہ تھی کہ اخیر زمانہ میں بھی ضعف و نقاہت اور ریاحی عوارض کے باوجود نماز کے دوران میں درد و کرب یا کمزوری کا کوئی اثر باقی نہ رہتا تھا، حیاتِ ناسوتی کے آخری رمضان المبارک میں طبیعت کافی مضمحل اور عارضۂ قلب کی وجہ سے تنفس میں بھی تیزی آگئی تھی، افطار کر کے لیٹ جایا کرتے تھے، مگر جب مصلے پر تشریف لاتے تو ختم تراویح تک ذرہ برابر قیام و قعود میں تامل یا ارکان کی ہیئت میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا، بلکہ بعد نماز معلوم ہوتا تھا کہ قوت بڑھ گئی ہے۔ آخر یہ کیا چیز تھی؟

نماز عشاء کے بعد گفتگو کرنا اور سننا پسند نہ فرماتے تھے، مگر کبھی کبھی ایک آدھ جملہ یا

مصرعہ زبانِ مبارک سے جو نکل جاتا، اس سے باطنی کیفیت کا اشارہ مِل جاتا تھا اور وہ اس قدر پرکیف ہوتا تھا کہ رات کو بہار کا دن بنا جاتا تھا، مثلاً ایک روز ختم تراویح کے بعد حسب معمول احقر نے پانی کا گلاس پیش کیا تو نظر بھر کر دیکھا اور ارشاد فرمایا ؎

عالم بجز وشِ لا الہ الا ہوست

یقین جانیئے کہ یوں نظر آرہا تھا کہ سارا عالم معدوم ہے، جلوہ گر صرف ذاتِ باری ہے اور یہ کیفیت وقتی بھی نہیں تھی، کئی دن تک قائم رہی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا کو نماز میں کیسی معراجی کیفیت حاصل رہتی ہوگی؟

غرض اس قسم کے ظاہری اور معنوی آثار سے پتہ چلتا ہے کہ حضرتِ اقدس کو حقیقت صلوٰۃ میں رسوخ حاصل تھا مگر اس ظن و تخمین میں یقین کی کیفیت خود حضرتؒ کے بعض ارشادات سے ہوتی ہے مثلاً جب کبھی حضرتؒ سے امامت کی درخواست کی جاتی تو مسکراتے ہوئے یہی جواب مِلتا کہ

"بھئی مجھے نماز پڑھنا تو آتا ہے مگر پڑھانا نہیں آتا"۔

اس سے واضح تر روایت مولانا محمد اویس ندوی نگرامی مدظلہ سے ملی، کہ حضرتؒ والا نے ارشاد فرمایا:۔

"نماز کا فلسفہ اور اس کے اسرار و رموز تو بہت پڑھے اور لکھے تھے مگر نماز پڑھنا حضرت مولانا تھانویؒ کے تعلق کے بعد ہی آیا"۔

"یہ نماز پڑھنا آیا" اور "نماز پڑھنا آتا ہے" کا اقرار کس درجہ واضح اور صاف ہے۔

اسی ذیل میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے اور حضرتؒ ہی کے ارشاد سے معلوم ہوئی ہے کہ وہ نماز تہجد میں اکثر سورۂ یٰسٓ اور اوابین میں سورہ قٓ تلاوت فرماتے تھے، اس اظہار کے ساتھ حضرت والا نے احقر سے بھی ارشاد فرمایا کہ اس سے یہ مقصد نہیں کہ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نماز تہجد میں سورۂ مزمل پڑھا کرتے تھے اور اس کا نفع محسوس

کرتے تھے۔[1]

ذکر حضرتِ والا رح کے ذکر کی کیفیت بھی عجیب تھی، خصوصاً جہری ذکر حیرت انگیز تھا، شروع تعلق میں ذکر جہری کا غلبہ دیکھا تھا، مگر بعد کو معمول کے علاوہ جہر کا اہتمام نہ پایا دائماً ذکرِ خفی میں مشغول رہتے تھے۔

پہلے ذکرِ جلی (مفرد و مرکب) کی کیفیت سنئے، چار زانو ہو کر سیدھے قبلہ رُخ بیٹھ جاتے سر کا ہلکا سا اشارہ قلبِ صافی کی طرف ہوتا، آنکھیں بند ہوتیں اور ہونٹ بھی بند۔ اب ذکر فرماتے، مگر جسم کے کسی حصّہ کو ذرا بھی حرکت نہ ہوتی، ساکت و صامت رہتے۔ بارہا دیکھا اور بہت سوں نے دیکھا۔ ہر ایک کی نظر ہر وقت تو دھوکا نہیں کھا سکتی کہ اس عالمِ سکوت میں ذکر کی آواز صاف اندر سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور گو حضرت رح کی آواز بھاری تھی اور غنا سے تو حضرت رح کو دُور کا واسطہ بھی نہ تھا، مگر صوتِ ذکر اس قدر مترنم اور شیریں ہو کر نکلتی تھی کہ سننے والے مست و سرشار ہو جاتے تھے حیرت ہوتی تھی کہ

ع از کجا می آید ایں آوازِ دوست

اس کیفیت کی شہادت اپنے بڑوں میں مولانا دریابادی مدظلہٗ اور مولانا عبدالباری ندوی مدظلہٗ نے بھی اپنے اپنے مضامین میں پیش کی ہے، افسوس ہے کہ اس وقت "صدق جدید" کے وہ شمارے میرے سامنے نہیں ہیں۔

حضرت والا رح فرماتے تھے کہ ذکر "نفی و اثبات" کے دوران مجھ کو

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ۔

کہنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

اس ارشاد سے شیخ قدس سرہٗ کی یافت کا اندازہ اہلِ بصیرت بخوبی لگا سکتے ہیں۔

---

[1] اس کے بعد حضرت والا رح نے ایک ہی سورت کو بار بار پڑھنے کو جو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے اس کی علت بیان فرمائی اور پھر اس کے جواز کے دلائل بیان فرمائے۔!!

بہرحال یہ تو ذکرِ جلی کا عالم تھا خفی کی کیفیت کا دھندلا سا اندازہ ان آثار سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ذاکرِ دائم (قدس سرہٗ) کے پاس بیٹھتے ہی ظاہری و باطنی سب الجھنیں ختم ہو جاتی تھیں وساوس و خطرات کافور ہو جاتے تھے۔ اوہام و اشکالات بلا قیل و قال دفعۃً حل ہو جاتے تھے یہ تو منفی منفعت تھی، اثباتی نفع یہ محسوس ہوتا تھا کہ خود اپنا دل بھی اللہ اللہ کرنے لگتا جو کیفیت اور جگہ مسلسل توجہ اور مراقبات کے اہتمام سے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یہاں قریب ہو کر خود بخود حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ اثر دوام ذکر ہی کا تو تھا، اور ذکر بھی خفی، کیونکہ ظاہر طور پر تو وہ اکثر کوئی کتاب مطالعہ فرماتے ہوتے یا تحریر میں مصروف! ایک واقفِ طریق بزرگ نے راقم سے ارشاد فرمایا کہ "ماشاء اللہ حضرت سید صاحب کے تو ساتوں لطائف جاری ہیں[1]"۔ ایسے بہت سے اہلِ دل حضرات سے یہ بات سننے میں آتی رہی کہ حضرت دائماً ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔

اسی ذیل کا ایک واقعہ سننے کے لائق ہے، ہمارے ایک محترم برادر طریق نے بتایا کہ ایک روز حضرتِ والا لیٹے ہوئے تھے اور تنہائی تھی تو انہوں نے حضرتؒ سے پاؤں دابنے کی اجازت چاہی، ایسی اجازت بھلا کہاں مل سکتی تھی، مگر ان کے جوشِ عقیدت کی رعایت فرما کر حضرتؒ نے ہاتھ کی طرف اشارہ فرمایا، محبِ گرامی نے اپنا ہاتھ جیسے ہی حضرتؒ کے بازو پر رکھا تو ان کے سر سے پاؤں تک ایک برقی رَو سی دوڑ گئی جس میں حرارت و حلاوتِ ذکر کا اثر تھا وہ حضرتِ اقدس کا بازو دباتے رہے اور اس بات کو مسلسل محسوس کیا کہ جب ان کا ہاتھ جسمِ مبارک سے ہٹ جاتا تو برقی رو منقطع ہو جاتی اور جب پھر مس کرتا تو وہ برق پھر سارے جسم میں کوند جاتی جب یہ خدمت ختم ہوئی تو وہ کیفیت بھی جاتی رہی۔ برادرِ گرامی کا بیان ہے کہ خدمتِ شیخ کی یہ سعادت پھر نہ مل سکی اور یہ کیفیت بھی کہیں اور نہ پائی جا سکی۔

ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

---

[1] جو سالکین کامل ہیں وہی جانتے ہیں کہ وقتِ واحد میں دو تین لطائف کا قیام ہی کس درجہ مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ اس سے زائد اور خصوصاً ساتوں لطائف کا جاری رہنا تو نوادر ہی سے ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

حضرت شیخ رح کے اصولِ تربیت

کسی شیخ محقق کے اصولِ تربیت میں بعض امور تو خاص طور پر ذاتِ شیخ سے متعلق ہوتے ہیں اور بعض کا خصوصی تعلق مرید کی ذات سے ہوتا ہے اس لئے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے اصولِ تربیت کے اظہار میں بھی اس تقسیم کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ البتہ یہاں ان اصول کا صرف شمار ہی ہوگا۔ ان کی خوبی اور کمال کے تفصیلی اور عملی مشاہدہ کے لئے منہاجِ سلیمانی کا مطالعہ ضروری ہے۔

اصول متعلقہ ذاتِ مرشدِ اقدس رح

برکت و صرفِ ہمت

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ہی کا ارشاد ہے کہ کامل شیوخ میں بھی دو قسم کی ہستیاں ملتی ہیں، ایک وہ جن کے ہاں کام "برکت" سے چلتا ہے یعنی وہ خود زیادہ مشقت اٹھاتے ہیں اور مریدوں کی اصلاح میں بجائے زجر و توبیخ کے "صرف ہمت" سے زیادہ کام لیتے ہیں اور دوسرے وہ جن کے ہاں "حرکت" سے کام چلتا ہے، یعنی وہ اپنے مریدوں کو خوب ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے ہیں، اور ان کے بار کو خود ان ہی سے اٹھواتے ہیں، یہ اختلاف دراصل شیوخ کے انفرادی مزاج کا نتیجہ ہے۔ ہمارے حضرت والا رح کے ہاں بھی "برکت" کا مشاہدہ عام تھا اور وہ صرف ہمت ہی سے غافلوں کو ہوشیار، کاہلوں کو چُست اور قدم قدم پر تھک جانے والوں میں عزیمت کی قوت پیدا فرماتے تھے۔ وابستگانِ سلیمانی کا یہ متفقہ تجربہ ہے کہ حضرت رح نے ان سے کام بہت کم لیا مگر ان کو ثمرات کہیں زیادہ ملے۔

حضرت رح کے صرف ہمت کی یہ بین دلیل ہے کہ ان کے دست گرفتوں میں شدت طلب پہلے پیدا ہوتی تھی اور ترقی کا جذبہ پہلے اُبھرتا تھا، پھر کہیں حضرتِ والا رح مناسب عمل کی تلقین

فرماتے تھے۔

فیضانِ توجہ اسی طرح حضرت شیخ کے ہاں گو عرفی "توجہ" کا کوئی اہتمام نہ تھا مگر ان کے فیض جاری کی یہ برکت تھی کہ ان کے قریب بیٹھ کر دفعتہً قلب سے وساوس اور خطرات مٹ جاتے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ دل سکینت سے معمور ہوگیا ہے بلکہ جو برکات صحبتِ مبارکہ میں پائی جاتی تھیں وہی مراسلت و مکاتیب کے ذریعہ بھی برابر حاصل رہتی تھیں! فیض معنوی میں کیا قرب و کیا بعد!

سیّد عارف صاحب، رشتہ میں حضرت والا رحؒ کے بھانجے ہوتے ہیں اور حضرتؒ سے بہت بے تکلف بھی تھے، انہوں نے اپنا واقعہ سنایا کہ ایک روز ظہر کی نماز سے پہلے میں نے ماموں جان سے عرض کیا کہ آپ کو میرا نام معلوم ہے؟ حضرتؒ نے فرمایا "ہاں، عارف" میں نے عرض کیا کہ میرا یہ نام کس نے رکھا تھا، حضرتؒ نے فرمایا "میرے والد ماجدؒ نے" ــــــــ اس پر میں نے عرض کیا کہ نام تو "عارف" ہے اور معاملہ بالکل برعکس ہے! ــــــ حضرتؒ نے پوچھا: "کیا نماز و ماز کچھ نہیں" میں نے عرض کیا "کچھ نہیں" ــــــ دریافت فرمایا کہ "جمعہ کے جمعہ بھی نہیں" عرض کیا "جمعہ کی بھی نہیں"، پھر دریافت فرمایا کہ "عیدین کی!" میں نے عرض کیا کہ "بس سال میں صرف دو نمازیں عیدین کی تو ہو جاتی ہیں" ــــــــــــ بات ختم ہوگئی ظہر کی نماز کے لئے اٹھے تو مجھے بھی وضو کرنے کا حکم دیا، چنانچہ میں نے وضو کیا، عاصم اور سلمان بھی وضو کر کے آگئے، ہم تینوں نے ماموں جان کے پیچھے نماز پڑھی، سنت و نفل پڑھ کر عاصم اور سلمان اپنے کمرے میں چلے گئے، میں بھی اٹھنے لگا تو فرمایا کہ آپ بیٹھے رہیئے، چنانچہ میں بیٹھ گیا، میں نہیں جانتا کہ مجھ پر کیسی توجہ فرمائی کہ اس روز سے آج تک (جب کہ حضرتؒ کی رحلت کو تیرہ برس ہو چکے ہیں) نماز سے غفلت نہیں، بلکہ جب تک حضرتؒ زندہ رہے نماز کی ادائی بالکل ایسی محسوس ہوتی تھی گویا بلا ارادہ ہی خود بخود ہو رہی ہے البتہ اب ارادہ کا احساس بھی ہوتا ہے۔

خود اس راقم عاجز کے انقلاب روحانی میں بھی اصل دخل توجہ سلیمانی ہی کا رہا جس کی تفصیل

حصّہ دوم کے آغاز میں آتے لگی، پہلی ہی حاضری اور وہ بھی غیر معتقدانہ حاضری میں صرف باتوں ہی باتوں میں حضرتِ اقدسؒ کے فیضانِ توجہ نے اپنا ہی بنا ڈالا، بقول عرفی ؎

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
پیرانہ سال مردے بردہ بہ یک نگاہے

اس قسم کے خصوصی واقعات کے علاوہ اہل ارادت کے روزمرّہ تجربہ کی بات یہ تھی کہ جب حضرتِ اقدسؒ کی خدمت میں حاضر رہتے تو گو حضرت والارح بہت کم گفتگو فرماتے تھے اور اکثر کسی کتاب یا رسالے کے مطالعہ میں مصروف رہتے مگر حاضرینِ مجلس اپنے قلب میں روحانی فیضان کا اثر صاف محسوس کرتے تھے،

شفقت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کو مایوس نہ فرماتے تھے۔ بلکہ دو لفظوں سے حضرتؒ کو نفرت تھی، ایک مایوسی اور دوسرے بدقسمتی، فرماتے تھے کہ صاحبِ ایمان ہو کر پھر بدقسمتی اور مایوسی کے کیا معنے ہیں؟ یہ تو کافر کے لئے ہے چنانچہ ایک صاحبِ ارادت سے ایک بڑی لغزش ہوئی جس پر وہ نادم وشرمسار بھی تھے، حضرتؒ نے ان کی بھی دل دہی یوں فرمائی کہ متبسّم ہو کر بڑی قوت سے ارشاد فرمایا کہ توبہ واستغفار کے پانی سے ہر داغ دُھل جاتا ہے اللہ کی رحمت سے مایوسی کی کسی حال میں بھی کوئی وجہ نہیں ہے پھر وہ سالک بطریق مسلسل۔ ایک ہفتہ تک یہی خواب دیکھتے رہے کہ ایک زبردست صاف وشفاف آبشار کے نیچے وہ کھڑے ہوئے ہیں اور دھلتے جارہے ہیں، اس کے بعد ان کی کیفیت کامل رَجا سے بدل گئی ـــــــ یہ آبشار کیا تھا؟ شیخ قدس سرہٗ کی سراپا شفقت توجہ و ہمت کی مثالی صورت! قدس سرہٗ۔

اسی طرح ایک غیر سلسلہ کے سالک کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اعمالِ صالحہ پر تو گو دوام نصیب ہے مگر ان کی قبولیت کا کیا بھروسہ؟۔ یہ خطرہ انہوں نے اور جگہ بھی پیش کیا مگر کہیں تشفی نہیں ہوتی تھی، آخر لکھنؤ میں حضرتؒ والارح سے ملاقات ہوئی تو اپنی پریشانی کا اظہار فرمایا۔

حضرت والاؒ نے ان سے پوچھا کہ کبھی بنک کے نام چیک لکھ کر بھی شبہ ہوتا ہے کہ نہ معلوم قبول ہو یا نہ ہو، دستخط ملیں یا نہ ملیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ "نہیں"! حضرت والاؒ نے فرمایا کہ معاملہ تو یہ بھی محتمل تھا، مگر یہاں احتمال پر یقین غالب رہا اور حق تعالیٰ کے معاملے میں کھٹک باقی رہ جاتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور ان سے سچا کس کا وعدہ ہو سکتا ہے کہ جو طاعت ان کے حکم کے مطابق ہو اس کو وہ قبول فرما لیتے ہیں۔

اس جواب کو سُن کر ان پریشان حال سالک کا خطرہ کافور ہو گیا اور انہوں نے اعتراف کیا کہ کامل تشفی ہو گئی اور دل امید سے معمور ہو گیا۔ شیخ کامل کے اسی انداز شفقت کو عارف رومی فرماتے ہیں: ؎

زاں کہ او ہر خار را گلشن کند   دیدۂ ہر کور را روشن کند

طریقِ عشق اتباع سنت سب ہی شیوخ کا مقصود اور رضائے الٰہی سب ہی کا مدعا ہے، مگر مریدوں میں اس مقصد و مدعا تک رسائی کی آمادگی پیدا کرنے کے لئے شیوخ محققین نے مختلف محرکات یا ذرائع اختیار کئے ہیں، چنانچہ حضرت والاؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ کوئی صبر و شکر کے ذریعہ طے سلوک کرواتا ہے جیسے حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا طریق ہے۔ کوئی محض اتباعِ سنت کے ذریعہ جیسے حضرات نقشبند (رحمہم اللہ) ہیں۔ اور ہمارے حضرت (تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ کا طریق، طریقِ عشق ہے!

یعنی یہاں جذبۂ عشق کی بیداری کو امراضِ نفسانی سے شفائے کامل اور حصولِ نسبت کا ذریعہ بنایا جاتا ہے جیسے کہ اس طریق کے امام حضرت پیر رومی قدس سرہٗ کا ارشاد ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیبِ جملہ علتہائے ما

اور اس کی قرآنی اصل والذین اٰمنوا اشد حبًا للہ۔ اور یحبھم ویحبونہٗ نہایت مستحکم ہے۔

البتہ حضرتِ والاؒ حب طبعی نہیں بلکہ حبِ عقلی کے قائل تھے جو اعمالِ صالحہ کا محرک

ہو اور دلیلِ قرآنی میں یہ آیت شریفہ تلاوت فرماتے تھے کہ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

تطہیرِ فکر و تعینِ راہ

جذبہ اور محرک جو بھی استعمال کیا جائے اولیں اہمیت کی بات یہ ہے کہ رہرو طریق میں اپنی منزلِ مقصود کا صحیح شعور اور اس تک رسائی کے طریق کا یقینی علم پیدا ہو جائے اور اس کی ذمہ داری رہبر طریق پر عائد ہوتی ہے۔

ہمارے حضرت والارح زبانی افہام و تفہیم کے علاوہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اپنے شیخ حضرت حکیم الامت کا مرتب فرمودہ "نصاب" استعمال فرماتے تھے، یعنی تطہیر فکر اور سنت و بدعت و رسم میں امتیازِ کامل پیدا کرنے کے لئے تعلیم الدین، بہشتی زیور، اغلاط العوام اور اصلاح الرسوم کے مطالعہ کی اور مقصودِ طریق اور خود راہِ طریقت کا یقینی شعور پیدا کرنے کے لئے قصد السبیل کے مطالعہ کی تاکید فرماتے تھے اور سوالات کر کر کے عازمِ طریق کی فہم کا اطمینان فرما لیتے تھے کیونکہ یہ معاملہ صرف ہمت یا توجہ کا نہیں بلکہ تعلیم و تعلم ہی کا ہے۔

پاکیٔ فکر اور تعین راہ کا یہ اہتمام جیسا سلسلۂ اشرفیہ میں ہے اور کہیں نہیں۔ یوں کرنے کو تو اور شیوخ بھی سنت کی تلقین و تاکید کرتے ہیں مگر کوئی نہیں بتاتا کہ ہر ہر قدم پر سنت کا نقش کون سا ہے اور بدعت اور رسم کے خطوط کیا ہیں؟ اسی طرح مقصود طریق کیا چیزیں ہیں اور غیر مقصود کیا؟ اسی لئے جہاں تمام تر بدعات اور وجد و حال ہی کا ہنگامہ نہیں وہاں بھی خلط و آمیزش ضرور ہے اور یہ صورت کم فہم کے لئے اور زیادہ خطرناک ہے۔

انفرادی مزاج اور مرض کی رعایت

حضراتِ چشتیہ کا یہ امتیاز قائم ہے کہ انکے ہاں سلوک کا کوئی نصاب متعین و مقرر نہیں بلکہ وہ اپنی بصیرت سے مریض کے مرض کو مشخص کر کے اس کے مزاج کی رعایت کے ساتھ اس کا علاج تجویز کرتے رہے ہے، اس سلسلہ میں شیخ وہی ہو سکتا ہے جو مکائدِ نفس و شیطان سے پوری طرح واقف اور تجویز علاج میں مجتہدانہ قوت رکھتا ہو، چنانچہ ہمارے حضرتِ والارح کے ہاں بھی یہی

تھا کہ ہر ہر طالب کے ساتھ اس کے انفرادی مزاج اور استعداد کے مطابق معاملہ فرمایا جاتا تھا مثلاً کسی کو مدت تک ذکر کی تلقین ہی نہیں فرماتے تھے، اور کسی کو اول روز ہی ذکر بتا دیا جاتا تھا پھر کسی کو جہری ذکر کی تاکید ہوتی تھی اور کسی کو سری کی ہدایت، یہاں تک بھی دیکھا گیا کہ بعض صالح علماء کو اوّل ہی مرحلہ پر مراقبات کی تلقین فرمائی گئی اور بعض سالکین کو محض ذکر ہی پر رکھا گیا۔ انفرادی مزاج کی اس رعایت سے نفع بھی بہت جلد حاصل ہوتا رہا۔

ملکات کی اصلاح اپنے شیخ مجدد قدس سرہٗ کی تقلید میں حضرت والا رحؒ کی نگاہ بھی سالکین کے افعال و اعمال سے کہیں زیادہ ان کے ملکات اور باطنی رجحانات پر رہتی تھی وہ ملکات کی اصلاح فرما دیتے تھے جس کی وجہ سے اعمال و افعال کی اصلاح خود بخود نہایت سرعت سے ہو جاتی تھی، مجھے یاد نہیں کہ ایک مرتبہ بھی حضرت والا رحؒ نے کسی کو داڑھی نہ رکھنے یا انگریزی وضع کے بال ترشوانے وغیرہ پر بصراحت ٹوکا ہو، مگر حالت یہ تھی کہ خود منتسبین کے دل ہی میں اصلاح کی امنگ زور شور سے اٹھتی تھی اور ہر وہ مخالفِ سنّت ادا کو مٹا دیتی تھی سچ یہ ہے کہ دل حاکم ہے اور اعضاء وجوارح محکوم، حاکم کا رجحان بدل جائے تو محکوم کی کیا مجال ہے کہ اسکے خلاف قائم رہیں!

توحید افعالی سے توحید ذاتی تک حضرتِ والا رحؒ کا ایک امتیازی انفرادی اصول یہ نظر آیا کہ توحید کی تکمیل اور اس میں رسوخِ کامل کے لئے وہ توحید افعالی ہی پر تمامتر زور دیتے تھے اور اسی کی افہام و تفہیم فرماتے رہتے تھے، حضرتؒ کا ارشاد تھا کہ توحیدِ افعالی میں رسوخ کے بغیر توحید کامل نہیں ہو سکتی، قرآنِ پاک نے اسی لئے تمام تر زور توحید افعالی ہی پر دیا ہے۔

اس توحیدِ افعالی کے اہتمام کا نتیجہ خود بخود توحیدِ ذاتی کی صورت میں حاصل ہو جانا

تھا، اور وہ بھی بلاتشبیہ ، سراسر تنزیہہ لئے ہوئے جو کہ منتہائے حصول ہے!

حضرت شیخ رح کا یہ طریق نہایت اقرب، محفوظ اور پاک تھا اور کیسے نہ ہوتا جب کہ یہ کسی صوفی کا معلوم کیا ہوا راستہ نہیں بلکہ خود خالقِ فطرت کی متعین کردہ راہ ہے، اور یہی طریق نجوم ہدایت (صحابہ کرامؓ) کا طریق رہا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

اصول متعلقہ ذاتِ مُرید

اپنے معائب پر آپ نظر

حضرتِ والاؒ کے ہاں عمومی بات یہی تھی کہ جب تک رذائلِ نفس کی معتد بہ اصلاح نہ ہو جاتی تھی ذِکر کی اجازت نہ ہوتی تھی کہ سوئے ہضم یا تپ محرقہ میں مقوی غذا کی اجازت مریض کی ہلاکت کا سامان ہے! لیکن رذائل نفس کی فہرست مرتب کرنے اور اس کی درماں طلبی کا کام خود سالک کے تفویض رہتا تھا، البتہ شیخ کی باطنی معاونت یہاں بھی برابر شامل رہتی تھی، جس کی دلیل یہ ہے کہ حضرتؒ سے تعلق قائم کرتے ہی قریب وبعید کے ہر سالک کو فوراً کشف عیوب ہونے لگتا تھا اور اس کی اتنی شدت ہوتی تھی کہ وہ اس کو اپنی نگاہ میں ذلیل وخوار بنا کر رکھ دیتا تھا جیسا کہ حدیث شریف میں دُعا آئی ہے کہ "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا" ــــــ دراصل یہی کیفیت خود کتنے خبائث کا علاج ہے، مگر اس سے بڑھ کر یہ جذبہ بھی اُبھر آتا تھا کہ اپنے ہر مرض کا علاج طلب کر کے اپنی صحت کے سامان کئے جائیں!

تدریجی طور پر مشق ذکر

جب امراضِ نفس سے ایک گونہ شفا میسر آتی تو پھر ٹانک تجویز فرمایا جاتا اور اس کا اثر بھی فوراً ہونے لگتا تھا، آغاز ذکر مفرد یک ضربی (اللہُ۔ اللہُ) سے فرماتے اور نظر کیت سے زیادہ کیفیت پر ہوتی، جب یہ ذکر راسخ ہو جاتا تو اب اپنے سلسلہ کا خاص ذکر یعنی ذکر بارہ تسبیح[لہ] تعلیم فرماتے اور یہاں بھی

لہ پہلے لا الٰہ الا اللہ دو سو مرتبہ۔ پھر الا اللہ چار سو دفعہ۔ اس کے بعد اللہُ اللہ چھ سو مرتبہ یہ کل بارہ تسبیحیں ہوگئیں۔ آخر میں اللہُ اللہُ سو مرتبہ! یہ سلسلۂ امدادیہ کا خاص ذکر ہے، نہایت مختصر اور از حد مفید!

تدریج ملحوظِ خاطر رہتی۔ ارشاد تھا کہ :۔

"لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے دو جز ہیں، ایک لَآ اِلٰہَ یعنی ہر حادث کی نفی ———— (لا احب الآفلین) اور دوسرے الا اللہ یعنی صرف ذات الٰہی کا اثبات۔ چونکہ اس کلمہ کے دو جز ہیں اس لئے ابتداً اس کا کلی تصور قائم ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے اس لئے مبتدی کو چاہیئے کہ لا الٰہ الا اللہ کے ذکر کے وقت اوّلاً صرف لا اِلٰہ کا تصوّر کرنے کی کوشش کرے کہ دل سے ہر ایک محبوب شئے کی نفی ہو رہی ہے اور پھر "اِلاّ اللہ" کہتے وقت اثباتی تصوّر قائم کرے۔"

سارا زور لطیفۂ قلب ہی پر حضرت والاؒ فرماتے تھے کہ شروع سے آخر تک تمامتر توجہ "لطیفۂ قلب" ہی کی اصلاح پر مرتکز رہنی چاہیئے کیونکہ یہی لطیفہ منصوص ہے اور اسی کی اصلاح مقصود، جیسا کہ قرآنِ پاک کا ارشاد ہے :

مَن جاءَ بقلبٍ سلیمؐ اور حدیث شریف میں ہے "الا و ھی القلب" اس کی اصلاح سے اور لطائف بھی (جو کشف سے ثابت ہیں) خود بخود صاف ہو جاتے ہیں، یہی حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکیؒ کا ارشاد ہے۔

ہر غیر مقصود سے صرفِ نظر کی تاکید متکلمانہ مسائل اور فلسفیانہ اصطلاحات کے متعلق حضرتؒ متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ ان سے بچنا چاہیئے کیونکہ :۔

"بہت سی باتیں کلام و فلسفہ کی راہ سے تصوّف میں داخل ہو گئیں اور پھر عین تصوّف سمجھی جانے لگیں، خصوصاً فلسفیانہ اصطلاحات کو دینی اہمیت دی گئی اور پھر ان کی بنیاد پر الٰہیاتی مسائل کی تشریح و توضیح کی گئی اور اسی کو تصوّف یا فن احسان قرار دیا گیا، اس اصطلاحی تصوّف کے شیوع سے بڑی گمراہیاں پیدا ہوئیں اور "نبوت" و "مہدیت" کے دعویدار پیدا ہو گئے۔"

وحدۃ الوجود و شہود اور تنزلات ستہ کے بارے میں ارشاد تھا کہ :۔

"اول تو یہ مدار طریق نہیں، پھر ان میں سے بعض تو حال کا درجہ رکھتے ہیں (جیسے وحدۃ الوجود و شہود) اور بعض محض افلاطونی فلسفہ کی متبدل شکلیں ہیں (جیسے مسئلہ تنزلات) انکی طرف توجہ نہ ہونا چاہیئے۔"

اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ :۔

"سلطان الاذکار، شغلِ اسد، کشفِ قبور اور اس قبیل کی چیزیں تصوف نہیں بلکہ تصوف کا آرٹ ہیں، آرٹ میں حقیقت کہاں؟ تصوف کا مقصود تو رضائے الٰہی اور اتباعِ سنت ہے، ہاں اس سلسلہ میں از خود کوئی بات حاصل ہو جائے تو وہ اور بات ہے[1]"۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ تک فرماتے تھے کہ :۔

"مثنوی مولانا روم بھی تصوّف نہیں، بلکہ فلسفۂ تصوف ہے اور صرف فلسفہ سے بگڑے ہوئے دماغوں کا علاج نہ کہ ہر ایک کا۔"

اپنے عمل سے ہٹ کر احوال پر نگاہ کے پہنچنے کو بھی حضرت والا رح سخت مضر سمجھتے تھے، ایک مرتبہ راقم نے عرض کیا کہ عمل پر تو بحمد اللہ دوام ہے، لیکن اس کی عدم قبولیت کا گمان ہوتا ہے، معاً پر زور لہجہ میں فرمایا :۔

---

[1] چنانچہ خود حضرتِ والا رح ہی کو کشف قبور کی استعداد بھی ایسی حاصل تھی کہ شاید و باید۔! ایک روز حضرتِ والا[2] ہمارے محلہ کی "نوری مسجد" (واقع جہانگیر روڈ) کراچی میں عصر کی نماز کیلئے تشریف لائے جماعت میں کچھ دیر تھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر صحن میں بیٹھ گئے، احقر بھی پاس ہی بیٹھ گیا، مسکرا کر چپکے سے معاً ارشاد فرمایا کہ "یہ قبر تو خالی ہے"۔ (یہ ایک نوزائیدہ نوفٹ لانبی قبر ہے صحن مسجد سے متصل، اتنی بات تو آنکھوں دیکھی ہے کہ پہلے جو کتبہ لگا تھا، اس پر صاحب مزار کو "صحابی" لکھا تھا، مگر پھر جو تبدیل کیا گیا تو وہ لفظ بھی نکال دیا گیا اور سنِ وفات بھی بدل دیا گیا) مجھے حیرت اس کی رہی کہ "حضرت" نہ تو ظاہراً اس قبر کی طرف متوجہ ہوئے نہ مراقبہ فرمایا، مگر فوراً حقیقت کو پا گئے۔!

"خوب! اپنے احوال کو اللہ میاں کے سپرد کر دیا، ان کی رضا و قبولیت کا حال تو صرف دوسری دنیا میں معلوم ہوگا، یہاں تو صرف عمل مقصود ہے۔ عمل میں لگے رہیئے!"

احقر نے مزید عرض کی جسارت کی کہ حضرت قرب کے آثار کچھ تو یہاں بھی ظاہر ہوتے ہوں گے ارشاد ہوا :۔

"یہ بھی بندے ہی کے ظنون ہیں، بڑے سے بڑے ولی کی ولایت کا بھی جو اعتقاد ہے وہ محض ظنِ غالب کی بنا پر ہے اور اپنے میں آثار قبولیت تلاش کرنا تو عجب ہے! کیسے آثار اور کیسی بزرگی؟ اس راہ میں تو اپنے آپ کو مٹانا ہی اصل شے ہے۔"

ایک اور مرتبہ اس حقیر نے تنہائی میں اپنے بعض احوال عرض کئے تو ارشاد فرمایا :۔

"میرے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ جب سوتے وقت لائٹ بند کر دیتا ہوں تو سارا کمرہ نور سے معمور دکھائی دیتا ہے، مگر میں فوراً آنکھیں بند کر لیتا ہوں کہ

" ہر انچہ دیدہ می شود ہمہ غیر خدا است "

احوال و کیفیات کی طرح خوابوں پر توجہ کو بھی سالک کے حق میں مضر تصور فرماتے تھے اور اسی لئے اکثر تعبیر سے احتراز فرماتے تھے، مگر جب کبھی تعبیر عطا فرماتے تو معلوم ہوتا کہ علامہ ابن سیرین کے ذوق کی تجدید ہو گئی ہے!

مذکورہ ساری باتیں کلیہ کی حیثیت رکھتی ہیں، جس میں استثناء بہر حال موجود تھا، ذی فہم صاحبِ استعداد سالک کو حضرت والا اصطلاحات کی تفہیم، احوال کی حقیقت اور منازلِ راہ کی اطلاع بھی فرما دیتے تھے، اور ارشاد یہ تھا کہ ہم جن امور کی نفی کرتے ہیں وہ مقصودیت کے اعتبار سے ہے یہ نہیں کہ ہم ان سے محروم ہیں، بحمد اللہ سب کچھ حاصل ہے مگر مقصدِ طریق (یعنی حصول رضائے الٰہی) بھی ہم کو معلوم ہے جس کے سامنے یہ سب کچھ ہیچ ہے!

صرف طلبِ رضا مقصود ہے

فرمایا "ہر عمل میں طلب رضا کا شعور پیدا ہونا یہی اس طریق کا حاصل ہے۔

اسی علاقہ کا استحکام نسبت ہے

اور جب خدا اور بندے کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اسکو نسبت کہتے ہیں اور قرآنِ پاک کی زبان میں اس کی تعبیر یحبھم و یحبونہٗ اور رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کے لفظوں میں کی گئی ہے۔ یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ، انہی کیلئے نوید بشارت ہے[1]۔

کمال اتباع سنّت کا مفہوم اور اس کی تاکید

"اتباع سنت بس اسی کا نام نہیں کہ وضع قطع مطابقِ سنت کر لی جائے، بلکہ کامل اتباع یہ ہے کہ فکر و نظر اور جذبات واحساسات بھی ذوقِ نبویؐ کے تابع ہو جائیں"۔

فراغت قلبی کی ہدایت

فی زمانہ فراغتِ قلبی کا مدار معاشی فراغت پر ہے اس لئے حضرت والارحؒ اپنے منتسبین کی توجہ اسباب ووسائلِ رزق سے ہٹنے نہیں دیتے تھے اور تاکید فرماتے تھے کہ رزقِ حلال کی کوشش واجب ہے، اس تاکید کے ساتھ سب کے لئے فراغت رزق کی دعا بھی بطور خاص فرماتے تھے ایک مرتبہ ایک طالب نے اپنی مالی پریشانی کا حال لکھا تو حضرت والارحؒ نے اس کیفیت کو سناتے ہوئے بڑے تأثر کے ساتھ فرمایا کہ:

"میں تو اپنے سب دوستوں کے لئے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ ان کو معاشی فراغت نصیب فرمائے۔

ع پراگندہ روزی پراگندہ دل"

اس ضمن میں حضرتِ والارحؒ کی ایک نہایت مختصر اور جامع نصیحت اگر ہم لوگوں کے پیشِ نظر رہے تو انشاء اللہ ہر شخص کو اپنی اپنی حیثیت میں فراغ خاطر میسر آجائے فرماتے تھے کہ:-

---

[1] مکاتیب سلیمان مکتوب ۱۳۱ مرتبۂ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم۔

" آمدنی کثرت مداخل کا نام نہیں بلکہ قلتِ مصارف کا نام ہے"۔

پس نظر کسب سے زیادہ صرف کی مدات پر رہنی چاہیئے ! یہی قناعت کی راہ ہے۔

تقلیلِ مُباحات

حضرت اقدسؒ کا ارشاد تھا کہ سالک کو مباحات میں بھی کمی کرنی چاہیئے کیونکہ کثرت مباحات سے بھی قلب میں ظلمت پیدا ہو جاتی ہے۔

علم کا حصول عمل کی نیّت سے

حصولِ علمِ دین پر حضرتؒ بہت زور دیتے تھے اور طالبانِ علم سے خوش ہوتے تھے اور ان کی ہمت افزائی فرماتے تھے مگر غایتِ علم سے بے خبری یعنی " علم برائے علم" کو قلبی جہل سے تعبیر فرماتے تھے !!

مواعظ و ملفوظات اشرفیہ کے مُطالعہ کی تاکید

حضرت والاؒ فرماتے تھے کہ :۔

" ان میں (حضرت تھانوی رح کی تصانیف میں) حضرت والارح کا فیض بند ہے اس لیئے جو شخص اس فیض خاص سے بہرہ اندوز ہونا چاہے اس کو بار بار ان کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے خواہ وہ ان مضامین سے واقف ہی کیوں نہ ہو جائے جو ان میں بیان کیئے گئے ہیں"۔

خود اپنی کیفیت کو بطورِ مثال پیش فرماتے تھے کہ :۔

"حضرتؒ کا ملفوظ پڑھ کر جان سی آجاتی ہے"۔

ہمارے ایک برادر طریق کے متعلق جب حضرتؒ کو معلوم ہوا کہ حضرت حکیم الامت کے مواعظ و ملفوظات ان کے زیر مطالعہ نہیں رہتے تو تاکیداً جو بات ارشاد فرمائی اسکا لفظ لفظ غور طلب ہے :۔

" ملفوظات و مواعظ پڑھیئے ، وہاں ہر چیز اندر سے پھوٹ کر نکلتی ہے ان کا مطالعہ ضرور کیا کریں ۔ بے حد منافع بخش اور علم صحیح اللہ تعالیٰ عنایت فرمائیں گے

اور تمیز حق و باطل عطا ہوگی۔"

ایک اور طالب کو اسی طرح کمال بلاغت سے تحریر فرمایا:۔

"ان کتابوں کا بغور اور بغرض استفادہ مطالعہ انشاء اللہ تعالیٰ مفیدِ علم، محرکِ عمل اور مثمرِ برکات ہوگا۔"

"انفاس عیسیٰ" (مرتبہ مولانا محمد عیسیٰ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ) کے مطالعہ کو بھی حضرتِ والا رحمۃ اللہ علیہ صاحب فہم سالکین کے لئے بے حد مفید تصور فرماتے تھے، حضرتؒ کا ارشاد تھا کہ یہ" اشرفی مطب کی بہترین قرابادین ہے[1]۔"

دوسرے سلسلہ کے طالبین کے ساتھ اصول اصلاح

اب تک جو اصول بیان کئے گئے وہ خاص اپنے ہی متوسلین سے متعلق تھے، جو لوگ پہلے کسی اور سلسلہ میں زیر تربیت رہ کر حضرت والا رحمہ سے رجوع ہوتے تو دیکھا یہی کہ حضرت والا رحمہ ان کے سابقہ نہج ہی میں ان کی تربیت فرماتے اور معمولات کی تفصیل معلوم کرکے اگر کوئی بات قابلِ نکیر نہ ہوتی تو اسی طرح برقرار رکھتے تھے، ———— یہ حضرتِ والا رحمہ کے شیخ کامل ہونے کی بین دلیل تھی اور اسی لئے ان کے دامنِ فیض میں ہر رنگ کے سالک کو جگہ مل جاتی تھی، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً واسعۃً۔

اصولِ بیعت :۔

(۱) عام طور پر بیعت میں تاخیر فرماتے تھے، ہاں اگر صدق طلب اور عزم استقامت کا یقین ہوتا تو جلد بھی بیعت فرمالیتے تھے، ایک صاحب کو آٹھ نو برس کے تعلق کے باوجود

[1] اس میں حضرت حکیم الامتؒ کے معالجات کا انتخاب اور تقسیم امراض کے ساتھ انکی ترتیب ہے۔ حکیم الامتؒ نے اسکو پسند فرماکر مرتب عارف کے نام پر اسکا نام "انفاس عیسیٰ" تجویز فرمایا تھا ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس کتاب کو" اشرفی مطب کی قرابادین" اور کبھی مطلقاً " قرابادین تصوّف" فرماتے تھے۔

بیعت نہیں فرمایا، پھران سے ایک ایسی ناشائستہ حرکت سرزد ہوئی کہ جس سے صاف معلوم ہوا کہ اب تک صدق طلب ہی پیدا نہیں ہے اور "ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں" کے مخمصہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ حضرتؒ نے ان کی اس حرکت پر راقم احقر سے فرمایا کہ "دیکھئے یہ اتنی مدت سے میرے سر ہو رہے ہیں کہ بیعت کرلوں اور میں انکار ہی کرتا رہا، اگر کرلیتا تو آج بزرگوں کی کیسی بدنامی ہوتی"۔ ——— پھر اپنے شیخ اقدسؒ کا مقولہ مسکراتے ہوئے سنایا کہ :۔

"اتنا ٹھونک بجا کرلیتا ہوں پھر بھی کھوٹا نکل ہی جاتا ہے"۔

(۲) نا کتخدا لڑکیوں کو بیعت نہ فرماتے تھے کہ نہ معلوم آئندہ ان کو کیسا ماحول ملے اور شادی شدہ عورتوں کو بھی ان کے خاوند کے ایما کے بغیر بیعت نہ فرماتے تھے بلکہ بلا بیعت بھی تعلق اصلاح قبول نہ فرماتے تھے۔

(۳) عورتوں کو بیعت پردہ کے پورے اہتمام کے ساتھ اور اکثر بذریعہ خط ہی فرماتے تھے۔

(۴) مرد ہو یا عورت، محض بیعت کی خاطر سفر کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے بلکہ خط کے ذریعہ داخل سلسلہ فرمالیتے تھے، اور غیاب میں بھی وہی برکات حاصل رہتی تھیں جو حاضری میں ملتی تھیں۔

(۵) دست بدست بیعت کی صورت "منہاج سلیمانی" میں ملاحظہ فرمائیں، مراسلت کے ذریعہ بیعت کی مثال درج ذیل ہے :۔

میرے خسر محترم مولانا محمد علی حیدر آبادی نے کچھ عرصہ تعلق کے بعد درخواست بیعت کردی حضرتؒ کا جواب بھوپال سے آیا :۔

بسم اللہ وعلیٰ برکت اللہ، یہ فقیر ہیچمدان اپنی بے بضاعتی کے باوجود حسب استطاعت خدمت کو حاضر ہے، آپ اس خط کو پاکر کسی اطمینان خاطر کے وقت اچھی طرح وضو کرکے بخلوص دوگانہ نفل توبہ ادا کریں اور اس کے بعد استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ۔

سو دفعہ پڑھ کر درگاہ باری تعالیٰ میں جملہ گناہوں اور تقصیرات سے توبہ کریں اور اپنی اس عزیمتِ توبہ پر قائم رہیں کہ آج سے میری نئی زندگی شروع ہوتی ہے:

التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ اور اسکے بعد الحمد اور قل ھو اللہ احد تین بار اول وآخر درود پاک کے ساتھ بزرگانِ چشتیہ صابریہ پر علی العموم اور خصوصیت کے ساتھ نام لے کر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب قدس سرہٗ کو اس کا ثواب بخشیں اور زبان سے عہد کریں کہ آج سے میں اپنے شیخ ؒ کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر صداقت سے بغیر تغافل کے عمل کروں گا، پھر یہ آیتِ کریمہ پڑھیں ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم فمن نکث فانما ینکث علیٰ نفسہ ومن اوفیٰ بما عاھد علیہ اللہ فسیوتیہ اجرًا عظیمًا۔

اس کے بعد مجھے اطلاع دیں ......!

الفقیر الی اللہ

سلیمان احد مسترشدی حضرت شاہ مولانا اشرف علی قدس سرہٗ

جب مولانا نے تعمیل ارشاد کر کے خدمتِ شیخ میں اطلاع کر دی تو جواب آیا:

"آپ کو بیعت میں داخل کر لیا گیا، یہ میرے لئے موجب سعادت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس ذرۂ بے مقدار کے ذریعہ اس آفتاب رشد و ہدایت کے ساتھ نسبت عطا فرمائی ؎

گرچہ خورد یم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتابِ تابانیم"

خواتین کے واسطے اور زیادہ تسہیل سے کام لیا جاتا تھا یعنی عبارت سہل تحریر فرماتے اور نصیحت بھی زیادہ الطاف اور صریح پیرایہ میں فرمائی جاتی تھی۔

خصوصیاتِ بیعت ایک خاص بات حضرتؒ کے ہاں یہ دیکھنے میں آئی کہ کسی کو صرف چشتیہ سلسلہ میں، کسی کو اس کے ساتھ ساتھ مزید ایک یا دو یا تین سلسلوں میں داخل فرماتے تھے اور یہ بات محض تبرکاً نہیں تھی بلکہ اس میں گہری معنویت مضمر ہوتی تھی۔ جس میں دو راز تو غالباً یہ تھے کہ طالب کے لون اور وسعتِ ظرف کی خاص رعایت فرمائی جاتی تھی نیز بعض مرتبہ کسی میں سلسلہ کی عصبیت (جس کی وجہ سے اور سلاسل میں تنقیص کا اندیشہ ہو) مٹانے کے لئے بیک وقت چاروں سلاسل میں داخل فرما لیتے تھے۔ اس کے علاوہ اور جو مصلحتیں ہوں گی ان کا علم اس عاجز کو نہیں۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت والارح جب کسی کو بیعت فرماتے تو القائے نسبت کی کیفیت مرید کو صاف محسوس ہو جاتی تھی، چنانچہ بعضوں نے اس کو بہت ہی محسوس پایا اور اس کے اثر سے مرید نے "ید اللہ فوق ایدیھم" کی کیفیت کو محسوس کیا، کسی پر سکینت کا اثر طاری ہو گیا، کوئی سراپا حیرت بن گیا اور عام طور پر اکثر مریدوں نے شکستگی کی دولت پائی، ان کا سینہ سوز و گداز سے معمور ہو گیا اور شدّتِ گریہ نے برسوں کے زنگ کو آن کی آن میں دھو ڈالا ڈاکٹر زبیر صاحب مرحوم صدر شعبۂ عربی فارسی الہ آباد یونیورسٹی حضرت والارح کی خدمت میں فتحپور (ہنسوہ) حاضر ہوئے جہاں کچھ عرصہ کے لئے حضرت والارح اپنے داماد سید حسین صاحب کے گھر قیام فرما تھے۔ تنہائی میں دیر تک نہ معلوم کیا گفتگو رہی۔ بہرحال طالب نے بیعت کی درخواست کی جو قبول ہو گئی۔ تین گھنٹہ بعد ڈاکٹر صاحب برآمد ہوئے تو شدّتِ گریہ سے نڈھال تھے اور طوفانِ اشک اس وقت بھی نہ تھمتا تھا جب وہ شام کو واپسی کے لئے ٹرین میں سوار ہو چکے تھے۔ بعد کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کب اشکِ ندامت تھمے۔

ؔ یہ روایت محترمی جناب سید حسین صاحب ہی سے ملی!

حضرتؒ کی دو۲ وصیتیں

کوئی تحریری وصیت نامہ تو حضرتِ والاؒ نے چھوڑا نہیں البتہ راہِ طریقت کے بارے میں ایک وصیت راقم خستہ حال کو ضرور فرمائی تھی اور دوسری وصیت بعد کو مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے موسومہ ایک مکتوب میں اُسی پُر اثر لب ولہجہ میں ملی۔ ان دونوں وصیتوں میں لطیف فرق افراط وتفریط سے بچاؤ کی تاکید کا ہے اور جامعیت کے اعتبار سے یہ دو جملے لمبی چوڑی فہرست وصایا پر بھاری ہیں ــــــ راقم آشفتہ حال کو ہدایت فرمائی۔

"ادھر ادھر مت دیکھئے، سیدھے سیدھے صحابۂ کرام کے طریق پر چلیئے"۔

اور

مولانا مسعود مرحوم کو تحریر فرمایا ہے:۔

"سلف کی راہ سے سرِمو تجاوز نہ ہو، یہی اپنی وصیت ہے اور یہی زندگی کی آخری فرمائش"۔

بار الٰہا! ہم سب کو عدل وتوازن کی راہ پر قائم رکھ اور ہر رہ رو طریق کی دستگیری فرما کہ راہ نازک ہے اور چلنا آخر دم تک ہے!!

باب ہشتم

عارفانہ دور کا کلام اور تحریریں

غزل الغزلات

یہ حضرت والاؒ کا عارفانہ کلام ہے، اس حسنِ ذوق کی داد دیجئے کہ کس قدر موزوں نام اپنے اس مجموعۂ کلام کا تجویز فرمایا ہے کہ لفظی و معنوی دونوں مناسبتیں جمع ہوگئیں "غزل الغزلات" دراصل حضرت سلیمان علیہ السلام کے لاہوتی نغمات کا عنوان تھا[1]۔ اشتراک اسمی سے حضرت والاؒ نے یہاں بھی فائدہ اُٹھالیا۔

یہ مجموعۂ کلام وہ آئینہ ہے جس میں حضرت والاؒ کی روحانی سیر کے منازل اور مقامات دکھائی دیتے ہیں۔ خود فرماتے تھے کہ "یہ تو میرا سفرنامہ ہے" ___ اس سفرنامہ کی ہر غزل پر تاریخ درج ہے جس سے سالک طریق کے تدریجی ارتقار اور اس کے مشاہداتِ راہ کا حال معلوم ہوتا ہے اس مجموعۂ نغمات میں کل انتالیس غزلیں تین قطعے اور ایک فرد ہے، ان میں سے ایک غزل ایک قطعہ اور ایک شعر فارسی زبان میں ہے اور باقی سارا کلام زبانِ اردو کے حصّہ میں آیا ہے۔

---

[1] توراۃ کی بائیسویں کتاب کا نام غزل الغزلات ہے، اس میں ایک اعلیٰ پایہ کی تمثیلی عشقیہ نظم ہے جو حضرت سلیمانؑ سے منسوب ہے، یہ نظم آٹھ الواب پر مشتمل ہے نظم کی ابتدا اسطرح ہوتی ہے، ایک حسینہ اپنے محبوب کے فراق میں نغمہ طراز ہے:۔

" وہ اپنے مُنھ کے چوموں سے مجھے چُومے
کیونکہ تیرا عشق مئے سے بہتر ہے
تیرے عشق کی خوبی لطیف ہے
تیرا نام عطر ریختہ ہے" (غزل الغزلات باب ۲ و ۳)

ماخوذ از انبیائے قرآن (ج ۳ ص ۱۴۸) مصنفۂ محمد جمیل احمد ایم۔ اے۔

غزل الغزلات، حضرت والا کی نشاۃ ثانیہ یا روحانی انقلاب کی یادگار ہے چنانچہ شیخ الشیوخ حضرت مولانا تھانویؒ کی حلقہ بگوشی سے اس کا آغاز ہوتا ہے، پہلی غزل جس پر ۵ راپریل ۱۹۲۷ء کی تاریخ درج ہے اس کا اوّل و آخر شعر اس تاریخیت پر گواہ ہے فرماتے ہیں۔

ے

پاکر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں　　ہر سود و زیانِ دوسرا بھول گیا ہوں

الٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا　　افسانۂ پارینہ دلا بھول گیا ہوں

ان نغماتِ روحانی کا جائزہ لینے سے پہلے ایک اصولی بات ذہن نشین ہو جائے تو اچھا ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ عارفانہ کلام پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے ادب کے طالب علم سے ایک بے ادبی ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ عرفانیات کو پرکھنے کے لئے وہ وہی معیارِ نظر لے بیٹھتا ہے جس سے غیر عارفانہ کلام کو جانچ رہا تھا حالانکہ ہیرے جواہر بنئیے کی ترازو میں تُلا نہیں کرتے، زرِ خالص کی خوبی عام پتھر پر کس کے معلوم نہیں کی جاسکتی، ہر شے کی کسوٹی الگ اور ہر جنس کا پیمانہ جُدا ہوتا ہے ــــــــ بھلا عرفی و قاآنی کی شاعری اور حافظ و رومی کی نغمہ سرائی میں اشتراکِ اسمی کے سوا کوئی حقیقی نقطۂ اتحاد بھی ہے؟ ان کا سارا دار و مدار تو تخیل کے زورِ محاکات کی ندرت اور مبالغہ کی شدت پر ہے، اور یہاں ان ظاہرداریوں کی طرف التفات جرمِ عظیم ــــــــ عارف رومی فرماتے ہیں ے

قافیہ اندیشم و دلدارِ من　　گویدم مندیش جز دیدارِ من

محبوب ازلی کی نامکرر تجلیات (کل یوم ھو فی شان) پر نظر جمائے رکھنا، ان میں محو ہو کر حالتِ بے خودی میں گنگنانے لگنا یہ عاشقِ ربانی کی مختصر روداد ہے، اس کو فن شاعری کے بکھیڑوں سے کیا واسطہ۔

اسی لئے عارفین کی اس مجبوری کو سامنے رکھ کر معیارِ نظر کو بدلنا ہوگا، اب وہ خوردبین لگانی پڑے گی جو لفظوں سے گزر کر ان کے پس پردہ حقیقتوں کو دیکھ سکے، اپنے اندر وہ ذوق پیدا

کرنا ہوگا جو کلام کی معارف نوازی، اس کی مستی و سرشاری اور اس کی پُرتاثیری اور انقلاب آفرینی کو پا سکے اور پرکھ سکے۔ بقول حضرت والاؒ کے ؎

سمجھیں مرے کلام کو جو ہوشمند ہیں — مستی مری یہ بادۂ انگور کی نہیں

خیر یہ تو ایک ضروری فقرۂ معترضہ تھا، بات یہ ہو رہی تھی کہ حضرتِ والاؒ کا زیرِ نظر کلام فیض روحانی کا ایک کرشمہ ہے، ذہنی تخلیق سے اس کا کوئی تعلق نہیں، خود فرماتے ہیں ؎

فیض ہے یہ کس ولی وقت کا — اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

ایک اور جگہ تصریح فرمائی ہے ؎

جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں میں — سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں
دیوانگانِ عشق کو دیکر صلائے عام — آراستہ یہ مجلسِ جم کر رہا ہوں میں

اس لئے اس کلام کو "دیوانگانِ عشقِ الٰہی" کے ذوق اور معیارِ نظر سے دیکھئے، کیا عجب کہ آپکی روح بھی سرشار ہو جائے اور کچھ دیر کے لئے مادّی کثافتوں سے نکل کر سرمدی لذتوں کا کیف آپ بھی محسوس کر جائیں!

سفر نامہ کی حیثیت سے کلام کا جائزہ

آیئے پہلے اس نقطۂ نظر سے اس کلام کا جائزہ لیں جس کی طرف خود صاحبِ کلام نے اشارہ کیا ہے کہ "یہ تو میرا سفرنامہ ہے" ——— سیرِ افغانستان یا سفرِ یورپ کا نہیں بلکہ سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کا۔

راہِ طریقت کے واقف کاروں کا کہنا ہے کہ اس راہ میں پہلا مرحلہ "حبِّ شیخ" کا آتا ہے یہ طے ہو جائے تو "حبِّ رسولؐ" کی منزل آتی ہے پھر اس سے گزر کر سالک "حبِّ الٰہی" کے مقام کو پاتا ہے یہاں اس کو پہلے صفات کی نیرنگیاں نظر آتی ہیں اور وہ ان میں محو ہو جاتا ہے، اس کو سیر الی اللہ سے تعبیر کرتے ہیں، پھر جب سالک کا مشاہدہ اور قوی ہو جاتا ہے تو اس کا منتہائے نظر صرف ذاتِ الٰہی رہ جاتی ہے اور اب وہ اس مشاہدہ میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ اسی کو سیر فی اللہ کا نام دیا گیا ہے جو نا محدود ہے، ہمارے حضرت والاؒ نے راستے کے یہ منازل اِس برق رفتاری

سے آنا فاناً طے فرمائے کہ اچھے اچھے سالک بھی ان کی قوتِ پرواز پر دنگ تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے سفرنامۂ روحانی میں خطِ فاصل لگا لگا کر منازل کو الگ الگ کرکے دکھانا کم ازکم اس طفلِ طریقت کے لئے تو ناممکن ہے۔ البتہ ملے جلے جو احوال اس میں نظر آتے ہیں ان میں سے ایک ایک حال کو ایک ایک مقام سے متعلق کرکے دکھانا زیادہ دشوار نہیں اور اسی کی سعی یہاں کی جارہی ہے :-

ہم کو حضرتِ والاؒ کی ارادتِ شیخ اور کمال محبت میں کوئی فصل نہیں ملتا، ہاتھ میں ہاتھ دیا تو دل وجان بھی نذر کردی، اب محبوب کی گفتار و رفتار، طرزِ نشست و برخاست بلکہ اس کے بیٹھنے کی جگہ تک محبوب بن گئی، چنانچہ شیخ کی ایک ایک ادا اور خانقاہ کے در و دیوار تک کی جاذبیت کلام میں نمایاں نظر آتی ہے۔ دیکھئے خانقاہ میں مریدوں کے اجتماع اور ان کے حسنِ ادب، شیخ کے افادات اور ان کی پُرتاثیری کا نقشہ کس حسنِ ادا اور جوش و محبت سے کھینچا ہے :- ؎

ذرّہ ذرّہ عالمِ محسوس کا خاموش ہے — یار ہے گرم سخن محفل سراپا گوش ہے
چشمِ ساقی میں بھری کیا بادۂ پُرجوش ہے — جس طرف آنکھ اٹھ گئی وہ مست ہے مدہوش ہے
حبذا پیرِ مغاں دریا دل و دریا نوال — جمع ہیں میخوار میخانے میں نوشا نوش ہے
تیرے میخواروں کے ساقی کچھ عجب انداز ہیں — دل سراپا جوش ہے لیکن زباں خاموش ہے

اب تو مے نوشی ہے عین شرع بر فتوائے شیخ
اب وہی ہوگا فقیہہ شہر جو مے نوش ہے

ایک اور بحر میں اسی طوفانِ عشق و محبّت کا منظر دیکھئے ؎

ہر چیز میں جس کی ہے کیفیت مستانہ — آباد رہے یا رب تا حشر وہ مے خانہ
چھائی ہے یہاں مستی ہر ایک نمازی پر — حیرت ہے یہ گھر لے دل مسجد ہے کہ میخانہ

اس سراپا جذب واثر ماحول میں پہنچ کر خود حضرتِ والاؒ کو جو سرور و نشاط حاصل ہوگیا

اس کی تصدیق بھی ملاحظہ ہو ؎

ساز گار اب گردشِ ایام ہے　　　دور میں ہشتاد سالہ جام ہے

"یہاں ہشتاد سالہ جام" سے مراد اسّی سالہ پیرِ عارف ہے۔ آگے اپنے انجذاب کا ذکر ہے

؎ تھی جو آزادی تو ہر سو دوڑ تھی　　　قید میں آرام ہی آرام ہے

اب درِ پیرِ مغاں چھوٹے نہیں　　　اس کی مٹی میں بھی کیف جام ہے

اب شیخؒ کے لطف نگاہ اور حلاوتِ کلام کی کچھ تفصیل بھی زبان عشق سے سنئے،

حضرت تھانویؒ وفورِ حیا سے آنکھ سے آنکھ ملا کر دیکھ نہ سکتے تھے، بس ذرا پلک اٹھا کر دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں، کبھی کسی سمت ترچھی نظر دوڑائی اور فوراً سمیٹ لی، البتہ یہ ضرور تھا کہ اس "دزدیدہ نگاہی" کے لطف سے کسی کو محروم نہ فرماتے تھے اور اس اچٹتی نگاہ میں تاثیر اس بلا کی تھی کہ جس پر پڑی اس کو بے تاب کر دیا، اس کیفیت کو حضرت والاؒ کی زبانِ محبت سے سنئے اور محسوس کیجئے ؎

بزم میں دیکھا کئے اس ناز سے　　　جس طرف دیکھا نشانہ دل ہوا

اس کی دزدیدہ نگاہی کے نثار　　　آج ہی آغاز کا انجام ہے

دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ کس غضب کا ہے۔

شیخ کی نگاہ یہی نہیں کہ تڑپا جاتی تھی بلکہ جس پر پڑتی اس کو حیاتِ عشق بخش دیتی تھی،

حضرت والاؒ اپنا تجربہ سنا رہے ہیں :-

حیاتِ نو مجھے ان کی نگاہِ ناز نے بخشی　　　بھرا ہے آبِ حیواں کاسۂ زہرِ ہلاہل میں

دل اس پیری میں بھی غرقِ ہوسناکی و رندی ہے　　　پھنسی ہے کشتیِ عمرِ رواں گردابِ ساحل میں

ایک اور اسلوب میں اسی کیفیت کو یوں ادا فرمایا ہے :-

تری نظر میں ہے تاثیرِ مستیِ صہبا　　　تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں — وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

یہاں مستی و ہشیاری سے مراد سُکر و صحو ہے۔

حضرت مولانا تھانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے علم و معرفت کے ساتھ حسنِ صوت اور حسنِ بیان بھی ایسا عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر نایاب نہ ہو تو نادر ضرور تھی، ہوا میں جو ارتعاش ان کی پُر اثر آواز سے پیدا ہوتا تھا، اس کی ایک ایک لہر سامعہ نواز اور وجد آفریں تھی، حضرت والارح اسی کی توصیف فرما رہے ہیں ؎

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے — جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے

باغ میں صحرا نظر آتا ہے اور صحرا میں باغ — اب مرے جوشِ جنوں کا اور ہی انداز ہے

حضرت تھانویؒ کے بیان کا ایک وصف عالی یہ بھی تھا کہ اس سے ذہنی الجھنیں مٹتیں وساوس کافور ہو جاتے اور ایمان و ایقان بڑھ جاتا تھا، اس کا اعتراف حضرت والارح کی زبانی سنیئے ؎

ایسے کچھ انداز سے تقریر کی — پھر نہ پیدا شبہ باطل ہوا

آج ہی پایا مزہ ایمان کا — جیسے قرآن آج ہی نازل ہوا

گھول کر کیا جانئے کیا دے دیا — حلق سے اُترا کہ شیدا دل ہوا

جادو بیانی کا تذکرہ ختم کر کے اب شیخ تھانویؒ کی سحر نگاری پر آیئے ــــــــــــــــ

مرشد تھانویؒ کے ہاں حضرات نقشبندیہ کا طریق توجہ تو نہ تھا مگر وہ خط و کتابت کے تعلق سے اس کمی کو پورا فرماتے تھے اور اسی لئے اس کی پابندی پر پورا زور دیا جاتا تھا، ان کی اس مجتہدانہ تدبیر سے سالکین کو عجیب و غریب فائدے حاصل رہے ہمارے حضرت والارح بھی اس "مکتوم توجہ" سے فیض یاب رہے، اس لئے تصدیق فرما رہے ہیں ؎

نسخۂ اکسیر و دارو ئے شفا — تیرے ہاتھوں کا لکھا مکتوب ہے

ایک مرتبہ ایسے ہی اکسیر صفت مکتوب کو پڑھ کر مکتوب الیہ کی روح فرطِ نشاط سے

جھوم گئی اور یوں مترنم ہوئی ؎

قوتِ جاں قوتِ دل سرمۂ بینش تحریر ۔۔۔ روح افزا و دل آویز و دلآرا مکتوب
روشنائی نظر آئے گی سوادِ خط میں ۔۔۔ دیدۂ کور بھی دیکھے جو تمہارا مکتوب
سربسر شوق و ہمہ درد ہماری تحریر ۔۔۔ سربسر مایۂ تسکین ہے تمہارا مکتوب

شیخ سے کمالِ محبت کے سبب سالک کی نگاہِ معرفت وا ہوئی، عمر گذشتہ پر افسوس ہونے لگا کہ ہائے اتنی عمر اس میخانہ سے دوری میں کیوں بسر ہوئی، اب تھوڑی سی مدت میں طویل غفلت کی تلافی کیسے ہو شیخ عالی مقام سے بار بار التجا کرتے ہیں کہ اپنی ہمت عالی سے مجھ کو آگے بڑھا دیجئے۔ تنہا میری جد وجہد سے تو کام نہیں بنے گا ؎

جام پر جام مجھے دے کے بنا دے سرمست ۔۔۔ صبر سر جوشیٔ اذکار کہاں سے لاؤں

دیر سے آیا ہوں ساقی دُور سے آیا ہوں میں ۔۔۔ ہو عطائے خاص مجھ کو جو عطائے عام ہے

راقم نے ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ سے سنا کہ ایک روز خانقاہ اشرفیہ کے دروازے پر کھڑے حضرت والاؒ یوں فرما رہے تھے کہ جو کچھ پڑھا لکھا تھا سب ان بڑے میاں کے (یعنی حضرت شیخؒ کے) قدموں پر لا ڈالا۔ اسی کیفیت کو حضرتؒ کا یہ شعر بے نقاب کر رہا ہے ؎

میرے ہوش و خرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں
لگا دے برق ایمن آگ تو اس میرے حاصل کو

اور یہ جو برسوں کے جمع کردہ خرمن ہوش کو پھونکنے بیٹھ گئے تو کچھ تو دل کی دولت مل گئی تھی کہ سارا سرمایۂ خرد ہیچ نظر آ رہا تھا ــــــــــ ذرا مستی و سرشاری تو دیکھئے ساقی میخانہ سے مخاطب ہیں ؎

تیرے اک چھینٹے سے لے ابرِ بہاری ان دنوں ۔۔۔ سبز ہے شاداب ہے سیراب ہے گلزارِ دل
عشق کا رہبر دلیلِ راہ جس دن سے بنا ۔۔۔ بن رہا ہے آپ ہی انکارِ دل اقرارِ دل

جوش ہے گرمی و مستی ہے وفور شوق سے　　شکر ہے رونق پہ ہے امروز کاروبارِ دل

یہ ۱۳ اپریل ۱۹۴۲ء کی غزل ہے، اس کے دوسرے ہی دن یعنی ۱۴ اپریل ۱۹۴۲ء کو بھوپال سے لکھنؤ جاتے ہوئے ٹرین پر ایک اور غزل ہوئی جو سلطان الاذکار کی کیفیت کا آئینہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کس نے بھر دی یہ صدائے دل نواز　　ہر رگِ جاں سازِ الا اللہ ہے

کوئی ہو آواز میرے کان میں　　ہر صدا آوازِ الا اللہ ہے

کارفرما ایک آتا ہے نظر　　منکشف اب راز الا اللہ ہے

اس تجلی گاہ کا ہر نازنیں　　کشتۂ اندازِ الا اللہ ہے

ہے اسی کی سانس انفاس حیات　　جو کوئی دمساز الا اللہ ہے

دل سے ہوتا ہے ترانہ خود بلند　　قلب ذاکر ساز الا اللہ ہے

وجد میں جاں ہے تو اعضا رقص میں

جامِ مے آواز الا اللہ ہے

یہ جوش و انبساط تو اس وقت تک ہے جب تک کہ سالک کی نظر انوار و تجلیات پر ہے مگر جہاں اس کا رُخ خود اپنی ذات اور اپنی بے بضاعتی کی طرف ہوا اور وہ تڑپنے لگا، بلبلانے لگا، یہ تغیرِ احوال بھی نعمتِ عظمیٰ ہے کیونکہ بقول عارف رومی رح

گریۂ ابر است و سوز آفتاب　　اُستنِ دنیا ہمیں دو رشتہ تاب

گر نہ بودے سوزِ مہر و اشکِ ابر　　کے شدے اجسام ما زفت و سطبر

چنانچہ یہی معاملہ یہاں بھی پیش آیا، جتنے اونچے ہوتے گئے بلندیاں پست نظر آنے لگیں اپنا ہر عمل خام اور طاعت ناکام نظر آنے لگی۔ نگاہ جس افق تک پہنچ رہی تھی وہ اپنی قوتِ پرواز سے بہت دور نظر آ رہا تھا، اسی کرب و اضطراب میں دل سے آہیں جو اٹھیں تو زبان پر آ کر نالہ بن گئیں۔

شکستہ دلی کا شاہکار ملاحظہ ہو۔[1]

دل حریفِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں — جو نہ بیخود ہو وہ مے خوار کہاں سے لاؤں؟

نور ہی نور جدھر دیکھو نظر آتا ہے — تابِ نظارۂ انوار کہاں سے لاؤں؟

اُف ری دریائے معاصی کی تلاطم خیزی — وہ سفینہ جو کرے پار کہاں سے لاؤں؟

فیضِ ساقی ہے باندازۂ ظرفِ مے خوار — دل حریفِ مئے بسیار کہاں سے لاؤں؟

ٹوٹ ہی جاتی ہے ہر موسمِ گل میں توبہ — جو نہ ٹوٹے میرے غفار کہاں سے لاؤں؟

قطرۂ اشک میں ہوں دل کے بھی ٹکڑے شامل — فطرتِ دیدۂ خونبار کہاں سے لاؤں؟

توبہ توبہ میری توبہ بھی ہے کوئی توبہ — ٹوٹ جائے جو نہ ہر بار کہاں سے لاؤں؟

مدرسہ چھوڑ خرابات میں آکر بیٹھا — دوسرا سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں؟

جام پر جام مجھے دے کے بنا دے بدمست
صبرِ سرجوشیِ اذکار کہاں سے لاؤں؟

(۱۲/اپریل ۱۹۴۲ء)

اسی کرب و بلا کے عالم میں آہ و فریاد کی ایک اور درد انگیزی ملاحظہ ہو ؎

کوئی چوٹ ایسی لگ جائے الٰہی میرے سینہ میں — کہ فوّارہ سا بن جائے یہ زخمِ خونچکانِ دل کا

اگر ساقی تری چشمِ فسوں گر کام کر جائے — بدل جائے نظامِ دل بدل جائے جہانِ دل

---

[1] حضرت والارحؒ کی غزلوں میں، میں سمجھتا تھا کہ ان کی غزل ؎

سما جا میرے دل میں ارمان ہوکر — دوئی دُور کر دے میری جان ہوکر

قلبِ والا کی سب سے بہترین ترجمان ہے، لیکن جب زیرِ نظر موضوع پر اپنی استطاعت کے موافق لکھ رہا تھا تو عالمِ رویا میں حضرت والارحؒ کی زیارت سے مشرف ہوا، مسرور تھے اور دستِ مبارک میں "غزل الغزلات" کا مجموعہ تھا فرمایا ہماری سب سے اچھی غزل یہ ہے ؏ دل حریفِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں؟۔ آنکھ کھلنے پر خیال آیا کہ واقعی شکستگی اور عبدیت ہی تو حضرت والارحؒ کا وصفِ خاص تھا۔

دل کی اس تڑپ اور شیخ کی توجہ عالی نے مل کر سالک کو اور آگے بڑھایا، وہ دفعتہً فنا فی الشیخ کی منزل سے فنا فی الرسولؐ کے رتبہ کو پہنچ گئے ۲۵ر شوال ۱۳۶۱ھ (نومبر ۱۹۴۲ء) کو خانقاہ تھانہ بھون میں ایک نعت کہی ہے جس میں حسنِ ادب اور وفورِ محبت کا ایسا پاکیزہ امتزاج ہے کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نعت گو مشاہدۂ نبوی سے مشرف ہے اس کے قلب پر محبت و عظمت چھا گئی ہے اور اسی سرشاری سے زبانِ سخن قند ریز ہے ــــــــــــ

میں طفلانہ شوخی سے یوں تو ہر بات حضرتِ والاؒ سے پوچھ بیٹھتا تھا مگر اس خصوص میں جب بھی زبان کھولنے کا قصد کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی غیبی ہاتھ میرے مُنھ کو بند کر رہا ہے کہ یہ نہ پوچھنا، اپنی اس کیفیت سے یہ یقین اور گہرا ہو گیا کہ ضرور خواب یا نیم بیداری میں سالک عارف کو قربِ خصوصی حاصل رہا ہے جس کے اثر سے جذباتِ محبت بحرِ متقارب میں موجزن ہو گئے، چند بند تبرکاً پیش ہیں :۔

نام محمد صل علیٰ نور مجسد صل علیٰ	صدمورد صل علیٰ قد ممد صل علیٰ
چہرۂ انور شمس ضحیٰ زلفِ معنبر لیلِ سجیٰ	قلب مطہر نور ہدیٰ ذکر ممجد صل علیٰ
کوچۂ جنت کوچے تیرے خار و خسِ در پھول تیرے	خاک قدم ہے میرے لئے سرمۂ احمد صل علیٰ
جی میں ہے عاشق سجدہ کرے تونے جہاں پر پاؤں دھرے	اور بشوق و ذوق پڑھے محضر مرقد صلِ علیٰ

حضرت اقدس سید زادے تھے، شروع ہی سے عاشق سنت تھے، فنا فی الرسولؐ کے مقام کو پاتے ہی یوں معلوم ہوتا ہے کہ دستِ قدرت نے ان کو فوراً اور اونچا کر دیا اب سیر الی اللہ شروع ہوئی، جدھر جدھر نظر اٹھتی" یا توئی یا خوے تو یا بوئے تو" کا سماں نظر آتا تھا اسی یافت کو آیۂ کریمہ" اللہ نور السموٰت والارض " اور حدیث قدسی " انا جلیس من ذکرنی "سے موید کر کے یوں ادا فرمایا ہے ؎

جہاں ڈھونڈیں وہیں پائیں جہاں دیکھیں وہیں تو ہے
تجھے جو یاد کرتا ہے، اسی کا ہم نشیں تو ہے

تری ہی روشنی ہر چار سو پھیلی ہے عالم میں
کہیں مہرِ فلک تو ہے، کہیں نورِ زمیں تو ہے

اس قطعہ پر ۱۷ ذیقعدہ ۱۳۶۱ھ کی تاریخ پڑی ہے، اس کے بعد رمضان ۱۳۶۲ھ (۲۶ ستمبر ۱۹۴۳ء) کے آخری دہے تک دو تین غزلیں اسی سیرِ صفاتی کی آئینہ دار ملتی ہیں مگر اب رحمتِ باری نے چاہا کہ سالک کا عرفان اور ترقی کرے، کامل سے کامل تر ہو جائے، چنانچہ اس کے سامان عجیب ہوئے۔

حضرت والا کی ایک غزل پر ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ کی تاریخ پڑی ہے اور حاشیہ کے ایک گوشہ میں "بوقتِ خاص" کا اشارہ بھی موجود ہے، میں نے جرأت کر کے اس اشارہ کی رمز کشائی کی درخواست کی تو حضرتؒ نے فرمایا کہ:-

"انتیسویں ۲۹ شب کو تہجد کے بعد ذکر کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ دفعتہً یہ پوری غزل قلب پر وارد ہوئی، فارسی میں میری یہی ایک غزل ہے"۔

یہ تو حضرتِ والا کا ارشاد ہے، خود اس الہامی غزل کو پڑھیئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ قدر والی رات میں شاہدِ ازل نے سالک عارف کی نظر سے صفات کا پردہ بھی ہٹا دیا اور قرب و معرفت کا وہ درجہ عطا فرمایا کہ اب تجلیاتِ ذات سامنے آگئیں، سیر فی اللہ شروع ہوگئی، اس طرح یہ الہامی غزل اسی تکمیلِ سیر کی تمہید نظر آتی ہے سنیئے اور سر دھنیئے فرماتے ہیں ؎

شیوۂ صیدِ زبونم آرزوست سینہ آغشتہ بخونم آرزوست
گوش می جوید پیام از وصلِ دوست ارجعی وراجعونم آرزوست
عشق را گوئی جنوں اے بے خبر با ہمہ ہوش این جنونم آرزوست
داغ بر دل از غمِ انجامِ دل مژدۂ لایحزنونم آرزوست
خوش نمی آید سجودِ بے حضور فی صلوٰۃٍ خاشعونم آرزوست
قربِ بے غیبت نمازِ عاشقان فی صلوٰۃٍ دائمونم آرزوست

می برد بے تابیِ دل کو بہ کو | بہر درت صبر و سکونم آرزوست
ایں شتابیٔ دلِ ناصبر بیں | انچہ می خواہی کنونم آرزوست
از حصارِ ایں و آں بیروں کشد | آں نگاہِ پر فسونم آرزوست
بسکہ دزدیدہ نگہ بر من فگن | نشترِ زخمِ درونم آرزوست

خیرِ من ہست انچہ تو فرمودہ
انچہ فرمودی ہمونم آرزوست

حضرتِ والا رح نے یہ غزل ایک مرتبہ ایک اہل سخن کو لکھ بھیجی، انہوں نے جواب میں لکھا کہ اس پر تو عراقی کے کلام کا شبہ ہوتا ہے، واقعی ظاہری حُسن بھی کس درجہ اتم ہے کہ گو آیات قرآنی ڈھلتی گئی ہیں مگر اس موزونیت کے ساتھ کہ نہ شعریت نے آیات کو مجروح ہونے دیا نہ آیات نزاکتِ شعری پر بھاری ہو سکیں، تنہا یہی وصف اس غزل کے القائی و الہامی ہونے کے لئے کافی تھا، چہ جائے کہ اس کا اعتراف خود صاحبِ غزل کی زبانِ مبارک سے مل گیا، والحمدللہ!

حضرت والا رح نے اس فضا میں برسوں پرواز کی اور جتنا جتنا مشاہدہ ترقی کرتا گیا قرب کی تشنگی بڑھتی چلی گئی، چار سال گزر جانے کے بعد بھوپال کے دورانِ قیام میں پھر ایک غزل ہوئی تو وہ بھی اسی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس غزل پر ۳ ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ مطابق (۱۸ ستمبر ۱۹۴۷ء) کی تاریخ درج ہے ـــــــ استاذِ سخن جلالؔ لکھنوی کی غزل تو آپ نے سنی ہوگی جس کا مطلع ہے ؎

میرے دل میں تم گھر کرو جان ہو کر | بنو صاحبِ خانہ مہماں ہو کر

اسی بحر و ردیف میں ایک عشقِ حقیقی کے متوالے کی بھی ترنم ریزی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔

؎ سما جا میرے دل میں ارمان ہو کر | دوئی دور کر دے میری جان ہو کر
تصور میں کیا کیا عنایت ہے ان کی | میرے گھر میں آئے ہیں مہمان ہو کر

ستم بھی کرم ہے کہ شورِ محبت　　　مزہ دے رہا ہے نمکدان ہو کر
جہاں کو معطر بنائے ہوئے ہے　　　وہ زلفِ معنبر پریشان ہو کر

یہ کس میکدے سے اٹھی موجِ مے ہے
چلی آرہی ہے جو فیضان ہو کر

اس کے بعد جیسا کہ آپ پچھلے باب میں پڑھ چکے ہیں سیرت نگارِ رسول کو جب ۱۹۴۹ء میں حرمین کی حاضری کا شرف ملا اور بارگاہِ رسالت میں صلوٰۃ وسلام کے ساتھ عاشقِ نبویؐ نے جب وہ نعت پیش کی جس کا مطلع یہ ہے ؎

آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے　　　مکّی مدنی ہاشمی و مطلبی ہے

اور آخر میں یہ عاجزانہ التماس بھی گذران دی کہ

بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابرِ کرم آج
جو آگ مرے سینہ میں مدّت سے دبی ہے　　(محرّم ۱۳۶۹ھ)

تو سالک عارف کو تمکین کی لازوال دولت بخشی گئی، اب وہ سارے خزینۂ عشق وعرفان کے باوجود بظاہر اس قدر سادہ، پُرسکون اور مطمئن ہو گئے کہ ان کے مقامِ رفیع کو پہچاننا بھی مشکل ہو گیا۔

اسی سفرِ مبارک سے مراجعت کے دوران میں جہاز پر حضرت والاؒ نے ایک اور نعت کہی جس کے بعد زبانِ عشق ہمیشہ کے لئے چپ ہو گئی۔ خود اس نعت کا مطلع بھی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اب حضرتِ والاؒ کو مقامِ تمکین حاصل ہو چکا ہے اور اس کا باعث فیضانِ نبویؐ ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

عشقِ نبویؐ دردِ معاصی کی دوا ہے　　　ظلمتکدۂ دہر میں وہ شمعِ ہدا ہے
پڑھتا ہے درود آپ ہی تجھ پر ترا خالق　　　تصویر پہ خود اپنی مصور بھی فدا ہے
آمد تری اے ابرِ کرم رونقِ عالم　　　تیرے ہی لئے گلشنِ ہستی یہ بنا ہے

بندہ کی محبت سے ہے آقا کی محبت — جو پیروِ احمدؐ ہے وہ محبوبِ خدا ہے

لے جائے گا رہرو کو وہ منزل سے بہت دُور
جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

مسائلِ تصوّف کے اعتبار سے کلام پر نظر

سفرنامۂ روحانی کے بعد اب غزل الغزالات کے چیدہ چیدہ بعض مسائل تصوف پر بھی غور کیجئے کہ کس خوبی و سادگی سے اس میں ادا ہو گئے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عام بھی ہے اور خاص بھی، ربوبیت عامہ سے تو یہ مخلوق فیض یاب ہے البتہ انسانی شرف یہ ہے کہ وہ ربوبیت خاصہ کا محل بن جائے اور یہ ایمان کے بغیر تو ممکن ہی نہیں، مگر محض لفظی ایمان کے ساتھ بھی نہ اسکا مشاہدہ ہو سکتا ہے نہ خاطر خواہ استفادہ بلکہ اس کے لئے اہتمام اور قلبی انتظام کی ضرورت ہے جو صوفیائے کرام کا امتیازی شرف ہے، حضرتِ والا رحؒ نے ربوبیت عامہ اور خاصّہ کے اس فرق کو "رونقِ محفل" اور "جلوۂ خلوت" کے کنایہ سے یوں ادا فرمایا ہے ؎

محفل میں نظر آئیں تو رونقِ محفل ہیں
جلوہ ہے وہی جلوہ جو جلوۂ خلوت ہے

(۲) حقیقت کی نگاہ میں یہ کائنات کوئی حجاب نہیں بلکہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر ہونے کی وجہ سے معرفت الٰہیہ کا ذریعہ ہے، اسی حقیقت کو کس شاعرانہ خوبی سے ادا فرمایا ہے

؎ واکر اے مجنوں تو اپنے دیدۂ مشتاق کو — لیلیٰ پردہ نشیں ہر پردۂ محمل میں ہے

(۳) فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ ایک قرآنی مژدہ ہے، ضرورت صرف نگاہِ شوق پیدا کرنے کی ہے، فرماتے ہیں ؎

دیکھنا ہو تو نگاہِ شوق بن　　　اس کی ہر سو بارگاہ عام ہے

(۴) حق تعالیٰ کی ذات بیچون و بےچگون ہے۔ وہ "ہوالظاہر" ہو کر بھی "ہوالباطن" ہی ہے، اسی لئے اس کو پانا بھی دراصل اس کے مظاہر ہی کو دیکھنا ہے۔ ذات ہمیشہ ورار الورار ہے۔ اس نازک حقیقت کو کس سادگی اور حسن ادا کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے، فرماتے ہیں ؎

نہ جانے وہ ہیں جلوہ فرما کہاں　　　جدھر دیکھئے نور ہی نور ہے

(۵) صوفیائے کرام کے نزدیک ساری کائنات عشق ہی کی آفریدہ و پروردہ ہے، اسی نظریہ کو حضرت والاؒ نے یوں بیان فرمایا ہے ؎

کشش پر ہے قائم نظامِ وجود　　　یہ گھر اک محبت سے معمور ہے

(۶) مگر آج کی زبان میں ہماری زندگی میں جو حادثات پیش آتے ہیں ان سے حیاتِ انسانی غم آلود ہو جاتی ہے اور یہ غم وہ ستم ہے جو لطفِ زیست کو کھا جاتا ہے۔ کیا اس کا کوئی علاج بھی ہے؟ ہے اور وہ بالمثل ہے، زبانِ رسالت میں اس نسخہ کو یوں بیان کیا گیا ہے

"مَنْ جعل الھموم ھمًا واحدًا ھمّ آخرتہ کفاہ اللہ"

یعنی جس نے سارے غموں کو غم آخرت میں ضم کر دیا تو پھر اللہ تعالےٰ نے اس کو ہر فکر سے آزاد کر دیا، چنانچہ صوفیائے کرام اسی نسخہ کو پی پی کر مست و سرشار رہتے ہیں۔ ہمارے حضرت والاؒ بھی فرماتے ہیں ؎

اک غم نے بنایا ہے ہر غم سے مجھے فارغ　　　اندوہِ محبت بھی گنجینۂ عشرت ہے

(۷) عارف اہل دنیا کی طرح احول نہیں ہوتا بلکہ وہ نفع و ضرر کو اسی شاہدِ ازل کا کرم و ستم سمجھتا ہے۔ اسی لئے محبوب کے قہر میں بھی اس کو پیار بھری ہی کی لگاوٹ محسوس ہوتی ہے اسی کو فرماتے ہیں ؎

ستم بھی کرم ہے کہ شورِ محبت ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ مزا دے رہا ہے نمکدان ہو کر

اسی حقیقت کو پا کر وہ حالت قہر میں بھی اپنے محبوب ہی کے دامن سے چمٹتا ہے کہ:
لاملجا ولامنجا من اللہ الا الیہ ــــــــــ اس حسنِ تدبیر کو حضرت والاؒ
نے یوں ادا فرمایا ہے ؎

پناہ اے دل خدنگِ نازِ قاتل سے نہیں ملتی
جو مل سکتی ہے تو پھر سایۂ دامانِ قاتل میں

(۸) دنیوی جد و جہد کے برعکس اُخروی سعی و کوشش میں ناکامی کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس راہ کا ہر قدم قرب کا ایک یقینی زینہ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے یہ ذریعہ خود مقصود بھی بن جاتا ہے، حضرت والاؒ نے اس حقیقت کو کیا خوب ادا فرمایا ہے ؎

جد و جہد دید میں ہے ذوق و شوق و لطفِ دید ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ حاصل ہر سعی میری سعی لاحاصل میں ہے
منزلِ مقصود ہے راہِ طلب کا ہر قدم ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ وہ سرِ منزل ہے جو اب تک رہِ منزل میں ہے

(۹) سلوک کی راہ عقلی موشگافیوں سے نہیں بلکہ شیخ کامل کی رہبری میں عملی نزاہتوں سے طے ہوتی ہے، یہاں اعتقادِ جازم کی ضرورت ہے اور چون و چرا قاطع راہ ہے حضرت تھانویؒ کا قول ہے کہ مرید کے لئے چار باتیں ضروری ہیں، اطلاع و اتباع و اعتقاد و انقیاد اسی گُر کو حضرتِ والاؒ نے شاعرانہ زبان میں یوں ادا کیا ہے ؎

چل کھڑا ہو رہنما سے پوچھ کر راہِ سفر ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بحث میں الجھا مسافر تو سفر ناکام ہے
میری عرضِ شوق ہو ہر چند محرومِ قبول ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ مجھ کو کہنے سے غرض ہر میرا کہنا کام ہے

(۱۰) سیرِ روحانی میں سالک کو کچھ مناظر بھی دکھائی دیتے ہیں اور کچھ نغمات بھی سنائی دیتے ہیں مگر یہ سب غیر مقصود ہے کیونکہ بقول خواجۂ نقشبندؒ "ہر آنچہ دیدہ می شود و شنیدہ می شود ہمہ غیر خدا است" اور ہر غیر سے قطع تعلق ہی تقاضائے ایمانی اور وجہ قربِ ربّانی ہے اس حقیقت کو حضرت والاؒ نے نہایت موثر پیرایہ میں بیان فرمایا ہے، پہلے سالک کے

حال کی تائید فرما رہے ہیں اور پھر حقیقت کے اعتبار سے اس کی نفی ہے، سنیئے ؎

ہے ان کا تصور بھی کس درجہ سراپا نور ‏ گویا کہ قرینِ دل اک شمع فروزاں ہے
آنے ہو تصور میں بھر بھر کے نئے تم روپ ‏ ان سب سے الگ تم کو جانیں تو یہ ایماں ہے

(۱۱) مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر طریق باطن میں تصورات و مراقبات کی تلقین کیوں کی جاتی ہے۔ حضرت والا رح نے اس کا عجیب جواب دیا ہے کہ یہ محض وساوس و خطرات کا علاج ہے تاکہ حواس ظاہری دیدار کے لالچ میں آکر دل کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ان کے انتشار سے یکسوئی میں جو خلل پڑ رہا ہے وہ ختم ہو جائے، غور سے سننے اور سن کر غور و فکر کرنے کا شعر ہے، فرماتے ہیں ؎

دے کر تجھے حواس، فریبِ نوید دید ‏ اجزائے منتشر کو بہم کر رہا ہوں میں

(۱۲) اس یکسوئی میں کبھی کبھی ذاکر یا مراقب کے قلب پر کوئی وارد، کوئی کیفیت بجلی کی چمک کی طرح آکر گذر جاتی ہے حواس منتشرہ متلاشی بن جاتے ہیں کہ جھپک تو دکھائی دی تھی، آہٹ تو سنائی دی تھی، پھر محبوب کہاں غائب ہو گیا؟ سالک کی اس تصوری کیفیت کو حضرتِ والا رح نے جس خوبی سے ادا فرمایا ہے سچ یہ ہے کہ اس سے بہتر باطن کی عکاسی ممکن نہیں ملاحظہ ہو ؎

آواز دے کے کوئی ادھر سے ابھی گیا ‏ ہر سو تلاشِ نقشِ قدم کر رہا ہوں میں

(۱۳) کرنے کو تو احکام الٰہی کی پابندی ایک نرا عابد بھی کرتا ہے اور ایک صوفیٔ صافی بھی، مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، عابد اس کو فریضہ سمجھ کر ادا کرتا ہے اور اس پر اجر کا متمنی ہے مگر صوفی اس میں اپنے جبلی جذبۂ فدویت کی تسکین پاتا ہے اور توفیق طاعت پر محسن حقیقی کا ممنون ہوتا ہے گویا ایک مزدور ہے اور دوسرا بندۂ عشق، اسی فرق کو حضرت والا رح نے ایک شعر میں واضح فرمایا ہے، وہ شعر کیا ہے اہلِ ذوق کے لئے ایک جامِ سرشار ہے سنیئے ؎

برضربِ تیشہ ساغرِ کیفِ وصالِ دوست ـــــــ فرہاد کی جو بات ہے مزدور کی نہیں!

(۱۴) نرا عابد جب سجدہ کرتا ہے تو اپنی پیشانی خاک آلود کرتا ہے، اس پر نماز کی حقیقت کھلتی ہے نہ سجدے میں قربِ الٰہی کا کوئی حظ محسوس ہوتا ہے یعنی وہ محلِ قرب میں آکر بھی لطفِ وصل سے محروم رہتا ہے، مگر عارف سجدے میں کیا کرتا ہے اپنی جبینِ شوق و نیاز کو محبوبِ ازل کے بے کیف وکم قدم پر رکھ کر شش جہات سے گزر جاتا اور قرب کی لذت میں کھو جاتا ہے، اس کیفیت کو حضرت والا کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں ؎

سجدے میں رکھ کے سر ترے پائے خیال پہ ـــــ تعمیر اک بہشتِ ارم کر رہا ہوں میں

(۱۵) ارشادِ نبوی "کُن فی الدنیا کانک غریب" صوفیانہ تعمیرِ حیات کا اصل سنگِ بنیاد ہے اور عارفانہ موعظت کا لب لباب، دیکھئے کہ حضرت والا کی زبانِ فیض اثر سے یہی وصیت کس موزونیت سے قطعہ بند ہو گئی ہے ـــــــ طرزِ ادا اس قدر سادہ اور صاف کہ سہلِ ممتنع کی ایک مثال اور جذبِ روحانی کا یہ عالم کہ کوئی حساس دل اس کو سُن کر محرومِ اثر نہ رہ سکے، سنئے اور فیض لے کر اٹھئے، فرماتے ہیں ؎

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے ـــــ وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے

حیاتِ دوروزہ کا کیا عیش و غم ـــــ سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

یہ اسباب ہیں دستِ قدرت میں یوں

قلم دستِ کاتب میں جیسے رہے

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ ۔

عارفانہ تصانیف

تصوّف یا احسان کے موضوع پر حضرت والاؒ کی تصانیف بہت کم ہیں، اور اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس سلسلہ کی مہلت ہی بہت کم ملی اور جو کچھ ملی وہ پئے در پئے اضطراب یعنی ترک مستقر (اعظم گڈھ) ترک وطن اور پھر مہاجرانہ الجھنوں کی نذر ہو گئی ــــــ دوسری وجہ شاید یہ بھی رہی کہ ان کو سید العارفین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے جمع و ترتیب کی سعادت حاصل تھی، یہ وہ معیاری کام تھا جس کے بعد اور کچھ لکھنا اوج سے تنزل کی طرف آنا تھا، خصوصاً سیرت النبیؐ کی چھٹی جلد جو اخلاق نبوی کا مرقع ہے وہ یقیناً تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کے موضوع پر ایک جامع اور مستند ترین کتاب ہے۔

بہرکیف قلّتِ تصانیف کا سبب جو کچھ بھی رہا ہو، مگر دو تین ہی تحریریں جو اس رنگ کی لکھی جا سکیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت سلیمان (قدس سرہ) جس اقلیم میں بھی نکل جاتے ہیں وہاں انہی کی سطوت قائم ہو جاتی ہے۔

عِلمِ معاش و معاد

جامعہ حسینیہ راندیر (ضلع سورت) کے جلسۂ تقسیم اسناد (منعقدہ ۱۳ شعبان ۱۳۶۴ھ) میں حضرتِ والاؒ نے ایک خطبہ دیا تھا جس کے عنوان یا انداز تحریر میں اپنے شیخ عالی مقام کے طرز کی پیروی کی تھی۔ اس خطبہ کا عنوان ہے "الجهد والجهاد لعلمي المعاش والمعاد" اس میں علم معاش اور علم معاد کا فرق، قرآنی روشنی میں ان دونوں کی تشریح اور ان کی ہم آہنگی کی ضرورت و اہمیت کو بڑی خوبی اور کمال سے بیان فرمایا گیا ہے، خطبۂ ماثورہ کے بعد علمِ معاش (مادی علوم) اور علم معاد (علم وحی) کا عنوان ان دو آیاتِ قرآنی کو قرار دیا گیا ہے:۔

(۱) وعلم آدم الاسماء کلھا

(۲) علم الانسان مالم یعلم

پھر اسمار کی توضیح "تسخیر کائنات" کا قرآنی مدعا "امانتِ الٰہیہ" کا مفہوم و منشاء نہایت دلپذیر انداز میں بیان کرکے "نظام تعلیم کی وحدت" یا یوں کہیے کہ اسلام کے نظریۂ تعلیم کی جامعیت و کمال کو اس حقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر یہ رسالہ جدید و قدیم ماہرین تعلیم کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔

اس خطبہ کا دوسرا نمایاں وصف اس کی پُرتاثیری ہے اس کو پڑھتے جائیے تو صاف محسوس ہوگا دل میں ایک فیض آرہا ہے جس سے روشنی پھیلتی جا رہی ہے، جگہ جگہ منتخب اشعار اور ناصحانہ پیرایۂ بیان نے عجیب گھلاوٹ پیدا کردی ہے واعظانہ زبان اور محققانہ کلام کا امتزاج اردو میں بہت کم ملے گا، اور گو حضرت والاؒ نے اس میں اپنے شیخ قدس سرہٗ کے طرز کی پیروی کی ہے مگر تحقیق، تعبیر اور زبان ہر اعتبار سے یہ مقالہ اپنا منفرد مقام رکھتا ہے ——— سلیمان ذی جاہ جس طرح شبلوی ہوکر بھی انفرادی شان کے حامل ہیں اسی طرح اشرفی بن کر بھی ان کا انفرادی شرف قائم ہے!

حیاتِ اشرف

حضرت والاؒ کبھی کبھی فرماتے تھے کہ:۔

"حیاتِ شبلیؒ لکھ کر تو اپنے استاد کا حق ایک درجہ میں ادا کرچکا ہوں اب جی چاہتا ہے کہ اپنے پیرو مرشد کی بھی کچھ خدمت کا شرف ملے"۔

اس طرح حضرت والاؒ کے دل میں یہ تقاضا موجود تھا کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے سوانح حیات مرتب فرمائیں، ادھر بعض مخلصوں کا بھی پیہم تقاضا ہوا کہ یہ کام ان ہاتھوں سے انجام پانا چاہیئے، اس اصرار میں سب سے پیش پیش حضرت تھانویؒ کے علاتی بھائی خان بہادر محمد مظہر مرحوم تھے، میں نے خود دیکھا کہ جنوری ۱۹۴۵ء میں جب حضرت والاؒ

حیدرآباد دکن تشریف لائے تھے اور چند روز مظہر صاحب کے مہمان تھے تو تقریباً روزانہ ہی وہ حضرت والا رح کو اس کام کی یاد دہانی فرمایا کرتے تھے مگر حضرت والا رح کو جواب میں یہ فرماتے سنا کہ :۔

"ابھی کچھ انتظار ہے"۔

آخر ایک روز شام کی نشست میں جب مظہر مرحوم نے پھر یہی ذکر چھیڑا تو حضرت والا رح نے مسکراتے ہوئے فرمایا :۔

"آج تو معاملہ طے ہوگیا، انشاء اللہ اب قلم اٹھاؤں گا۔"

مظہر صاحب نے فرمایا کہ معاملہ کیا تھا؟ حضرت والا رح نے بات ٹالنی چاہی، مگر پھر مرحوم کے اصرار پر فرمایا کہ دوپہر کو لیٹا تھا کہ خواب میں حضرت والا رح (حکیم الامت) کی زیارت نصیب ہوئی اور حضرت رح کے دستِ مبارک سے ہدیۂ خاص ملا[1]۔

اس تائیدی رؤیا کے بعد حضرتِ والا رح نے ترتیب سوانح کا ارادہ فرمالیا، اور "حیاتِ اشرف" کے نام سے حالات قلم بند فرمانے لگے۔ یہ کام قیام بھوپال کے زمانہ میں انجام پارہا تھا، ابھی حضرت تھانوی رح کے قیام کانپور تک کے حالات ضبط تحریر میں آسکے تھے کہ سقوط ریاست اور اس کے بعد کی بے اطمینانیوں نے قلم کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور کام ناتمام رہ گیا۔

کراچی کے دورانِ قیام میں محترم ڈاکٹر صاحب نے خصوصیت سے اس کی تکمیل پر اصرار فرمایا تو راقم حقیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ازراہِ لطف ارشاد ہوا کہ :۔

"اب تو یوں بھی اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، انہوں نے مختصر سوانح لکھ دی ہے اور میرا مجوزہ نام (حیاتِ اشرف) بھی اڑا لیا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت میری تحریر کو آپ کی تحریر سے نسبت ہی کیا ہوسکتی ہے۔ رہا نام تو

---

[1] افسوس کہ احقر کو پورا خواب اس وقت یاد نہیں نہ اُس وقت اس کو قلمبند کرنے کا خیال آیا تھا ورنہ حضرتِ والا رح نے تفصیل سے سنایا تھا۔

میں نے تو سنا تھا کہ حضرت کا مجوزہ نام (اشرف الحیات[1]) ہے! فرمایا "نہیں میں نے حیاتِ اشرف ہی تجویز کیا تھا۔ چلیے توارد ہو گیا ہوگا اس میں حرج ہی کیا ہے"۔

بہرحال "حیاتِ اشرف" کے زیرِ عنوان حضرت والا رح نے جتنا کچھ تحریر فرمایا ہے جب وہ چھپ کر اہلِ علم و نظر کے سامنے آئے گا[2] تو پڑھنے والے محسوس کرلیں گے کہ اشرف السوانح کے ہوتے ہوئے بھی ایک اور سوانح کی یقیناً ضرورت تھی جو کاش کہ تکمیل پا جاتی!! مؤلفین کے فرق و امتیاز سے مولفات کا تفاوت ظاہر ہے!

اس ناتمام حیاتِ اشرف کا ایک پیش لفظ بھی حضرت والا رح نے تحریر فرمایا تھا جو اب مولانا عبدالباری ندوی مدظلہٗ کی کتاب "تجدید تصوّف و سلوک" کا مقدمہ بنا دیا گیا ہے، اس کا فقرۂ آغاز تبرکاً یہاں نقل کیا جاتا ہے:-

"پیشِ نظر اوراق میں ایک ہستی کا مرقع پیش کیا جا رہا ہے جو اپنے وقت میں مجموعۂ کمالات اور جامع انواع و فضائل تھی، حافظ، قاری، مدرس، مفسر، محدث۔ فقیہ۔ واعظ، صوفی، متکلّم، مناظر، ناظم، ناشر، ادیب اور خانقاہ نشین شیخ سب کچھ تھی۔ لیکن اس نے سب سے بڑھ کر اپنے تمام فضائل و کمالات کو فنِ تصوف کی اصلاح و تکمیل میں صرف فرما دیا اور ان علوم و فنون میں سے ہر ایک پر عالمانہ اطلاع اور محققانہ عبور کے باوجود کسی کو اپنا تنہا اور مخصوص شغل نہیں بنایا، بلکہ اپنے تمام علوم و فنون کو اسی ایک فنِ شریف کی خدمت میں لگا دیا، اس لئے یہ کہنا گویا صحیح ہے کہ اس کو تمام دوسرے علمی

---

[1] یہ غلط فہمی مجھ کو مولانا عبدالباری ندوی مدظلہٗ کی کتاب "تجدید تعلیم و تبلیغ" کے دیباچہ سے ہوئی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ "سیّد صاحب" "اشرف الحیات" کے نام سے حضرت رح کی سوانحِ حیات کا ارادہ بلکہ شاید آغاز فرما چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صفحہ نؔ)۔

[2] یہ مسودہ صاحبزادہ سید سلمان سلمہٗ کے پاس محفوظ ہے۔

وثلی حالات دیے جا اس لئے گئے تھے کہ اس فن کی تجدید موجود نیا میں کس مپرسی کی حالت میں اور ہندوستان میں بحالتِ غربت تھا۔"

مقدمہ جامع المجددین مولانا عبدالباری ندوی مدظلہٗ نے حضرت حکیم الامت کی تجدیدی شان کو آشکار کرنے کے لئے جو "سلسلہ تجدید دین" آغاز فرمایا جامع المجددین اس کی پہلی اور اہم کڑی ہے۔ اس پر مقدمہ حضرت والا رحؒ کے قلم اعجاز رقم کا لکھا ہوا ہے۔ سترہ صفحات کے مقدمہ میں علوم و معارف کا ایک خزینہ محفوظ ہو گیا ہے، حدیث تجدید کی تنقیح، اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح و توضیح، حضرات مجددین کی تاریخ اور اسمائے گرامی کی فہرست، مسئلہ "مجددیت" کی حیثیت اور اس کی نزاکت پھر اس میں کلام کرنے والوں کو تنبیہ اور اس کے بعد چودھویں صدی میں حضرت حکیم الامت کی خدمات کی تجدیدی حیثیت، سب کچھ بکمال خوبی اس مقدمہ میں آگیا ہے۔ چند مختصر اقتباسات سے اس کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

نفس حدیث تجدید ان اللہ یبعث فی اُمتی علی راس کل مائۃ من یجدد لہا دینہا، کے متعلق ارشاد ہے"۔ ایسی بہت سی حدیثیں ہیں جن کی صحت میں کلام کیا گیا ہے مگر واقعہ نے ان کی صداقت کی توثیق کر دی ہے یہی حال اس حدیث کا بھی ہے اور تاریخ اسلام اس کی صداقت کی شاہد ہے"۔

پھر لفظ مَنْ کی تشریح ہے :-

" پھر لفظ مَنْ جیسا کہ محققین نے اصولِ فقہ میں ثابت کیا ہے کسی خاص کے لئے اس کا ہونا ضروری نہیں بلکہ عموم بھی اس سے سمجھا جاتا ہے"۔

پس :- " بالکل ممکن ہے کہ مختلف ملکوں میں یا مختلف اصلاحوں اور مختلف مفاسد کے مقابلے میں تجدید دین کے لحاظ سے کئی مجدد ظہور کر سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ علماء نے بعض دفعہ ایک ہی وقت میں کئی کئی بزرگوں کو مجدد مانا ہے"۔

آگے ان حضرات کے ناموں کی تفصیل ہے ۔اب "رأس کل مائۃ" کی گرہ کشائی ملاحظہ ہو:۔

"سرا (رأس) ابتداء اور انتہا دونوں پر بولا جاتا ہے اس لئے صحیح ترجمہ صدی کے سرے پر کے بجائے تخصیص کے ساتھ ابتدار اور انتہا نہیں آنا چاہیئے"۔

"صدی کے سرے پر مجدد کی پیدائش ہونا ضروری نہیں بلکہ اس وقت اس کے تجدیدی مشن کا آغاز ہونا ہے جس کو حدیث میں بعثت کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے"۔

" مجدد کی بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کی تعلیم وتلقین اور جدوجہد اور دعوت سے زمانہ کی ظلمتیں، خیالات کی بدعتیں اور اعمال کے مفاسد دور ہو کر وہ اصل دین نمودار ہو جائے جس کی صحیح تصویر نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے نگارخانہ کتاب وسنّت میں محفوظ ہے"۔

اس کے بعد متنبہ فرمایا گیا ہے:۔

"چونکہ اس حدیث کا سہارا لے کر بعض مدعیان باطل نے نئے نئے دعوے کئے ہیں یہاں تک کہ نبوت کے حدود حرم تک پہنچنے کی کوشش کی ہے ۔ اس لئے یہ لغزش گاہ بھی ہے اور اس مقام پر قلم اور قدم کو پھونک پھونک کر چلنا چاہیئے"۔

اسی لئے صاف طور پر اعلان فرما دیا گیا کہ:۔

"مجدد اپنی شخصیت کی دعوت نہیں دیتا، یہاں تک کہ مجدد کو مجدد ماننا ایمان کا ادنیٰ جزو بھی نہیں"۔

اور یہ کہ:۔

"اس تعین کے مسئلہ میں نیک نیتی سے دو شخصوں کی رائیں حسب عقیدت و محبت مختلف ہو سکتی ہیں اور ان میں سے کسی ایک پر اعتراض اور ایراد نہیں

کیا جا سکتا کیونکہ یہ مسئلہ محض گمان وتخمین اور قیاس کا ہے۔"

ان حدود کو تسلیم کرتے ہوئے اور انہی قیود کے ساتھ اپنے شیخ حضرت حکیم الامت رح کی تجدیدی حیثیت کی تائید فرمائی گئی ہے باقی نفس تالیف (جامع المجددین) کے متعلق صاف طور پر تحریر فرما دیا ہے کہ:۔

"کسی کو یہ شبہ نہ گزرے کہ اس تحریر یا اس تالیف کا مدعا کسی شخص کے مجددیت کے دعوے کی تشہیر یا منصبِ تجدید کی دعوت وتلقین ہے بلکہ یہ مؤلف کی عقیدتمندانہ تعبیر ہے کہ وہ حضرت رح کی اصلاحی مساعی کو تجدیدات کے نام سے یاد کرتے ہیں۔" (صفحہ ۲۷ تحف) -

اس مقدمہ سے حضرتِ والا رح کی وہ شانِ جامعیت آشکارا ہے جس کو کسی شاعر عارف نے ع "بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق" سے تعبیر کیا ہے۔ اس مقدمہ کو ملاحظہ فرما کر حکیم الامت رح کے مذاق آشنا اور خلیفہ مجاز حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے خود حضرت والا رح سے فرمایا تھا کہ:۔

"مولانا عبدالباری صاحب نے تو یہ کتاب غلبۂ محبت میں لکھی ہے اور حضرت (یعنی مولانا سید سلیمان رح) نے مقدمہ ایسا تحریر فرما دیا ہے جیسے خود حضرت والا رح (حکیم الامت) تحریر فرماتے۔"

اور عارف ومحقق حضرت مولانا گیلانی رح نے اسی مقدمہ کی بابت اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا کہ:۔

"کتاب خوب ہے مگر اس کا مقدمہ تو لاجواب ہے۔"

مقدمہ "مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت"[1] یہ بلند پایہ مقدمہ بھی اپنی جامعیت، علمیت اور افادیت کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے۔ بیس صفحات میں اتنے مضامین کی وسعتوں کو سمیٹ لینا یہ حضرت رح ہی کا حصہ تھا صرف عنوانات

---

[1] مولفہ مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ۔

کے شمار ہی سے اس کی گوناگونی کا اندازہ لگائیے جو یہ ہیں :-

۱۔ امتِ مسلمہ کا فریضہ، ۲۔ دولت وسلطنت مقصودِ اوّل نہیں، ۳۔ امت مسلمہ جانشین نبی ہے، ۴۔ تعلیم وتزکیہ میں تفریق، ۵۔ تعلیم وتزکیہ کی یکجائی، ۶۔ فلاح دونوں کی یکجائی میں ہے، ۷۔ مزاج نبوت قوام ملت ہے، ۸۔ صاحب سوانح اس معیار سے، ۹۔ سلسلہ ولٰلّہی، ۱۰۔ صاحب سوانح کا سلسلۂ نسب، ۱۱۔ اس عہد میں تبلیغی ناکامی کے وجوہ، ۱۲۔ انبیاء کے اصولِ دعوت۔

اس آخری عنوان کے تحت قرآنِ پاک اور سیرت طیبہ کی روشنی میں حسبِ ذیل اصول گنا کر ان کی مختصر تشریح فرمائی گئی ہے۔

(۱) وہ اپنے کام کی اُجرت ومزدوری کسی مخلوق سے نہیں چاہتے۔

(۲) ان کی تبلیغ ودعوت کا محرک بندگانِ الٰہی پر شفقت ورحمت اور خیر خواہی کا جذبہ ہے۔

(۳) نرمی، سہولت، آہستگی، دانشمندی اور ایسے اسلوب سے گفتگو کہ جس سے مخاطب پر داعی کے خلوص ومحبت وشفقت کا اثر پڑے اور بات مخاطب کے دل میں اُتر جائے۔

(۴) دعوتِ تبلیغ میں اَلْاَھم فالاھم کی ترتیب مدنظر رہے۔

(۵) "عرض" یعنی لوگوں کا انتظار نہیں بلکہ خود ان تک پہنچ کر دین کو پیش کرنا۔

(۶) "نفیر" یعنی دین کی طلب اور تبلیغ کے لئے ترکِ وطن کرکے ایسے مقامات پر جانا جہاں دین حاصل ہوسکے اور پھر وہاں سے لوٹ کر اپنے وطن میں آکر اپنے قبیلہ اور ہم قوموں کو اس فیض سے مستفید کرنا۔

(۷) اصحابِ صفّہ کی طرح ایک گروہ خاص کا انتظام رکھنا۔

(۸) زیادہ تر فیضِ صحبت، زبانی تعلیم واحکام ومسائل کا ذکر اور مذاکرہ۔

ان زرّیں اصولوں کو گنا کر آخر میں تبلیغ کی اہمیت پر ایک پُر اثر فقرہ تحریر فرمایا ہے جو پڑھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

اس مقدمہ سے حضرت اقدس رح کے مشرب ومسلک اور وسعت قلبی کا اندازہ ہوتا ہے

اپنے شیخ عالی مقام مجدد وقت کے ایک معاصر بزرگ کے کمالات اور ان کی خدمات کا علانیہ اعتراف واعلان ذرا دکھا تو دیجئے کہ کسی اور کی زبان وقلم سے اس صفائی سے ہوا ہے۔

اس بے نظیر مقدمہ کا سب سے زیادہ اعتراف تبلیغی حضرات کو ہونا چاہیئے تھا اور ہے مگر سچ یہ ہے کہ ان کی قدر دانی بھی گہری نہیں بلکہ سطحی ہے۔ ان کی پہنچ مقدمہ کی اسپرٹ تک نہیں جو یہ ہے کہ دین کی خدمت جہاں کہیں، جس کسی قالب موزوں میں ہو رہی ہے اس کا اعتراف اور حتی الامکان اس سے تعاون کیا جائے نہ یہ کہ جس کام میں خود مشغول ہوں اسی کو وقت کی تنہا ضرورت اور دین کی تنہا خدمت قرار دیں اور اس کے سوا کسی دینی خدمت کو خدمت ہی نہ سمجھیں!

اچھے اچھے کام اور اچھی اچھی تحریکیں اس غلو کی وجہ سے خود اپنے ہی حلقۂ اثر کو تنگ کر لیتی ہیں اور مختلف دینی خدمت گزاروں اور اداروں میں اسی وجہ سے وہ ربط پیدا نہیں ہونے پاتا جو ملت کی ہمہ جہتی صلاح و فلاح کے لئے ضروری ہے! حضرتِ والا رح کی ساری زندگی اسی ربطِ باہمی کے قیام اور رفع غلط فہمی میں گزری تھی، جس نے اس کو نہیں سمجھا، اس نے حضرت رح کو نہیں پہچانا۔!

(تمت)

تذکرۂ سُلیمان حِصّۂ دوم

یعنی

مِنہاجِ سُلیمانی برائے سالکِ رحمانی

باسلیماں خُوکن اے خفاشِ رد
تا کہ در ظلمت نمانی تا اَبد
یک گزے رہ گر بد آنسو میروی
ہمچو گز، قطبِ مساحت میشوی
(رومیؒ)

حاصل و منتہائے طریق

ہر عمل میں طلبِ رضا کا شعور پیدا ہونا یہی اس طریق کا حاصل ہے

اور

جب خدا اور بندہ کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو "نسبت" کہتے ہیں، اور قرآنِ پاک کی زبان میں اس کی تعبیر یحبھم ویحبونہ اور رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ کے لفظوں میں کی گئی ہے

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃً مرضیۃ۔ انہی کے لئے نویدِ بشارت ہے!

(ارشادِ سلیمانی)

فہرست منہاج سلیمانی

نوٹ :-

مندرجہ ذیل مکاتیب اپنی خصوصی نوعیت کے اعتبار سے خاص طور پر قابلِ دید ہیں۔

۱۱ - ۱۲ - ۲۶ - ۲۹ - ۳۷ - ۵۱ - ۵۹ - ۶۲

۶۵ - ۶۶ - ۷۰ - ۷۲ - ۷۹ - ۸۵

اور آخر کے ۱۴ خطوط!

⁂ ⁂ ⁂

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم إنما الاعمال بالنیات وانما لکل امرئٍ مانوی۔ (بخاری)	عمر بن خطاب رضی اللہ عنہٗ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :۔ " تمام اعمال (کے نتائج) نیتوں پر موقوف ہیں اور ہر شخص کے لئے (اُس کے عمل کا) وہی (نتیجہ) ہے جو اس نے نیت کی ہو۔"

بشنوید اے دوستاں ایں داستاں — خود حقیقت نقدِ حالِ ماست آں

نقدِ حالِ خویش را گر پے بریم — ہم ز دُنیا ہم ز عقبا برخوریم

(رومیؒ)

حضرت والاؒ کی خدمت میں پہلی حاضری

فروری یا مارچ ۱۹۴۲ء کی بات ہے، حضرت والاؒ حیدر آباد دکن تشریف لائے تھے، میرے ایک ہم عمر مخلص دوست مولوی سید احمد فریدالدین صاحب حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے مشتاق تھے مگر ان کو قیام گاہ کا پتہ نہ تھا مجھ سے فرمایا کہ ذرا مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کے گھر لے چلیے معلوم ہوا ہے کہ علامہ ندوی وہیں قیام فرما ہیں، بات ٹالنے کی کوئی وجہ نہ تھی، اپنے دوست کو ساتھ لے کر مولانا عبدالباری مدظلہٗ کے گھر پہنچ گیا، دیکھا کہ صاحب خانہ اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی رح کے درمیان آرام کرسی پر ایک ہستی جلوہ فرما ہے، میانہ قد و قامت، متوسط جسم بارعب اور پُرنور گول چہرہ، گرداگرد گھنی ڈاڑھی، خوش وضع ترشی ہوئی، فراخ دمکتی ہوئی پیشانی ،

آنکھیں بڑی بڑی، پُرحیا، بینی وگوش مناسب وموزوں، ہونٹ پتلے اور دورِ دہن تنگ، رنگ کھُلا ہوا مگر سفید نہیں بلکہ" انا ملیح" والی جاذبیت لئے ہوئے، مجموعی طور پر شخصیت میں رُعب بھی اور کشش بھی، مگر جمال جلال پر غالب، مولا کا عکس بندہ میں نمایاں، اہلِ نظر سے پوچھئے تو توحید کا غلبہ بشرہ سے عیاں ——— دل نے کہا ہو نہ ہو یہی ہیں علامہ سلیمان! آگے بڑھ کر سلام کیا حضرت گیلانی رح سے تو نیاز حاصل ہی تھا، مولانا نے بڑے کریمانہ اور پرشفقت پیرایہ میں حضرت علامہؒ سے اس حقیر کا تعارف کرایا اور وہاں سے اٹھ گئے۔ اُس وقت تک اپنا حال یہ تھا کہ آنکھیں علامہ عصر کی تصانیف سے محروم، دماغ آپ کے مرتبہ علمی سے ناآشنا اور دل آپ کے رتبۂ عالی سے بے خبر تھا اور یہی نہ تھا بلکہ بزرگانِ دین کی وقعت وعظمت بھی دل میں بس یوں ہی سی تھی نتیجہ یہ کہ اس پہلی حاضری میں اپنی طرف سے شوخی وبے باکی جو طالب علمانہ زندگی کا لازمہ ہے، پوری طرح نمایاں رہی لیکن اُدھر سے تحمل ہی نہیں بلکہ لطف وکرم اس درجہ بڑھا کہ تھوڑی ہی دیر میں مَیں مسخر ہوگیا، بس ایک ہی نشست میں دل ودماغ پر دین کا نشہ چھا گیا، حالانکہ باتیں کوئی فلسفیانہ تھیں نہ اصطلاحی صوفیانہ مگر اس قدر پُرسوز اور دلگداز[1] کہ اپنے نہ چاہے بھی وہ بلا کا اثر کرگئیں ——— سچ بھی یہی ہے کہ انقلاب فلسفہ وکلام سے نہیں بلکہ اہلِ دل کے سوزِ دروں سے پیدا ہوتا ہے۔

خیر اب مورو سلیمان کی گفتگو کو ذرا غور کے کانوں سے دل لگا کر سنئے، میری معروضات کے لئے علامت (غ) اور حضرت والا رح کے ارشادات کے لئے علامت (س) ذہن میں محفوظ رکھئے اور یہ بھی نہ بھُولئے کہ اب تعارف ہوچکا ہے:۔

---

[1] یہ وہ زمانہ تھا کہ شیخ الشیوخ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ رح کے وصال (۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء) کو ابھی چند ہی مہینے ہوئے تھے اور ہمارے حضرت والا رح پر رحلت شیخ کا ایسا اثر تھا کہ جو لفظ بھی زبان مبارک سے نکلتا سوز میں ڈوب کر نکلتا تھا۔

س۔ (پوری متانت کے ساتھ جو شعارِ سلیمانی تھا) آپ کس درجہ میں پڑھتے ہیں ؟

غ۔ ایل ایل، بی کے ابتدائی سال میں!

س۔ بی۔اے میں آپ کا مضمونِ اختیاری کیا تھا ؟

غ۔ معاشیات۔

س۔ اس وقت آپ کی عمر کیا ہے ؟

غ۔ اکیس (۲۱) برس!

س۔ اچھا یہ بتائیے کہ ہمارے ملک میں عمر کا اوسط کیا ہے ؟

غ۔ اٹھائیس (۲۸) برس

س۔ (مسکراتے ہوئے) خیر یہ تو آپ نے اپنے فن کے اعتبار سے کہا، ویسے فرض کیجئے کہ تقریباً (۴۰) سال ہے تو اس چالیس سال کا نصف سے زائد حصہ آپ نے کس چیز کے حصول میں صرف کیا ؟

غ۔ ڈگری حاصل کرنے میں!

س۔ اور اس سے مقصود کیا ہے ؟

غ۔ (پوری بے تکلفی سے) کوئی اچھا عہدہ حاصل کرنا!

س۔ تو گویا آپ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ ایک ایسی شئے کے حصول میں صرف کیا جو یقینی نہیں بلکہ اکثر جس میں ناکامی ہی رہتی ہے، لیکن آخرت کا اجر تو محتمل نہیں بلکہ یقینی ہے (اس جملہ کے بعد "اللہ" کا لفظ بڑے ہی سوز کے ساتھ زبانِ حق ترجمان سے نکلا) اور اس عمر کے بڑے حصہ میں اس کے لئے کچھ بھی نہ ہو سکا، رہی باقی عمر، اس میں بھی نہ جانے کتنا حصہ صرف تلاشِ معاش ہی کی نذر ہو، جس میں حسب مرضی کامیابی کی توقع بھی نہیں اور یہ سب اس چند روزہ زندگی کے لئے جدوجہد ہے جس کی بے ثباتی کا ثبوت آئے دن ملتا ہی رہتا ہے اور جس کے فنا کا یقین حاصل ہے مگر اس زندگی کے لئے جس کا

دوام مسلم ہے کوئی اہتمام و کوشش نہیں !!

غ۔ (طالب علمانہ شوخی کے ساتھ) یہ سب بجا، اور کبھی کبھی دل بھی یہی چاہتا ہے کہ اسؔ دنیا کی فکر کی جائے مگر جب "بنجارہ ہل" (شہر حیدرآباد کا بہت ہی مغرب زدہ امراء کا محلہ جو پہاڑی سلسلہ پر واقع ہے) کی طرف جانا ہوتا ہے تو جی یہی چاہتا ہے کہ ایسا ہی عالی شان بنگلہ ہو، یہی کرّ و فر ہو اور ایسی ہی مہوشیں ہوں !

س۔ (اب یا تو یہ تھا کہ میری سادگی پسند آگئی[1] یا پھر خوردان کا حکیمانہ اندازِ کرم[2] تھا کہ فوراً مسکراتے ہوئے بڑی ہی محبت سے فرمایا)

آپ مجھ سے خط و کتابت رکھئے ——— (پھر متاثر کن لہجہ میں فرمایا) اصل یہ ہے کہ جب دین کی فہم پیدا ہو جاتی ہے اور دنیا کی حقیقت کھُل جاتی ہے تو یہ سب چیزیں ہیچ نظر آتی ہیں ——— اللہ[3] ——— کیا یہ عقلمندی ہے کہ چند روزہ حیات عیش و عشرت سے گذار کر آخرت کی دائمی تکلیف برداشت کی جائے یا یہ کہ چند دنوں تھوڑی سی مشقت اٹھا کر ہمیشہ کی راحت کا سامان کیا جائے؟ ——— پھر اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اسباب و علل کے تحت ہے اور یہ سارے اسباب ایک مسبب الاسباب کے ہاتھ میں مُسخر ہیں تو اگر کسی کو یہی دنیا حاصل کرنا ہے تو بھی اس کا صحیح طریقہ کیا یہی نہ ہوگا کہ ان اسباب سے نظر ہٹا کر مسبب الاسباب کو اپنانے کی کوشش کی جائے؟ ——— (پھر متبسم ہو کر) آپ کو شاعری سے دلچسپی ہے؟

---

[1] حضرت والا رسمی آداب سے خوش نہ ہوتے تھے بلکہ سادگی اور بے تکلفی کے دلدادہ تھے۔

[2] اکثر فرماتے تھے کہ طبیب اگر مریض کی حالت پر رحم نہ کھائے تو وہ علاج کیا کرے گا؟ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک بھی تو رحمت و رافت ہی سے مملو تھا)

[3] گفتگو کے دوران میں کبھی کبھی بے ساختہ لفظ 'اللہ' حضرتؒ کی زبان سے نکلتا اور دلوں کو ہلا دیتا تھا۔

غ۔ (اب بے باکی ختم تھی، دل متاثر ہوچکا تھا، ادب سے عرض کیا) جی، ہے!

س۔ اچھا تو سنیئے، میں نے اسی مضمون کو اشعار میں یوں ادا کیا ہے۔ (نہایت سادہ مگر پُراثر انداز میں یہ سہل ممتنع اشعار عطا فرمائے)۔

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے — وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے

حیاتِ دوروزہ کا کیا عیش وغم — سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

یہ اسباب ہیں دستِ قدرت میں یوں — قلم دستِ کاتب میں جیسے رہے

یہاں تو مسافرانہ حیثیت میں رہنا ہے، منزلِ مقصود پر پہنچ کر انشاء اللہ آرام ہی آرام ہے

(اس عارفانہ ارشاد نے عمرِ رفتہ کو اپنی نظروں میں گرا دیا، لمحاتِ زندگی کی ناقدری سے دل افسردہ ہوگیا اور دینداری کی اہمیت گویا مشاہد ہوگئی، ساتھ ہی صاحب معارفؒ کی عظمت کا سکّہ قلب پر جم گیا)

ساقی۔ (حضرت والا کا خطاب اور ان کے الطاف تمام تر اسی ناکارہ پر مبذول تھے، ع
کہ مستحق کرامت گناہ گارانند

اب چونکہ گفتگو ختم ہوچکی تھی اس لئے میرے دوست مکرم نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے علّامہ کی خدمت میں عرض کیا)

آپ مضمون نگار بھی ہیں، ابھی چند روز ہوئے کہ آپ کا ایک مضمون "فاروقِ اعظمؓ بحیثیت معلّمِ فنِ حکمرانی" اخبار "رہبرِ دکن" میں چھپ چکا ہے۔

س۔ (مسکراتے ہوئے) اچھا تو اس مضمون کی تیاری میں کون کون سی کتابیں آپ کے پیشِ نظر رہیں؟

غ۔ (کامل مرعوبیت کے ساتھ) تاریخ اسلام مولفہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، الفاروق مصنفہ مولانا شبلیؒ اور تاریخ اسلام مرتبہ دارالمصنّفین۔

س۔ الفاروق کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

غ۔ (ع۔ آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا ——— دبی زبان میں مجمل رائے یہ ظاہر کردی

کہ) بہترین کتاب ہے!

س۔ (پھر بھی اس اجمال کی تفصیل طلب ہی کر لی گئی کہ) کیا یہ مکمل ہے؟

(اب میرے پاس سوال کی تائید میں کوئی دلیل حاضر تھی نہ اس کی نفی کی جرأت[1] لاجواب و حیران رہ گیا)

س۔ (متبسم ہو کر) جی نہیں یہ مکمل نہیں ہے، اس میں تو صرف سیاسی پہلو کو نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے، جس وقت یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت سیاسیات کا دور دورہ تھا، اگر یہی کتاب آج لکھی جاتی تو حضرت عمر فاروقؓ کے معاشی تدبّر و تنظیم کو زیادہ اُجاگر کر کے دکھایا جاتا کیونکہ اب کمیونزم کا عروج ہے! (گفتگو ختم)

غ۔ (گہرے قلبی تاثر کے ساتھ رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے) اجازت ہو تو حضرتؒ کے دورانِ قیام میں کبھی کبھی حاضر ہوا کروں۔

س۔ ضرور تشریف لائیے!

پھر کبھی کبھی کا کیا سوال تھا، بار بار بلکہ کالج کا درس چھوڑ چھوڑ کر خدمت والا میں حاضری ہوتی رہی، کیونکہ ایک نگاہ میں بساطِ دل ہی کچھ ایسی اُلٹ دی گئی تھی کہ زندگی کی قدریں بدل گئیں، مقصدِ زندگی کچھ سے کچھ ہو گیا ؎

ہوشم بہ نگاہے برد جانانہ چنیں باید
یک جرعہ خرابم کرد پیمانہ چنیں باید

جی تو یہ چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بس انہی کا ہو رہیئے کہ کچھ گذشتہ کی تلافی اور آئندہ کا اہتمام ہو سکے ورنہ ناپائدار زندگی کا کیا بھروسہ!!

؏ شاید ہمیں نفس، نفسِ واپسیں بود

---

[1] میری بساط ہی کیا ہے، خود حضرت والارحؒ کے شاگردوں سے سنا ہے کہ اچھے سے اچھے طلبا، بھی اُن کے سوال سے گھبراتے اور بچنے کی کوشش کرتے تھے!

دارالسلام میں تقریر

مسلمانانِ دکن کی واحد نمائندہ جماعت "مجلس اتحاد المسلمین" نے شہر حیدرآباد کے ایک مرکزی مقام پر ایک وسیع زمین جس میں قدیم وضع کی دو عالیشان عمارتیں بھی موجود ہیں حاصل کر لی تھی، انہی میں مجلس کا صدر دفتر بھی تھا اور طلباء کا دارالاقامہ بھی اور اسی میدان میں مجلس کے عام جلسے بھی ہوا کرتے تھے ـــــــــ

مجلس اتحاد المسلمین کے صدر اور مسلمانان دکن کے دلوں کے قائد نواب بہادر یار جنگ مرحوم کو حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رح سے ایسا ہی تعلق تھا جیسے ایک با ادب شاگرد کو اپنے استادِ شفیق سے ہونا چاہیئے، وہ علامہ رح کو ایک غیر جانبدار محقق دین اور بے مثل مورخِ اسلام مانتے تھے ان کی ہر بات کو خوب دل لگا کر سنتے اور فقہی مسائل میں جہاں دیوبندی اور بریلوی اسکول میں اختلاف نظر آتا، انہی کے قول کو قولِ فیصل سمجھتے تھے۔

انہی دنوں جب راقم عاصم کو حضرت والا رح سے ابھی ابھی تعارف حاصل ہوا تھا، قائدِ ملت مرحوم نے مقامی اخبارات میں ایک شخصی اپیل شائع کی کہ اگلے دن علامہ سید سلیمان ندوی رح دارالسلام میں خطاب فرمائیں گے مسلمان زیادہ سے زیادہ اس میں شریک ہوں! ـــــــــ اپیل اور مسلمانوں کے محبوب قائدِ ملت کی طرف سے! دوسرے روز چار بجتے بجتے دارالسلام میں خواص و عوام کا ایک زبردست اجتماع ہو گیا، پہلی تقریر مولانا سید مناظر احسن گیلانی رح کی ہوئی اور پھر حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے کوئی گھنٹہ بھر خطاب فرمایا، جہاں تک خیال پڑتا ہے قرآنِ پاک کی آیت:

"کنتم خیر امۃٍ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر"

کو موضوع بنایا گیا تھا حضرت رح نے پہلے آیتِ پاک نہایت سادگی و ادب کے ساتھ تلاوت فرمائی اور پھر بلا تمہید و تکلف راست نفسِ مضمون پر آ گئے، تقریر ایسی مرتب اور رواں تھی کہ گویا قلم بند ہے اور گو بیان تمام تر علمی اور جوش سے خالی تھا لیکن سوز و جذب کچھ ایسا تھا کہ ہزاروں کا مجمع ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا اور ضرورت بھی کامل توجہ ہی کی تھی کیونکہ سلسلۂ تقریر کی ہر کڑی یکساں اہم اور اول و آخر سے پیوست تھی ـــــــــ میں قائد ملت مرحوم کے قریب ہی بیٹھا ہوا دیکھ

رہا تھا کہ ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو ہو جاتی تھی اور دبی زبان میں سبحان اللہ سبحان اللہ کے کلمات اعتراف نکلتے جارہے تھے۔

حضرت والارحؒ کی اس بصیرت افزا تقریر کا حاصل آج تک یاد ہے اور ہر دور کے مسلمانوں کے لئے اس میں سرمایۂ کامرانی ہے۔ فرمایا:۔

(i) اسلام کا سرچشمہ صافی جہاں سے پھوٹا ہے وہیں سے شفاف پانی مل سکتا ہے۔

(ii) مسلمان خیرِ اُمت بن کر ساری دنیا کی طرف مبعوث ہیں اس لئے ان پر اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی بڑی ذمہ داری عائد کی ہے۔ اگر ان میں وہ برائیاں پیدا ہوجائیں جو غیر مسلموں میں پائی جاتی ہیں تو وہ دنیوی اعتبار سے غیروں سے بھی زیادہ جلد تباہ ہوجائیں گے ـــــــــ اس کی مثال بڑے مؤثر انداز میں یہ بیان فرمائی:۔

"اے حضرات! جوتے کو غلاظت لگ جائے تو پھر بھی چل جاتا ہے لیکن ٹوپی کو لگ جائے تو فوراً اتار پھینکتے ہیں۔"

(iii) حکومت کُفر کے ساتھ تو چل سکتی ہے لیکن بے انصافی کے ساتھ زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتی۔

(iv) حکومت بالذات مقصود نہیں بلکہ اس کا مقصود بھی تبلیغ و اشاعتِ دین ہے مگر افسوس ہے کہ حکومت حیدرآباد اس فریضہ سے یکسر غافل ہے۔

(v) حیدرآبادی مسلمانوں کا ۱۲ فی صدی کی اقلیت میں ہوتے ہوئے صرف سرکاری ملازمتوں پر تکیہ کئے بیٹھنا نہایت خطرناک ہے ضرورت ہے کہ زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت پر قابو حاصل کریں۔

حضرت والارحؒ کی تقریر ختم ہوئی تو قائد ملت اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان دنوں اُن کی تقریر پر حکومت کی طرف سے امتناع عائد تھا، مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں فرمایا کہ میں تو زبان بندی کی مدت کاٹ رہا ہوں اس لئے میرا تقریر کرنا خلافِ قانون ہوگا البتہ جو باتیں ابھی بیان کی گئی ہیں ان کا اعادہ کردوں تو اس میں کیا ہرج ہے ـــــــــ چنانچہ پہلے تو مولانا گیلانیؒ کی

تقریر کا حاصل و مدعا پیش کیا کیونکہ اس روز مولانا کی تقریر کچھ اُلجھ گئی تھی اور پھر فرمانے لگے کہ میری کیا مجال کہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی تقریر پر تبصرہ کی جرأت کروں۔ وہ بحر علم کے غواص ہیں میرے بازار کی رونق انہی کے نکالے ہوئے جواہر سے ہے، میں نے خطبات مدراس کو رٹ رٹ کر میلاد کی محفلوں کو گرمایا ہے[1]۔

دوسری اہم حاضری صبح دس بجے کا وقت ہوگا، قانون کی کلاس میں شریک تاریخ ارتقائے قانون پر لکچر سُن رہا تھا، مگر ارتقائے روحانیت کی دھن کچھ ایسی سوار تھی کہ کان تو پروفیسر کی طرف اور دھیان سارا عارف ندویؒ کی طرف، ۴۵ منٹ کا گھنٹہ نہ پوچھیے کہ کس کرب میں گذرا، غرض جیسے ہی گھنٹہ ختم ہوا حضرت والاؒ کی قیام گاہ کی طرف قدم خود رواں ہو گئے، تین چار فرلانگ کا فاصلہ معلوم نہیں کتنی دیر میں طے ہوگیا، کیونکہ ذہن طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ــــــ ۱۱ بجے دن کا وقت تھا، یہ بھی کوئی ملاقات کا وقت ہے حضرتؒ تو شاید ہی اس وقت گھر پر ہوں گے، اگر ہوں بھی تو ملاقات کی کیا سبیل نکالی جائے، یہی پوچھ بیٹھیں کہ اس وقت کہاں سے آرہے ہو، کیوں آرہے ہو تو جواب کیا بن پڑے گا ــــــ

اسی ذہنی ہیجان میں مولانا عبدالباری صاحب کے مکان سے متصلہ مسجد (مسجد اقصیٰ) تک پہنچ گیا مگر اب ٹھیک مکان تک پہنچنے کی جرأت نہ تھی، آخر صحن مسجد کے شمال مغربی کنارہ پر اس طرح بیٹھ گیا کہ وہاں سے مکان کا برآمدہ صاف نظر پڑتا تھا، خیال یہی تھا کہ حضرت والا اگر برآمدہ میں نکل آئیں تو دیدار ہی کا شرف ملے اور اگر کہیں نظر لطف اس طرف پھر گئی تو کیا عجب کہ طلب بھی فرمالیں، بس قبلہ رو ہو کر قبلہ نما کے انتظار میں نظریں وقف کردیں ــــــ خدا کا شکر کہ کچھ ہی دیر میں حضرت والاؒ کا خادمِ خاص سلیم برآمدہ میں آنکلا اور اس کی نظر اس مشتاقِ دید پر پڑی، بارگاہِ سلیمانی میں حاضر ہوتے دیکھ چکا تھا، وہیں سے پکارا "جناب آپ وہاں کیوں بیٹھے ہیں، آتے کیوں نہیں"،

---

[1] بہادر یار جنگؒ سے تعارف کے لئے ملاحظہ ہو حضرت والاؒ کا مضمون "ایک بہادر مسلمان کی موت" جو "یادِ رفتگاں" میں شامل ہے اور راقم کی مرتبہ سوانح "حیات بہادر یار جنگ" میں بھی لیا گیا ہے،

میں نے اپنی انگلی منہ پر رکھتے ہوئے اشارہ کیا کہ چپ بھی رہو، اور فوراً آگے بڑھ کر اس کو بلوایا اور جتا دیا کہ میرے آنے کی اطلاع حضرت کو نہ کرنا کہیں بارِ خاطر نہ ہو جائے۔

________ سلیم حضرت والارح کا مزاج شناس، یہ کہتے ہوئے کہ نہیں نہیں مولانا فارغ ہیں کمرہ میں چلا گیا اور پھر آ کر اطلاع کی کہ "آیئے یاد فرما رہے ہیں"۔

دل میں بے وقت کی حاضری سے خوف ضرور تھا لیکن اب مسرت اس پر غلبہ پاتی جا رہی تھی دبے پاؤں کمرہ میں داخل ہو کر سلام عرض کیا، حضرت والارح سرمئی رنگ کی شال اوڑھے، پلنگ پر لیٹے لیٹے کوئی کتاب مطالعہ فرما رہے تھے۔ احقر کو سرہانے کی طرف بیٹھنے کا اشارہ فرمایا اور پھر سرہانے سے ایک پتلی سی کتاب نکال کر اس کی ایک عبارت جو خصائل رذیلہ کی اصلاح سے متعلق تھی، پڑھنے کی ہدایت فرمائی، کتاب کا نام جو دیکھا تو یہ تھی "قصد السبیل" جو بعد کو معلوم ہوا کہ سلوک اشرفیہ کی ترجمان اور جامعیت کے اعتبار سے دریا بہ کوزہ کا صحیح مصداق ہے۔ غرض پوری عبارت غور سے پڑھ لی اور پھر عرض کیا کہ حضرت پڑھ چکا، ارشاد فرمایا:

"ان باتوں پر خوب توجہ رہے"۔

(گویا پہلے ہی قدم پر معاملہ صاف کر دیا کہ سارے تصوف کا حاصل بس رذائل اخلاق سے پاکی اور فضائل اخلاق سے آراستگی ہے) احقر نے حکم تسلیم کرتے ہوئے عرض کیا کہ اسی قسم کی ایک کتاب اور بھی ہے لیکن وہ ایک اور بزرگ کی لکھی ہوئی ہے، کتاب کا نام ہے "علاج السالکین" اور اس کے مولف ہیں حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب نقشبندی مجددی، فوراً ارشاد فرمایا: "ہاں ہاں، ابھی مدراس سے جو آ رہا تھا تو راستہ میں ایک صاحب نے یہ رسالہ مجھ کو دیا، اس میں تو صفحے کے صفحے قصد السبیل سے نقل ہیں ________ یہ کون بزرگ ہیں[1]؟"

---

[1] حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب مدظلہ ان باخدا ہستیوں میں سے ہیں جن کا چہرہ ان کی ولایت پر گواہ اور جن کی زندگی زہد و ریاضت کا نمونہ ہے، ابتدائی تعلیم کسی دیوبندی عالم سے پائی، پھر حدیث کی سند مولانا حکیم عبدالرحمٰن صاحب رح (فرزند مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رح) سے حاصل کی، مگر جزئیات فقہ میں مولانا

عرض کیا کہ یہ ایک بڑے عالم اور بزرگ ہیں اور ہمارا تو تقریباً سارا خاندان ہی ان بزرگ سے بیعت ہے۔ ارشاد فرمایا:۔ "آپ نے مجھ سے پہلے ذکر نہ کیا ورنہ میں ان سے ضرور ملتا۔ مجھے مجددیہ خانوادہ سے خاص محبت ہے، مگر اب تو میں کل شام اعظم گڈھ روانہ ہو جاؤں گا"______

میں نے عرض کیا کہ حضرت والارح نماز جمعہ تو مکہ مسجد (شہر کی سب سے عالیشان جامع مسجد سلطان قلی قطب شاہ کی یادگار) ہی میں ادا فرماتے ہیں اور حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب بھی وہاں تشریف لاتے ہیں، اگر حضرت مناسب تصور فرمائیں تو وہیں ملاقات ہو سکتی ہے، میں بھی حاضر ہو جاؤں گا،

ارشاد فرمایا______ "جی ہاں______ کیا حرج ہے"۔

اس کے بعد میں نے اپنے لئے دعا کی درخواست پیش کی اور سلام و مصافحہ کے بعد خوش خوش رخصت ہوا۔

دو صاحبدل کی ملاقات

آج ربیع الاول ۱۳۶۳ھ[1] کی چودھویں تاریخ ہے اور جمعہ کا مبارک دن، میں وقت سے گھنٹہ بھر پہلے ہی مکہ مسجد پہنچ گیا کچھ دیر بعد مولانا گیلانی اور مولانا عبدالباری مدظلہم کے ساتھ حضرت والارح بھی تشریف لے آئے حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب تو حسب معمول بہت سویرے آچکے تھے اور پہلی صف میں

انوار اللہ خاں صاحب رح (بانی مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن) کی طرف مائل ہیں ویسے بحیثیت مجموعی حضرت مولانا تھانوی رح کے بھی بہت قائل ہیں۔ مولانا کا علمی کارنامہ "زجاجۃ المصابیح" کی تالیف ہے جو مسلک حنفی کی موید احادیث کا مشکوٰۃ شریف کی طرز پر پہلا ذخیرہ ہے۔ مولانا مدظلہ طریق باطن میں حضرت سید محمد بادشاہ بخاری رح کے تنہا خلیفہ ہیں اور وہ حضرت شاہ سعد اللہ رح کے خلیفہ تھے جن کو قطب وقت حضرت شاہ غلام علی دہلوی رح سے خلافت حاصل تھی اس وقت حضرت ممدوح کی عمر ۹۰ برس کے لگ بھگ ہوگی (۲۷ اگست ۱۹۶۴ء کو رحلت فرما گئے)

[1] عیسوی لحاظ سے آخر مارچ ۱۹۴۴ء کو کوئی تاریخ ہوگی، میری یادداشت میں صرف ہجری تاریخ درج ہے!!

امام کے قریب تشریف فرما تھے، میں حضرت والاؒ کے ساتھ چوتھی صف میں بیٹھ گیا، نماز ہو چکی تو حضرت والاؒ نے فرمایا "کہاں ہیں مولانا سید عبداللہ صاحب؟" میں فوراً اٹھا اور مصافحہ کرنیوالوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا مولانا کے قریب پہنچ کر آہستہ سے یہ بات گوش گذار کر دی کہ حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں فرمایا "مولانا شبلیؒ کے شاگرد؟" عرض کیا "جی ہاں"۔ مولانا نے فوراً اپنا ہاتھ مصافحہ سے کھینچ لیا اور میرے ساتھ تشریف لے آئے، حضرت والاؒ مسجد کی شمالی کمان کے پاس کھڑے بعض احباب سے گفتگو فرما رہے تھے، مولانا کو آتا دیکھ کر فوراً آگے بڑھے، سلام میں تقدیم کی اور مصافحہ کے بعد دونوں بزرگ بغلگیر ہو گئے اور دو ایک منٹ تک اسی طرح رہے پھر حضرتِ والاؒ دو تین قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے، داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ سے تھامے، آنکھیں بند اور گردن قلب کی طرف جھکائے تصویرِ محویت بنے ہوئے تھے، اُدھر سامنے مولانا کا یہ عالم کہ دونوں ہاتھ سینہ کے قریب کف بستہ، نظریں حضرتِ والاؒ کی جبینِ مبارک پر گڑی ہوئیں، جیسے تحیّر میں کوئی کھڑا کا کھڑا رہ جائے ——— اچھے خاصے لوگ اطراف میں حلقہ باندھے کھڑے تھے مگر جو بھی تھا وہ لاچار اسیرِ حلقہ بنا ہوا تھا، اور غریق حیرت! خود میں بھی تعجّب و حیرت سے کبھی اِدھر دیکھتا تھا اور کبھی اُدھر، ع

بداں ماندم کہ ہم بزم است تصویرے بہ تصویرے

راقم نے دیکھا کہ کچھ دیر بعد مولانا کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور چہرہ پر آثارِ گریہ نمایاں ہو گئے، ادھر حضرت والاؒ پر جو نظر پڑی تو عجیب بات دیکھی کہ علامات گریہ کے بغیر کیفیتِ گریہ محسوس ہو رہی تھی! ایسے میں حضرت والاؒ نے آنکھیں جو کھولیں تو ایک قطرۂ اشک نکل پڑا پھر مولانا سے فرمایا: "اچھا تو اب خدا حافظ" ——— دونوں بزرگوں کے رخصتی مصافحہ پر ملاقات ختم ہو گئی۔

اب یہ سوچنا تو بے کار ہے کہ اس خاموش ملاقات میں کیا ہوا، کیوں کر ہوا، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دو مجلّی قلوب اور دو مزکّٰی نفوس کا آمنا سامنا تھا، دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا، معترف ہو گئے ——— صحنِ مسجد میں پہنچ کر حضرت والاؒ نے ازراہِ لطف اس بے بصیرت

سے فرمایا: "بہت غنیمت ہستی ہے"!

اسی طرح چند روز بعد جب مجددی بزرگ سے نیاز حاصل ہوا تو انہوں نے ہدایت فرمائی کہ "مولانا کی راحت کا خیال رکھئے، بزرگ آدمی ہیں"۔۔۔۔۔ پھر حضرت والاؒ کی قیام گاہ کا پتہ بھی دریافت فرمایا مگر حضرتؒ تو اعظم گڈھ پہنچ چکے تھے۔

ریلوے اسٹیشن پر اسی دوپہر کی شام کو جس کا ذکر ابھی ہو چکا حضرت والاؒ اعظم گڈھ تشریف لے جا رہے تھے وقت پر میں بھی نامپلی ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا حضرت والاؒ علم دوستوں اور محبت کیشوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہوئے تھے، میں قریب پہنچا تو فرمانے لگے "اچھا آپ بھی آگئے"!۔۔۔۔۔ ایسے میں میں نے دیکھا کہ مکہ مسجد کے خطیب ابراہیم رشید مکی بھی چلے آرہے ہیں، جید حافظ، دلکش قاری، اعلیٰ خطیب[1] ہونے کے ساتھ ساتھ وجیہہ و شکیل بھی، ان کے والد ماجد ندوہ میں استاذ رہ چکے تھے اس لئے حضرت والاؒ سے انکے دیرینہ تعلقات قائم تھے آئے اور حضرت سے بڑے ادب و محبت سے ملے، آج ہی جمعہ کے خطبہ میں انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کو "عید الاعیاد" کہا تھا، سلام و مصافحہ کے ساتھ ہی حضرت والاؒ نے مسکراتے ہوئے ان کے لفظ پر گرفت فرمائی، خطیب صاحب نے پہلے تو کچھ جواب دینے کی کوشش کی مگر بہت جلد لاجواب ہو گئے اور ہنستے ہوئے اپنی لغزش کا اعتراف فرما لیا، گفتگو چونکہ ٹھیٹ علمی تھی اور عربی زبان میں ہو رہی تھی اس لئے تفصیل لکھنے سے قلم عاجز ہے۔

خطیب صاحب سے ابھی یہ بات ختم ہی ہوئی تھی کہ خیام ثانی[2] حضرت امجد حیدرآبادی، آپہنچے، حضرت والاؒ کا متبسم چہرہ اور کھل گیا، امجد صاحب نے اپنی درویشانہ سادگی کے ساتھ

---

[1] بہادر یار جنگ مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے ایسے عمدہ خطیب عالم اسلام میں کم ہی دیکھے! بعد کو معلوم ہوا کہ خود حضرت والاؒ کا بھی یہی تاثر تھا!

[2] یہ خود حضرت والاؒ کا عطا کردہ لقب ہے!

سلام و مصافحہ کرکے ایک المونیم کا گول ڈبہ جس میں کچھ ناشتہ تیار کر لائے تھے، حضرتِ والاؒ کی نذر کیا، ــــــــــــــــ یہ ان جیسے عزلت پسند اور مستغنی مزاج انسان کی محبت وعقیدت کی انتہا تھی۔

اب ٹرین چلنے والی ہے، حضرتِ والاؒ ڈبہ میں سوار ہو گئے۔ لوگوں نے مصافحہ شروع کیا، میں نے بھی اس کا شرف پایا مگر کس قدر حسرت میں ڈوب کر اور زبانِ حال سے عرض کرتے ہوئے کہ: ع

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

٭ ٭ ٭

مکتوب (۱)

حضرتِ والارح تشریف لے جاچکے، اب ان کی یاد اور ان کا خیال مونس و ہمدم بھی تھا اور قوتِ دین و ایمان بھی، بار بار ان کی پُرشفقت ہدایت سامنے آنے لگی کہ "آپ مجھ سے خط و کتابت رکھئے"۔ لیکن ایک بے علم و بے ہنر ایک علّامہ عصر کی خدمت میں عرض حال کرے تو کس نہج سے؟ نہ آدابِ تحریر معلوم نہ آئین مخاطبت کا کچھ پتہ! یہی خیال کچھ عرصہ رکاوٹ بنا رہا، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ خود اس نقص کا اظہار اور اس جہل کا اعتراف بھی تو ضروری ہے، بلا تکلّف جو چاہا چاہا لکھ دیا —— اب میرے معروضات اور حضرت والارح کے ارشادات اسی علامت (غ) و (س) کے فرق سے ملاحظہ ہوں!

غ۔ ۵۸۹۔ ریڈ ہلز
حیدر آباد دکن
مورخہ ۸ اپریل ۱۹۴۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی و مکرمی مدظلکم۔[1] السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

کیا بات ہے کہ حضرت قبلہ سے صرف چندہی بار شرفِ ملاقات حاصل رہا لیکن ہر وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شفیق استاد اور قدیم کرم فرما، جو ایک عرصہ سے ہم میں موجود تھا اب ہم سے دور لکھنؤ میں ہے؟

س۔ اعظم گڑھ

---

[1] القاب کے لئے مناسب الفاظ کی تلاش میں اس بے علم کو ہمیشہ ناکامی رہی!

س۔ از ہیچمداں سلیمان بہ محبّی العزیز یا صلح اللہ شانکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ
یہ آپ کی محبت ہے جو اس ہیچمداں ناکارہ کے ساتھ ہے، اگر اس محبّت کی دل میں پرورش
کی جائے تو فریقین کے لئے نافع ہو، انشاء اللہ العزیز۔
(شانِ تحقیق ملاحظہ ہو کہ 'حب فی اللہ' کو پیر و مرید دونوں کے لئے یکساں نافع قرار
دیا گیا ہے)،

ع۔ حضرتِ والا اور مولانا سیّد عبداللہ صاحب مدظلہٗ کی مکہ مسجد والی ملاقات نے قلب
پر گہرے اثرات چھوڑے، اب تک جو بات سننے آئے تھے، اس کو اس جمعہ محسوس و معلوم
پایا، قلب کی بیداری اور بیدار قلب کی ماہیت کا اندازہ گو بقدرِ ظرف سہی، بہرحال
ہو گیا، اب بھی جب وہ سماں نظروں کے آگے آتا ہے تو قلب اسی طرح متاثر ہوتا ہے!

س۔ جو کچھ آپ نے دیکھا یا پایا وہ خود آپ کا تاثر تھا جو بہرحال مفید ہے، (اب آگے کس قلم
سے الفاظِ عجز نقل کروں) آپ کا ممنون ہوں کہ آپ کے بدولت ان بزرگ سے ملاقات
نصیب ہوئی، مجھے مجددی خانوادہ سے دلی تعلق ہے، سبب یہ ہے کہ میری تربیت
میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم کے زیر سایہ ہوئی جو مجددی سلسلہ کے شیخ تھے، اور
حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی مہاجر مکیؒ کے خلیفہ حضرت شاہ ابو احمد صاحب
بھوپالی کے خلیفہ تھے۔

ع۔ پھر گذارش ہے (بالمشافہ بھی پہلی ہی حاضری میں عرض کر چکا تھا) کہ مزاج میں اعتدال
و استقلال نہیں، اُتار چڑھاؤ بہت ہے اسی وجہ سے اکثر حالت اعتدال میں یہ شعر
زبان پر جاری رہتا ہے ؎

گہ سبو زنم بر سنگ گہ بپائے خم غلطم
ساقیا مرنج از من عالمِ جوانیہاست (صائب)

دعا فرمایئے کہ خدا صراطِ مستقیم پر چلائے اور ثباتِ قدم عطا فرمائے۔

س۔ دل سے دعا ہے۔ (حضرت والاؒ کا دستور یہ تھا کہ پہلے دعا فرما دیتے تھے پھر اسکا اظہار قلم سے فرماتے تھے)

غ۔ میں نے اپنی حصول ملازمت کی کوشش کا بھی ذکر کیا تھا؛ بحمد اللہ میں امتحانِ مقابلہ میں کامیاب ہوگیا اور منتخب کر لیا گیا، دعا فرمائیے کہ حصولِ دنیا مطمح نظر نہ بن جائے بلکہ اصل شے حاصل کرنے کی فکر ہمیشہ لگی رہے، (یہ تمیز بھی حضرت والاؒ ہی کی ایک نگاہ فیض اثر نے پیدا کر دی تھی)

س۔ انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا، اپنی طرف سے نیت درست رکھئے۔

غ۔ حضرت والا کی روانگی کے بعد مولانا سیّد عبداللہ صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا تھا اور شاید پھر چند روز بعد حاضر خدمت رہوں۔

س۔ میرا اسلام اور میرے حسن خاتمہ و سلامتی ایمان کی دعا کی درخواست پیش کر دیجئے۔

غ۔ سنا تھا کہ مولانا تھانوی ؒ سے خط و کتابت کا عام طرز یہی تھا اس لئے اسی کے مطابق لکھنے کی کوشش کی گئی ہے اگر کوئی بات ناگوارِ خاطر ہو تو برائے خدا معاف فرمائیے اور غلطیوں سے ازراہِ عنایت مطلع فرمائیے۔ دعا کا طالب

غلام محمد

س۔ کوئی بات نہیں! والسّلام

مکتوب (۲)

(اب ہمّت جو بندھی تو پہلے سے زیادہ طول طویل عریضہ لکھ بھیجا اور جواب بھی ویسا ہی شافی و وافی ملا، خوب غور سے پڑھیئے)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۵ مئی ۱۹۴۴ء

مولانائے محترم و مکرم مدظلکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بے حد مشکور ہوں کہ حضرت والا رحؒ نے اپنے شفقت آمیز اور گراں قدر نصائح سے کمترین کو سرفراز فرمایا۔

س۔ از دیسنہ ضلع پٹنہ

از ہیچداں سلیمان غفراللہ لہٗ بہ محب درویشاں سعادتمند باشند۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزدور جو مزدوری کرتا ہے وہ اس پر شکریہ کا مستحق نہیں کہ اس نے تو اپنا فرض ہی ادا کیا۔ (سبحان اللہ کیا وجد آفریں جواب ہے اور منصبِ ارشاد کی نزاکت کا کیسا آئینہ دار ہے

منت منہ کہ خدمتِ سلطان ہمی کنی　　　منت شناس از وکہ بخدمت بداشتت

ع۔ طبیبِ روحانی کے معیارات جو مولانا تھانوی رحؒ نے "قصد السبیل" میں بیان فرمائے ہیں، مطالعہ کرنے کی عزت حاصل ہوئی، لیکن تشفی نہ ہوئی۔ میری فہم ناقص میں ایک طبیب حاذق یا "پیر کامل" کی زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا عکس ہونی چاہیئے، اس سے میری مراد یہ ہے کہ زندگی کے ہر پہلو میں وہی توازن ہونا چاہیئے جو سیرتِ مقدسہ میں پایا جاتا ہے، یعنی "پیر کامل" اگر زہد و تقویٰ کے اعتبار سے افضل ہو تو دوسری طرف اجتماعی اور ملی حقوق و فرائض سے بھی غافل نہ ہوا اور اس طرح اسکے انفرادی اور اجتماعی پہلو نہایت متوازن ہوں، آج اس معیار کی ہستیاں دکھائی نہیں دیتیں، جو بھی دکھائی دیتا ہے ایک لحاظ سے اعلیٰ دوسرے اعتبار سے ناقص ممکن ہے اس میں میری کوتاہ نظری کا دخل ہو، براہِ کرم اس باب میں رہنمائی فرمائی جائے۔

س۔ حضرت والا (مولانا تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ نے جو معیار بتائے ہیں وہ تمام تر حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و محاسن ہی کو پیشِ نظر رکھ کر بتائے ہیں چنانچہ ارشاد فرمایا کہ اس کے عقائد اور اعمال تمام تر شرع کے مطابق ہوں، تعبیر کا

فرق ہے آپ شرع کی جگہ اسوۂ رسول اللہ رکھ دیجئے، ایک ہی بات ہے، اجتماعی پہلو اگر شرع ہے تو وہ بھی اس میں آگیا، اور اگر مقصود موجودہ زمانہ کی سوشل و پولیٹکل تحریکات ہیں تو ان کی نسبت بھی وہی سوال ہے کہ کیا وہ شرع سے باہر ہیں؟ اگر ایسا نہیں تو انفرادی و اجتماعی کوئی پہلو شرع کے دائرہ سے خارج نہیں۔

(سوال کا دوسرا جزو جواب طلب رہ گیا یا چھوڑ دیا گیا، لیکن اب خود اپنے پاس اس کا شافی جواب موجود ہے، وہ یہ ہے (۱) جامعیت کمال کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے، اس لئے عدم جامعیت نقص نہیں بلکہ جامع شخصیت کی تلاش میں سرگردانی تضییع اوقات ہے، جس پہلو میں بھی کہیں کمال نظر آئے بشرطیکہ وہ کمال معیارِ شریعت پر پورا اترے، فوراً لائق تقلید ہے (۲) طریق اصلاح کا مدار مصلح کے اجتہاد پر ہے، اگر وہ اجتماعیت سے علیٰ وجہ البصیرت گریز کر کے انفرادی تزکیہ میں مشغول ہے تو اس پر محض اس ایک وجہ سے عدم جامعیت کا گمان اپنی ہی فہم کا قصور ہے)۔

غ۔ دوسرے یہ کہ اگر ایک سے زیادہ ہستیاں ایسی ہوں جن کو ہم اپنا رہبر بنا سکیں لیکن عقل فیصلہ نہ کر سکے کہ کس کی اتباع کی جائے اور اس طرح تذبذب پیدا ہو تو کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے؟

س۔ اگر ایک سے زائد ہستیاں نظر کے سامنے ہوں تو غور کرنا چاہیئے کہ دل کا میلان کس کی طرف زائد ہے اور کس سے اس کی عقیدتمندی زیادہ ہے، اُوسی کی صحبت اوس کیلئے نافع ہوگی، جی چاہے تو استخارہ کر لیا جائے۔

غ۔ ایک گذارش یہ ہے کہ نماز میں اکثر خیالات پراگندہ رہتے ہیں، کبھی تو نماز میں دل لگتا ہے اور اکثر محض فرض کی ادائی ہوجاتی ہے اس لئے کوئی رہبری ایسی فرمائی جائے کہ لطف سے محروم نہ رہوں۔

س۔ نماز میں دل لگنا یا نہ لگنا اپنے اختیار کی بات نہیں اور جو چیز بندہ کی اختیاری نہیں وہ

اس کا مامور بھی نہیں۔ (یہ زرّیں اصول ذہن میں محفوظ رہے تو بیسیوں اشکالات اور الجھنوں سے خود بخود نجات مل جائے) بندہ پر اپنی طرف سے دل لگانے کی کوشش ہے جو اختیاری ہے، جس طرح مریض کا کام دوا کا پینا ہے جو اس کے اختیار میں ہے، شفا کا حصول نہیں جو اوس کے اختیار سے باہر ہے ــــــــ نماز میں استحضار اور خشوع خضوع کے حصول کے لئے کوشش چاہیئے اور اوس کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ معانیٔ ادعیہ وسُورِ قرآنی جو پڑھے، اون پر نظر رہے اور ہر لفظ ارادہ سے نکلے، دوسری بات یہ ہے کہ بتوجہ کثرتِ ذکر کا اہتمام رہے، اس سے انشاء اللہ تعالیٰ مطلوب حاصل ہوگا، یعنی یہ نسخہ ہے جس سے شفا کی امید ہے مگر شفا کا ہوجانا یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار اور بخشش کی بات ہے مگر جس طرح عادتِ الٰہی یہ جاری ہے کہ عموماً صحیح نسخہ کے استعمال کے بعد وہ شفا عنایت فرماتے ہیں، ایسے ہی اس طریقہ سے نماز میں استحضار و خضوع بفضلہٖ حاصل ہوجاتا ہے اور اگر کوشش کے بعد بھی حاصل نہ ہو تو بندہ کے لئے یہ محرومی انشاء اللہ مضر نہیں، طمانیت رکھیں۔ لا یکلف اللّٰہ نفساً إلا وسعہا (سبحان اللہ اصول اور یقینِ نفع کو کس خوبی سے ذہن نشین کر دیا)۔

ع۔ آخری التجا یہ ہے کہ پانچ چھ برس سے میری حالت دائمی مریض کی سی ہوگئی ہے، باوجود علاج معالجہ اور اصول حفظانِ صحت کی پابندی کے اکثر کوئی نہ کوئی مرض لگا رہتا ہے، توبہ و استغفار بھی کیا کرتا ہوں (یہ بھی محض حضرت والا کی نگاہِ کیمیا اثر کا ایک نتیجہ تھا کہ خود بخود توبہ و انابت کی توفیق ملی) مولانا بھی دعا فرمائیں تو اولیٰ ہے!

س۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کاملہ عنایت فرمائیں اور یہ دُعا پڑھا کریں:
اَللّٰهُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِیْ دِيْنِیْ وَدُنْيَایَ وَفِیْ نَفْسِیْ وَاَهْلِیْ وَمَالِیْ (یہ حدیثی دعا ہے) اور اگر دُعا بعینہ قبول نہ ہو تو مصلحتِ الٰہی پر صابر رہنا چاہیئے اور اس کو کفارۂ سیّات کا ذریعہ جاننا چاہیئے۔

غ۔ حضرت مولانا سیّد عبداللہ صاحب نے بھی حضرتِ والا کو سلام فرمایا ہے۔ فقط
دُعا کا طالب ، غلام محمّد

س۔ حضرت مولانا سید عبداللہ صاحب کی خدمت با سعادت میں اس ہیچمیرز کی طرف سے بھی سلام پہنچا دیں اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کہ میری بہتری اور حُسنِ خاتمہ اور ترقی و تکمیلِ مدارجِ ایمان کے لئے دعا فرمائیں۔ ۴ جمادی الثانیہ ۱۳۶۳ھ (یہ الفاظ کس شان تواضع کا پتہ دے رہے ہیں جب کہ کہنے والے کے متعلق یہ بات متحقق ہے کہ وہ ذاتِ گرامی رسمی باتوں سے نفور اور سراپا صدق واخلاص تھی)

مکتوب (۳)

غ۔ حیدرآباد۔

حضرت مولانا و مخدومنا مدظلکم العالی۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
حضرت والا کے شفقت آمیز جواب سے نہ صرف عزّت افزائی ہوتی ہے بلکہ بڑی ہمّت افزائی بھی اور ذوق عمل میں تقویت محسوس ہونے لگتی ہے۔

س۔ اعظم گڈھ۔

از ہیچمداں سلیمان بہ اخی فی اللہ غلام محمد صاحب زادکم اللہ تعالیٰ توفیقاً۔
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ عزّت افزائی غیر مطلوب ہے (حالانکہ کتنے بے بصر اسی کو مطلوب سمجھے ہوئے ہیں) عزّت اصطلاح میں اوس قدر و منزلت کو کہتے ہیں جو اوس کو ہم چشموں میں حاصل ہوتی ہے فقراء کے خطوط سے طالبین کی عزّت افزائی غیر مقصود ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سعادت حاصل ہوئی (قربان اس اصلاحِ فکر و نظر کے) بہرحال آپ کو اس ہیچمداں کے خطوط سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں جو آپ کو آپ کے حسنِ نیّت اور اخلاص پر عطا ہوتے ہیں۔ اللّٰھمّ زد فزد (دیکھتے

جائیے کہ ہر جگہ اپنی ذات کی کیسی نفی ہے)

ع۔ کچھ عرصہ سے قلب کی کیفیت یہ ہے کہ بعض اوقات (خصوصاً بعد نماز مغرب) دل چاہتا ہے کہ خوب روؤں، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلب رو رہا ہے لیکن آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلتا، پھر خیال ہوتا ہے کہ کسی بزرگ سے لپٹ کر دل کی بھڑاس نکالوں لیکن اس کا موقع بھی حاصل نہیں، ایسی صورت میں ویسی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسے ابر خوب گھِر آئے لیکن نہ تو برسے اور نہ ہی کھُلے اور حبس ہو جائے۔

س۔ یہ کیفیات بالکل صحیح ہیں (ایسی یقینی بات ایک شیخ محقق ہی کر سکتا ہے ورنہ رسمی پیروں کو حال و قال اور خود احوال کی صحت و عدمِ صحت کی تمیز کہاں، ع نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند) یہ کیفیات آثار ہیں انابت الی الحق کے گویا کہ اب زمین تیار ہے، اسی کو قلب منیب کہتے ہیں، آنکھوں سے آنسو ٹپکنا ضرور نہیں، دل کا رونا کافی ہے اور وہی مقصود ہے، بس اب تھوڑی ہمت درکار ہے استغفر اللہ ربی من کل ذنبٍ واتوب الیہ، پڑھا کیجئے اور ہو سکے تو تہجد کی مداومت اختیار کیجئے، (کیا شفقت آمیز اور ہمت افزا پیرایۂ تلقین ہے!)

ع۔ الحمد للہ کہ اوائل رمضان سے نماز تہجد کا بھی اہتمام جاری ہے (یہ حضرت والا رح کی عند اللہ مقبولیت کی دلیل ہے کہ ان سے تعلق کے بعد از خود ایک ایک عمل صالح کی امنگ دل میں پیدا ہوتی چلی گئی، اسی کو برکت شیخ سے تعبیر کرتے ہیں) بعض دفعہ اسمیں ایک لطف بھی محسوس ہوتا ہے، حضرت والا رح اس نماز کے مستحب طریقۂ ادائی سے آگاہ فرمائیں تو باعثِ الطاف نوازی ہو گا۔

س۔ خدا کا شکر کیجئے کہ رمضان میں یہ سعادت نصیب ہوئی۔ اب شوال و ذیقعدہ و ذیحجہ کو بھی رمضان بنائیے یعنی وہی تہجد پر مداومت، دو دو کر کے آٹھ رکعتیں عشاء کے بعد سے وقت سحری تک کسی وقت ادا کیجئے اور دل میں تصور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ سے باتیں ہو رہی

ہیں، (یہ تصور ایک مسلّم حقیقت کا باندھا جا رہا ہے تاکہ حقیقت تک جتنی پہنچ ہو سکے اس کو محسوس کر کے یقین کو کامل تر کیا جائے خوب سمجھیے!) تہجد میں وہی تسبیحیں بالفعل پڑھئے جو عام نمازوں میں پڑھتے ہیں مگر احادیث و ادعیہ سے وہ تسبیحیں یاد کر لیجیے جو تہجد میں شروع قیام میں، رکوع و سجود میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا کرتے تھے۔

غ۔ ملازمت کے سلسلہ میں آج کل جو ٹریننگ ہو رہی ہے (یہ اکاؤنٹس سروس کی ٹریننگ تھی) اس کے مضامین کی طرف طبیعت کا رجحان کبھی نہ تھا، سوچتا ہوں کہ چھوڑ دوں لیکن نقصان مایہ سے زیادہ شماتت ہمسایہ کا خیال تکلیف دہ ہے اور اس سے ذہنی خلفشار و مایوسی اس درجہ طاری ہے کہ نہ دینی کام انجام پاتا ہے نہ عبادت کی رغبت باقی حضرت والا دعا فرمائیں کہ کسی طرح معاشی پریشانیاں رفع ہوں، سکون قلب میسر آئے اور جس طرف رجحان پیدا ہو چلا ہے اس میں کوئی چیز مانع نہ ہو۔

س۔ اللہ تعالیٰ سے بدل دعا ہے کہ اپنے فضل و کرم سے آپ کو معاشی اطمینان عنایت فرمائیں اس کے لئے کوشش کرنا بھی ضرور ہے، طلب رزق حلال واجب ہے اور یہ بھی حسن نیت کے ساتھ عبادت ہے، ع پراگندہ روزی پراگندہ دل' سعدیؒ جیسے تجربہ کار کا کہنا ہے ؎

شب جو عقد نماز می بندم   چہ خورد بامداد فرزندم

غ۔ بعض دفعہ حضرت سید عبداللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں، حضرت والا کی اس سے متعلق کیا رائے ہے؟ اگر حضرت کی نظر میں یہاں اور بزرگ بھی ہوں جن کی خدمت میں حاضری مناسب و مفید ہو تو رہبری فرمائیں۔

س۔ صحبت تو تمام صالحین کی مفید ہے بشرطیکہ متبع سنّت ہوں، ع تمتع زہر گوشۂ یافتم، مگر ارشاد صرف ایک ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے، ورنہ انتشارِ مقاصد پیدا ہو کر ہر مقصد فوت ہو جائے گا، ہر ایک کی راہ الگ الگ ہے۔

غ۔ اس سے قبل حضرت والا نے جو دعا تحریر فرمائی تھی، اس کو پڑھ لیا کرتا ہوں مزید کوئی دُعا تحریر

فرمادیں جس میں جسمانی و معاشی درستی کے ساتھ ساتھ بطور خاص ارتقائے روحانیت کی التجا ہو تو نوازش ہوگی، (یہ خواہش بھی اسی وقت تک ہے جب تک اپنے عیوب اپنی نظر میں نہیں آجاتے، ورنہ پھر طلب مغفرت کے سوا اور کچھ مدعا باقی نہیں رہ جاتا)۔

س۔ اَللّٰهُمَّ اَغْنِنِیْ عَمَّنْ سِوَاكَ وَارْزُقْنِیْ مِنْ عِنْدِكَ، نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر خضوع و خشوع کے ساتھ دعا میں کہا کریں اور بار بار کہا کریں۔

ع۔ احوال لکھنے کے طرز میں کوئی بات ناگوار خاطر ہو تو حضرت معاف فرمائیں اور غلطی سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ کے لئے اس کا سدِ باب ہو سکے۔

س۔ کوئی حرج نہیں، قابلِ اصلاح امور پر میں خود گرفت کرتا ہوں۔

ع۔ حضرت والا اس احقر پر توجہ رکھیں اور اصلاح حال کے لئے دعا فرمائیں۔

س۔ اپنے نفس پر ہمیشہ محاسبہ رکھئے اور اس کے رذائل کی فہرست بنا کر ہر ایک کے ازالہ کے لئے تھوڑا تھوڑا مجاہدہ کیجئے۔ والسّلام، سیّد سلیمان، ۲، ذیقعدہ ۱۳۶۳ھ

مکتوب (۴)

ع۔ حیدرآباد دکن

۳ جولائی ۱۹۴۴ء

محترمی و مکرمی مدظلکم العالی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

کچھ دن پہلے پتہ چلا تھا کہ حضرت والا کا مزاج ناساز تھا، اللہ تعالیٰ سے توقع ہے کہ اب طبیعت اچھی ہوگی۔

س۔ ندوہ لکھنؤ

اخی فی اللہ! اسعدکم اللہ تعالیٰ فی الدارین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا والا نامہ مورخہ ۳ جولائی ۱۹۴۴ء آج یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء کو ملا،

مدرسہ بند ہونے کے سبب سے یہ خط آپ کا یہاں پڑا رہا، کل شام کو مدرسہ آیا اور آج صبح خط ملا، الحمدللہ کہ یہ ہیچمداں قرینِ عافیت ہے ۔

غ۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ، اس آیتہ شریفہ میں "یقتل" کا لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے ؟ کیا اس کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے بھی داخل ہیں جو تلوار سے قتل تو نہیں ہوئے لیکن اگر موقع ملتا تو حصولِ رضائے الٰہی میں اس سے ہرگز گریز نہ کرتے ؟

س۔ جی نہیں ، یہ آیت پاک صرف اون مقتولین فی سبیل اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جنہوں نے اپنی جان خدا کی راہ میں دے دی اور وہ مارے گئے ، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر اوس مجاہد کو یہ آیت شامل ہوتی جو بہ نیتِ جہاد وغزاء وات میں شریک ہوا مگر مارا نہ گیا، کہ اس کی نیت بھی اپنی جان دینے کی تھی لیکن اوس کو یہ سعادت و شہادت حاصل نہیں ۔

غ۔ اولیاء اللہ کے مزاراتِ مقدسہ پر کبھی کبھی حاضر ہونے کی مولانا تھانویؒ نے تلقین فرمائی ہے دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان بزرگوں سے استفادہ کس طرح کیا جا سکتا ہے ؟ براہِ کرم رہبری فرمائی جائے ۔

س۔ مقابر و مزارات پر عبرت پذیری کے لئے جانا درست ہے ، اصحاب قبور صالحین سے استفادہ بہ ایں معنی کہ اون پر جو رحمت الٰہی کی بارش ہو رہی ہے اوس سے ایک نوع کا انصباغ حاصل ہو جائز ہے مگر اس کے لئے زائر کو اہل استعداد میں سے ہونا ضروری ہے ورنہ وہ مستفید نہ ہو سکے گا ۔

غ۔ گذشتہ دوشنبہ (یعنی ۳ ر رجب ۱۳۶۳ھ مطابق ۲۵ رجون ۱۹۴۴ء) ہمارے محبوب قائدِ ملت (بہادر یار جنگؒ) کی رحلت سے سخت صدمہ پہنچا (اس درجہ کہ اپنی زندگی بھی ختم معلوم ہوتی تھی) نہ جانے اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے ، بظاہر ہماری بدبختی ہی کے آثار دکھائی دیتے ہیں، خدا فضل کرے !

س۔ جی ہاں، مرحوم کی وفات کے سانحہ کا علم ہوا[1]، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے اور مغفرت عطا فرمائے۔

غ۔ حضرت والا میری اصلاح کے لئے دعا فرمائیں۔ فقط

دعا کا طالب، غلام محمد

س۔ آپ کی اصلاح و ترقی کے لئے بدل دعا ہے۔

میرا مستقل پتہ اعظم گڈھ ہے۔ والسّلام

ہیچمداں سیّد سلیمان شوال ۱۳۶۲ھ

مکتوب (۵)

غ۔ حیدرآباد، دکن یکم ذیحجہ ۱۳۶۳ھ

حضرت مولانا مخدومنا مدظلکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تقریباً تین ہفتہ قبل ایک احوال نامہ خدمت اقدس میں گذارنا تھا، لیکن اب تک جواب سے محرومی ہے، غالباً وصول ہی نہ ہوا ہوا ورنہ جواب سے ضرور مشرف فرمایا جاتا، اگر وہ خط نہ ملا ہو تو اچھا ہی ہے کیونکہ اس میں بعض گستاخیاں تھیں جن کو وساوس قلبی کی بناء پر درج کیا تھا، الحمدللہ اب وہ شکوک خود بخود رفع ہو چکے اور حضرت والا کی طرف کشش بڑھتی جارہی ہے۔

س۔ اعظم گڑھ، ۸ ذیحجہ ۱۳۶۳ھ

اخی فی اللہ تعالیٰ دام سعدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

---

[1] حضرت والا رح کے تاثر کا اندازہ لگانا ہو تو "یاد رفتگاں" کے اوراق ملاحظہ ہوں! زیر عنوان" ایک بہادر مسلمان کی موت" نیز میری تالیف" حیات بہادر یار جنگ" شائع کردہ بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی میں بھی حضرت اقدس کا یہ مضمون شامل ہے۔

آپ کے ہر خط کا جواب جا چکا، شاید اب پہنچا ہو، گستاخی کی کوئی بات نہیں، نیت نیک اور صالح ہے تو کوئی حرج نہیں۔

غ۔ یہ سُن کر مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ حضرت والا ماہِ دسمبر میں رونق فرمائے حیدر آباد ہو رہے ہیں، ع اے آمدنت باعث آبادی ما۔ حضرت والا تاریخ آمد سے مطلع فرمائیں تو نوازش ہوگی۔

س۔ دسمبر کے آخر میں یا جنوری کے شروع میں انشاء اللہ تعالیٰ۔ اصل سفر مدراس کا ہے (اور اس کی غرض آل انڈیا ہسٹری کانفرنس میں شرکت تھی)،

غ۔ تقریباً پندرہ روز کا عرصہ ہوتا ہے کہ نماز میں وہ سرور اور کیفیت پائی نہیں جاتی جو پہلے حاصل تھی، ہر چند خیالات کو مجتمع رکھنے کی کوشش کرتا ہوں پھر بھی یکسوئی سے محروم رہتا ہوں، استغفار ہر خالی وقت میں پڑھا کرتا ہوں۔ غرض اپنی طرف سے برابر کوشش کئے جا رہا ہوں، اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔ حضرت والا دعا فرمائیں۔

س۔ اس راہ میں ایسا ہوتا رہتا ہے، اس کی کچھ فکر نہ کیجئے، یہ سرور و لذت ہمارے آپ کے اختیار کی چیز نہیں اور جو امور اختیاری نہیں اون کے درپے نہ ہوئیے۔ ارتکابِ معصیت، صحبت ناجنس اور غفلت نہ ہو۔ اس کا علاج استغفار کی کثرت ہے اور بہت نافع ہے۔

غ۔ پہلے خط میں (جو ضائع ہوگیا) ایک خواب کا ذکر تھا جس کو اب مہینہ سے زیادہ ہوا، بعد نماز تہجد سویا تھا کہ حضرت والا کو ایک پلنگ پر قبلہ رو کروٹ لیٹے دیکھا، میں بھی قریب ہی روبرو بیٹھا تھا حضرت کی آنکھیں بالکل کھُلی ہوئی اور احقر کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں کچھ دیر دیکھ سکا پھر میں نے گردن جھکا لی اور آنکھیں بند کرلیں، کچھ دیر بعد سر اٹھایا کہ آیا حضرت اس طرف متوجہ ہیں؟ کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کے اور اس احقر کے درمیان ایک بان کی چارپائی حائل ہے اور حضرت والا کی نظریں اس میں سے برابر پڑ رہی ہیں۔ آنکھوں کی

کیفیت وجاذبیت میں کوئی فرق نہیں لیکن اب حضرت والارحؒ کے چہرہ پر نہ ڈاڑھی ہے نہ موچھ، اس کے بعد میں بیدار ہو گیا ——— حضرت رحؒ سے محبت بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

س۔ خواب کو اہمیت نہ دیجئے، بس یوں سمجھیں کہ رحمتِ الٰہی متوجہ ہے اور اس سے فائدہ اٹھائیے [1]۔

وہ چشمِ محبت تو جویانِ محبت ہے　　دیکھے تو ذرا کرکے اس سے کوئی یارانہ

(یہ شعر خود حضرت والارحؒ کا ہے)۔

غ۔ ایک اور طول طویل خواب۔

س۔ دل کا تعلق مسجد و نماز سے ہونا بشارت ہے۔ حدیث میں اس کی بشارت آئی ہے وقلبہ معلق بالصلوٰۃ (تعبیرِ خواب کو آیت قرآنی یا حدیث نبوی سے مؤید کر دکھانا حضرت والارحؒ کا خاص مذاق تھا)۔

غ۔ کیا خواب واقعی کوئی اہمیت رکھتے ہیں؟

س۔ خواب کی اہمیت اسی قدر ہے کہ اگر وہ رویائے صادقہ ہے تو مبشرات میں سے ہے۔

غ۔ حضرت والارحؒ میرے اصلاح حال کے لئے دعا فرمائیں۔ دیدار کا منتظر

غلام محمد

س۔ دل سے دعا ہے۔ ہیچمداں سلیمان

---

[1] اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ اجمالی تعبیر پر دو وجوہ سے اکتفا فرمایا گیا، ایک تو یہ کہ احقر کی توجہ عالمِ خواب سے ہٹ جائے اور دوسرے یہ کہ تفصیل میں اظہارِ کمال تھا جس کو حضرت والارحؒ کی فنائیت گوارا ہی نہ کرسکتی تھی ورنہ پیالہ پانی میں سے نظروں کا گذر کر احقر تک پہنچنا، صاف اشارہ ہے کہ فیض سلیمانی چاروں سلسلوں کی جامعیت لئے ہوئے جاری ہے، اسی طرح چہرۂ مبارک کا ڈاڑھی موچھ سے صاف دکھائی دینا طالب پر شیخ کے رنگ باطن کا اظہار ہے جو غلبۂ توحید سے عبارت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت والاؒ کا آخری سفر حیدر آباد دکن

جنوری ۱۹۴۵ء کی کوئی تاریخ ہو گی کہ حضرت والاؒ ہسٹری کانفرنس میں شرکت فرما کر مدراس سے حیدر آباد تشریف لائے، قیام وہی مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے مکان پر تھا، اس نیاز مند کو حضرت والاؒ کی آمد کا سخت انتظار تھا اور پروگرام نہ معلوم ہونے کی وجہ سے بڑا اضطراب رہتا تھا کہ نہ جانے کب تشریف لائیں، ایک روز بعد نماز عصر اسی حالتِ اضطراب وانتظار میں دعا کر رہا تھا کہ یکایک میرے دوست نے آکر آمدِ بہار کی نوید سنائی، ــــ دل باغ باغ ہوگیا، اب یاد نہیں کہ فوراً اسی وقت یا دوسرے روز کسی وقت حضرت والاؒ کی خدمت میں جا پہنچا، دیکھا کہ مولانا گیلانی اور میزبانِ محترم سے سفرِ مدراس کے کچھ حالات بیان ہو رہے ہیں اور بڑے ہی پُر لطف پیرایہ میں، چنانچہ مولانا گیلانی سے جو حضرتؒ کے بے تکلف دوست بلکہ دور کے عزیز بھی ہوتے تھے، مسکراتے ہوئے فرمانے لگے "مولانا مدراس میں تو آپ کی تقریروں کا بڑا چرچا ہے، لوگ کہتے تھے کہ سمجھ میں تو خیر کچھ نہیں آتا مگر مولانا کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے" ــــــــــــ اس قندِ سلیمانی سے وہی محظوظ ہو سکتے ہیں جو مولانا گیلانی کی فصیح و بلیغ اور رواں دواں تقریریں سُن چکے ہوں اور اس کا تصور مدراسی اردو داں طبقہ کے درمیان کر سکیں!

غرض یہ دلچسپ صحبت نمازِ مغرب کے لئے برخاست ہوگئی اور ہم سب پاس ہی "مسجد اقصیٰ" میں آ گئے، حضرت والاؒ نے ادھر اُدھر دیکھا، امام صاحب نظر نہ آئے، مولانا گیلانی سے مسکراتے ہوئے فرمایا "آج امام العلماء دکھائی نہیں دیتے؟" ایسے میں امام صاحب آ پہنچے، اس روز سے ان کا نام "امام العلماء" پڑ گیا اور یہ ظریفانہ لقب اس لئے موزوں ہوا کہ حضرت گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی مدظلہم جیسے جلیل القدر علماء ان امام صاحب کے مستقل مقتدی تھے۔

ظرافتِ سلیمانی کے ایسے چند نمونے آج پہلی بار اپنی نظروں نے دیکھے اور دل شکر سے

معمور ہوگیا کہ بہادر یار جنگ مرحوم و مغفور کی سنجیدہ، ادب پرور اور ظرافت نواز محفل کی تلافی ہوگئی، اور بڑا اطمینان اس بات سے حاصل ہوا کہ ظرافت، دامنِ زہد کا دھبہ ہرگز نہیں!

نقائص نامہ

اب تک معاملہ کچھ ایسا رہا کہ طاعت کی رغبت بھی بڑھتی رہی اور علم دین کا شوق بھی ـــــ چنانچہ عمل میں نماز باجماعت کے علاوہ تہجد کا اہتمام اور علم میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی تصانیف کے علاوہ اکابر علماء و صوفیاء کی کتابوں کا مطالعہ زور و شور سے ہوتا رہا ـــــ مگر اپنے عیوب سے اب بھی بالکل بے خبری تھی حالانکہ مسلک اشرفیہ میں رذائلِ نفس پر نظر اور اُن کا اپنے شیخ سے معالجہ خود سالک کے فرائض میں داخل ہے ـــــ یہ یقیناً صحبت شیخ کا کرشمہ تھا کہ اس مرتبہ کی چند ہی حاضریوں میں احساسِ زیاں بیدار ہوگیا اور اپنے عیوب سے پردہ اٹھنے لگا ـــــ ایک روز ایک پرچہ پر بعض عیوب ایک ایک دو دو لفظ میں لکھ دیئے اور "نقائص نامہ" کا عنوان لگا کر ان کو خدمتِ شیخ میں پیش کر دیا من و عن مع جواب باصواب ملاحظہ ہو:۔

غ۔ قنوطی خیالات غالب لہٰذا یاس زیادہ آس کم!

س۔ مومن قانط (PESSIMIST) نہیں ہوسکتا، لا تقنطوا من رحمة الله اور انه لاييأس من روح الله الا الكافرون[1]۔ بظاہر جو یاس مومن پر ہوتی ہے وہ عدم ظہور اسباب سے ہے، تو خوب سمجھ لیجئے کہ مسبب الاسباب پر نظر ہو تو عدم ظہورِ اسباب سے دل پر قنوط راہ نہ پائے پس ہمیشہ فتوکل علی الحی الذی لا یموت پر نظر رکھئے، یہ کیفیت انشاء اللہ دُور ہوجائے گی۔

غ۔ حُبِّ عزّت وجاہ!

---

[1] ان آیات کا حاصل یہ ہے کہ مایوسی کفر کے مترادف ہے ـــــ ہمارے حضرت والاؒ کو "مایوسی" اور "بدقسمتی" کے الفاظ سے نفرت تھی اور مسلمان کی زبان سے ان الفاظ کو سننا گوارا نہ فرماتے تھے!

س۔ عزّت وجاہ اگر میسر آجائے تو کچھ حرج نہیں مگر اوس کی کوشش میں نہ لگے، کوشش صرف حصولِ رزق کی ہو۔

غ۔ کچھ تصنّع!

س۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْر کا استحضار ایسے وقت میں کر کے تصحیح اپنے عمل کی کرلیں، (آیات قرآنی سے بیش از بیش تذکیری وعملی فائدہ اٹھانا علمائے عارفین ہی کا حصہ ہے ورنہ علمائے قشر تو محض نظری بحثوں میں مگن رہتے ہیں مثلاً وہ اسی پر نازاں ہیں کہ اس آیت سے انہوں نے فلاسفۂ یونان کا رد کر کے ثابت کر دکھایا کہ حق تعالیٰ کا علم کلیات تک محدود نہیں بلکہ جزئیات کو بھی حاوی ہے ———— مگر غور کیجئے کہ اس جواب سے حاصل کیا ہوگا جب تک کہ اس کے منشاء کو سمجھ کر اس سے اصلاح وتقویتِ عمل میں مدد نہ لی جائے!)

غ۔ قوت جہاد فی النفس کی کمی!

س۔ کچھ حرج نہیں، کام میں لگے رہیئے (یعنی اضافہ قوت کا راز قوتِ حاصلہ کے صرف میں ہے)

غ۔ غِیبَت!

س۔ اپنے عیوب پیشِ نظر رکھیں اور اپنے گناہوں کا جائزہ لیتے رہیں۔

غ۔ حاسدانہ جذبات بعض دفعہ پیدا ہو جاتے ہیں لیکن نہ عملی شکل اختیار کرتے ہیں نہ زیادہ دیر قائم رہ سکتے ہیں!

س۔ اس کے تقاضے پر عمل نہ کیا جائے (باقی یہ کوشش کہ سرے سے یہ جذبہ ہی فنا ہو جائے نہ صرف محال بلکہ خلاف حکمتِ الٰہیہ ہے!!)

غ۔ دنیوی منزلت ودینی رفعت یعنی اولیاء اللہ میں شریک ہونے کی تمنّا، ————

س۔ دنیوی منزلت کے معنی وسعت رزق کے صحیح ہیں (یعنی جس سے صرف دلِ جمعی مقصود

ہو تفاخر پیشِ نظر نہ ہو) دینی رفعت کی طلب مبارک مگر اوس کی طلب اوس کے راستوں سے ہو (یعنی خواہشات نفسانی لوجہ اللہ فنا کر کے اور مرضیاتِ الٰہیہ کو مقصود عمل بنا کر)

ع۔ علوم دینی میں ترقی اور دوسروں کو فائدہ پہنچانا۔

س۔ علوم دینی میں ترقی کا خیال مبارک لیکن اپنے فائدہ کے لئے، دوسروں کا خیال دل سے نکال دیجئے!

(صالح بننے کے بجائے مصلح بننے کی فکر موجودہ مسلمان کی ایک خام خیالی ہے، خواہ اس عیب کو ہنر سمجھنے کے لئے اس نے کتنے ہی دلفریب عنوانات تراش لئے ہوں صحتِ نتائج اگر صحتِ فکر کا معیار ہے تو دیکھ لیجئے کہ آج کی اس خام خیالی سے مسلم معاشرہ کس درجہ گر چکا ہے اور اُس وقت کس اوج پر تھا جب کہ ہر مسلمان کو اپنی اصلاح کا خیال دامنگیر تھا!)

خان بہادر محمد مظہر مرحوم کی میزبانی

ان دنوں حضرت تھانوی رح کے علاقی بھائی خان بہادر محمد مظہر جو حکومت ہند میں بھی بڑے عہدہ پر رہ چکے تھے۔ کمشنر "انسدادِ رشوت ستانی" کی حیثیت سے حیدرآباد آئے اور جوبلی ہل پر "پریم ولا" میں سرکاری طور پر مقیم تھے، مظہر صاحب مرحوم شرافت، ذہانت اور بذلہ سنجی میں فرد تھے۔ ادھر مولانا تھانوی رح سے ان کے مرتبہ نصاب تعلیم کی تکمیل بھی کی تھی، اس لئے ان کی دینی معلومات بھی معیاری تھیں اور ذہانت و فطانت کی بناء پر اچھے اچھے علماء کو بھی گفتگو میں زیر کر جاتے تھے۔ ہمارے حضرت والا رح سے مرحوم کو خاص محبت تھی اور بڑا احترام فرماتے تھے اور خود حضرت رح کو بھی اُن کا پاسِ خاطر ملحوظ رہتا تھا۔

مظہر صاحب مرحوم کا بار بار اصرار رہا کہ حضرت والا رح اُن کے گھر مقیم رہیں لیکن حضرت والاؒ نے ہمیشہ دو عذر ظاہر فرمائے، ایک تو یہ کہ وہاں مسجد کا قرب میسر نہ ہوگا اور دوسرے یہ کہ

احباب (مولانا گیلانی اور مولانا عبدالباری مدظلہم) سے دوری رہے گی لیکن مظہر صاحب کہاں چھوڑنے والے تھے، فرمانے لگے کہ حضرت مع احباب کے وہاں تشریف لے چلیں، راست ان حضرات سے بھی مظہر صاحب نے فرمایا کہ وہ اس مخلصانہ دعوت کو رد نہ فرمائیں، اصرار کی اس انتہا پر اپنے احباب سے پندرہ دن کی اجازت چاہی اور جوبلی ہل تشریف لے گئے۔

"پریم ولا" کے راحت کدہ میں ایک اہل اللہ کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ اس کے آس پاس دُور دُور تک کوئی مسجد موجود نہ تھی، سرمایہ دار فیشن پرست طبقہ کے محلہ میں خدا پرستی کے آثار و علامات کی تلاش بے سود تھی البتہ جوبلی ہل کی سرحدی سڑک پر ایک مسجد ضرور تھی جو پکے راستہ سے کوئی میل بھر کی مسافت پر ہوگی۔ البتہ مظہر صاحب کی قیام گاہ سے ایک پگ ڈنڈی کوئی دو فرلانگ لانبی وہاں تک پہنچتی تھی، حضرت والا رح کو دیکھا کہ باوجود ریاحی تکلیف اور خرابیٔ صحت کے اکثر نماز کے لئے اسی راستہ سے مسجد جاتے آتے تھے، خدا کی شان کہ وہ پگ ڈنڈی جو مفلسوں اور ناداروں کی پامالی کا نشان تھی ایک فقیر الی اللہ کے قدوم سے مشرف ہو کر ہمت و عزیمت کا خط جلی بن گئی!

جناب مظہر صاحب کے ہاں جتنے دن قیام رہا، عصر سے بعد مغرب تک کا وقت بڑا قیمتی اور پر لطف رہتا تھا، مولانا گیلانی اور مولانا عبدالباری صاحب تو روزانہ ہی تشریف لاتے تھے، ان کے علاوہ اور بھی چند قدر شناس جن میں پروفیسر غلام دستگیر رشید اور ان کے دوست خواجہ محمد احمد ناظم اعداد و شمار خاص تھے، جمع ہو جاتے تھے۔

ان محفلوں میں باتوں باتوں میں کتنی علمی گتھیاں سلجھ جاتی تھیں اور کتنے عارفانہ عقدے حل ہو جاتے تھے، تقدیر اور خیر و شر کے مسئلہ کی سلیس و تشفی بخش توجیہہ پہلی مرتبہ کانوں نے یہیں سنی، ذوق و شوق کا درجہ اور ان کی حیثیت کا صحیح ادراک یہیں حاصل ہوا، سنت میں شائستگی اور حسنِ سلیقہ کا جو اعلیٰ معیار موجود ہے اس کا درس بھی یہیں نہایت لطیف انداز میں ملا۔

اب ان محفلوں کو یاد کر کے افسوس ہوتا ہے کہ ان کی روزانہ کی روئداد کیوں محفوظ نہ

کرلی گئی؛ اب اپنا حافظہ ایسا کہاں کہ اس کے بل بُوتے پر یقین کے ساتھ وہ تفصیلات دہرائی جاسکیں!

خادم نوازی اسی دوران قیام میں ایک بار حضرت والاؒ نے راقم کے غریب خانہ پر تشریف لاکر زحمت طعام گوارا فرمائی تھی، اور حضرتؒ ہی کے ایما سے ہماری درخواست پر حضرت مولانا سیّد عبداللہ صاحب مدظلہ نے بھی اس دعوت میں شرکت قبول فرمائی تھی، دونوں بزرگوں نے نمازِ مغرب ہماری ہی مسجد میں ادا فرمائی اور پھر غریب خانہ پر رونق افروز ہوئے، واقعتہً دو نور ایک جگہ جمع نظر آرہے تھے۔ اخلاص و محبّت، پاکی و للّٰہیت کے یہ دو پیکر جتنی دیر رونق فرما رہے اہلِ خانہ کے دل نے عجیب کیف و سرور اور ایمانی برکت و حلاوت پائی۔

جی تو چاہتا تھا کہ ایسی سعادتیں بار بار حاصل ہوتی رہیں مگر حضرتِ والاؒ کی زحمت کے خیال سے عرضِ مکرر کی جسارت نہ ہوسکی البتہ ایک متبادل صورت ذہن میں آئی کہ کسی روز "ماحضر" خود حضرتؒ کی قیام گاہ ہی پر پہنچا دیا جائے چنانچہ اس کی اجازت طلب کی گئی جس کو حضرت والاؒ اور محترم مظہر صاحب نے بہ طیبِ خاطر قبول فرمالیا اور رات ہی کے کھانے پر بات ٹھیری، یہ موقع بھی بڑا دلچسپ رہا، دسترخوان پر مظہر مرحوم اور حضرت والاؒ میں لطائف و ظرائف چلتے رہے، اپنی توجہ چونکہ تمام تر ذاتِ سلیمانی پر مرتکز تھی اس لئے مرحوم مظہر صاحب کا ایک لطیفہ بھی اس وقت یاد نہیں البتہ حضرت والاؒ کا ایک ظریفانہ فقرہ ناقابلِ فراموش ہے ـــــــ کھانے کے بعد کافی کا اہتمام تھا، خود حضرتؒ نے اپنے دستِ مبارک سے ایک پیالی بناکر مظہر صاحب کو عنایت فرمائی اور پھر دوسری پیالی اس خادم کے لئے بنا رہے تھے، چونکہ کافی میرے مزاج میں فوراً خشکی کا اثر پیدا کرتی ہے اس لئے جیسے ہی نصف پیالی بھر چکی میری زبان سے اضطراراً یہ جملہ نکلا کہ "حضرت کافی ہے"!

ـــــــ اس پر حضرت والاؒ نے کمالِ ظرافت سے فرمایا، "میں کب کہہ رہا ہوں کہ

چاٹنے ہے!" اور پیالی بھردی!

ایک خدامست بزرگ سے ملاقات

حیدرآباد دکن میں ایک چشتی بزرگ حضرت مولانا محمد حسین صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) بھی تھے جن کے فیض یافتوں میں مشہور و معروف ہستیاں مولانا گیلانی رح محمد الیاس برنی مرحوم اور ڈاکٹر میر ولی الدین (صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ) کی ہیں۔ حضرت موصوف مسئلہ وحدۃ الوجود کے بہترین شارح اور صحیح ترین ترجمان تھے، جب وہ اس مسئلہ کو بیان فرماتے تو خود ان کا حال اس کی تائید و تصدیق پیش کرتا تھا، دراصل ان کا قال مجبوریِ حال کا نتیجہ تھا ——————

ع بنو د بر سر آتش میسرم کہ نجوشم (منصور حلاج)

دوسری خاص بات رحمتِ حق پر ان کا ایقانِ کامل تھا جس کے اثر سے ان کے صحبت یافتہ رجا سے معمور ہو جاتے تھے، مظہر صاحب مرحوم ان سے مل کر بہت متاثر ہو چکے تھے، ایک شام حضرت والا رح سے فرمانے لگے کہ "جی چاہے تو کچھ دیر کے لئے حضرت محمد حسین صاحب کے پاس چلیں"۔ حضرت رح نے آمادگی ظاہر کی اور اس خادم کو بھی ساتھ چلنے کا اذن ہوا، ہم تینوں غلام محمود قریشی مرحوم (سابق وزیر مالگزاری حکومت حیدرآباد) کی قیام گاہ پر پہنچے، جہاں کچھ عرصہ سے مولانا مقیم تھے، یہ زمانہ ان کی علالت کا تھا اور صاحبِ فراش تھے، حضرت مرشدیؒ کو آتا دیکھ کر مولانا اٹھ بیٹھے، سلام و مصافحہ کے ساتھ ہی توحیدِ باری اور ربطِ خالق و مخلوق پر اپنے انداز کی تقریر شروع فرمادی جو تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہی —————— میں حیران کہ نہ تو حضرتؒ کی خیریت دریافت کی نہ یہ پوچھا کہ کب آنا ہوا، بس اپنا ساز چھیڑ دیا —————— مگر جب تقریر ختم فرمائی تو کمال تواضع سے فرمایا:۔

"میں نے آپ کے سامنے یہ تقریر اس لئے دہرادی کہ اس میں کوئی سقم ہو تو وہ معلوم ہو جائے"۔

حضرت والا رح نے پاسِ ادب سے فرمایا کہ

"تقریر کامل و مکمّل تھی"۔

اس تصدیق سے مولانا محمد حسین صاحب کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا اور زبان سے "الحمد للہ" کی صدا بھی نکلی ——— اس ضروری گفتگو کے بعد اب میزبان نے مہمان کی خیریت وغیرہ پوچھی، جس پر اس ظلوم وجہول کو یاد آ گیا کہ صحابہ کرامؓ کا یہی طریقہ تھا کہ پہلے دین وایمان کی بات کر لیتے اور پھر ظاہری خیر خیریت معلوم فرما لیتے تھے۔

اس کے بعد ذکر حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا آ گیا، حضرت محمد حسین صاحب نے بڑی قوت سے فرمایا کہ "وہ اس صدی کے مجدد تھے" یہ صحبت بابرکت نماز مغرب کا وقت قریب ہونے کی وجہ سے برخاست ہو گئی اور صحبتِ آخر ثابت ہوئی کیونکہ اس کے پندرہ بیس روز بعد پھر یہ توحید کا متوالا بارگاہِ احدیت میں جا پہنچا، رحمۃ اللہ تعالیٰ شیخ اکبر قدس سرہٗ کے مسلک کا ایسا ترجمان جس کا قال وحال ایک ہو پھر دیکھنے میں نہیں آیا۔

مذکورہ واقعہ میں مولانا محمد حسین صاحب حیدر آبادیؒ کی کمال بے نفسی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آج جس ہستی سے وہ اپنی تقریر کی تصدیق پر شکر ادا کر رہے تھے وہ پہلے طالب کی حیثیت میں خود انہی کے سامنے آ چکی تھی!! ——— یہ بے نفسی اربابِ احسان (تصوف) ہی کا حصہ ہے!

ایک اصرار بے جا ان دنوں حیدر آباد میں جماعت اسلامی کی شاخ قائم ہو چکی تھی اور اس کے صدر (قیم) اپنے ہی ایک ملاقاتی تھے، محکمۂ تعمیرات کے سب اور سیر، جواں عمر، جذباتی، معمولی تعلیم یافتہ البتہ جماعتی لٹریچر کے فارغ التحصیل! ایک شام بعض احباب کے ساتھ حضرت والاؒ کی خدمت میں حاضر تھا کہ انہوں نے اپنے نام کا کارڈ بھجوایا، حضرتؒ نے احقر سے پوچھا کہ "آپ ان صاحب کو جانتے ہیں"۔ میں نے اقرار کیا تو فرمایا کہ اس سے پہلے بھی یہ تشریف لائے تھے اور کافی دیر تک اصرار کرتے رہے کہ میں جماعت اسلامی میں شریک ہو جاؤں، آج پھر آئے ہیں، میں ابھی ان سے نمٹ آتا ہوں،

یہ فرما کر حضرتؒ اُٹھے، داعیٔ جماعت سے تنہائی میں چند منٹ گفتگو فرمائی جس کے بعد وہ چلے گئے، حضرت والارحؒ نے واپس آکر ہم لوگوں سے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ پہلی ملاقات میں میں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر بات ان کی سمجھ ہی میں نہ آتی تھی، آج صاف انکار کر دیا، اب وہ نہ آئیں گے ــــــ چنانچہ یہی ہوا کہ پھر وہ ایسے خفا ہو گئے کہ دوبارہ نہ آئے، اس سے پہلے وہ اسی "دعوتِ حق" کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے دیدہ ور قائد بہادر یار جنگ مرحوم سے بھی ناراض ہو چکے تھے!

یہاں دیکھنے کی چیز ایک طرف صوفیانہ مذاق کی پاکیزگی اور شائستگی ہے جو پہلے واقعہ میں پیش کی جا چکی اور دوسری طرف جماعتی مزاج کی شدت اور اس کا بگاڑ ہے جو اس واقعہ سے ظاہر ہے، یوں گنانے اگر بیٹھئے تو سیکڑوں واقعات کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے چنانچہ یہ سُن کر ذرا بھی حیرت نہ ہونی چاہیئے کہ حضرت والارحؒ جب کراچی تشریف لائے تو "دعوتِ صالحیت" کی یہ تبلیغ جماعتِ اسلامی کے شاعرِ ماہر کے حصہ میں آئی اور وہ وقتاً فوقتاً یہ فریضہ پورے جوش و خروش سے اُچھل کر مچل کر بے قابو ہو ہو کر انجام دیتے رہے اور چاہیئے تو یہ تھا کہ بار بار کی ناکامی کے بعد وہ بھی حضرت سے قطع تعلق کر لیتے مگر یہاں شاعر کا طبعی لوچ اور مزاج کی فطری لچک جماعت کے عارضی تقشف سے ٹوٹ نہ سکی اور بلاشبہ حضرت والارحؒ کا حلم ذرحم بھی فصل میں وصل پیدا کرتا رہا۔

واپسی اب ٹھیک یاد تو نہیں نہ اس وقت یادداشت کا اہتمام تھا البتہ خیال یہ ہے کہ مہینہ بھر کے قیام کے بعد حضرت والارحؒ اعظم گڈھ تشریف لے گئے اور یہ سفر حیدرآباد کا آخری سفر ثابت ہوا۔

مکتوب (۶)

غ۔ حیدرآباد دکن

۱۰ر مارچ ۱۹۴۵ء

حضرت مولانا و مخدومنا دامت برکاتہم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

اُمید ہے کہ اب حضرت والا بہ صحت و عافیت ہوں گے، حضرت کے دورانِ قیام حیدرآباد میں احقر سے جو گستاخیاں ہوئی ہوں ازراہ شفقت معاف فرمائیں، اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا کہ حضرت والا کی صحبت کیمیا اثر سے بقدر حوصلہ استفادہ کی سعادت حاصل ہوگئی، حق تو یہ ہے کہ حضور کی محفل میں آنکھیں کھلتی جاتی تھیں اور سر جھکتا جاتا تھا ـــــــــــــــ

دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ عمل صالح کی توفیق احقر کو عطا فرمائیں!

س۔ اعظم گڈھ

اخی فی اللہ ادام اللہ رشدکم ۔ السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

الحمد للہ کہ میں آٹھ روز بھوپال، چار روز لکھنؤ اور دو روز جونپور ٹھہر کر ۱۵ر مارچ کو اعظم گڈھ پہنچ گیا، اللہ تعالیٰ آپ کو مزید توفیق عطا فرمائیں، یہ جو کچھ ہے آپ کی محبت کا ثمرہ ہے اللہ تعالیٰ طرفین کو اس سے بہرہ ور فرمائیں، دلی دعا ہے کہ عمل صالح اور علمِ نافع کی توفیق بخشیں!

غ۔ عرض یہ ہے کہ کون سے درود شریف کا ورد افضل ہے؟

س۔ درودِ ماثورہ کا ثواب زیادہ ہے جو نماز میں پڑھتے ہیں، مگر بطور معالجہ کے حضراتِ اکابر نے مختلف کلمات درود کے بنائے ہیں، عام طور سے ہمارے حضرت (مولانا تھانوی قدس سرہٗ) یہ درود پڑھتے تھے:۔

اللّٰھمّ صلّ وسلّم علیٰ سیّدنا ومولانا محمّد وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ وبارك وسلّم

غ۔ چند روز پہلے ایک تقریر میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے "اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ" کی توضیح میں فرمایا کہ "صالحون" سے مراد وہ اصحاب ہیں جن کو اصطلاحِ صوفیا میں "اہلِ خدمت" کہا جاتا ہے کیا یہ درست ہے؟ ——— کیا صوفیاء کے ہاں جو مراتب و مناصب کی تقسیم ہے (مثلاً قطب، ابدال، اوتاد وغیرہ) اس کا ثبوت قرآن و حدیث سے ملتا ہے؟

س۔ ان مراتب کا ذکر بعض ضعیف احادیث میں ہے، مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے اوس سے کتب تفسیر خالی ہیں۔

غ۔ بعض اہلِ علم (ایک صاحب تھے دیوبند کے فارغ التحصیل اور الہ آباد کے کسی نقشبندی بزرگ کے فیض یافتہ) سے یہاں یہ بھی پتہ چلا کہ ان "صاحبِ خدمت افراد" کو اختیار بھی ہوتا ہے کہ کسی کو پریشانیوں میں مبتلا کر دیں یا کسی کی تکلیف رفع کر دیں، اسی عقیدہ کے تحت بعض لوگ ان اصحاب کی تلاش میں لگے رہتے ہیں تا کہ ان سے اپنی تکالیف کا ازالہ کرائیں ——— یہ بات احقر کی سمجھ میں نہ آئی (کہ حق تعالیٰ کے سوا بھی کسی کو نفع و ضرر کا اختیار ہو سکتا ہے) حضرت والا سے درخواست ہے کہ اس باب میں رہبری فرمائیں۔

س۔ مجھے اُن اہلِ علم کے ان خیالات سے اتفاق نہیں اور نہ نصوص سے ان کی تائید ہوتی ہے البتہ حضرت خضرؑ کے واقعہ سے جو قرآن پاک میں ہے یہ ظاہر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ امور تکوینی میں بھی بعض اشخاص کو اپنے لئے بمنزلہ آلہ کے استعمال فرماتا ہے، مگر یہ کہ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے اس کا علم مجھے نہیں ——— اور اگر ہوں بھی تو وہ مختار نہیں بلکہ محکوم الٰہی ہوتے ہیں اپنی مرضی اور اختیار سے کچھ نہیں کر سکتے۔

غ۔ خرابیٔ صحت کی وجہ سے احقر نمازِ تہجد بعد نمازِ عشاء ہی ادا کر رہا ہے اس طرح کہ فرض و سُنّت و نفل کے بعد آٹھ رکعت نمازِ تہجد پڑھ کر واجب الوتر ادا کرتا ہوں، اس میں

کوئی قباحت ہو تو اصلاح کی درخواست ہے نیز حضرت والا دعا بھی فرمائیں۔ ممنون ہوں گا اگر کوئی دُعا اس ضمن میں (یعنی حصول صحت کے لیے) تحریر فرمائیں۔

س۔ سر دست یہ عمل مناسب ہے، مناجاتِ مقبول سے کوئی مناسب دعا یاد کر لی جائے۔

غ۔ "حیواۃ المسلمین" (مصنفہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ؒ) باب "امتیاز قومی" (روح بست و پنجم) کے ضمن میں حضرت تھانوی رح نے ایک حدیث شریف نقل فرمائی ہے جو درج ذیل ہے:

"حضرت حذیفہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن کو عرب کے لہجہ اور آواز میں پڑھو اور اپنے کو اہلِ عشق کے لہجہ سے اور دونوں اہلِ کتاب (یعنی یہود و نصاریٰ) کے لہجہ سے بچاؤ۔"

اس میں "اہلِ عشق کے لہجہ" سے کیا مراد ہے، حضرت تھانوی رح نے وضاحت نہیں فرمائی ہے!

س۔ اہلِ عشق کے لہجہ سے مراد گانے کے قاعدہ سے پڑھنے کے ہوں گے۔

(بعد کو فن تجوید و قرأت کے سلسلہ میں معلوم ہوا کہ قاریوں کے ہاں ایک لحن "عُشّاق" بھی ہے جس میں لب و لہجہ بالکل عاشقانہ سوز و گداز کا اختیار کیا جاتا ہے اور بالعموم سورۂ یوسف عُشاق لحن" میں پڑھی جاتی ہے، شاید یہ ممنوع ہو)۔

غ حضرت والا احقر کی دینی و دنیوی فلاح کے لئے دعا فرمائیں۔

س۔ دلی دعا ہے۔ والسّلام ہیچمداں سُلیمان۔

مکتوب (۷)

غ۔ حیدر آباد دکن

حضرت مولانا و مخدومنا دام اسطا نہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

عرض حال یہ ہے کہ ہر مہینہ یا بیس روز کے بعد ہفتہ عشرہ کا ایک ایسا دور آتا ہے جس میں کسی قسم کی عبادت میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی، گو دلچسپی یا لذت مقصود نہیں لیکن اس کے بغیر وہ اشتیاق باقی نہیں رہتا جو ایک بندہ کو اپنے رب کی بندگی میں ہونا چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نماز میں بھی انتشار خاطر رہتا ہے، یہاں تک کہ بعض دفعہ یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ پہلی رکعت میں کون سی سورۃ پڑھی گئی تھی، جب اس طرح کی نماز ہوتی ہے تو حدیث شریف کی روشنی میں صدفی صد گمان یہی ہوتا ہے کہ فرشتوں نے اس بے حضور نماز کو منھ ہی پر دے مارا ہو گا، اس خرابی کا تدارک کیوں کر کیا جائے؟

س۔ اعظم گڈھ

۳۰ ربیع الثانی ۱۳۶۴ھ

اخی فی اللہ، ارشدکم اللہ تعالیٰ۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ایسا بے شک ہوتا رہتا ہے، اگر ایسا پیش نہ آیا کرے تو خضوع وخشوع کی حقیقت کیوں کر ظاہر ہو اور اس کی قدر کیوں کر ہو وبضدّھا تتبین الاشیاء صحت کی قدر علیل کو علالت ہی سے ہو سکتی ہے شکم سیری کی قدر بھوک ہی سے ہو سکتی ہے حالت کی یکسانی میں شئے کی قدر چلی جاتی ہے اس لئے یہ تغیّرِ احوال بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اس پر بھی شکر کیجئے اور سمجھئے کہ یہ امور غیر اختیاریہ میں سے ہے، مولیٰ جل شانہٗ کی عطا ہے جب وہ دے قبول کیجئے اور نہ دے تو گلہ نہ کیجئے، اس پر جو غم ہوتا ہے وہ بھی ثواب کا موجب ہے کہ ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود | گر ز باغِ دل خلالے کم بود

اس احساسِ کمی اور غم پر مبارک باد قبول کیجئے۔

(یہ کمال ہے شیخِ محقق کا کہ سالک کو کبھی مایوس ہونے نہ دے اور اس کے راہ کے ہر کانٹے کو گل وگلزار بنا تا چلا جائے۔ بقول عارف رومیؒ:

زاں کہ اُو ہر خار را گلشن کند　　　دیدۂ ہر کور را روشن کند)

غ۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نماز ایسی پڑھی جائے گویا بندہ اللہ کو دیکھ رہا ہے یا کم از کم اتنا تو ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہے ہیں، شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ نماز میں آخر الذکر صورت پیدا ہوتی ہے اور یہ بھی اس وقت جب کہ خضوع و خشوع حاصل رہتا ہے، لہٰذا اس کیفیت کے دوام کی صورت سے مطلع فرمایا جائے تاکہ نماز میں کم از کم یہی تصور مستحضر رہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں!

س۔ حدیث مذکورہ کا جو ترجمہ آپ نے لکھا ہے وہ عام طور سے زیادہ مشہور ہے مگر غلط[1] ہے صحیح یوں ہے" اللہ کی عبادت ایسی کرو کہ گویا تم اوسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اوس کو نہیں دیکھتے تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے"۔

اب خواہ ہم بادشاہ کو دیکھ رہے ہیں یا وہ ہم کو دیکھ رہا ہے، دونوں کا حاصل ایک ہے کہ ہم اپنی نماز کو پورے خضوع، آداب اور انہماک کے ساتھ ادا کریں۔

نماز کے الفاظ یا معنی پر نظر رہنے سے حضور ہو جاتا ہے اور یوں سمجھئے کہ لفظ اللہ آپ کے قلب پر لکھا ہوا ہے اودھر خیال جمائے رکھئے۔

غ۔ اگر حضرت والا مناسب تصوّر فرمائیں تو کسی ذکر کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

(یہ شیخ قدس سرہٗ کا کمال تھا کہ اُن کے اثر فیض سے پہلے خود اپنے قلب میں حصول نیکی کا داعیہ پیدا ہو جاتا تھا اور پھر حضرت شیخ اس کے مناسب تلقین فرماتے تھے، یاد نہیں کہ کبھی حضرت والا نے کوئی نصیحت و موعظت فرمائی ہو جس کے لئے اپنے قلب میں پہلے ہی سے آمادگی ہی نہیں بلکہ اضطراب و تشنگی پیدا نہ تھی)

س۔ اگر فرصت ہو تو کسی خاص وقت میں بہ پابندی کم از کم تین ہزار بار اللہ اللہ

---

[1] س نے کہ الفاظِ حدیث اس کے مؤید نہیں" کَاَنَّ" کا لفظ ارشادِ نبوی کے جزء اوّل و آخر میں مشبہ و مشبہ بہ کا علاقہ پیدا کئے ہوئے ہے۔ حاصل دونوں کا ایک ہے!!

کا ذکر کریں اور یہ سمجھیں کہ لفظ اللہ بخط نورانی آپ کے قلب پر لکھا ہے۔

غ۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ قرآن مجید میں لو انزلنا ھذا القرآن علیٰ جبل الخ والی آیت شریفہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کو برداشت کرنے کی قوت انسان میں بہ نسبت دوسری مخلوقات کے کہیں زیادہ ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی آیت " قال لن ترانی ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی" سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہاڑ کی قوت برداشت زیادہ ہے انسان کی قوت سے۔ حالانکہ اوّل الذکر آیت میں تجلئ صفتی (یعنی نزول کلام الٰہی) کا ذکر ہے اور یہاں تو تجلّی ذات کا! جو مخلوق تجلئ صفت کو نہ برداشت کر سکتی تھی اس کے متعلق یہ ارشاد کیا مفہوم رکھتا ہے کہ اگر یہ تجلئ ذات کو برداشت کر سکے تو موسیٰؑ بھی دیکھ سکیں گے؟

س۔ ان آیتوں کا صحیح مطلب آپ کے ذہن میں نہیں ہے، پہلی آیت لو انزلنا، باعتبار تعقل کے ہے کہ اگر پہاڑ پر بھی یہ قرآن اترتا تو باوجود لا یعقل اور ناقابل تاثر ہونے کے ٹکڑے ہو جاتا، پھر تعجب ہے کہ انسان کا دل اس سے متاثر کیوں نہیں ہوتا ______ دوسری آیت باعتبار تحمّل کے ہے، اللہ تعالیٰ کی رویت تجلّی ہی کی شکل میں جنّت کے باہر ہو سکتی ہے، یہ تجلّی جس شئے میں ہو کر ظاہر ہوگی اوس شئے کا اوس تجلّی کا تحمّل کر کے اپنی جگہ پر رہنا دشوار ہے اور جب یہ تجلّی اس طرح نہیں ہو سکتی تو انسان اوس کو دنیا میں دیکھ بھی نہیں سکتا۔

(سبحان اللہ بات کس قدر صاف ہوگئی اور حقیقت نکھر آئی۔ حضرت والاؒ کو تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں وہ بصیرت عطا فرمائی تھی کہ اس دور میں اس کی مثال شاذ ہی ملے گی)

غ۔ مولانا عبد الجبار صاحب کے ذریعہ کل پتہ چلا کہ حضرت والاؒ نے بھوپال کے ... کی خدمت صدارت قبول فرمائی ہے۔ اس صورت میں غالباً حضرت والاؒ بھوپال ہی میں قیام فرما

ہوں گے ———— پتہ کی تبدیلی سے مطلع فرمایا جائے تو باعثِ سہولت ہوگا۔

س۔ یہ خبر پوری طرح صحیح نہیں ہے، میرا پتہ یہی رہے گا۔

غ۔ احوال نامہ کافی طویل ہوگیا، جس کے لئے ادباً معافی کا خواستگار ہوں، نیز کوئی بات بارِ خاطر ہو تو حضور معاف فرما کر متنبہ فرمادیں، احقر کے لئے استقامت فی الدین اور فلاح دارین کی دعا فرمائیں۔ فقط

خادم، ہدایت کا طلبگار، غلام محمد عفی عنہ

س۔ دلی دعا ہے۔

ہیچمداں سلیمان

مکتوب (۸)

حیدر آباد دکن

۲۹ اپریل ۱۹۴۵ء

حضرت مولانا و مخدومنا مدت فیوضہم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ایک کمپنی کی ملازمت (جس کا حضرت والا سے بالمشافہ ذکر کرچکا تھا) کے حصول میں ناکامی کی تفصیلات لکھی تھیں اور یہ بھی عرض کیا تھا کہ زیادہ تنخواہ پر نظر اس لئے ہے کہ اپنے والدین وغیرہ کی زیادہ خدمت کرسکوں!

س۔ اعظم گڑھ

۸ مئی ۱۹۴۵ء

اخی العزیز اسعدک اللہ فی الدین، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ،

رزق تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے موعود ہے، اس لئے اس کے حصول میں تو شک نہیں، البتہ اوس کا وقت شاید ابھی نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی صفتِ رزّاقی کا دوسروں کے

لئے ذریعہ بنائیں۔

(یہ نکتہ خوب سمجھنے اور یاد رکھنے کا ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی بندہ کو رزقِ فراواں عطا کرتے ہیں تو اس کا منشاء محض یہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنی صفت رزّاقی کا ذریعہ بنائیں یعنی دوسروں کو ملے مگر اس بندہ کے ہاتھ سے! بس یہی شرف مقصود ہوتا ہے نہ یہ کہ وہ بندہ خود اس مال و دولت پر خزانہ کا سانپ بن کر بیٹھ رہے! سرمایہ داری و اشتراکیت کی آویزش اسی فرق کو بھولنے سے پیدا ہو جاتی ہے')

ع۔ معاشی مایوسیوں سے بعض دفعہ شیطان وساوس میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن حضور کی دعا و توجہ کی برکت سے نہ صرف یہ خیالات باطل جلد رفع ہو جاتے ہیں بلکہ ان پر بعد میں ہنسی آتی ہے اور اپنے نفس کو یہ کہہ کر دھتکار دیتا ہوں کہ ؎

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

حضور چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ استقامت دیں اور اس قسم کی پریشانیاں کچھ اثر نہ کر سکیں بلکہ اللہ تعالیٰ ان آزمائشوں سے کمزور بندوں کو محفوظ ہی رکھے!

س۔ الحمدللہ کہ آپ شیطان کے ان وسوسوں سے محفوظ رہتے ہیں، آئندہ بھی اللہ تعالیٰ محفوظ رکھیں، دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو رزق بھی دیں اور کشائش بھی فرمائیں حصولِ رزق کے لئے بہتر ہے کہ آپ یَا وَهَّابُ روزانہ وقت مقررہ پر پانچ سو بار پڑھتے رہئے اور شروع و اخیر میں کوئی درود۔

ع۔ کچھ علالت کے سبب سے ذکر کا آغاز نہ کر سکا، دو تین روز میں شروع کر دوں گا اور انشاء اللہ حسب الحکم بہ پابندیٔ وقت جاری رکھوں گا۔

س۔ اللہ تعالیٰ پابندی سے ذکر کی توفیق بخشیں۔ ولذکر اللہِ اکبر۔

ل ان اوراد کی عارفانہ تحقیق کے لئے ملاحظہ ہو مکتوب ۸۲۔

ع ۔ مکتوبات حضرت مجدّد الف ثانیؒ زیر مطالعہ ہیں، جتنے خطوط نظر سے گذرے ان سے یہ اثر ہوا کہ واقعی سلسلۂ نقشبندیہ میں کس قدر اتباع شریعت ہے اور ان کا تصوف عجمی افکار کی آمیزش سے کس قدر منزّہ ہے لیکن ساتھ ہی آج کل کے حالات پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اس سلسلہ میں بھی بدعات نے رسوخ حاصل کر لیا ہے اور اگر اس کی صحیح آب و تاب کہیں نظر آتی ہے تو وہ حضرت حکیم الامتؒ ہی کے سلسلہ میں ہے یہ چیز احقر کے لئے بڑی ہی طمانیت کا باعث بنی کیونکہ احقر کا طبعی رجحان کچھ سلسلۂ نقشبندیہ (مجددیہ) ہی کی طرف تھا ممکن ہے کہ والدین کے اثرات کی وجہ سے ہو!

س ۔ صحیح ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مجددیوں میں بھی مختلف بدعات نے راہ پالی، حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قبر بھی پختہ کر دی گئی اور چادر و غلاف کا بھی اضافہ ہوا۔ ______

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نقشبندی و چشتی کا سنگم ہے، ذوق و شوق چشتی ہے اور اتباع کا ذوق نقشبندی ہے، حضرت حاجی صاحب (حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ رحمۃ اللہ علیہ) دونوں سلسلوں کے مخزن تھے (حضرت مولانا نصیر الدین مجددی دہلویؒ سے سلسلہ نقشبندیہ میں اور حضرت میاجی نور محمد صاحبؒ[1] سے سلسلۂ چشتیہ میں خلافت سے ممتاز تھے،) اور اسی لئے ہمارے ہاں چاروں سلسلوں میں ایک ساتھ بیعت ہوتی ہے!

ع ۔ احقر کے پاس مکتوبات مذکور کا جو نسخہ موجود ہے اس میں حضرت مجدد صاحب رح کی سوانح بھی دی گئی ہے مترجم و سوانح نگار کوئی عالم الدین صاحب نقشبندی ہیں اور کتاب نول کشور پریس سے چھپی ہے، سوانح نگار نے "حضرتؒ کے مخصوص کمالات" کے زیر عنوان یہ بھی لکھا ہے کہ "چونکہ آپ کے فیض سے اہل قبور بھی مستفید ہو کر ولی ہو گئے، ایک شخص نے

---

[1] جو حضرت مولانا شاہ محمد آفاق قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "امداد المشتاق" مؤلفہ حضرت تھانویؒ۔

دمِ اخیر یہ وصیت کی کہ میرا جنازہ آپ کی خدمت میں لے جاکر پیش کرنا، جب جنازہ لایا گیا تو آپ نے توجّہ دی، مُردہ کا دل جاری ہوگیا، اسی شب اس کے اقربا نے اس کی کیفیت کو خواب میں دیکھا" ________ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مرنے کے بعد بھی اسطرح مدارج میں ترقی ہوسکتی ہے؟ کیا اس قسم کی باتیں حضرت مجدّد صاحب سے متعلق دُرست ہیں؟

س۔ اس قسم کی حکایات غیر مستند ہیں، موت کے بعد عمل نہیں!!

غ۔ کیا حلقہ ذکر درست ہے؟ کیا حضرت حکیم الامت رح کے ہاں بھی یہ طریقہ رائج تھا، متقدمین صوفیاء کے ہاں تو یہ چیز ہر سلسلہ میں ملتی ہے!

س۔ ذکر بالجماعہ کا دستور ہمارے ہاں نہیں، اس میں ریا اور دوسری خرابیاں ہوتی ہیں[1]۔

غ۔ آخر میں پھر وہی درخواست ہے کہ حضور استقامت فی الدین کے لئے دعا فرمائیں، نیز دنیوی فلاح وکشائشِ رزق کے لئے بھی ________ احقر کو یقین ہے کہ اگر دنیوی واُخروی سعادتیں کچھ حاصل ہوں گی تو وہ حضور کی دُعاؤں ہی کی برکت سے ہوں گی۔ فقط

دُعا کا امیدوار، غلام محمد عفی عنہٗ

س۔ دل سے دُعا ہے۔

ہیچمدان سُلیمان

مکتوب (۹)

غ۔ حیدرآباد دکن

۹ جمادی الثانی ۱۳۶۴ھ

---

[1] یعنی ان خرابیوں کے پیشِ نظر حضرت حکیم الامت رح نے ذکر بالجماعۃ کو ترک فرمادیا۔ کوئی شیخ محقق اس طریقہ کی نافعیت کو محسوس کرکے اس کو اب بھی احتیاط سے اختیار کرتا ہے تو نکیر نہ کرنی چاہیئے کیونکہ مسئلہ منصوص نہیں بلکہ مجتہد فیہ ہے!

حضرت مولانا و مخدومنا مد فیوضہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تین روز ہوئے کہ ذکر "اللہ، اللہ" اور "یا وہاب" بعد نماز فجر حسب ارشاد تین ہزار اور پانچ سو مرتبہ علی الترتیب شروع کر چکا ہوں، استقامت کے لئے حضرت والا دعا فرمائیں۔

س۔ میرٹھ۔ کوٹھی سید حسین صاحب

۱۹ ج ۲ ۱۳۶۴ھ

اخی العزیز زادکم اللہ تعالیٰ علماً و عملاً۔

دِل سے استقامت کی دُعا ہے!

غ دورانِ ذکر لفظ "اللہ" کا قلب پر تصوّر قائم نہیں رہتا، کچھ دیر کے لئے تصوّر قائم ہوتا ہے، اور پھر ناپید ہو جاتا ہے اس کے قیام کی صورت سے ایما فرمائیں۔

س۔ جتنی دیر ہوتا ہے وہ غنیمت ہے۔ اس پر مزید کاوش کی ضرورت نہیں، یہ مقصود بالذات نہیں اور کاوش سے اور پریشانی بڑھے گی۔

غ۔ (محکمۂ امداد باہمی میں ملازمت ملنے کی توقع تھی مگر اس کے جواز و عدم جواز میں شبہ تھا۔ اس کی تفصیل عرض کی گئی تھی)

س۔ بالفعل رزق کے باب میں طمانیت کرلیں، فتویٰ پھر پوچھیں۔ اضطراراً جو صورت ہو رہی ہے اس کو قبول کریں اور بہتر صورت کی اُمید رکھیں اور صورت موجودہ کو بادل نخواستہ قبول کریں اور کام کریں اور استغفار کریں۔

(ارشادِ سلیمانی کا ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے اور غور کرنے کا طالب ہے حضرات صوفیاء چونکہ باریک بیں اور دُور بیں ہوتے ہیں اس لئے ظاہر پرستوں کی نظر میں ان کے بعض ارشادات قابلِ نکیر بن جاتے ہیں لیکن وہ عواقب پر نظر کر کے اس نکیر کی کچھ پروا نہیں کرتے مثلاً اکثر سالک کے ضعف قوت کا اندازہ لگا کر اس کو کبھی مشتبہ امور کی بھی اجازت "بے دلی" "کثرت استغفار" اور "صحیح صورت کی تلاش" کی سہ گونہ

قیود کے ساتھ محض اس وجہ سے دیتے ہیں کہ حرام صریح یا خرابیٔ ایمان سے اسکی حفاظت ہوجائے، کیا حدیث شریف میں وارد نہیں کہ کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا؟ یعنی مجھے ڈر ہے کہ فقر وفاقہ حالتِ کفر تک نہ پہنچا دے!)

ع۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت والا سے ابتدائی مراسلت کے زمانہ میں جو ذوق و شوق کی کیفیت تھی وہ اب کم ہوچکی ہے، اسی وجہ سے موجودہ حالت اس حالت سے خراب ہی معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

س۔ تعبیر کی غلطی ہے، بات یہ ہے کہ آپ موجودہ سے زیادہ کے متوقع ہیں اور موجود آپ کو متوقع سے کم محسوس ہوتا ہے اس لئے افسوس معلوم ہوتا ہوگا ــــــــ اس کو آپ خرابی نہ کہیں۔ آپ اپنے کام میں لگے رہیں اور وسواس میں نہ پڑیں۔ تعلق باللہ اگر بڑھ رہا ہے تو واسطہ کا تعلق نہ بھی رہے تو کیا حرج ہے؟

ع۔ گرمی کی شدت کے سبب اکثر نماز تہجد قضا ہو رہی ہے جس کا بڑا قلق ہے، دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل احقر کے شامل حال ہو۔

س۔ کچھ حرج نہیں، جب ناغہ ہو دن کے اشراق کے بعد ۱۲ رکعتیں پڑھ لی جائیں۔

ع۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ زماں و مکان کے قیود بس اسی عالم کی حد تک ہیں، آخرت کی دنیا ان سے پاک ہے، اگر یہ صحیح ہے تو اس کا کیا جواب ہے کہ جنت بھی تو "مکان" ہے اور جب یہ مُسلّم ہے کہ وہاں بھی مومنین کے درجات بڑھتے رہیں گے تو پھر "زمان" کا تخیل بھی آ ہی جاتا ہے کیونکہ جس مرتبہ سے ترقی ہوئی وہ ماضی ہوا اور جس مرتبہ پر ترقی ہوئی وہ مستقبل۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمان و مکان کے قیود وہاں بھی رہیں گے، البتہ ان کی انتہا نہ ہوگی۔

س۔ مقصود یہ ہے کہ اس عالم کے زمان و مکان اور یہاں کے زمان و مکان کے قواعد اور قیود وہاں نہیں، وہ دوسرا عالم ہے وہاں کے زمان و مکان کی کیفیتیں اور ہیں یہاں

آفتاب کی روشنی ہے وہاں تجلّی الٰہی کا نور ہوگا اور اس سے روز و شب بنے گا یہی حال مکان کا ہے، اوس کی وسعت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

غ۔ حضرت والا احقر کی فلاحِ دارین کے لئے دعا فرمائیں۔

طالبِ دعا۔ غلام محمد عفی عنہٗ

س۔ دل سے دُعا ہے۔

ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۱۰)

غ۔ حیدرآباد دکن

۷ رجون ۴۵ ۱۹ء

حضرت مولانا و مخدومنا دام فیوضہٗ۔ السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

الحمد للہ کہ حضرت والا کے نصائح پر عمل جاری ہے، استقامت کے لئے دعا کی درخواست ہے۔

س۔ اعظم گڈھ

اخی فی اللہ تعالےٰ رزقکم السلامۃ

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ ــــــــ بارک اللہ فیکم

غ۔ اس حدیث شریف کا مطلب سمجھ میں نہ آیا کہ "اللہ تعالیٰ نے آدم ؑ کو اپنی صورۃ پر پیدا کیا"[1]۔ حضرت مجدد الف ثانی رح کے مکتوبات[2] میں اس کی یہ توجیہہ کی گئی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ

---

[1] اِنَّ اللّٰہ خلق آدم علیٰ صورتہ۔

[2] مکتوب ۲۸۷ دفتر اوّل

کی ذات بے چون و بے چگون ہے اسی طرح روح آدم کو بھی بے چون و بے چگون بنایا گیا، نیز یہ کہ جو تعلق ذات باری تعالیٰ کو کائنات سے ہے وہی تعلق روح کو انسان کے جسد سے ہے کہ نہ یہ متصل ہے نہ منفصل نہ اندر ہے نہ باہر!! اور اسی تشریح سے حضرت مجدد نے استدلال اس حدیث شریف پر بھی کیا ہے کہ "میں ارض و سما کی پہنائیوں میں نہیں سماتا لیکن قلبِ مومن میں" اس سے احقر کی تشفی نہ ہوئی کہ روح کس طرح بے چون و بے چگون ہو سکتی ہے ؟
حضرت والا ان دونوں احادیث کی تشریح فرما دیں تو احقر کی تشفی کا باعث ہو۔

س۔ اس کی بہترین توجیہہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنے اسماء حسنیٰ کا مظہر بنایا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ روح تو غیر مادی ہے، وہ شکل و صورت سے پاک ہے، قلب میں سمائی ہونے کے معنی اوس کی معرفت کا حصول ہے۔

(سبحان اللہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں باتیں کس قدر تشفی بخش آ گئیں ــــــ اس کو ایجاز کہیے یا اعجاز سلیمانی!)۔

غ۔ حضرت والا کے مضمون "حکیم الامتہ کے آثار علمیہ" کو پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اگر حضرت والا مناسب تصور فرمائیں تو حضرت تھانوی کے وہ اشعار تحریر فرما دیں جو حضرتِ والا کو خطاب کر کے ارشاد فرمائے تھے جن کا ذکر اس مضمون میں فرمایا گیا ہے، اگر اس درخواست میں بے ادبی و گستاخی ہو تو معاف فرمائیں۔ (یہ جملہ اس احتیاط کی بنا پر لکھ دیا تھا کہ شاید ان اشعار کی نوعیت بالکل شخصی ہو اور ان کا افشا خلافِ مصلحت!)

س۔ وہ اشعار "معارف" میں چھپ چکے ہیں۔ (جو پچھلے باب میں نقل ہو چکے ہیں)

غ۔ آج کل مرحوم قائد ملت (محمد بہادر خاں) کی سوانح لکھ رہا ہوں، حضرت والا کا تعزیتی مضمون جو معارف (اگست ۱۹۴۴ء) میں چھپا تھا، مطالعہ کر لیا، اس کے علاوہ کوئی اور خاص بات جو مرحوم کے کسی پہلو پر روشنی ڈالتی ہو اگر حضرت والا کے علم میں ہو تو تحریر فرمائیں

لے لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب عبدی مومن۔

بہت ممنون ہوں گا۔

س۔ اس مسئلہ کو اُن کے حقیقی جاننے والوں سے پوچھیئے، وہ بہتر رائے دیں گے۔

غ۔ اصلاح حال کے لئے حضرت والا دعا فرمائیں۔ فقط

دعا کا طالب، احقر غلام محمد

س۔ دلی دُعا ہے۔

ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۱۱)

غ۔ حیدر آباد دکن

۵ جولائی ۱۹۴۵ء

حضرت مرشدنا و مولانا دامت برکاتہم۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

الحمد للہ حضرت والا کی دعا سے ہدایات گرامی پر عمل جاری ہے۔ استقامت کے لئے دُعا کی درخواست پیش ہے!

س۔ اعظم گڈھ

اخی فی اللہ ادام اللہ توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

احباب کے اصرار سے میں تین ہفتوں کے لئے رانڈیر چلا گیا تھا، آج شب کو واپس آیا ہوں الحمد للہ خیریت ہی! (یعنی سفر سے لوٹتے ہی، بلا ستائے ایک طالبِ حقیر کے عریضہ کا جواب لکھنے بیٹھ گئے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا رحمۃ اللہ کی خاطر تعلق رکھنے والوں کی کتنی قدر فرماتے تھے!)

مُبارک، دلی دُعا ہے! (یہ احقر کی درخواستِ دعا کا جوابی ارشاد ہے)۔

غ۔ بعض ایسے بدعتی جو مسجد سے بہت قریب رہتے ہوئے بھی اپنے ہی گھر پر علیٰحدہ جماعت سے نماز پڑھتے ہیں، ان سے طبیعت گریز کرتی ہے، بعض دفعہ ان میں کا کوئی سلام کرتا ہے تو جواب تو دے دیتا ہوں مگر خیال یہ آتا ہے کہ اپنی طرف سے سلام میں پہل نہ کرنے کی وجہ سے کہیں اپنے نفس میں رعونت نہ پیدا ہوتی ہو، اس لئے دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس قسم کے لوگوں کے ساتھ بھی سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کی جائے؟

س۔ نفس کو دبا کر، یعنی اون کے فعل کو بُرا سمجھتے ہوئے سلام کرلیں۔

(اس جامع تجویز سے اپنے نفس کی حفاظت بھی ہو گئی اور دوسرے مسلمان کی، خواہ وہ گمراہ ہی ہو، خیر طلبی بھی! اور غور کیجئے تو سلامتی کی دُعا کا محتاج بھی زیادہ وہی ہے جو سلامتی کی راہ سے ہٹا ہوا ہے!)

غ۔ ذکر کے وقت اکثر حضور، حاصل نہیں ہوتا، اس سے بعض مرتبہ گمان ہوتا ہے کہ اسطرح زبان سے اللہ اللہ کہے جانے سے کیا حاصل ہے، لیکن جب کبھی صبح کسی وجہ سے ذکر ناغہ ہو جاتا ہے تو دن تمام ایک طرح کی بے چینی رہتی ہے اور اس وقت تک دور نہیں ہوتی جب تک ذکر کو پورا نہ کرلیا جائے ——— پھر بھی اس کا رنج ضرور ہے کہ ذکر میں جو استغراق پیدا ہونا چاہیئے بالکل حاصل نہیں ہے، حضرتِ والا دُعا فرمائیں!

(یہ شکوہ و شکایت سالکین کے ساتھ عام رہتی ہے اس لئے اس کا جواب باثواب جو عطا فرمایا گیا ہے وہ پورے غور کا طالب ہے،)

س۔ ابھی تک آپ کی سمجھ میں ذکر کی حقیقت نہیں آئی، اس سے مقصود محبّت الٰہی کی ترقی ہے ——— "استغراق" اور "حضور" دو (الگ الگ) چیزیں ہیں "استغراق" تو اس کا نام ہے کہ انسان کا شعور باطل ہو جائے بوجہ شدّتِ انہماک کے تو یہ مطلوب و ممدوح نہیں، البتہ "حضور" مطلوب و ممدوح ہے، وہ اس کا نام ہے کہ فی الجملہ ذکر میں مذکور یعنی اللہ تعالیٰ کا استحضار ہو یا قلب کی طرف توجّہ یا خود ذکر کی طرف دھیان ہو، ان میں

سے جو بات جس وقت اور جتنی بھی حاصل ہو جائے وہ شکر کے قابل ہے کیونکہ وہ عطائے الٰہی ہے، اختیاری نہیں !!

غ۔ حضور، یہ کیا بات ہے کہ دینی گفتگو گھنٹوں ہوتی رہے تو طبیعت اُکتاتی نہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے شغف بڑھتا جا رہا ہے لیکن جہاں عمل کا موقع آتا ہے تو سوائے معینہ نمازوں اور فرائض کے یہ نہیں ہوتا کہ مسلسل نفلیں پڑھنے میں متواتر تلاوتِ قرآن میں دل لگا رہے اور لطف بھی کم نہ ہونے پائے!

س۔ لُطف مطلوب نہیں، اگر دل نہ چاہے اور پھر عبادت کی جائے تو مجاہدہ کا مزید ثواب ہے لُطف اختیاری چیز نہیں اور غیر اختیاری چیزیں عطیۂ الٰہی ہیں، دعا کیجئے۔

گفتگو میں چونکہ نفس کا حصہ بھی شامل ہوتا ہے اس لئے اس میں حظِ نفس بھی شامل ہوتا ہے اور عملِ خالص عبادت ہے اس لئے وہ حظِ نفس سے خالی ہوتا ہے!

(حظِ نفسانی اور ارتقائے روحانی کے فرق سے بے خبری نے کتنوں کو گمراہ کر رکھا ہے، خصوصاً یہ اہلِ سماع حضرات تو تمام تر اسی گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں کہ حظِ نفسانی کو ترقی رُوحانی سمجھتے ہیں اور شرع و سنّت کے بالکل خلاف رقص و سرود کو حصولِ قربِ الٰہی کا ذریعہ جتلاتے ہیں، العیاذ باللہ ۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست   اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست)

غ۔ کبھی کبھی اس تصوّر کی بنا پر کہ سجدہ میں بندہ کا سر گویا اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے، طبیعت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اک دم گر پڑوں اور اس کیفیت میں ایک طرح کا لُطف بھی محسوس ہوتا ہے جو بیان میں نہیں آسکتا۔

س۔ یہ کیفیت محمود ہے مگر اس میں کوئی قرب نہیں، قرب اطاعت محض میں ہے !!

غ۔ جہاں تک احقر کو علم ہے حدیث شریف میں غیبت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کے پیٹھ پیچھے ایسی بات کہنا جو اگر اس کے سامنے کہی جائے تو اس کو ناگوار گذرے اور اگر کوئی

جھوٹی بات کسی کے غیاب میں کہہ دی گئی ہو تو وہ اتہام ہے! اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ جنگ کے سلسلہ میں یا ہندوستانی سیاست کے مسائل پر جو دن رات گفتگو ہوتی ہے اور مختلف اشخاص پر جو تنقیدیں ہوتی رہتی ہیں، کیا یہ سب غیبت میں داخل ہیں؟

س۔ ایسی سیاسی گفتگوئیں بیکار بلکہ مضر ہیں! ان سے پرہیز چاہیئے، ان میں سے اکثر باتیں عموماً ظنّی اور قیاسی کہی جاتی ہیں، غیبت اور اتہام کے تحت میں آجاتی ہیں اور ان سے قلب میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے!!

(چنانچہ لیگ اور کانگریس کی آویزش کے زمانے میں مسلمان ایک دوسرے کے رہنماؤں اور بزرگوں پر جس فراخ دلی سے اِتّہام تراشی کرتے رہے اور محض سیاسی اختلاف کی بناء پر اپنی عاقبت خراب کرتے رہے وہ کچھ کم عبرتناک سانحہ ہے؟)

غ۔ اگر کسی محفل میں یا کسی مشورہ کے موقع پر کوئی بات زبان سے ایسی نکل جائے جس کو سب پسند کرنے لگیں تو نفس میں ایک طرح کا غرور پیدا ہوتا ہے، اس کا ازالہ کیونکر کیا جائے؟

س۔ فوراً اپنے عیوب اور گناہوں پر نظر رکھ کر اپنی اصلاح کی جائے اور سمجھا جائے کہ جو خوبی بھی ہوئی وہ از طرف حق تعالیٰ ہے، اوس میں بندہ کو کیا دخل ہے۔ پھر غیر کے عطیہ میں نفس کے لئے غرور کا کیا موقع ہے، پھر زبان سے "استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ" بار بار کہئے تا آنکہ وہ حالت دُور ہو جائے۔

غ۔ حضرت والا دعا فرمائیں کہ احقر تمام خصائل رذیلہ سے پاک ہو جائے۔ فقط

احقر

غلام محمّد

س۔ دلی دعا ہے۔

ہیچمدان سُلیمان

مکتوب (۱۲)

غ۔ حیدر آباد دکن

شعبان ۱۳۶۴ھ

حضرت مخدومنا و مولانا مدظلکم العالی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

تقریباً ایک ماہ قبل ایک احوال نامہ خدمت اقدس میں گذرانا تھا، لیکن نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ جواب سے محروم رہا۔ (یہ وہی عریضہ ہے جو اوپر نقل ہو چکا، اس کا جواب دیر سے ملا اور تاخیر کی وجہ خود حضرت والا کے قلم سے آپ پڑھ چکے، بہرحال کیونکہ اپنا گمان عریضہ کے گم ہوجانے کا تھا اس لئے زیر نظر عریضہ میں دو ایک پچھلی معروضات کا بھی اعادہ ہو گیا ہے، مگر سبحان اللہ کہ جواب میں مزید و نادر افادات آگئے ہیں،)

س۔ اعظم گڈھ

۳۰ شعبان ۱۳۶۴ھ ۱۰ اگست ۱۹۴۵ء

اخی فی اللہ تعالیٰ رزقکم اللہ السعادۃ فی الدارین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'۔ شعبان کے آغاز سے ۲۰ تک بمبئی و سورت و رآندیر میں گذرا، اگر خط آیا ہوگا تو تاخیر سے جواب گیا ہوگا۔

غ۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ اللہ و رسولؐ کی باتیں کرنے اور سننے میں جو لطف آتا ہے وہ نماز اور دیگر اعمال میں باقی نہیں رہتا؟

س۔ جی ہاں، اس گفتگو میں تھوڑا سا حظِ نفس بھی شامل ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے دوسرا سنتا ہے اور نماز و عبادات میں یہ صورت نہیں ہوتی، مگر اہل دل جن کو نماز گویا عبد و معبود میں مکالمہ محسوس ہوتا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں" وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز ہے!

غ۔ ذکر میں اکثر خیالات منتشر رہتے ہیں جس کی وجہ سے گمان ہوتا ہے کہ ایسے ذکر سے کیا حاصل ہوگا۔ اس کے ازالہ کی کوئی صورت براہِ کرم تجویز فرمائی جائے ــــــــــــ لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی دن وقتِ مقررہ پر ذکر کا موقع نہ ملے تو طبیعت اس وقت تک مضطرب رہتی ہے جب تک اس کی تکمیل نہ کرلی جائے کیا اس اضطراب کی کچھ اصلیت ہے؟ (یعنی کیا عدمِ ذکر عدمِ سکون کا موجب بن جاتا ہے؟) کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی فعل، خواہ اچھا ہو یا بُرا، عادت بن جاتا ہے تو اس کے کبھی کبھار ناغہ ہوجانے سے بے چینی ضرور محسوس ہوتی ہے (یہ بات کتنے ذہنوں میں جن میں عقلیت کا غلبہ ہے کھٹک جاتی ہوگی!ــــــــــــ

انہی وساوس وخطرات سے بچا کر نکالنے کے لئے پیر کی رفاقت ضروری ہوتی ہے ورنہ اپنے آپ تو انسان گمراہ ہو کر بھی گمراہی سے بے خبر رہتا ہے ؎

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق — عمر بگذشت و نشد آگاہِ عشق

س۔ ذکر ہر حال میں کرنا چاہیئے، اگر لذت ملے تو نعمت ورنہ ادائے فرض کی نعمت تو بہرحال ہے ؎

بہرحال بندہ پہ ہے بندگی — کرم ہے جو ذوقِ عبادت ملے[1]

ذکر کا خاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق "اُذکرونی اذکرکم" تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ اس سے بڑھ کر نعمت کیا ہوسکتی ہے کہ ذاکر کو بوقت ذکر خود حق تعالیٰ یاد کرتے ہیں، ذرا اس کا تصوّر تو کیجئے اور جب "اللہ" کہئے تو تصوّر کے کان سے سنئے کہ "عبدی" کی آواز آتی ہے (خوب سمجھ لیجئے کہ تصوّر ایک منصوص حقیقت کو مستحضر کرنے کے لئے باندھا جارہا ہے، یہ کوئی نِرا تصوّر نہیں!) ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا میرے لئے انعام ہے
آپ خود سنتے ہیں آ کر جو میرا پیغام ہے[2]

---

[1]، [2] حضرتِ والاؒ ہی کے اشعار ہیں۔

کیا دوا کے استعمال سے غرض طلب صحت ہے یا لذتِ کام و دہن؟ اگر یہ میسر آجائے تو فبہا ورنہ دوا سے انکار تو نہیں کیا جائے گا۔

ذکر میں انتشارِ خیال سے پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے قلب و دماغ کو ایسا ہی بنایا ہے کہ اوس میں حرکت فطری ہوتی رہے۔ یہ شاہی شاہراہ ہے، آپ کون اس کا پہرہ بٹھانے والے کہ اس شاہی شاہراہ پر چوہڑے چمار نہ چلنے پائیں، آپ اپنی راہ چلیئے وہ اپنی راہ چلیں، حسب تجویز اعلیٰ حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ آپ یہ خیال کیا کیجئے کہ "اللہ اکبر! اللہ تعالیٰ کی بھی قدرت ہے کہ دل کے ایک قطرہ میں خیالات کا سمندر بھر دیا ہے اللہ رے اوس کی عظمت و کبریائی" اس تصوّر سے یہ خیالاتِ پریشاں معرفت کے آیات بن جائیں گے ـــــــ ایسے وقت یہ شعر پڑھ لیا کیجئے ؎

دور باش افکارِ باطل، دور باش اغیارِ دل
سج رہا ہے شاہِ خوباں کے لئے دربارِ دل[1]

("افکارِ باطل" کو "اغیارِ دل" سے کیا خوب تعبیر فرمایا ہے اور کیسے عارفانہ پیرایہ میں!)
بہرحال آپ مضطرب نہ ہوں، کام میں لگے رہیں، اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں گے، اونکا وعدہ ہے!

غ۔ وسطِ شعبان ۱۳۸۲ھ میں حضرت والا رح کی خدمت میں حاضری کا قصد تھا اور تیاری بھی مکمل کر لی تھی، اب اجازت طلب کرنے والا ہی تھا کہ حالات مخالف ہو گئے وہ یوں کہ معتدی تعمیرات میں (۱۰۰ تا ۱۶۰) کا گریڈ مل رہا ہے اور اس کو قبول کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہوں۔ حضرت والا رح دعا فرمائیں کہ یہ معاشی صورت مفید ثابت ہو، محکمۂ امداد باہمی سے نفرت ہے اس لئے باوجود طلب کئے جانے اور ترقی کے زیادہ امکانات کے احقر نے انکار کر دیا۔

س۔ کچھ حرج نہیں، آپ کو نیّت کا ثواب مل گیا،
اچھا کیا جو اوس ملازمت سے آپ نے قطع نظر کر لیا، اب جو صورت پیشِ نظر ہے شاید

---

[1] حضرت والا رح ہی کا شعر ہے اور انتشار کے رفع کرنے میں احقر نے اکسیر پایا ہے!

اللہ تعالیٰ اس میں بھلائی رکھیں!

غ۔ پرسوں رات ایک خواب دیکھا کہ حضرت والارح مکہ مسجد میں پہلی صف میں تشریف فرما ہیں، احقر بھی قریب ہی بیٹھا ہے، کچھ فاصلہ پر ایک کہنہ سال سفید ریش بزرگ بیٹھے ہیں جن کے چہرے سے تقدس کے آثار نمایاں ہیں، احقر نے دیکھا کہ وہ الحاح کے ساتھ دُعا میں مصروف ہیں اور بار بار یہ فرماتے ہیں کہ "اے اللہ! تیرے نیک بندے سید سلیمان کا واسطہ" ایسا ایسا کر دے احقر کے دل میں تعجب و خوشی کے جذبات بیک وقت پیدا ہوئے، تعجب اس وجہ سے کہ ان بُزرگ کا حضرت والارح سے کوئی تعلق نہیں پھر حضرت والارح ہی کے واسطہ سے دعا کر رہے ہیں اور خوشی اس لئے کہ ایسے بڑے بڑے بزرگ بھی حضرت والارح کے قائل ہیں جس سے حضرت والارح کے مقام کی رفعت کا اندازہ ہوتا ہے ——— غرض پھر حضرت والارح منبر پر تشریف فرما ہوتے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پُرزہ تھا، مؤذن نے اذان کہی، یاد نہیں رہا کہ حضرت والارح نے کیا خطبہ ارشاد فرمایا اور نماز کیونکر ہوئی، لیکن جب لوگ منتشر ہونے لگے تو احقر کو مختلف لوگوں سے یہ خبر ملی کہ حضرت والارح کو درجۂ اوّل کا گریڈ مل گیا ہے[1]، اسی کیفیت میں آنکھ کُھل گئی، تہجّد کا وقت تھا،

س۔ آپ کا یہ خواب آپ کے لئے اور اس ہیچ میرز کے لئے بشارت ہے، اللہ تعالیٰ اس حُسنِ ظن کے مطابق بنائے یہ اوس کی ستّاری ہے!

مگر خوابوں کو اہمیت نہ دی جائے، اس سے درجۂ قرب نہیں بڑھتا، صرف عمل سے بڑھتا ہے اس کے درپے رہنا چاہیئے!

غ۔ کیا دعا واسطہ سے کی جائے تو زیادہ موثر ہوتی ہے؟

س۔ جی نہیں، ادعیۂ ماثورہ بکثرت مروی ہیں مگر اُن میں کہیں واسطہ اور توسّل ہے؟ شاید

---

[1] کیا عجب کہ مرتبۂ صدیقیت پر فائز ہو گئے ہوں کیونکہ از روئے قرآن غیر نبی کے لئے درجۂ اوّل کا گریڈ "صدیقیت" ہی ہے، الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین!

ایک آدھ مقام پر ہو، اس لئے اگر توسّل بالعمل ہو تو جائز ہے اور اشخاص سے توسّل بھی ان کے اعمال ہی سے ہوتا ہے۔ ——— جب حق تعالےٰ خود فرماتے ہیں ادعونی استجب لکم مجھ سے مانگو میں دوں گا، مجھے پکارو میں جواب دوں گا، تو پھر واسطہ کی کیا ضرورت رہی؟

(یہ ہے ع "یکے بین ویکے جوئے ویکے باش" پر عمل اور اس کی تلقین!)

غ۔ حضرت والا کی ہدایت پر عمل جاری ہے لیکن دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ اطمینان وسکون عطا فرمائے۔ فقط

احقر غلام محمدؐ

س۔ الحمد للہ، شکر کیجئے، دلی دعا ہے۔

ہیچمداں سلیمان

مکتوب (۱۳)

غ۔ حیدرآباد دکن

۲۹ر شعبان ۶۴ھ

حضرت مخدومنا ومولانا دامت برکاتہم۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کچھ ہی روز قبل ایک عریضہ خدمت اقدس میں گذران چکا ہوں جس میں ایک کرم نامہ کی عدم وصولی کا ذکر تھا، الحمد للہ پرسوں وہ شفقت نامہ شرف صدور لایا اور وجہ تاخیر بھی معلوم ہوئی جس کے لئے احقر سراپا سپاس ہے! (مراد مکتوب ۱۱ ہے)

س۔ اعظم گڈھ

۴ر رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ

اخی فی اللہ تعالےٰ، ادام اللہ توفیقکم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دوسرا خط بھی ملا ہوگا۔ (یعنی مکتوب ۱۲ جو ابھی نقل ہو چکا)

غ۔ ذکر سے متعلق عرض ہے کہ اگر بالجہر نہیں کرتا ہوں تو کم وقت لگتا ہے لیکن اللہ اللہ کے لفظ صاف ادا نہیں ہوتے اور اگر کسی قدر جہر سے صاف ادائی کی کوشش کی جاتی ہے تو کافی وقت صرف ہونے کے باوجود صرف چند مرتبہ کہنے کے بعد "اللہ اللہ" کے الف کی آواز نہیں نکلتی اور بڑی دقت محسوس ہوتی ہے[1]۔ اب تک اس طرف توجہ نہیں ہوئی تھی حضرت والا کے ارشاد کا طالب ہوں، نیز یہ بھی بتایا جائے کہ ذکر میں نشست کس طرح کی ہو؟

س۔ آپ ان مشکلات اور دقتوں کی پرواہ نہ کیجئے، نہ ذکر کے اندر ان لفظوں پر دھیان دیجئے آپ مذکور یعنی اللہ تعالیٰ کا تصور کریں، بشکل نور، خواہ قلب میں لفظ "اللہ" کا نورانی تصور، تلفظ اپنی کوشش بھر صحیح ہو پھر جو کچھ ادا ہوتا ہے وہ صحیح ہے۔

غ۔ کل سے رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو رہا ہے، چند مزید ہدایات سے سرفراز فرمایا جائے تو موجب تشکر ہوگا، نیز حضرت والا دعا فرمائیں کہ احقر اس مہینہ سے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھا سکے۔

س۔ رمضان المبارک قرآن پاک کا مہینہ ہے، پس تلاوت اور تراویح اور نوافل کی شکل میں قرآن پاک بکثرت پڑھا جائے۔

غ۔ بعض دفعہ یہ گمان ہوتا ہے (اپنے احوال پر نظر رکھتے ہوئے) کہ نہ معلوم حضرت والا کی توجہ اس گنہگار کے حال پر پوری طرح ہے بھی یا نہیں، کیونکہ جس مکتب سے علماء و صلحاء درس لیتے ہوں وہاں اس بے علم و عمل کا کیا گذر ______ احقر تو حضور کا ہو چکا اب جو چاہے کیجئے، لیکن ؎

از بندہ پروری و نوازش بعید نیست
شاہا اگر نگاہ بحالِ گدا کنند

---

[1] اس بحث کے لئے ملاحظہ ہو "انتالیسواں عزیمہ، در تحقیق تکرار اسم جلالہٗ منفرداً" "بوادر النوادر" مؤلفہ حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ۔

س۔ استغفراللہ، میں خود قاصرالعمل ہوں اور سب سے کم درجہ، ــــــــــــــــــــ

اپنے احباب اور دوستوں میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلقِ خاطر رکھتا ہوں اور آپ تو خاص تعلق و وابستگی رکھتے ہیں، ع تا نسوزد شمع کئے پروانہ شیدامی شود۔ (اللہ اللہ، کیا ٹھکانا ہے شفقت و محبت کا! آج بھی بھروسہ ہے تو صرف اسی نظرِ کرم کا، ع سُلیمان باچنیں حشمت نظرہابود باموزش!)۔

غ۔ گستاخی ہوتی ہے لیکن جذبات شوق چونکہ بلا تکلف اشعار کی شکل میں ڈھل گئے، اسلئے خدمتِ اقدس میں پیش ہیں، زبان ٹوٹی پھوٹی شاعرانہ ہے لیکن معنیٰ و مفہوم بالکل واقعی اور شاعرانہ مبالغہ سے پاک ہے ؎

بفرما نظرے برمنِ خستہ حالے — بدہ بادۂ پُرز کیف جمالے
منم عاصی و غرق در بحرِ عصیاں — توئی صوفی و صافی و غرقِ عرفاں
یکے در خودم سیر بنمودہ دیدم — ہمہ ظلمت فسق اندر وجودم
نہ بازوئے عزم و نہ نیروئے ہمّت — بگو چوں ثنا کردن ایں بحرِ زحمت
شرابُ زخت نقلِ گفتار خواہم — چو نادیدہ ام، روئے دلدار خواہم
دعائے بفرما کہ خاکم بروید — گُلے، لالہ، یاسمینے بروید

ببارد سحابِ کرم لعل و گوہر
شود دامن عاصیان پُر زجوہر

دُعا کا طالب، احقر غلام محمّد

(یہ اشعار زبان و فن کے اعتبار سے جس قدر بھی پُر عیب ہوں لیکن زبان سے نِکل گئے تھے دفعتہً اور رہینِ منّت ہیں جذبات قلبی کے ورنہ شعر گوئی سے بیگانگی کا یہ عالم ہے کہ اُس دور کے اپنے جیسے نیسے اشعار پر بھی اب حیرت ہی ہوتی ہے کیسے موزوں ہو گئے!)

س۔ ان خیالات کا شکریہ جو آپ کی محبت کا تقاضا ہیں ورنہ "من آنم کہ من دانم" مجھ میں بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ حضرت والا رحمہ اللہ کا دست گرفتہ ہوں، اب جو کچھ ہے، یہی نسبت ہے اور اسی کا بفضل خدا بھروسہ ہے، آپ بھی میرے لئے دعا کریں، میں آپ کے لئے کرتا ہوں، ہر مسلمان بھائی کی دعا دوسرے مسلمان بھائی کے حق میں قبول کی استعدادِ تام بدرگاہ باری تعالیٰ رکھتی ہے!

ہیچمدان سلیمان

(کیا ٹھکانا ہے فنائیت وعبدیت کا! اور عبدیت سے بالاتر بندہ کے لئے کوئی اور مقام ہو بھی سکتا ہے؟)

غ۔ پس تحریر:۔

احقر کے ایک دوست عزیز حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے تعلقِ خاطر رکھتے اور اس بنا پر ان سے اصلاح کا تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں، گمان یہ ہے کہ مولانا بھی حضرت تھانوی سے مجاز بیعت ہیں (صدق میں گذارشیں اور مشورے جو چھپتے رہتے ہیں اُن سے یہ گمان ہوتا ہے) لیکن مجازین کی فہرست میں مولانا کا اسم گرامی موجود نہیں ہے از راہِ عنایت حقیقتِ حال سے مطلع فرمایا جائے، نیز اس کی بھی وضاحت فرمائی جائے کہ آیا مولانائے موصوف سے اس قسم کا تعلق مفید ثابت ہوگا اور سلسلۂ عالیۂ امدادیہ کی برکات حاصل ہوں گی؟ فقط

احقر غلام محمد

س۔ محبی مولوی عبدالماجد صاحب کو بیعت تو حضرت مولانا حسین احمد صاحب دام فیوضہٗ سے ہے مگر اون کو عقیدت اور آمد و رفت اور مکاتبت کا تعلق حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ سے رہا، مگر حضرت والا رح سے نہ اون کو بیعت ہے اور نہ اجازت حاصل ہے اجازت کسی سے بھی نہیں، ابھی صدق میں خود بھی ظاہر کردیا ہے تاہم وہ تعلیم یافتہ اصحاب کے نباض ہیں

کیونکہ وہ خود بھی اوسی جماعت سے ہیں، اللہ تعالیٰ اون سے بھی دین کا کام لے رہا ہے۔

والسلام۔

(چنانچہ اس جواب باثواب کے بعد میرے دوست نے حضرت دریابادی مدظلہ سے خط وکتابت شروع کردی، شاید ۵، ۷ ہی خطوط آئے اور گئے ہوں گے کہ اُن پر گریہ اور اس نوع کے احوال طاری ہونے لگے اور جب انھوں نے اپنا یہ حال لکھ بھیجا تو جواب صرف یہ ملا کہ اب آپ کو کسی شیخ سے رابطہ قائم کرلینا چاہیئے ــــــــــــ یہ خط بھی صدق میں چھپ چکا ہے اور حضرت دریابادی مدظلہ کی دیانت وامانت کی شہادتوں میں سے ایک بین شہادت ہے!)

مکتوب (۱۴)

غ۔ حیدرآباد دکن

۱۶، رمضان ۶۶ھ

بخدمتِ اقدس حضرت مولانا ومخدومنا دام برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ حضرتِ والا کے شفقت نامے پہنچے اور طمانیت وتقویت کا باعث ہوئے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ صحیح جذبۂ عمل اور حضرت والا سے استفادہ کی توفیق عطا ہو۔

س۔ اعظم گڈھ

اخی فی اللہ تعالےٰ ادام اللہ تعالیٰ توفیقکم

آمین!

غ۔ حضرت والا کے حکم کے بموجب عام دنوں کی بہ نسبت قرآن پاک کی زیادہ تلاوت اور تراویح وغیرہ کا اہتمام جاری ہے!

س۔ بحمداللہ ______

غ۔ گذشتہ رمضان سے نمازِ تہجد کی ادائی کی توفیق ہوئی تھی، الحمداللہ اس رمضان میں ڈاڑھی منڈھوانے کے گناہ کا حقیقی احساس عطا ہوا، اس عمل سے نفرت پیدا ہوئی اور اس کے ترک پر قدرت بھی عطا ہوئی، یہ سب حضرت والا کی دعاؤں کے برکات ہیں ورنہ احقر میں نہ ہمت نہ عزیمت!

س۔ بارک اللہ فیکم۔ شاباش!

غ۔ کیا یہ صحیح ہے کہ عالم رویا میں جس طرح شیطان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھیس اختیار کر نہیں سکتا اسی طرح شیخ چونکہ ہادی ہوتا ہے اس لئے اس کا روپ بھی اختیار نہیں کر سکتا اور جب شیخ کی زیارت رویا میں نصیب ہو تو واقعی ایک بشارت ہوتی ہے!

س۔ اس کی کوئی تصریح شریعت میں نہیں۔

غ۔ "قلب العبد بین اصبعین من اصابع الرحمٰن"۔ اس حدیث شریف سے بظاہر احوال قلبیہ کا غیر اختیاری ہونا معلوم ہوتا ہے، اگر ایسا ہو تو پھر اعمال بھی غیر اختیاری ہو جائیں گے، نیک و بد بننا بندے کی اختیاری بات نہ ہوگی، براہِ کرم توضیح فرما کر تشفی فرمائی جائے۔

س۔ جی ہاں، ایسا ہی ہے مگر اللہ تعالےٰ نے اس کے بھی قواعد مبنی بر حکمت بنا رکھے ہیں، اس لئے یہ شبہ غلط ہے[1]۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى

غ۔ بعض دفعہ خوب غور کرتا ہوں کہ قلب کا کیا حال ہے مگر کچھ پتہ نہیں چلتا بجز اس کے

---

[1] نیز مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی رح کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ اس حدیث میں عام قلب کا ذکر نہیں بلکہ قلبِ عارف کا ذکر ہے جو مرتبۂ عبدیت پر فائز اور تصرف الٰہی کے تابع ہوتا ہے۔

کہ محض مختلف اچھے اور فضول خیالات کا ہنگامہ محسوس ہوتا ہے، یہ کبھی محسوس نہ ہوا کہ ایمان اور محبتِ الٰہی کا بھی کوئی شائبہ موجود ہے۔

س۔ اس کی دریافت کی کچھ کوشش نہ کیجئے۔

غ۔ حضرت والا اصلاح حال کے لئے دُعا فرمائیں۔ فقط

ننگِ اسلام غلام محمدؐ

س۔ دلی دُعا ہے۔

آج کل ریاحی درد حوالیٔ قلب کے دورہ میں مبتلا ہوں، اللہ تعالےٰ خیر فرمائے۔

ہیچمداں سُلیمان

۲۱، رمضان ۱۳۶۴ھ

(یہی باعث تھا کہ اب کی مرتبہ جوابات شافی مگر مختصر رہے اور تحریر کی شکستگی سے بھی شدتِ تکلیف کا اثر نمایاں رہا ـــــــــ یہ مرض کم وبیش آخر وقت تک رہا۔ اِنا للہ)۔

مکتوب (۱۵)

غ۔ حیدرآباد دکن

۲۷، رمضان ۱۳۶۴ھ

حضرت مولانا و مخدومنا ادام اللہ ظلکم و فیوضکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

کل شفقت نامہ بدست ہوا حضرت والا کی علالت کی خبر نے قلب و دماغ میں زلزلہ پیدا کر دیا، گنہگار دل سے جیسے بن پڑا دعا کی اور کر رہا ہوں حضرت مولانا محمود الغنی صاحب (خلیفۂ مجاز حضرت مولانا تھانویؒ) اور دوسرے وابستگانِ بارگاہِ اشرفی سے بھی حضور کی صحت کے لئے دُعا کروائی، دوست احباب نے بھی صحت و عمرِ طویل

کی دعائیں کیں اور کر رہے ہیں۔

الرحم الراحمین کی بے پناہ رحمت سے امید ہے کہ حضرت والا اب بہ صحت و عافیت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حضور کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر سلامت رکھے اور جس طرح بغیر مانگے اس نے بلا طلب ہماری اصلاح کا ذریعہ فراہم کیا اب ہماری التجا اور گذارش ہے کہ اس واسطۂ اقدس کو ہماری منزلِ مقصود تک رہبری کا ذریعہ بنائے رکھے اور صحت و عافیت کے ساتھ عمرِ طویل عطا فرمائے۔ ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم وتب علينا انك انت التواب رحیم ــــ خستہ جگر،

احقر غلام محمد

س۔ اعظم گڈھ

اخی فی اللہ تعالیٰ رزقکم اللہ رزقاً حسناً فی الدنیا والآخرہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

فقیر بحمد اللہ ببرکت دعائے بزرگاں علالت کے اس حملہ سے بہ سلامت نکلا، اب ضعف کے آثار ہیں، اب راتوں کی نیند کچھ کچھ آرہی ہے، اب لیٹتا ہوں اور سوتا ہوں[1]، مولانا محمود الغنی صاحب اور دوسرے بزرگوں اور عزیزوں کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔

اب آپ مطمئن رہیں، انشاء اللہ مولیٰ کا کرم ہو گا، والسلام

ہیچمداں سید سلیمان

۲ شوال ۱۳۶۴ھ

---

[1] یہ وہی مرض تھا جس میں قلب پھیل گیا تھا جس کی تفصیل باب پنجم میں گذر چکی !!

مکتوب (۱۶)

غ۔ حیدرآباد دکن

۱۱ر شوال ۱۳۶۴ھ

حضرت مولانا و مخدومنا مدظلکم العالی، السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

گرامی نامہ پڑھ کر ایک گونہ سکون حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ حضرتِ والا کے سایہ کو ہم عاصیوں کے سروں پر تادیر قائم رکھے اور فیوض سے بہرہ ور فرماتے یہاں سب خدام حضرتِ والا کی کامل صحت کے لئے دست بہ دعا ہیں۔

س۔ اعظم گڈھ

۱۵ر شوال ۶۴ھ

عزیزی وحبیبی ادام اللہ توفیقکم، السّلام علیکم و رحمۃ اللہ

الحمد للہ اچھا ہوں، ضعف باقی ہے، اللہ تعالیٰ اس مزید مہلت کو اپنے مرضیات میں صرف فرمائیں۔

غ۔ گرانیِ طبع کا باعث نہ ہو تو حضرت والا پورا عریضہ پڑھیں ورنہ صرف اپنی صحت و عافیت سے مطلع فرمائیں کیونکہ جو باتیں آئندہ عرض کی جارہی ہیں کچھ زیادہ اہم نہیں۔

س۔ بحمد اللہ میں نے پڑھ لیا اور آپ کے لئے دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت عطا فرمائیں۔

غ۔ میرے کرم فرما افسر بالادست نے جو میری پوری زندگی سے واقف ہیں میرے چہرے پر ڈاڑھی دیکھ کر سخت ناراضی ظاہر کی اور کہنے لگے کہ جتنی نمازیں چاہے پڑھئے، روزے رکھیے لیکن اپنے ظاہر کو آپ کیوں بدلتے ہیں پھر متعدد مثالیں پیش کیں جن میں محض ڈاڑھی کی وجہ سے افراد کی ترقیاں رُک گئیں، جب احقر نے کہا کہ آپ کام دیکھئے ان ذاتی امور سے

دفتر کو کیا تعلق تو فرمانے لگے کہ یہ دورِ خلافت نہیں بلکہ انگریزوں کا دَور ہے اور ریاست حیدرآباد بھی انہی کے زیرِ اثر ہے ــــــــ میں نے جب ان کی باتیں اَن سُنی کرنی شروع کردیں اور کچھ جواب نہ دیا تو کہنے لگے کہ آپ کی یہ تبدیلی قنوطیت کی دلیل ہے، سب کچھ سُن کر میں مسکراتا ہوا ان سے رخصت ہوگیا، (افسوس کہ یہی غلامانہ ذہنیت پاکستانی اعلیٰ حکام میں بھی سرایت کئے ہوئے ہے، الا ماشاء اللہ)۔

س۔ آپ استقامت کے ساتھ قائم رہیئے، ؎ دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تر است، اگر سر جو گندر سنگھ، سکھ، بڑی ڈاڑھی اور بڑے بال اور پگڑی لے کر ویسرائے کا ہوم ممبر ہوسکتا ہے تو کیا عام مسلمان معمولی سرکاری ملازم بھی نہیں ہوسکتے؟ استغفر اللہ کیا مسلمانوں میں سکھوں جیسی استقامت بھی نہیں؟ ــــــــ آپ ان باتوں سے ملول نہ ہوں۔ ایسے ایسے مواقع شیطانی تو خدا جانے کتنے پیش آئیں گے، ہمارے خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ بڑی لمبی ڈاڑھی کے ساتھ انسپکٹر آف اسکولس تھے، میرے داماد سیّد حسین ڈاڑھی کے ساتھ ڈپٹی مجسٹریٹ اور سٹی مجسٹریٹ ہیں والحمدللہ!

غ۔ جب سے ڈاڑھی رکھی ہے کوئی کہتا ہے ایسی بھی کیا عجلت تھی، کچھ ترقی ہوجاتی۔ شادی ہوجاتی تو پھر رکھ لیتے۔ اور اس سلسلہ میں عجیب دلائل خود اپنا نفس بھی پیش کرتا ہے، حضرت والا اس ضعیف الہمت کے لئے استقامت کی دعا فرمائیں اور یہ بھی کہ سارے خدشات غلط ثابت ہوں تاکہ معترضین کی نظریں بھی جھک جائیں اور اپنے نفس کی بھی تذلیل ہوکر قلبی اطمینان حاصل ہو۔

س۔ مخالفین کے اقوال پر لاحول پڑھئے، آپ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مبارکہ اپنے پیش نظر رکھئے اور اس کے عشق میں اتباع کامل پر قائم رہیئے (کیا حکیمانہ پیرایۂ تلقین ہے کہ جذبۂ عشق کو ہوا دے دی جس کے بعد ہر ناممکن بھی ممکن بن جاتا ہے ؎

ہر کہ عشقِ مصطفےٰ سامانِ اوست　　　　بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست)

دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ استقامت بخشیں، انشاء اللہ یہ سب فرضی خدشے حباب و سراب ثابت ہوں گے۔ (شیخ کا تیقّن مرید ناقص کے اندر بے پناہ قوتِ یقین پیدا کر دیتا ہے)

غ۔ حضرت والا احقر کی ہر جہتی فلاح کے لئے دُعا فرمائیں۔ فقط

احقر غلام محمّد

س۔ دلی دُعا ہے۔ والسّلام۔

ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۱۷)

غ۔ حیدرآباد دکن

۲۴ شوال ۶۴ھ

حضرت اقدس واعلیٰ مدفیوضکم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

حضرت مولانا محمود الغنی صاحب کے ایما واصرار پر احقر حضورِ والا کی توجہ ایک علمی مسئلہ کی طرف رجوع کرانے کی جسارت کر رہا ہے :۔

تفہیمات (از مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی) کا مضمون "مسلک اعتدال" ملاحظہ ہو، خصوصاً صفحہ ۳۱۸ سے ۳۲۵ تک کا حصہ ــــــــــــ اس حصہ میں "فنِ رجال" پر بحث کرتے ہوئے اس فن کی کافی اہمیت گھٹائی گئی ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں "یہ مواد اس حد تک قابلِ اعتماد ضرور ہے کہ سنّتِ نبویؐ اور آثارِ صحابہؓ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے مگر اس قابل نہیں کہ بالکل اسی پر اعتماد کیا جائے"۔ (صفحہ ۳۲۲) ــــــــــــ اسی طرح ردّ وقدح کرتے ہوئے صحیح وغلط احادیث کو پرکھنے کی کسوٹی "ذوق" کو قرار دیتے ہیں اور یہاں سے انتہائی گمراہ کن مضمون شروع ہوتا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبویؐ کا مزاج ہے ..... (۵ سطریں چھوڑ کر) ...... اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا، وہ اسناد سے ضرور مدد لیتا ہے مگر اس کے فیصلہ کا مدار اس پر نہیں ہوتا، وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس اُفتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے، اس لئے کہ اس جامِ زرّیں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی ...... وغیرہ"۔

حضرت مولانا محمود الغنی صاحب فرماتے ہیں کہ جس کسی نے اس مضمون کو پڑھا وہ الفاظ کے سحر سے مسحور اور معنی کی سمیت سے مسموم ہوا، اس لئے حضور والا اس پر تنقید تحریر فرمائیں تا کہ لوگ اس گمراہی سے محفوظ رہیں کیونکہ ہر شخص نہ فن کی گہرائیوں سے واقف ہے اور نہ اُردو میں اس قسم کا مواد عوام کے سامنے موجود ہے۔ فقط

خادم غلام محمدؐ

س۔ اعظم گڑھ

اخی فی اللہ تعالیٰ دام توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

حضرت مولانا ممدوح سے میرا سلام کہہ دیجئے اور عرض کر دیجئے کہ اس وقت میں اسقدر ضعیف ہوں کہ کوئی دماغی کام مدت تک نہیں کر سکتا۔

مولوی مودودی صاحب کا جواب مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری ایڈیٹر "اہلِ حدیث" دے رہے ہیں، میں رسالہ خطبۂ ماذیہ بھیجتا ہوں مولانا کی خدمت میں پیش کر دیں اور اپنے عفو و عافیت کے لئے اون سے دُعا کا طالب ہوں۔ "ہیچمداں سلیمان"

مکتوب (۱۸)

(اوپر کا عریضہ مولانا محمود الغنی صاحب کی طرف سے لکھا گیا تھا اور اب اُسی تاریخ کا اپنا

احوال نامہ آرہا ہے،)

غ۔ حیدرآباد دکن

۲۴ر شوال ۶۴ھ

اقدس و اعلیٰ حضرت مولانا مد فیوضکم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

حضرت والا کے رو بہ صحت ہونے کی کیفیت معلوم کر کے بڑی مسرت حاصل ہوئی، اللہ تعالیٰ حضور کو بہت جلد صحت کُلّی عطا فرمائے۔

س۔ اعظم گڈھ

اخی فی اللہ تعالیٰ ادام اللہ توفیقکم وزادکم مرضیاً علی الدین

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'۔ الحمد للہ اچھا ہوں مگر ضعف ابھی تک ہے،

غ۔ رسالہ معارف میں "الجهد والجهاد لعلمی المعاش والمعاد" کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی، احقر کی کیا بساط کہ اس کی تعریف و توصیف کرے۔ لیکن ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا یہ تقریر اسی گم کردہ راہ کے لئے لکھی گئی ہے، بار بار پڑھا اور بڑی تقویت حاصل ہوتی رہی، اللہ تعالیٰ حضور والا کے فیوض کو تا دیر جاری رکھے۔

س۔ الحمد للہ، یہ میری نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہوا جو کچھ ہوا ——————— حق تعالیٰ اس سے بہتر کی توفیق بخشیں،

غ۔ کیا حضرت والا کے بعض عام ارشادات یہ کہہ کر کہ "میں نے یہ عرض کی تو حضور نے یہ ارشاد فرمایا" نفعِ عام کی خاطر دوستوں کو سنائے جا سکتے ہیں؟

س۔ بغرض افادہ نقل کئے جا سکتے ہیں نہ کہ ریا اور استکبار کی راہ سے۔

غ۔ احقر بہت تباہ حال ہے، رشک وحسد کا بار بار حملہ ہوتا رہتا ہے، جب کسی کی تقریر، تحریر یا قابلیت کی تعریف سننے میں آتی ہے تو تکلیف ہوتی ہے اور خیال پیدا ہوتا ہے کہ اپنے میں یہ جوہر کیوں نہیں ہے، گو یہ جذبہ کوئی عملی بدنمائی اختیار کرنے نہیں پاتا مگر قلب ودماغ میں ہیجان ضرور پیدا کر دیتا ہے!

س۔ حسد اور رشک (غبطہ) دو چیزیں ہیں، حسد یہ ہے کہ جس پر حسد ہو (محسود) اوس سے اوس کی نعمت کے زوال کی تمنا ہو، یہ مذموم ہے اور رشک اور غبطہ یہ ہے کہ اوس نعمت کی اوس سے زوال کی تمنا کے بغیر اپنے لئے اوس کے حصول کی تمنا ہو، یہ بُرا نہیں تو آپ کو بحمداللہ مرضِ حسد نہیں بلکہ رشک آتا ہے کہ آپ بھی ایسے ہوتے تو ایسی تمنا اور مسابقت کا جذبہ تو رضائے الٰہی کا باعث ہے وفی ذلك فلیتنافس المتنافسون، اور دوسری جگہ فاستبقوا الخیرات۔

غ۔ کیا عرض کروں آج کل یہ حالت ہے کہ بعض مرتبہ عبادات اور مذہب کی بنیادی باتوں کے متعلق تک وساوس پیدا ہوتے ہیں کہ اس سے کیا حاصل ہے اور اگر کچھ فائدہ ہوتا بھی ہے تو محض اس اعتبار سے کہ یہ چند نفسیاتی اعمال ہیں اعوذ باللہ من ذلک!

س۔ یہ وساوس کبھی کبھی آتے ہیں اور اسی امر سے کہ آپ اس کو بُرا سمجھتے ہیں اور ان کے پیش آنے سے مشوش ہیں، یہ ثابت ہوتا ہے کہ بحمداللہ ایمان محفوظ ہے، ایسے موقع پر استغفار اور لَاحَولَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ کی کثرت کیجئے اور اُودھر سے دل کو پھیر کر دوسرے کام میں لگ جائیے، التفات بھی نہ کیجئے اور دعا کیجئے:۔

یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِكَ

غ۔ حافظہ کمزور ہے اور نسیان بڑھ رہا ہے، کوئی روحانی علاج تجویز فرمایا جائے۔

س۔ یہ تو کوئی مادّی مرض ہے، دوا کیجئے اور دُعا بھی کیجئے۔

غ۔ احقر کے والد ماجد تقریباً سات برس سے مقروض ہیں اس کی وجہ سے متفکر رہتے ہیں، اُون کی

پریشانی سے احقر کو پریشانی رہتی ہے، حضرت والا کوئی وظیفہ، دعا یا تدبیر بتائیں تو بڑی عنایت ہوگی!

س۔ فقیر نے دعا کی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں، گو خود جیسا ہوں ظاہر ہے مگر دوسرے مسلمان بھائی کے حق میں اللہ تعالیٰ قبول فرمایا کرتے ہیں یا اوس سے بہتر چیز عطا کرتے ہیں۔

غ۔ حضرت والا احقر اور اس کے خاندان کی دینوی و اُخروی فلاح کے لئے دعا فرمائیں۔

احقر غلام محمد

س۔ دلی دُعا ہے۔

ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۱۹)

غ۔ حیدرآباد دکن

۵ر نومبر ۱۹۴۵ء

حضرت اقدس واعلیٰ دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پندرہ روز سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہوگا کہ ایک عریضہ خدمت والا میں گذرانا تھا لیکن جواب سے محرومی ہے۔

س۔ میرٹھ، مکان سید حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر

عزیز مخلص زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے گذشتہ خط کا جواب دیا گیا تھا، اب آپ کو مل گیا ہوگا۔

(جو اوپر نقل ہو چکا)

غ۔ چند روز پہلے "صدق" میں حضرت والا کا ایک مکتوب نظر سے گذرا[1]۔ طبیعت متفکر ہوئی،

---

[1] غالباً مولانا دریابادی مدظلہٗ کا موسومہ تھا اور اس میں علالت کی خبر لکھی تھی۔

حضرت والا اپنی صحت سے مطلع فرماکر مطمئن فرمائیں۔

س۔ الحمدللہ اچھا ہوں اوس وقت وہی صورت حال تھی، اب صحت ترقی کر رہی ہے

غ۔ ویسے تو جب سے حضور کی علالت کی خبر ملی ہے برابر صحت کی دعا کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا لیکن کل رات نمازِ تہجد کے بعد جو دعا کی تو صبح سے قلب میں ایک طرح کا اطمینان محسوس ہونے لگا ہے جو اس سے پیشتر نہ ہوا تھا، یقین ہے کہ دعا کو قبولیت کا شرف نصیب ہوا ہوگا، اللہ تعالیٰ حضرتِ والا کو تا دیر بہ عافیت وصحت رکھے، آمین، جواب کا منتظر:

احقر العباد غلام محمد

س۔ جی ہاں، ہر بھائی کی دعا دوسرے بھائی کے حق میں غائبانہ قبول ہوتی ہے، قلب میں دعا کے بعد سکون کا احساس ازدیادِ ایمان کی نشانی ہے، اس دولت پر مبارک باد قبول کیجئے۔ والسلام،

ہیچمداں سُلیمان، ۶ ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ

مکتوب (۲۰)

غ۔ حیدرآباد دکن

۱۴ ذیقعدہ ۶۴ھ

حضرت اقدس واعلیٰ مدفیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ اقدس!

س۔ میرٹھ، کوٹھی سید حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر

اخی فی اللہ تعالیٰ ادام اللہ تعالیٰ توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمدللہ بخیر ہوں۔

غ۔ حضرت والا کا مرسلہ وعظ (خطبۂ مدراس) اور پیام (مندرجۂ مکتوب ۱۷) مولانا محمود الغنی

صاحب کو اُسی روز پہنچا دیا، حضرت موصوف نے بھی جواباً سلام لکھنے کے لئے ارشاد فرمایا ہے اور فرماتے تھے کہ حضرت کے لئے پہلے بھی دعا کی تھی اور اب پھر کروں گا اور کیسے دُعا نہ کریں کہ حضرت کا فیض جاری ہے۔"

س۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے اس کام کو انجام دے کر مجھے بھی اطلاع کرنا مناسب سمجھا، یہ حسنِ ادب ہے، مولانا کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں کہ ایک ناچیز کے ساتھ یہ حُسنِ سلوک فرماتے ہیں[1]۔

غ۔ احقر کا حال یہ ہے کہ ہر طرف سے طبیعت روکھی ہے، نہ دنیوی امور کی طرف رغبت ہے نہ دینی معاملات سے شغف، بس نام کی عبادتیں ہو رہی ہیں ـــــــــــــــــ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، حضرت والا دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے محروم نہ رکھے۔ فقط دُعا کا طالب،

احقر غلام محمد

س۔ یہ احوال پیش آتے رہتے ہیں، کیفیات مگر قائم نہیں رہتیں، جیسے کوئی ہر وقت ہنستا، روتا یا غصہ میں نہیں رہ سکتا، مگر طاعت میں علیٰ کل حال لگا رہنا چاہیئے اس سے کبھی غفلت نہ ہو، بلکہ لطف و کیفیت کے نہ ہونے پر بھی جو عبادت کی جاتی ہے اوس میں مجاہدہ کا ثواب زیادہ ہے کہ بندہ باوجود حظ اور لذت سے محرومی کے کام میں لگا ہے، غلام کو خواہ آقا کی خدمت میں لذت آئے یا نہ آئے خدمت میں لگا رہنا ہی ہے ورنہ وہ آقا کی راحت کا نہیں بلکہ اپنی لذت کا طالب ہے جو شرطِ وفا کے خلاف ہے ـــــــــ غرض اس راہ میں قبض یا بسط جو کچھ پیش آئے اوس پر راضی رہنا چاہیئے، آقا کی مرضی وہ جس حال میں رکھیں!

---

[1] اس ارشاد پر خود حضرتؒ کی ایک رُباعی یاد آئی جو خان بہادر محمد منظہر صاحب مرحوم کو لکھ بھیجی تھی ؎

انسان وہ ہے جو سب کو انساں سمجھے — ہو کوئی گدا اُسے بھی سُلطاں سمجھے

احباب کے حسنِ ظن کا ممنون ہوں میں — جو مورِ ضعیف کو سُلیماں سمجھے

ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار ہے　　　　پر تجھ کو چاہیئے کہ لگا لو لگی رہے[1]

یہمچداں سُلیمان ۳ ذیحجہ ۱۳۶۴ھ

مکتوب (۲۱)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۵ ذیحجہ ۱۳۶۴ھ

حضرت اقدس واعلیٰ دام فیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حضرت والا کی ترقی صحت کا حال سُن کر اطمینان نصیب ہوا، امید ہے کہ اب مزاج والا اور بہتر ہو گا۔

س۔ میرٹھ، بذریعہ سید حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر

برادر عزیز رفع اللہ شانکم ووسع رزقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ بخیریت ہوں، شفا دواؤں اور تدبیروں سے زیادہ بزرگوں دوستوں اور عزیزوں کی دعاؤں کی برکتوں سے اللہ تعالیٰ کے محض فضل وکرم کا نتیجہ ہے۔

غ۔ الحمد للہ کہ حضرت والا کی ہدایتوں پر عمل جاری ہے، استقامت ودوام کے لئے حضور دُعا فرمائیں۔

س۔ اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ استقامت کی دولت نصیب فرمائیں۔

غ۔ احقر نے منت مانی تھی کہ حضور کی ترقی صحت کی اطلاع پر ایک روزہ بطور شکرانہ رکھے گا، انشاء اللہ کل ہی اس کا ارادہ ہے ——— عجیب تذبذب میں تھا کہ اپنے اس حقیر عمل کی اطلاع کرنی چاہیئے یا نہیں؟ کیونکہ دو متضاد خیال پیدا ہو رہے تھے، ایک یہ کہ اظہار میں ریا ہے، دوسرے یہ کہ اظہار سے محبت وعقیدت کا اظہار ہو گا اور ایسے اظہار

---

[1] یہ شعر شیخ الشیوخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ تعالےٰ کا ہے!

کا حدیث شریف سے اشارہ ملتا ہے، اس کشمکش میں یہ بات ظاہر کردی، صحیح طریق کی رہبری فرمائی جائے۔

س۔ آپ کا خطرہ صحیح تھا، لیکن جب قلب ریا سے خالی ہو تو اس کا اظہار ریا نہیں، بے شبہ یہ مسنون ہے کہ جس سے محبّت ہو اس کو اپنی محبت سے آگاہ کر دے، اللہ تعالیٰ اس مخلصانہ محبّت کی جزائے خیر دے!

غ۔ چند دنوں پہلے بعد نماز احقر نے اپنی ہمشیرہ کے لئے ترقیٔ ایمان و عمل صالح کی دُعا کی تو یوں محسوس ہوا گویا اللہ تعالیٰ سُن رہے ہیں اور ایک اطمینان و امید کا احساس تھا لیکن ساتھ ہی جب اپنی صحت کے لئے دعا شروع کی تو وہ کیفیت جاتی رہی اور یوں محسوس ہوا گویا اللہ تعالیٰ ابھی اس درخواست کو سُننا نہیں چاہتے، جبراً دعا کر لی لیکن اس تغیّرِ حال پر حیرت ہے، اس کی کیا توضیح ہو سکتی ہے؟

س۔ یہ کیفیات ہیں، کیفیت کے تغیّر کو دعا کے قبول و عدم قبول سے تعلق نہیں بندہ دُعا پر مامور ہے جی لگے یا نہ لگے دعا میں لگا رہے، آپ نے اپنی بہن کے لئے پہلے پہل دعا کی ہو گی اس لئے اوس میں اخلاص کی وہ کیفیت نمودار ہوئی اور اپنے لئے آپ ہمیشہ ہی دعا کرتے ہوں گے، اس لئے اس میں وہ کیفیت نہیں رہی۔ (حرف حرف حق و صداقت کا آئینہ ہے!)

غ۔ خیال آیا تھا کہ اپنے رزق کی کشادگی کے لئے محلہ کی مسجد کے امام صاحب سے بھی دُعا کرالی جائے کیونکہ موصوف بڑے متقی اور حضرت تھانویؒ سے بیعت بھی ہیں لیکن فوراً ایک خیال اس پر غالب آیا کہ تُو نے کشادگیٔ رزق کے لئے بار بار دعائیں کی ہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ نے سُن لی ہیں اور جب وہ مصلحتاً اسی حالت میں رکھنا چاہتے ہیں تو کیوں دوسروں سے کہتا پھرتا ہے، یہ تو عبدیت کے خلاف ہے! ——— چنانچہ اُن بزرگ سے دُعا نہ کروا سکا البتہ خود کرتا رہتا ہوں، یہ رکاوٹ عموماً پیش آتی ہے البتہ

صرف حضرت والا کی خدمت میں عرض کرتے ہوئے یہ بات پیش نہیں آتی ——— عرض یہ ہے کہ کیا یہ محض وسوسہ ہے یا ایک صحیح خیال ؟

س۔ ضرور دعا کرائیں، حاجت اور تکلیف کا ذکر نہ کریں بلکہ صرف یہ کہیں کہ میری فلاح دین و دنیا کے لئے دعا کریں۔

غ۔ من ذا الذی یقرض اللہ قرضاً حَسَناً فیضاعفہ اضعافاً کثیراً۔ (قرآن)
کی تفسیر میں حضرت مولانا تھانویؒ نے یہ فرماتے ہوئے کہ "تفسیر پر جرأت نہیں کرتا بلکہ صرف احتمالاً بیان کرتا ہوں"۔ یہ بیان فرمایا ہے کہ "قرض کو بذلِ نفس کے لئے بھی عام رکھا جا سکتا ہے، ایسی صورت میں ایک جان کی ہزار جانیں ہو جائیں گی یہ قدرتِ حق سے بعید نہیں اور اگر اس تضاعف کو مان لیا جائے تو وہ حدیث بہت صاف ہو جاتی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ جنّت کے مختلف دروازے ہوں گے۔ جس شخص میں جو عمل غالب ہوگا وہ اسی دروازے سے بُلایا جائے گا، اس پر جب حضرت صدیق رضؓ نے سوال کیا تو ارشاد ہوا "وارجو ان تکون منہم" اس سے پتہ چلتا ہے کہ حق تعالیٰ بعض بندوں کو جسم و روح متعدد عطا فرمائیں گے، حقیقت میں وہ ایک شخص ہوگا لیکن تعدد جسد سے وہ متعدد ہوگا اس لئے وہ ہر دروازہ سے الگ الگ جائیگا بھی"۔ ———
پھر فرمایا "صاحبو! جب حق تعالیٰ کے ہاں بذلِ مال میں تضاعف ہوتا ہے جو نفس کے اعتبار سے اخس و ارذل ہے تو بذلِ نفس میں تضاعف کیوں نہ ہو جو اشرف و اعلیٰ ہے اسی سے یہ مضمون بھی سہل ہو جاتا ہے کہ ایک ایک جنّتی کے پاس حدِ بصر سے بھی زیادہ حوریں ہوں گی تو ایک ہی وقت میں ہر نعمت و لذت سے متمتع ہونا سہل ہو جائے گا"۔ ——— (وعظ خیر الحیات و خیر الممات) ——— حضرت والا مدظلہٗ کا اس آیت سے متعلق کیا ذوق ہے ؟

س۔ حضرت والا کا یہ استنباط صحیح ہے اور اس پر تعدد اجسام کا جو خیال ذوقاً ظاہر فرمایا ہے

وہ بھی صحیح ہو سکتا ہے تاہم کسی پر اس کا مان لینا ضروری نہیں !!

غ۔ حضرتِ والا رح احقر کی دنیوی و اُخروی صلاح و فلاح کے لئے دعا فرمائیں،

احقر غلام محمد

س۔ دل سے دعا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہاں کی نعمتیں عطا فرمائیں!

ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۲۲)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۲ محرم ۶۵ھ

حضرت مولانا و مخدومنا مد فیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ‘

مزاجِ اقدس!

س۔ میرٹھ

۱۹ محرم الحرام ۱۳۶۵ھ

اخی فی اللہ تعالیٰ دام توفیقکم وزاد سعدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمدللہ بخیر ہوں۔

غ۔ بحمدللہ حضرت والا رح کی ہدایات پر ایک حد تک عمل ہو رہا ہے، سردی کی شدت کی وجہ سے نمازِ تہجد کے لئے آنکھ نہیں کھُلتی، اس لئے اکثر بعد نمازِ عشاء آٹھ رکعت پڑھ لیتا ہوں اور کبھی رات میں بیداری کا قصد کر کے سو رہا اور اپنے ارادہ میں ناکام رہا تو آفتاب نکلنے پر ۱۲ رکعت نفل ادا کر لیتا ہوں، حضرت والا رح اس کم ہمت کے لئے قوتِ مجاہدہ کی دعا فرمائیں۔

س۔ کچھ حرج نہیں،

دلی دُعا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ ہمّت و عزیمتِ مجاہدہ عنایت فرمائیں۔

غ۔ ذاتی تجربہ یہ ہے کہ جب کسی ایسی جگہ جانا ہوتا ہے جہاں غیر عورتیں بے پردہ ہوتی ہیں تو تصوّرِ شیخ سے بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے، یعنی نہ صرف بدنظری سے بچاؤ ہوتا ہے بلکہ دراصل کسی کی طرف نظر اٹھانا خود طبیعت گوارا ہی نہیں کرتی ـــــــــ احقر کے خیال میں اس حد تک تصوّرِ شیخ کی اجازت ہونی چاہیئے کیونکہ اس میں مضرت کا کوئی پہلو نہیں البتہ اس سے آگے جو بعض لوگوں نے کہا ہے وہ غلط ہے، حضرت والا رہبری فرمائیں۔

س۔ تصوّرِ شیخ بالقصد نہ کیا جائے اور اگر بلا قصد ہو جائے تو کچھ حرج نہیں، بدنظری کا علاج اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا استحضار اور نگاہوں کو ہمیشہ نیچی رکھنا ہے جو ہمّت سے ہوتا ہے۔

غ۔ اعمال تو ویسے نہیں دل میں بار بار تڑپ یہ پیدا ہوتی ہے کہ کبھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت عالمِ رویا میں نصیب ہو ـــــــــ یا کم از کم مولانا تھانوی رحؒ ہی کی زیارت ہو جائے۔ (اب تو اس تجویز بدل سے دل کانپتا ہے، حضرت تھانویؒ کی شان جیسی بھی اعلیٰ سہی مگر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبۂ قدس سے اس کو کیا نسبت ـــــــــ اس لئے بطور بدل پیش کرنا کیسی گستاخی ہے، اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں)۔

س۔ بے شک یہ بڑی جرأت کی بات ہے تاہم کثرتِ درود سے یہ نعمت حاصل ہوتی ہے!

غ۔ دل تو بہت چاہتا ہے کہ نیک اعمال کروں اور جہاں تک ہو سکے برائیوں سے بچتا رہوں لیکن مجاہدہ کی قوّت بہت کم پاتا ہوں اور جب اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اخروی مراحل کیونکر طے پائیں گے۔

س۔ یہ فکر یوں ہی قائم رہنی چاہیئے، اخیر عمر تک یہ اُدھیڑ بن اسی طرح رہے یہ بہت اچھا حال ہے، تاہم ناامیدی کی بھی کوئی وجہ نہیں، گو ہم اس لائق نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت تو عظیم ہے!

غ۔ احقر نے بعض مرتبہ اچھی طرح غور کیا تو پتہ چلا کہ دراصل توحید کا اقرار صرف زبانی ہے، قلب میں اس کے اثرات پائے نہیں جاتے حضرت والارح میرے قلب کو مسلمان کر دیں تاکہ توحید کے جتنے مفاہیم عقل سمجھتی ہے اور زبان ادا کرتی ہے، دل اس کی تصدیق کرنے لگے اور عمل سے اس کا اظہار ممکن ہو۔

س۔ توحید کا بڑا مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ ہر کام اور ہر معاملہ میں ہمارا الٰہ ہو اور اس کے سوا کسی میں نفع وضرر اور عطا وعدم عطا کی قوت نہیں، سب اوس کے اذن ومشیت سے ہوتا ہے، وہی جو چاہتا ہے سو ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا سو نہیں ہوتا، سارا عالم اوس کے زیر فرمان ہے اوس کے سوا کسی دوسرے پر حقیقی نافع وضار اور معطی ومانع ہونے کا گمان بھی نہ ہو۔

غ۔ حضرت والارح دعا فرمائیں کہ یہ نام کا غلام محمدؐ عمل کا غلام محمدؐ بن جائے اور اس کو ذات اقدس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ نسبت باطنی کا شرف بھی حاصل ہو جائے

فقط

ننگ اسلام، احقر غلام محمدؐ

س۔ دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی بندگی اور عبودیت اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وتعظیم واتباع کی دولت عطا فرمائیں۔

ہیچمداں سلیمان

(کیا اعجاز بیانی ہے کہ جملہ کے آخر جزو میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سہ گانہ حقوق سے بھی آگاہ فرمادیا — تاکہ حتی الامکان ان کی پابجائی کی کوشش ہو سکے)

مکتوب (۲۳)

غ۔ حیدر آباد دکن ۱۰ صفر ۱۳۶۵ھ

حضرت والا دامت برکاتہم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مزاجِ اقدس!

س۔ دارالعلوم ندوہ۔ لکھنؤ

اخی فی اللہ تعالیٰ اسعدکم اللہ تعالیٰ فی الدارین۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' الحمدللہ مع الخیر ہوں!

غ۔ ارادہ ہے کہ اس سال اِل، اِل، بی (ابتدائی) کے امتحان میں شریک ہوجاؤں، بشرطیکہ حضرت والا مناسب تصوّر فرمائیں۔

س۔ اگر طبیعت قانون سے مناسبت رکھتی ہو تو بدرجۂ مجبوری اس کو بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔

(اپنی طبیعت کو قانون اور ریاضی سے کبھی کوئی مناسبت ہی نہیں رہی، اس لئے ان امتحانوں کا ارادہ کبھی پورا نہ ہوسکا)

غ۔ مجلس اتحّاد المسلمین کے بعض معاملات میں پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے اور انتشار کے آثار نمایاں ہیں، موقع کی نزاکت کا اعتبار کرتے احقر نے بعض احباب کے ساتھ مل کر ان کاموں میں کچھ عملی دلچسپی لی لیکن اس کی وجہ سے یوں محسوس ہورہا ہے کہ تعلق مع اللہ نسبتاً کم ہورہا ہے، حالانکہ کوئی بات خلافِ شرع کی گئی نہ نیت فاسد تھی اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی؟

س۔ اختلاط مع الانام بے شبہ تعلق باللہ میں حارج ہے گو اپنی نیت صحیح ہو جس کا ثواب ملے گا مگر نجاستوں کی پلیدی سے تو چارہ نہیں، اگر کوئی کوئلے کے گرد و غبار کو حُسنِ نیت سے صاف کرے تو ثواب تو ملے گا مگر ہاتھوں اور کپڑوں میں سیاہی لگنا بھی ممکن ہے!

غ۔ احقر عجیب متضاد کیفیات میں مبتلا ہے، شہر کی زندگی سے دِل روکھا ہوچکا ہے اور جی چاہتا ہے کہ کسی دیہات ہی میں رہ پڑوں تو شاید صحت اچھی ہوجائے لیکن ساتھ ہی بعض رکاوٹیں ہیں جو اس راہ میں حائل اور اشد ہیں، مثلاً علمِ دین سیکھنے کی تڑپ، طبِّ یونانی جس کا مطالعہ جاری ہے، ایسے ہی بعض اور فوائد جو صرف یہیں حاصل ہیں، غرض

کوئی صورت ہر طرح سکون کی دکھائی نہیں دیتی! (یہی الجھن کراچی پہنچ کر پیش رہی مگر جواب اس کا وہی رہا جواب آرہا ہے!)۔

س۔ اس دنیا میں سکون صرف تعلق باللہ اور ترک علائق غیر میں ہے ؎

نہیں جمع دل جمعِ اسباب سے ــــ رہِ جمع دل ذکرِ اللہ ہے (حضرت سیدیؒ)

اللہ تعالیٰ آپ کی آرزو پوری فرمائیں،

حصولِ علمِ دین کی تڑپ مبارک ہو ــــــ سب سے پہلا فرض طلبِ رزق ہے اور اس میں اخلاص نیّت کے ساتھ سعی و محنت بھی مجاہدہ ہے، گھبرانے کی بات نہیں تاخیرِ رزق کی ایک نعمت یہ ہے کہ آپ کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے، رزق امرِ موعود ہے وہ تو ملے گا خواہ اپنی آرزو کے مطابق نہ ہو، سو اس آرزو کو چھوڑ دینا چاہیئے۔

غ۔ بہرحال جو کچھ بھی اور جس کسی حالت میں بھی رہوں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اُس سے تعلق باقی رہے اور بڑھتا جائے ایسا نہ ہو کہ مادّی پریشانیاں دین سے بے پروا کر دیں حضرت والا بطورِ خاص دعا فرمائیں۔

س۔ بحمد اللہ یہ کیفیت بہت مبارک ہے، مادی پریشانیاں جو بندہ کو مضطر بنا کر حق تعالیٰ کی طرف رجوع کر دیں بابرکت ہیں گو مطلوب اللہ تعالیٰ کی عافیت ہی ہے، دلی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دین و دنیا کی نعمت آپ کو نصیب فرمائیں،

غ۔ ذکر حسبِ معمول جاری ہے، ارشاد ہو تو اس میں کچھ اضافہ کروں۔

س۔ بحمد اللہ، اگر وقت ہو اور مشقت نہ ہو تو کچھ اضافہ کیا جائے۔

غ۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ جب اپنے آپ پر غور کرتا ہوں تو نہ دین کے کسی کام کے لائق پاتا ہوں نہ دنیا کے ــــ جس قسم کی صلاحیت بظاہر اپنے اندر پاتا ہوں اس کے نشو و نما کے مواقع فراہم نہیں، اور جو صلاحیت مفقود ہے وہ کام کرنے پڑ رہے ہیں، اب تک نہ دنیوی مستقبل ٹھیک نظر آتا ہے، نہ دینی، اللہ فضل کرے!

س۔ چونکہ ہم اپنے ذہن میں پہلے اپنی خواہش سے کچھ آرزوئیں مقرر کر لیتے ہیں اس لئے اون کے نہ ملنے سے ہم ملولِ خاطر ہوتے ہیں، اگر رضا بالقضا پر عمل کیا جائے کہ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی مشیت و مصلحت سے ہے اور اسی میں حکمت ہے تو غم اور ملال نہ ہو۔ جو افسردگی کا باعث ہے۔

(حصولِ راحت کا گُر اس کے سوا کوئی اور ہو بھی سکتا ہے؟)

غ۔ حضرت والا کا قرب نصیب ہونا تو بہت سی غلط باتیں از خود رفع ہو جاتیں، مگر اس کا موقع بھی حاصل نہیں۔

س۔ انشاءاللہ تعالیٰ یہ موقع ممکن ہے کہ آئے۔

غ۔ حضرت والا کی خاص دعاؤں کا محتاج ہوں۔

احقر العباد غلام محمد

س۔ آپ کے لئے ہمیشہ دُعا کرتا ہوں، والسّلام

یہیچمداں سُلیمان ، ۱۶ صفر ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۲۴)

(اس وقت احقر کی کتاب "قائدِ ملت" سوانح بہادر یار جنگ مرحوم چھپ کر نکل آئی تھی اب کی مرتبہ جو احوال نامہ خدمت سلیمانی میں پیش کیا گیا تو اس کے ساتھ اپنی تالیفِ حقیر کا ایک نسخہ بھی ہدیہ کر دیا گیا تھا، اس ہدیہ سے متعلق حضرت والا نے ایک الگ کاغذ پر جواب عطا فرمایا، پہلے یہ مکرمت نامہ ملاحظہ کیجئے اور پھر احوال نامہ!!)

س۔ آعظم گڈھ

برادر عزیز القدر ارشدکم اللہ تعالیٰ، السّلام علیکم

اٹھارہ روز کے لئے وطن گیا ہوا تھا، واپسی پر کتاب ملی، جا بجا سے پڑھی، آپ نے جس

جذبہ سے کتاب لکھی ہے، صحیح لکھے ـــــ معارف میں ریویو ہوگا،

قلم میں احتیاط معلوم ہوتی ہے۔ غلو اور عدم اعتدال سے بات غلط بھی ہو جاتی ہے اور تاثیر سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔

دعا ہے کہ آپ کو مزید توفیقاتِ خیر حاصل ہوں۔ والسّلام

سیّد سلیمان ۲۷، ربیع ۱۳۶۵ھ

’احوال نامہ‘

غ۔ حیدر آباد دکن

۶، ربیع الاوّل ۶۵ھ

حضرت اقدس واعلیٰ مد فیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ اقدس!

س۔ آعظم گڈھ

اخی فی اللہ تعالیٰ اذاقکم اللہ تعالیٰ عرفانہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ الحمدللہ کہ فقیر بخیریت ہے، سفر کے باعث جواب میں تاخیر ہوئی، انتظار کی معافی چاہتا ہوں، (اللہ رے تواضع، اپنے خدام کے ساتھ یہ معاملہ ہے)

لے وہ جذبہ یہ تھا کہ لوگوں نے بہادر یار جنگ مرحوم کو محض ایک قومی لیڈر سمجھا حالانکہ وہ ایک سچے اور پکے مسلمان اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثار اُمتی تھے، ان کی خاموش تبلیغی مساعی جس کی وجہ سے (۲۰) ہزار ہندو مسلمان ہو گئے، اُن کی راتوں کی گریہ وزاری، اور اُمت محمدیہؐ سے سچی محبت اور اس کی بے لوث خدمت گذاری وہ اوصاف تھے جو عوام کی نگاہ سے مخفی تھے، میرا مدعا یہی رہا کہ اُن کی ظاہرہ فتح مندیوں کے پیچھے جو باطنی موثرات کارفرما تھے، اُن کو اُجاگر کردوں، بحمداللہ کہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے اس جذبہ کی توثیق فرمادی!

غ۔ آج سے ایک سال قبل "اشرف السوانح" پڑھنے کا شرف حاصل ہوا تھا اور اب پھر اس کی سعادت ملی ہے، لیکن تاثرات جُدا ہیں، گذشتہ مرتبہ بار بار یہی حسرت پیدا ہوتی تھی کہ کاش مولانا تھانویؒ کی صحبت میسّر آتی، لیکن اب کی بار یہ خیال راسخ ہوتا جاتا ہے کہ "مردِ کامل" میسّر ہے اپنے آپ کو اس کے آگے "پامال" کرنے کی ضرورت ہے ـــــــــ اللہ تعالیٰ اس بے ہمت کی مدد فرمائیں۔

س۔ آپ کا پہلا جذبہ تحسّر کا تھا جو ممدوح ہونے کے باوجود مفید عمل نہ تھا، موجودہ جذبہ قناعت کا اور موجود کی قدر پر ہے، اگر اس سے بھی استفادہ نہ کیا گیا تو صاحبِ سوانح کے برکات سے محرومی ہی رہے گی، یہ جذبہ محرّک عمل اور مفیدِ عمل ہے اور اسی کی ضرورت تھی سو بحمداللہ پیدا ہو گیا، (کیا جوابِ لاجواب ہے، سبحان اللہ)،

غ۔ حضرت والا سے عقلی و طبعی عشق بڑھتا جارہا ہے، البتہ اس میں دو متضاد کیفیتیں محسوس ہوتی ہیں، کبھی جی چاہتا ہے کہ ہر ایک کو حضرتِ والا کا خادم بنادیا جائے اور کبھی جی چاہتا ہے کہ بس ایک احقر ہی حضرت والا کا خادم ہو اور حضرت والا کی تمام تر توجہات اسی ایک پر ہوں۔

س۔ یہ دونوں جذبے درست ہیں اور دونوں کیفیتیں محبّت پر دال ہیں، محبّت کے یہ دونوں رنگ ہیں۔

پہلا ـــــــ یار کا کلمہ پڑھیں ہندو مُسلماں تو سہی

دوسرا ـــــــ باسایہ ترانمی پسندم

(آہ! اب ایسے پُرشفقت و دلربا جوابات کون دے گا)

غ۔ حسبِ ہدایت خالی اوقات میں استغفار یا درود شریف پڑھا کرتا ہوں مگر بعض دفعہ صرف زبان ہی مشغول رہتی ہے، ذہن کہیں اور ہی ہوتا ہے!

س۔ کوئی حرج نہیں، یہ بات بھی انشاءاللہ جاتی رہے گی۔

غ۔ چند دنوں سے اپنے سوا کسی اور کے لئے دعا کرنا مشکل ہو گیا ہے جونہی کسی اور کے لئے ایک آدھ کلمہ زبان سے نکلتا ہے تو یہ خیال آجاتا ہے کہ تیری ہستی ہی کیا ہے جو تو دوسرے کی سفارش بارگاہ رب العزت میں کر رہا ہے، اور تو جس کی سفارش کر رہا ہے وہ تو تجھ سے بہر حال بہتر ہے، بس ع ___ تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

س۔ جی ہاں، یہ کیفیت ہے، بات تو یہی ہے مگر ہم اس پر مامور ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں دعائے خیر کریں، یوں تو ہم ایسے ہی ناقابل مگر رب العالمین نے اپنی غایت کرم سے ہم کو یہی حکم دیا ہے کہ تم ہر حال میں جیسے بھی ہو، دُعا کرو اور مانگو، اس لئے یہ حکم بجالانا ہے وہ اپنی ربوبیت اور رحمت سے قبُول فرمائیں گے۔

(یعنی نقطۂ نظر کو بدل دیا گیا کہ محرّکِ دُعا تعمیلِ حکم الٰہی ہے اور بس)

غ۔ بعض دفعہ تنہائی میں اشعار گنگناتا ہوں تو ایک خاص کیف محسوس ہوتا ہے، اس میں کوئی حرج تو نہیں؟

س۔ تنہائی میں کوئی حرج نہیں!

غ۔ پہلے طبیعت تقریر کی طرف مائل تھی اور خیالات کی فراوانی محسوس ہوتی تھی، اب حالت برعکس ہے حتیٰ کہ بعض دفعہ کسی معمولی سوال کا جواب بھی بن نہیں پڑتا، البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیچیدہ اور مشکل سوال کا نہایت آسان اور تشفی بخش جواب ذہن میں ایسا آجاتا ہے کہ خود کو بھی حیرت ہوتی ہے۔

س۔ یہ حالت حسبِ توقع ہے، پہلے معرفت حاصل نہ تھی، اب ہو رہی ہے من عرف ربہ فقد کلّ لسانہ اور دوسری چیز نعمت ہے جو اس معرفت کا نتیجہ ہے،

غ۔ بعض مرتبہ قرآن مجید پڑھنے کی رغبت نہیں ہوتی لیکن جب طبیعت پر جبر کر کے کلام پاک کھولتا ہوں اور چار چھ آیات تلاوت کر لیتا ہوں تو فوراً دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

س۔ سب کیفیات مستحسنہ ہیں، یہی اس ہدایت کا مصداق ہے، الّذین جاھدوا فینا

لنھدینھم سبلنا ـــــــ پہلے مجاہدہ ہوتا ہے پھر ہدایت ہوتی ہے۔

غ۔ حضرت والا کا خیال تھا کہ حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح مرتب فرمائیں، امید ہے کہ یہ کام انجام پا رہا ہوگا اگر حضرت والا کے ہاتھوں یہ کام ہوگیا تو اس کی نوعیت بہت اعلیٰ وانفع ہوگی۔

س۔ انشاء اللہ دعا کیجئے کہ اتمام کی مہلت ملے۔

غ۔ آج کل اپنی کوتاہیوں اور برائیوں کا احساس تو الحمد للہ بہت ہے لیکن قوتِ مجاہدہ کم ہے۔

س۔ مجاہدہ یہی ہے کہ ہمت وعزیمت کو کام میں لایا جائے، یہی کمیٔ قوت کا علاج ہے۔

غ۔ حضرت والا سے درخواست ہے کہ اس بے عمل کے لئے استقامتِ دین کی دعا فرمائیں،

فقط خادم غلام محمدؐ

س۔ دلی دعا ہے، والسّلام ہیچمداں سُلیمان ۲۷، ربیع الاوّل ۱۳۶۵ ھ

مکتوب (۲۵)

غ۔ حیدرآباد دکن

۱۲، ربیع ۲ ۶۵ھ

حضرت اقدس واعلیٰ مدفیوضہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

الحمد للہ حضرت والا کی ہدایات پر عمل جاری ہے، استحکام ودوام کے لئے دعا کی درخواست پیش ہے۔

س۔ اعظم گڈھ

اخی العزیز زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

بڑی بات ہے، موفقِ حقیقی تعالےٰ مجدہٗ کا شکر ادا کیجئے کہ وہ آپکو استقامت کے ساتھ لے چل رہا ہے[1]

---

[1] گویا پتہ کی بات یہ بتلادی ہے کہ نعمت حاصلہ کے دوام وترقی کا راز یہ ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے کیونکہ وعدۂ ربانی ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ۔

دعا ہے کہ مزید ثبات اور استقامت نصیب فرمائے۔

ع۔ کل رات بعد نماز تہجّد ایک عجیب خواب دیکھا، اطلاعاً درج ذیل ہے۔

احقر اور مولانا عبدالجبار صاحب راستہ سے چلے جا رہے ہیں کہ ایک کافر مصیبت سے تڑپتا ہوا لبِ سڑک دکھائی دیا، میرے دل میں ہمدردی کا خیال پیدا ہوا، ایسے میں کیا دیکھتا ہوں کہ میری ہڈیوں کا ڈھانچہ ایک لکڑی کے تختہ پر ہَوا میں معلّق اس سے قریب ہونا چاہتا ہے لیکن ہو نہیں سکتا، میں نے مولانا عبدالجبّار صاحب سے کہا کہ دیکھئے میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں مگر کر نہیں سکتا، اس کے ساتھ ہی یہ محسوس ہوا کہ میں اپنے گوشت اور پوست کا پورا جسم اپنے کندھے پر ڈالے ہوئے مولانا کے ساتھ چل رہا ہوں (جیسے کوئی کندھے پر رومال ڈال لیتا ہے) غرض ہم چلتے رہے یہاں تک کہ آبادی سے باہر ایک قبرستان میں پہنچے جہاں ایک قبر قدِ آدم سے بھی زیادہ گہری کُھدی ہوئی تھی، میں نے اپنے گوشت پوست کے جسم کو اس کے اندر ڈال دیا اور ہم دونوں کچھ دور ہٹ کر کھڑے ہوگئے، ایسے میں ایک آواز آئی اور ہم دونوں نے جلدی جلدی قبر کو مٹی سے بھر دیا اور واپس ہوگئے اس کے بعد آنکھ کُھلی طبیعت پر ایک سُکون تھا۔

س۔ یہ کافر نفسِ امّارہ ہے، آپ کی اپنی لاش آپ کا مرتبۂ فنا کے قریب ہونے پر دال ہے حدیث میں ہے عُدَّ نَفْسَكَ مِنَ الْاَمْوَاتِ (اپنے کو مُردوں میں سے گنو)، یہ کیفیت اسی مرتبۂ فنا کی طرف اشارہ کرتی ہے! ایک مشہور عام حدیث صوفیہ میں مروّج ہے، یہ ہے موتوا قبلَ ان تموتوا (مرنے سے پہلے مرجاؤ) یعنی جسمانی موت آنے سے پہلے اپنی نفسانی خواہشوں اور اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بھی تم کچھ وجود رکھتے ہو موت طاری کرلو! (تعبیر کو کسی آیت یا حدیث سے مؤید کر دکھانا یہ خاص مذاقِ سلیمانی تھا)

ع۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہ آئی کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی بزرگ ہستی کا جس سے محبّت ہو ذکر ہو رہا ہو تو غیر اختیاری طور پر دل بھر آتا ہے، حالانکہ جو واقعات زیرِ بیان ہوتے

ہیں وہ غمگین نہیں ہوتے!

س۔ یہ دل بھر آنا محبّت کے اقتضاء سے ہوتا ہے، اور یہاں کسی محبوب کی بات نہیں، یہ تو اور ہی کیفیت ہے!

غ۔ "بلاغ المبین" کے نام سے ایک کتاب "اہلِ حدیث" حضرات کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور اس کو مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح بتایا گیا ہے، کیا یہ کتاب واقعتاً شاہ صاحب کی ہے، اگر ہے تو اس میں بعض مسائل ایسے ملتے ہیں جن میں شدّت حدِ اعتدال سے زائد ہے اور خود حضرت شاہ صاحب کے عمل سے اس کی تردید ہوتی ہے مثلاً پیری مریدی کا رد، انتفاعِ قبور کی سرے سے تردید وغیرہ ــــــــــــ حضرت والا حقیقت سے آگاہ فرمائیں۔

س۔ میں نے شاہ صاحب کا یہ رسالہ نہیں دیکھا۔

اوس پیری مریدی کا رد ہوگا جو دوکان دار صوفیہ میں مروّج ہے، اسی طرح اوس انتفاعِ قبور کا رد ہوگا جس سے شرک لازم آتا ہے۔

(بعد میں تحقیق سے پتہ چلا اور خود حضرتِ والا رح نے بھی تصدیق فرمائی کہ یہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیف ہے ہی نہیں بلکہ کسی نے لکھ کر ان کی طرف منسوب کر دی ہے، تاکہ شاہ صاحب کو ماننے والے ان عقائد کو مان لیں ــــــــ اِنا للہ۔ مصلحینِ دین کی یہ بددیانتی!!)

غ۔ حضرت والا رح دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ احقر کو ایمان و عمل صالح کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ احقر غلام محمّد

س۔ آپ کے لئے اور اپنے لئے بھی دلی دُعا ہے کہ ایمانِ کامل اور عمل صالح کی بیش از بیش توفیق ارزانی ہو۔

اُمید ہے کہ آپ تعمیرات میں کام کر رہے ہوں گے۔ آئندہ اس سے مطلع کریں کہ دل

لگا رہتا ہے،

ہیچمداں سُلیمان ۱۸، ربیع ۲، ۱۳۶۵ھ

(اللہ اللہ، کیا شفقت و توجّہ تھی، مجھے تو حضرت والا کی ارادت میں آکر سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض پہلو ایسے سمجھ میں آئے کہ گویا عین الیقین پیدا ہوگیا، منجملہ ان کے حضور اکرمؐ کی مومنین پر "رحمت ورافت" کی کیفیت کا اندازہ اور اس کا یقین کامل اسی وقت پیدا ہوا جب میں نے حضرت سیّدی قدس سرّہ کو خود میرے اپنے معاملات میں اور دوسرے برادرانِ طریقت اور اس سے بھی بڑھ کر عامۃ المسلمین کی عام تکالیف میں انتہائی مضطرب و پریشان ہوتے، اور ان کے درد کی حتی الامکان درمانی فرماتے اور ان کے لئے مچل مچل کر دُعا کرتے ہوئے دیکھا، اور اسی طرح مسلمانوں کی راحت و ترقی سے حضرت کو ایسا مسرور ہوتے دیکھا گویا خود ان کو کوئی بڑی نعمت مل گئی ہے ——— یہ اسوہ نبویؐ کا پرتو نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اس پرتو کے مشاہدہ سے اصل کا یقینِ کامل پیدا ہوجانے تو حیرت کی کون سی بات ہے !!)

مکتوب (۲۶)

غ۔ حیدرآباد دکن

ربیع الثانی ۶۵ھ

حضرت اقدس واعلیٰ مد فیوضہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ اقدس!

س۔ پٹنہ، بھنور پوکھر بذریعہ سیّد ابو عاصم صاحب وکیل

صدیقی الحمیم زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

الحمد للہ مع الخیر ہوں۔

غ۔ محکمۂ معتمدی تعمیرات میں کام کر رہا ہوں، حضرتِ والا رح کی دعاؤں کی برکت سے کام کرنے میں پہلی سی الجھن بھی نہیں رہی، استقلالِ ملازمت کی دعا فرمائیں۔

س۔ بحمداللہ تعالیٰ کہ آپ کو اس طرف سے گونہ طمانیت نصیب ہوئی۔ دعا ہے کہ آپ اس میں مستقل کر دیئے جائیں، آپ کے افسرِ اعلیٰ کون ہیں؟

غ۔ گذشتہ عریضہ میں احقر کے ایک خواب کی جو تعبیر حضرت والا رح نے عطا فرمائی، اللہ تعالیٰ اس کو احقر کے حق میں سچا کر دے لیکن فی الوقت تو احقر نفسانیت اور خبائث میں گھرا ہوا ہے، اپنی طاقت کے مطابق ان سے خلاصی کی کوشش کر رہا ہے حضرت والا رح کی توجہات درکار ہیں ؎

در رشتۂ مرادِ من افتاد صد گرہ
با ناخنِ مژہ مگر ایں عقدہ وا کنند

س۔ اپنے میں نقائص کا نظر آنا مبارک ہے۔ جب تک مرض کی تشخیص نہ ہو علاج کیسے ہو، اب آپ کو اپنے اندر جو عیوب معلوم ہوتے ہیں، دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے اون کے ازالہ کی درخواست کیجئے اور پھر کوشش کر کے اون کے مقتضاآت پر عمل سے احتراز کیجئے، یہی مجاہدہ ہے وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی

غ۔ ا۔ خلافِ طبیعت امور پر غصّہ بہت ہے،

ب۔ حرصِ دنیا کافی ہے گو اس کو دبانے کی کوشش کرتا ہوں۔

ج۔ نفس کو اپنی برتری کی خواہش رہتی ہے۔

د۔ حضوریٔ قلب حاصل نہیں۔

س۔ ا۔ غصّہ کو دبایئے وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ میں بنیئے اور جس وقت غصّہ آئے تصوّر کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو تو ہم پر بہت زیادہ اختیار ہے پھر بھی وہ معاف فرماتا ہے تو ہم کو بھی ایسا ہی چاہیئے۔

ب۔ حرصِ دنیا میں یہ غور کیجئے کہ جس کی حرص ہے وہ کہاں تک ضروری ہے،

ع انچہ مادر کار دایم اکثرش درکار نیست

پھر اوس کی جواب دہی بھی ہے، جس قدر زیادہ ہے اوسی قدر مواخذہ ہے ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ، ہر نعمت کی بازپرس ہوگی ـــــــــ حرص دنیا میں نہیں دین میں ہونی چاہیئے کہ قربِ الٰہی علم حقیقی اور نعیمِ جنت کی حرص میں ترقی ہو۔

ج۔ نفس کی برتری کی خواہش پر عمل نہ کیجئے اور تواضع اختیار کیجئے، اسی سے برتری ملتی ہے مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ،

د۔ حضورِ قلب کا حصول ذکر و شغل کی ترقی کے ساتھ ہوتا جائے گا، انشاءاللہ۔ قلب کو افکار سے خالی رکھنا چاہیئے تاکہ اوس میں نور الٰہی بھر سکے،

(سبحان اللہ کیا اکسیر معالجات تجویز فرمائے ہیں!)

ع۔ البتہ یہ حضرت والا ہی کی دعاؤں کی برکت ہے کہ مذکورہ رذائل کلیۃً غالب نہیں ہوتے اور دین کی فکر غالب رہتی ہے اور بعض دفعہ جو سکون خالت نماز، دعا یا ذکر میں حاصل ہوتا ہے وہ اور کسی صورت میں میسّر نہیں آتا۔

س۔ ایسا تفاوت ہوتا رہتا ہے، اگر دوام ہو تو لطف و لذت نہ ہوگا، جس کو ہر روز پلاؤ ملے گا وہ پلاؤ کے لطف سے محروم ہو جائے گا، یہ بھی اللہ تعالےٰ کی نعمت ہے، اگر سیرابی اور پیاس اور بھوک اور سیری یکے بعد دیگرے صورت بدل کر پیش نہ آتی رہے تو کیا لذتِ طعام اور لذّتِ آب حاصل ہوگی؟

ع۔ مولانا عبد الجبار صاحب کے مشورہ اور اصرار پر بعد نماز فجر قریب کی ایک مسجد میں سیرت طیبّہ بیان کر رہا ہوں، ہفتہ میں دو دن خود مولانا تفسیر و حدیث کا درس دیتے ہیں اور دو دن ایک اور صاحب تاریخ اسلام سُناتے ہیں اور دو دن احقر کے ذمّہ سیرت کا بیان کر دیا گیا ہے، احقر نے صرف دو وجوہ سے یہ خدمت قبول کی ہے: (۱) اس سے مطالعہ

کا موقع ہاتھ آتا ہے (۲) ثواب کا موجب بھی ہے ـــــــ ورنہ کچھ بولنے یا بیان کرنے سے طبیعت گریز کرتی ہے، اگر حضرت والا رح اس بے علم وعمل کے احوال کا اعتبار کرتے اس کو غیر نافع یا قبل از وقت تصوّر فرماتے ہوں تو احقر کو اس سے باز رہنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا اور کسی قسم کی گرانی بھی نہ ہوگی کیونکہ سب سے پہلے تو اپنی فکر ہے!

س۔ کچھ حرج نہیں، مگر بیان کے وقت یہ مستحضر رہے کہ جو کچھ یہ علم اور یہ بیان ہے وہ سب محض فضل الٰہی ہے میں کچھ نہیں، اور یہ نیت ہو کہ اس سے میرا قصد اپنی بڑائی نہیں، بلکہ مسلمانوں کو نفع پہنچانا ہے: فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى اس کا علاج یہ ہے کہ آپ حاضرین کو صاف صاف بتا دیا کریں کہ یہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ فلاں کتاب سے ماخوذ ہے، میں ذاتی طور سے تو جاہل ہوں۔

غ۔ ایک اشکال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ جاہل گروہ جس تک تبلیغ اسلام نہیں ہوئی اور جو حق و باطل ہی میں تمیز نہیں کر سکتے، کیا وہ بھی دوزخ میں جائیں گے؟ اگر ایسا ہو تو بظاہر یہ عدل کے خلاف معلوم ہوتا ہے! حضرت والا رح رہبری فرمائیں،

س۔ یہ کلامی مسئلہ ہے، جس تک تبلیغ نہیں پہنچی اس کو تکلیف بھی نہیں، مگر مسلمانوں کے اندر کون ہے جس تک آواز نہیں پہنچی مگر اس نے تغافل سے کام لیا تو وہ ماخوذ ہوگا۔

غ۔ ذکر اب تک تین ہزار ہو رہا تھا، ایک ہفتہ ہوا کہ ایک ـــــ ہزار کا اضافہ کر دیا گیا ہے استقامت کے لئے دعا فرمائیں۔

س۔ بہت مبارک، ترقی حسب موقع و خواہش کرتے جائیں تا آنکہ کم از کم بارہ۱۲ ہزار ہو جائے۔

غ۔ حضرت والا رح کو میں بذریعہ عریضہ بہت جلد جلد زحمت دیتا رہتا ہوں، اس میں حضرت کو تکلیف تو نہیں ہوتی؟ ـــــــ احقر کا اس میں فائدہ یہ ہے کہ جواب میں ایک حد تک صحبت کا فائدہ محسوس ہوتا ہے، جی نہیں چاہتا کہ اس سے بھی محروم رہا جائے۔

س۔ آپ کا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے، آپ فکر نہ کریں، اس سے خود مجھے دینی فائدہ ہوتا ہے، (یہ ہی

شیخ کا کمال کہ وہ اپنی نسبت یونہی سمجھتا رہے باقی مرید کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اس کا نفع شیخ کی توجہ پر منحصر ہے۔)

ع۔ حضرت والا رح احقر کی دینی و دنیوی فلاح کے لئے دعا فرمائیں۔ احقر غلام محمدؐ

س۔ دل دعا ہے۔

اپنے نام کے ساتھ "بی، اے عثمانیہ" آپ کب تک لکھیں گے، کیا اس سے خط کی حفاظت مطلوب ہے یا کچھ اور؟

ہیچمداں سُلیمان ۱۱ ج ۱ ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۲۷)

ع۔ حیدر آباد دکن

۲۱ ج ۱ ۱۳۶۵ھ

حضرت اقدس واعلیٰ دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"

مزاج مُبارک!

س۔ دیسنہ۔ ضلع پٹنہ

برادر محبوب زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

الحمدللہ مع الخیر ہوں، وطن میں ہوں اور جون کے آخر تک یہیں رہوں گا۔

ع۔ احقر کو اب تک مغالطہ رہا کہ ذکر کی اقل مقدار تین ہزار ہے، اب جو حقیقت کا علم ہوا تو احقر نے اس کی مقدار بڑھا کر بارہ ہزار کر دی ہے اور چار روز سے اس پر عمل پیرا ہے، صحت جسمانی ساتھ دے تو انشاء اللہ محنت سے کبھی دریغ نہ ہوگا ______ حضرت والا رح کی

توجہات عالیہ کے ہوتے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں گے اور ہمت و عزیمت سے سرفرازی ہوگی، حضور احقر کی صحت جسمانی وروحانی کے لئے دُعا فرمائیں۔

س۔ رفتہ رفتہ بڑھائے جیسے ۳ ہزار سے ۴ ہزار پھر ۶ ہزار پھر ۸ ہزار پھر ۱۰ ہزار پھر ۱۲ ہزار تاکہ طبیعت پر گرانی نہ ہو، (اس نصیحت کی قدر بعد کو ہوئی) اور تب ہی سمجھ میں آیا کہ ۳ ہزار سے ۴ ہزار کرنے پر تو مبارک باد ملی اور اب بارہ ہزار کرنے پر کوئی شاباشی کیوں نہیں ملی)،

ع۔ احقر کے افسر اعلیٰ ہوش یار جنگ[1] (ناظر الحسن ہوش بلگرامی مرحوم) ہیں جو زائد معتمد تعمیرات ہیں!

س۔ یہ معلوم ہو کر اطمینان ہوا، وہ میرے دوست ہیں۔

ع۔ مولانا محمد علی صاحب لکچرار دینیات جامعہ عثمانیہ سے حضرت والا ح واقف ہوں گے ان کی صاحبزادی سے احقر کی نسبت قرار پائی ہے ——— بعض دفع اس کے تصوّر سے قلب میں انتشار و اضطراب محسوس ہوتا ہے کہ کہیں شادی کے بعد جو کچھ بھی معمولات ہیں ان میں حرج یا ضعف واقع نہ ہو جائے حضرت والا ح دعا فرمائیں!

س۔ بہت مناسب ہے، انشاء اللہ تعالیٰ توافق مزاج حاصل ہوگا، مولوی صاحب موصوف کو اب حضرت والا رحمہ اللہ کے سلسلہ سے تعلق ہے، (یعنی خود حضرت سیدیؒ ہی کے دست گرفتہ ہو گئے تھے)

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اس تعلق کو بابرکت بنائیں۔

ع۔ "بی، اے" کے حروف اپنے نام کے ساتھ محض حفاظت خط کے لئے لکھتا ہوں ورنہ اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی، خصوصاً حضرتِ والا ح کی خدمت میں تو لکھتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے،

س۔ کچھ حرج نہیں،

---

[1] ہوشؔ کی مثنوی "طوفانِ محبّت" پاکیزہ اور اصلاحی ادب کا مرقع ہے، اور شیعہ ہونے کے باوجود ردِّ تعزیہ داری میں ان کے پرزور مضامین، عجب نہیں کہ سرمایۂ نجات بن جائیں!

غ۔ بہ سلسلۂ دعائے ملازمت حضرت والا رحمہ نے "یَا وَہَّابُ" پانچسو مرتبہ پڑھتے رہنے کی ہدایت فرمائی تھی، کیا اس کو اب بھی جاری رکھا جائے؟

س۔ چھوڑ سکتے ہیں،

غ۔ "حجۃ اللہ البالغہ" کا ترجمہ شائع کردہ کرم بخش صاحب مالک مطبع اسلامی لاہور، احقر کے پاس ہے، اس ترجمہ کے متعلق حضرت والا رحمہ کی کیا رائے گرامی ہے؟

س۔ یہ ترجمہ جا بجا غلط بھی ہے اور اکثر ناقابلِ فہم، بہرحال آپ کو اگر کہیں مغالطہ پیش آئے تو پوچھ لیں،

غ۔ حضرت والا رحمہ احقر کے لئے فلاح دارین کی دعا فرمائیں، احقر العباد غلام محمدؐ

س۔ دلی دعا ہے کہ آپ کو دین و دنیا کی فلاح وسعادت اور استقامت نصیب ہو۔ والسلام

ہیچمداں سُلیمان ، ج ۲ ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۲۸)

غ۔ حیدرآباد دکن

۱۶ ج ۲، ۱۳۶۵ھ

حضرت اقدس واعلیٰ مدفیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مزاج اقدس!

گذشتہ شفقت نامہ میں حضرت والا رحمہ نے احقر کو نصیحت فرمائی ہے کہ ذکر کی مقدار بتدریج بڑھانی چاہیئے تھی۔ لیکن احقر تو اس شفقت نامہ کے صادر ہونے کے قبل ہی بارہ ہزار پر عامل ہو چکا ہے، اب اگر گھٹا کر اضافہ تدریجی کروں تو ڈر ہے کہ حیلہ جو طبیعت کو آئندہ اور امور میں بھی حیلہ بازی کی خو نہ پڑ جائے اس لئے بارہ ہزار کی مقدار کو اس عریضہ کا جواب ملنے تک جاری رکھوں گا، آگے جیسا ارشاد ہو، حضرت والا رحمہ دوام کے لئے دعا فرمائیں،

س۔ دیسنہ، ضلع پٹنہ

اخی فی اللہ تعالیٰ دام توفیقکم للخیر والسعادۃ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

الحمدللہ مع الخیر ہوں،

اللہ تعالیٰ دوام واستقامت بخشیں،

غ۔ دو مقامات پر غیبت زیادہ ہوتی ہے، ایک دفتر، دوسرے گھر ــــــ ابتدا غیبت سننے سے ہوتی ہے اور بسا اوقات انتہا غیبت کرنے پر!! حضرت والا اس سے حفاظت کی کوئی تدبیر بتائیں۔

س۔ تدبیر اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ نہ سُنیں یا احباب کو منع کریں، اوس مقام سے اوٹھ جائیں یا اوس کی (جس کی غیبت ہو رہی ہو) تعریف کرنے لگیں،

غ۔ "اناعرضنا الامانۃ الخ" والی آیت پاک میں" امانت" کا معین مفہوم کیا ہے؟

س۔ امانت، اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کے وہ عکوس وظلال ہیں جو بندہ کو بطور خلافت ملے ہیں پوری توضیح راندیر والے خطبہ" الجہد والجہاد لعلمی المعاش والمعاد" میں کی جا چکی ہے اور آپ پڑھ چکے ہیں،

غ۔ احقر کی فلاحِ دین کے لئے حضرت والا دعا فرمائیں، احقر غلام محمد عفی عنہ

س۔ دل سے دعا بدرگاہ حق تعالیٰ ہے۔ ہیچمداں سید سلیمان ۲۶ مئی ۱۹۴۶ء

مکتوب (۲۹)

غ۔ حیدرآباد دکن

۶ رجب ۱۳۶۵ھ

حضرت مولانا و مخدومنا دام الطافہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مزاج مبارک!

حضرت والاؒ کی احقر کے حال پر جو مہربانیاں ہیں اور حضرت کو احقر کی دینی و دنیوی فلاح کی جو فکر رہتی ہے (دنیوی فلاح کی فکر کا یہ واقعہ ہوا تھا کہ حضرت والاؒ نے بلا میرے عرض کئے ہوئے از خود ہوش یار جنگ مرحوم معتمد وزارت تعمیرات کو ایک پر زور سفارشی خط تحریر فرما دیا تھا کہ وہ میری ترقی کا خاص طور پر خیال رکھیں) اس سے ایک اندازہ ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مومنین کی ہمہ جہتی فلاح کی کتنی فکر رہتی ہوگی ______ یہ باتیں اب محسوس ہو رہی ہیں!

س۔ اعظم گڈھ

اخی فی اللہ تعالیٰ ادام اللہ توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

الحمد للہ مع الخیر ہوں،

اللہ تعالیٰ سچّی پیروی کی توفیق بخشیں۔

ع۔ چند روز سے طبیعت میں اک طرح کا انقباض تھا، الحمد للہ کل شام سے حالت اعتدال پر ہے،

س۔ بحمد اللہ،

ع۔ مسجد کے پہلو یا صحن مسجد میں قبر بنانا یا جہاں کسی بزرگ کا مزار ہو اس کے قریب مسجد تعمیر کرنا درست ہے یا نہیں؟

س۔ درست ہے۔

ع۔ "خاتمۃ السوانح" (مولانا تھانوی قدس سرہٗ کی سوانح کا آخری حصّہ) پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، جیسے ہی کتاب ختم ہوئی قلب میں ایک اضطراب بپا ہوا اور ہیبت طاری ہوئی کہ اپنی اس موجودہ حالت میں موت آگئی تو کیا حشر ہوگا؟

س۔ بہت اچھا احساس ہے، مُبارک!

ع۔ شبہ یہ ہے کہ اصطلاح صوفیہ میں جسے "طےِ سلوک" کہا جاتا ہے کیا یہ شرعاً ضروری ہے،

اگر ہے تو اس کی اہمیت کس قدر ہے؟ فرائض کے برابر یا نفل کے درجہ میں؟

(یہ سوال کتنے ذہنوں کی خلش کی نمائندگی کر رہا ہے اس لئے جواب بھی ذرا غور سے سنیئے)

س۔ اوس کے مقاصد جو ہیں وہ حسبِ درجات فرض یا سنت یا مستحب ہیں مگر اوس کے ذرائع جو اہلِ سلوک نے لکھے ہیں وہ اکثر اجتہادی ہیں اور بعض منصوص بھی ہیں، اس لئے اجتہادی کا درجہ کمتر اور منصوص کا درجہ ضروری کا ہے، غرض سب کا یکساں حال نہیں اجتہادی امور کا قبول ضروری نہیں، اگر ان اجتہادی ذرائع سے بہتر ذرائع ہوں تو ان کو اختیار کیا جائے۔

(کیا ایجاز ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور کیا عدل ہے کہ کوئی بات اپنی حد سے تجاوز نہ کر سکی۔)

غ۔ کیا صحابائے کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم کے زمانہ میں تربیت نفس کے ایسے ہی یا اس کے مماثل طریقے ملتے ہیں جو آج رائج ہیں؟

س۔ بعض تھے، بعض نہ تھے، مثلاً کثرت نوافل، کثرت ادعیہ، اتباع سنن، کثرتِ تلاوت وغیرہ امور موجود تھے البتہ ذکر و فکر کے رائج الوقت طریق نہ تھے اور نہ اون کو ان کی ضرورت تھی (کیونکہ وہ سرچشمۂ فیضؐ سے راست فیضیاب تھے)،

غ۔ ڈرتے ہوئے اپنی اس کیفیت کا اظہار کر رہا ہوں کہ گو عقلاً چاروں خلفائے کرامؓ کا احترام ملحوظ رہتا ہے لیکن حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہی سے زیادہ عشق محسوس ہوتا ہے ــــ حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ سے نہیں۔ یہ بات اس وجہ سے بھی ظاہر کی ہے کہ اکثر کہا جاتا ہے کہ بیشتر سلسلے حضرت علیؓ سے ملتے ہیں اور احقر کو حضرت علیؓ سے عشق کی لگاوٹ نہیں، کہیں یہ حالت احقر کے لئے مضر اور اس راہ میں حائل تو نہیں؟

والسّلام احقر غلام محمدؐ

س۔ یہ اعتقاد کہ یہ چاروں خلفاء اللہ تعالےٰ کے مقبول اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے محبوب تھے ضروری ہے لیکن دل کا رجحان ان میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، مگر (کسی کی بھی) تنقیص نہ ہو ـــــــــ مناسبت الگ چیز ہے وہ ہر ایک کو ہر ایک سے یکساں نہیں ہوتی اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم،

ہیچمداں سُلیمان ۲۰ جون ۱۹۴۶ء

مکتوب (۳۰)

افسوس کہ گُم ہو گیا، مگر اس کا مضمون عام اہمیت کا نہ تھا، ـــــــــ خبر تھی کہ قریب میں حضرت علامہ قدس سرہٗ حیدر آباد دکن تشریف لائیں گے، اس کی توثیق مانگی گئی تھی اور جواب امید افزا نہیں بلکہ حسرت خیز ملا تھا۔

مکتوب (۳۱)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲ رمضان ۱۳۶۵ھ

حضرت مولانا و مخدومنا مدظلکم العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ مُبارک!

والا نامہ پڑھ کر رنج ہوا کہ حضرت والا کی تشریف آوری کی جو امید تھی وہ ٹوٹ گئی احقر تو اپنی حد تک یہ محسوس کرتا ہے کہ بلا صحبتِ شیخ اصلاح جیسی ہونی چاہیئے نہیں ہو سکتی (اور اب تو یہ احساس احساس نہیں رہا بلکہ ایقان کا درجہ حاصل کر چکا ہے) اور افسوس کہ نہ حاضری کی سہولت فراہم نہ بُلانے کی سکت موجود!

س۔ بھوپال، عقب موتی مسجد

۹ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ

اخی وحبیبی فی اللہ تعالیٰ زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ‘۔ الحمدللہ تعالیٰ خیریت ہے۔

بے شبہ آپ کو تکلیف ہوئی ہوگی جو نتیجہ ہے آپ کی اوس محبّت کا جو آپ کو اس ہیچداں کے ساتھ ہے، آپ کو جب فرصت یا رخصت مِل سکے یہاں آسکتے ہیں، ممکن ہے کہ کبھی میرا آنا ہو، وہاں مولوی محمود الغنی صاحب دام فیضہٗ کی صحبت غنیمت سمجھیں۔

غ۔ ذکر جاری ہے، اس سلسلہ میں ایک بات قابل عرض ہے، پہلے پہل تو نفس کا کید سمجھتا رہا لیکن اب اس میں کچھ حقیقت محسوس ہوتی ہے، ذکر کی وجہ سے سینہ اور دماغ پر بڑا بار محسوس ہو رہا ہے، ڈاکٹر اور طبیب سے مشورہ کیا تو کوئی مرض نہیں بتاتے، معلوم نہیں شیطانی دھوکا ہے کیا؟ ——— اطلاعاً عرض کر دیا۔

س۔ یہی بات تھی جو میں نے آپ سے کہی تھی جب آپ نے دفعتہً بارہ ہزار کی تعداد بڑھائی، اب آپ کم کر دیں مثلاً ـــ ہزار یا اس سے بھی کم، اس کے بعد دیکھیں کہ شکایت مذکور میں کچھ کمی ہوئی ——— بادام کا استعمال کریں۔

غ۔ رمضان المبارک کی وجہ سے تلاوت قرآن شریف کی مقدار بڑھا دی ہے۔

س۔ اچھّا کیا، ان ایّام مبارکہ کو اسی عبادت سے مناسبت ہے!

غ۔ حضرت والا دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کسی بہانے قرب شیخ کی دولت سے سرفراز فرمائے بعض مرتبہ مچل کے رہ جاتا ہوں مگر کوئی صورت نظر نہیں آتی،

س۔ اللہ تعالےٰ صحبتِ خیر کی صورتیں فرمائے، (مطلق "صحبتِ خیر" کے الفاظ وجد آفریں ہیں)

غ۔ اپنی خستہ حالی پر غور کر کے پریشانی ہوتی ہے کہ گناہ تو بے حد و حساب لیکن نیکیوں میں اضافہ کی ہمّت و طاقت مفقود!

س۔ یہی کیفیت موجبِ ترقی ہے، یہی خیال چاہیئے، انشاء اللہ اسی سے اعمال صالحہ میں ترقی ہوگی،

غ۔ حضرت والا اس گنہگار کے لئے دعا فرمائیں اور گو اس لائق نہیں لیکن اپنی جوتیوں سے قریب تر رکھیں تو احقر کے لئے باعثِ سعادت و فلاح دارین ہوگا۔

فقط توجہ کا طالب احقر غلام محمدؔ

س۔ اللہ تعالیٰ میری اور آپ کی تقصیرات کو معاف کریں اور توفیقات خیر سے اس عاجز ہیچمداں کو اور آپ کو بہرہ ور فرمائیں،

ہیچمداں سُلیمان ۹، رمضان ۱۳۶۵ھ

بھوپال کی پہلی حاضری

(۲۰ رمضان المبارک تا ۲ شوال ۱۳۶۵ھ)

۲ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ کا مکتوب ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، راقم کے عریضہ سے اشتیاق زیارت اور حالات کی نامساعدت دونوں ہی کا اندازہ ہو گیا تھا، مگر یہ حضرت شیخ قدس سرہٗ کی دعا کا اثر تھا کہ اسی ماہ مبارک میں دفعتہً حالات موافق ہو گئے دفتر سے رخصت بھی مل گئی اور سفر کا سارا بندوبست بھی ہو گیا، خوشی خوشی عزم کر لیا کہ ماہِ صیام کا آخری دہا حضرت شیخ کی صحبت فیضدرجت میں گذاروں گا، جب اپنے اس عزم کی اطلاع مولانا محمود الغنی صاحب مدظلہٗ کی خدمت میں کی تو موصوف نے ازراہِ کرم یہ فرمایا کہ بھوپال پہنچ کر بیعت کی درخواست ضرور کر دینا، میں نے اس کی تعمیل میں کچھ تامل ظاہر کیا اور اس درخواست کی جرأت سے بے ہمتی ظاہر کی تو ارشاد فرمایا کہ اگر آپ کی ہمت نہیں ہوتی تو میری طرف سے عرض کر دیجئے، باقی اس معاملہ میں تکلف نہ کیجئے ____ غرض اس ارشاد کو ذہن میں محفوظ کر کے، اور مولانائے موصوف اور والدین کی پاک دعاؤں کو لے کر پہلی مرتبہ اللہ کی محبت و رضا کے حصول کے لئے ایک اللہ والے کی زیارت کو چلا،

اب جہاں تک یاد پڑتا ہے انیسویں شب کو ۸ بجے حیدرآباد سے روانگی ہوئی، اور بیسویں شب کو بعد مغرب بھوپال اسٹیشن پر جا پہنچا،

حضرت اقدسؒ کی طرف سے چونکہ حاضری کی اجازت مل ہی چکی تھی، اس لئے اپنی حاضری کی تاریخ کا محض اطلاعی عریضہ خدمتِ والا میں گذران چکا تھا، اسٹیشن پر پہنچ کر ابھی سامان اٹھوا

رہا تھا کہ کانوں میں ایک پکارنے والے کی آواز پڑی کہ "غلام محمد صاحب! غلام محمد صاحب!" کی صدا لگا رہا ہے، میں نے بڑھ کر اس کو سلام کیا، یہ تھا امداد علی حضرت والاؒ کا موٹر ڈرائیور اور اسی کے ساتھ تھے فرزند دلبند سید سلمان صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ووفقہ، اس وقت صاحبزادہ سلمہٗ کی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں، سر پر مدنی رومال باندھے، شیروانی میں ملبوس ایک ادنیٰ خادم بارگاہ سلیمان کو لینے کے لئے تشریف لائے تھے ——— اس کرم فرمائی سے دل مجوب ہو گیا،

حضرت والاؒ کی قیام گاہ پر ہم لوگ پہنچے، حضرت اقدس عشاء کی نماز کے لئے متصلہ ایک چھوٹی قدیم مسجد میں تشریف لے جا چکے تھے، میں نے بھی فوراً وضو کیا اور کھانا کھا کر مسجد پہنچ گیا، غالباً ۹، ۹½ بجے ہوں گے، تراویح کے لئے جماعت کھڑی ہو چکی تھی، میں فرض پڑھ کر تراویح میں شریک ہو گیا اور جب نماز ختم ہو چکی تو مسجد ہی میں حضرت شیخ کی زیارت سے مشرف اور مسرور ہوا یہ ۶۵ھ کے ماہِ صیام کی بیسویں شب تھی،

یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت والاؒ کو قاضی القضاۃ کی حیثیت سے بھوپال تشریف لائے ابھی ڈیڑھ دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہ ہوا تھا، بھوپال کی عالی شان "موتی مسجد" (غالباً دورِ مغلیہ کی یادگار) سے قریب دفتر قضاۃ اور اسی عمارت کے ایک حصہ میں حضرتِ والاؒ کی قیام گاہ تھی، حضرت والاؒ کے ساتھ اس وقت صرف صاحبزادہ سلمان میاں تھے، محل میں سے ابھی تشریف نہیں لائی تھیں، شیخ قدس سرہٗ نے اس ناکارہ پر یہ کرم فرمایا کہ اپنے کمرہ سے متصلہ کمرہ میں قیام کا حکم فرمایا، جہاں ہر طرح کا آرام تھا،

رقم خوراکی پیش کرنے پر منشائے ثروت کی تفہیم

چونکہ بھوپال کے لئے میں بالکل اجنبی تھا اس لئے پہلے ہی حضرت والاؒ کی خدمت میں لکھ چکا تھا کہ قیام کے انتظام کا حضرت کے توسط سے امیدوار ہوں باقی کھانے کا انتظام ہوٹل میں بہ آسانی ہو جائے گا، صبح تفسیر کلام پاک کے بعد جب حضرت کی خدمت میں حاضر تھا تو عرض کیا کہ شام سے کھانے کا انتظام ہوٹل میں کر لوں گا، ارشاد فرمایا "نہیں، میرے ہی ساتھ کھا لیجئے"۔

_______ میں یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ حضرت کی خدمت میں کچھ رقم بطور خوراکی گذران دوں گا _______ مگر رقم کے تعین میں بڑی ذہنی کشمکش رہی، بالآخر کسی تصفیہ سے عاجز آکر پچاس روپے حضرت والا رح کی خدمت میں پیش کر دیئے کہ جو مناسب تصوّر فرمائیں قبول کر کے ممنون فرمائیں حضرت والا رح نے فوراً پچیس روپیہ اس میں سے نکال لئے اور کچھ دیر تک حیدر آباد کے حالات دریافت فرماتے رہے، روپیہ ہاتھ ہی میں تھا، جب گفتگو ختم ہوئی تو فرمایا کہ اب یہ روپیہ آپ میری طرف سے قبول فرمائیں، حضرت والا رح کے اس معاملہ سے میں لاجواب اور شرمسار ہو گیا، پھر اس کے بعد جو بات فرمائی اگر وہ ہر مسلمان صاحب ثروت کے پیش نظر رہے، تو کم از کم مسلم معاشرہ سے معاشی اونچ نیچ کا یہ موجودہ مہیب فرق آناً فاناً ختم ہو جائے _______ ارشاد فرمایا کہ :-

" اللہ تعالیٰ جب کسی کو دولت و ثروت سے نوازتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ اس پر قبضہ کر کے بیٹھ جائے، بلکہ اللہ تعالےٰ چاہتا ہے کہ اس کو تقسیمِ دولت کا ذریعہ بنائے اور اس کے ہاتھ سے بانٹے، یہ انسان کے لئے کچھ کم شرف نہیں ہےؔ _______ اس وقت میری مالی حالت بحمد اللہ اچھی ہے، آپ اطمینان سے رہیے اور کچھ خیال نہ فرمایئے۔"

اب بتایئے کہ کسی کامل کی صحبت اختیار کئے بغیر حسنِ معاشرت کی باتیں عملی طور پر اس موثر انداز میں سیکھی بھی جا سکتی ہیں؟ سچ یہ ہے کہ عابد و زاہد خواہ کوئی بھی بن جائے لیکن اگر انسان بننا ہے تو کسی انسان کامل ہی کی صحبت اختیار کرنی پڑے گی ورنہ درسِ انسانیت محض کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتا، اسی لئے عارف رومی رح نے فرمایا ؎

ؔ حضرت کا یہ ارشاد ٹھیک اُس قرآنی ہدایت کا آئینہ دار ہے جو قارون کے قصّے میں اہل علم و معرفت کی زبان سے نقل فرمائی گئی ہے کہ انھوں نے قارون سے کہا :

وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ الخ (قصص)

در پئے خو باش باخوش خونشیں   خوپذیریئے گل از روغن ببیں

اسی سلسلہ کی ایک اور بات یاد آگئی جس سے یہ عملی سبق بھی ملا تھا کہ ہر ہدیہ جو اخلاص کے ہاتھوں سے ملے تمام تر تکریم ہی کا مستحق ہے! جب میں گھر سے چلا تھا تو حضرت اقدس کے لئے میں نے تھوڑا سا چنے کا حلوا ساتھ رکھ لیا تھا، یہ حقیر ہدیہ جب خدمت سلیمانی میں پیش کیا گیا تو اس کی ایسی قدر فرمائی گئی کہ پورے دس دن تک روزانہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا تناول فرماتے رہے اور پھر عید کے دن اس کو تحسین و آفرین کے ساتھ سب میں تقسیم فرمایا کہ آج اس کو ختم کر دینا چاہیئے، اسی طرح کسی اور صاحب نے آب زم زم بھجوایا تھا، روزانہ افطار اسی طاہر و مطہر گھونٹ سے فرمایا کرتے تھے اور از راہِ عنایت اس حقیر کو بھی اس سعادت میں شریک فرمالیتے تھے!

ایک شدید وسوسہ اور اس کا کشفی عِلاج

حضرت والا رح کی ان ساری عنایات اور اس یکسوئی کے باوجود جو خدمت گرامی میں حاصل تھی دو ہی تین دن بعد ذہن میں ایک وسوسہ پیدا ہوا کہ یہاں آنے سے حاصل کیا ہوا؟ یہ نماز روزہ تو گھر پر بھی ہو ہی رہا تھا ——— اس وسوسہ سے بچنے کی وہ تمام تدبیریں اختیار کرلیں جو حضرت حکیم الامت رح نے تجویز فرمائی ہیں۔ لیکن وسوسہ تھا کہ شدت ہی پکڑتا جارہا تھا، حتیٰ کہ مسلسل ۲۴ گھنٹہ اسی حالت پر گذر گئے اور حضرت والا رح سے اس سلسلہ میں میں نے نہ کچھ عرض کیا نہ اس کی جرأت کر سکتا تھا ——— دوسرے دن عصر کی نماز کے لئے حضرت والا رح مسجد جارہے تھے اور یہ خادم بھی ساتھ تھا، چلتے چلتے حضرت والا رح دفعتہً رُکے چیں بہ جبیں ہو کر احقر کی طرف دیکھا اور ذرا ترش لہجہ میں فرمایا "تو آپ نے مجھ پر کوئی احسان کیا" بس یہ فرما کر پھر آگے چلے، احقر کو یوں محسوس ہوا کہ کسی نے سر پکڑ کر خوب اچھی طرح جھنجھوڑ دیا، اور وہ وسوسہ کافور تھا ——— بعد افطار جب عاجز نے اپنی اس حالت کا ذکر کیا تو متبسم ہو کر فرمانے لگے :-

ہمارے حضرت والا رح فرماتے تھے کہ جہاں خزانہ ہوتا ہے، چور وہیں نقب لگاتا ہے'

______ "انشاء اللہ آپ کو فائدہ ہوگا" ______ اب سمجھ میں آگیا کہ تمام کتب تصوّف ایک طرف اور شیخ کامل کی نگاہِ کیمیا اثر ایک طرف ______ ایسی ہی مشکلات سے گذرنے کے بعد یہ یقین پختہ ہوتا ہے کہ تصوّف کا بیش بہا کتابی ذخیرہ قیامت تک کسی سالک کو شیخ کامل کے تعلق سے مستغنی نہیں کرسکتا ______ آخر امام السالکین حضرت رومی رحمہ اللہ نے یونہی متنبہ تو نہیں فرمایا ؎

بار باید راہ را تنہا مرو　　　بے قلاوز اندریں صحرا مرو!

درخواست بیعت اور منظوری

اپنے محسن حضرت مولانا محمود الغنی صاحب مدظلہ کی تاکیدی نصیحت برابر یاد تھی کہ بیعت کی درخواست ضرور کردینا، لیکن بار بار خیال یہی آتا تھا کہ آخر کس صورت سے یہ درخواست پیش کی جائے؟ اور اپنی اِن آلائشوں کے ساتھ نسبتِ سلیمانی کو باضابطہ کرکے کیوں اس کی ناقدری کی جائے، مگر مولانائے مکرم کی تاکید ایسی شدید تھی کہ بالآخر یہ درخواست ایک عریضہ کی شکل میں پیش ہی کردی جو درج ذیل ہے:۔

مکتوب (۳۲)

ع۔ حضرت والا مدفیوضہم ودام الطافہم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

حیدرآباد سے تو بڑے اشتیاق سے چلا تھا لیکن یہاں پہنچ کر شرم وحجاب سے عجیب عالم ہے کہ کیوں آگیا؟ کیا صورت لے کر آیا؟

س۔ بھوپال

۲۳ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ

عزیز دلی زادکم اللہ تعالیٰ علماً وعملاً، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ،

یہ عین فطرت ہے کہ جب تک انسان کو کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی، بڑی تڑپ رہتی ہے

لیکن جب مل جاتی ہے طبیعت پر سکون طاری ہو جاتا ہے، یہ سکون عین مطلوب ہے، یہ محبّت کی کمی پر نہیں بلکہ کمال پر دال ہے!

غ۔ ایسا معلوم و محسوس ہوتا ہے کہ نہ کچھ ہوں نہ کچھ ہو سکتا ہوں، مایوسی کے قریب حالت ہے

س۔ یہ دوسری کیفیت بھی محمود ہے اور مقصود بھی، مایوسی کی بات نہیں، ہمّت کی بات ہے کمال مطلوب نہ حاصل ہو سکتا ہے نہ کسی کو مل سکتا ہے، جتنا یہاں اونچا اُڑیئے گا اتنا ہی آپ اپنے کو پست دیکھئے گا،

(سبحان اللہ کیا عرفانی جوابات ہیں، شیخ کامل کے اسی کمال کی عارف رومیؒ نے یوں مدح سرائی کی ہے ؎

زاں کہ او ہر خار را گلشن کند   دیدۂ ہر کور را روشن کند)

غ۔ باطن کا جو حال ہے وہ مخفی نہیں، ظاہرا اتباعِ شریعت بھی پوری نہیں، پھر بھی دِل چاہتا ہے کہ حضرت سے بیعت کی درخواست کی جائے، شاید اس کے برکات سے حالت کچھ سُدھر سکے۔

س۔ ظاہر و باطن میں اپنے نقص کا احساس ہی اصلاح کی بنیاد ہے، آپ نے بیعت کی خواہش کی ہے، اس فقیر بے نوا کو اگر آپ اس قابل سمجھتے ہیں تو اس لحاظ سے خدمت سے دریغ نہیں کہ مرشدِ اقدس رحمہ اللہ کا نام لیوا ہوں، جو کچھ انھوں نے بتایا اس کو دوسروں کو بتانے کی اجازت بھی ہے، انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے اس سفر میں یہ خدمت انجام پاجائیگی۔

غ۔ بالمشافہ عرض کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اس لئے تحریراً عرض کر دیا۔

دعا کا طالب، احقر غلام محمّد

س۔ بالکل مناسب تھا اور عین اقتضائے ادب،

ہیچمداں

سُلیمان

شبِ قدر میں شرفِ بیعت

بس اب اس جواب سے تشفی ہوگئی کہ انشاء اللہ بیعت تو ضرور فرمالیں گے، مگر کب اور کس وقت؟ کے سوال نے اشتیاق بیعت کو تیز تر کر دیا، کیا عجب کہ اس اجمالی جواب میں مصلحت ہی یہ رکھی گئی ہو کہ تشنگی بڑھا کر آبِ حیات سے سیراب فرمایا جائے تاکہ نعمت کی قدر اس کے شایانِ شان ہوسکے! ـــــــ بہرکیف دن آتے رہے اور راتیں گذرتی رہیں، یہاں تک کہ قدر والی رات یعنی ستائیسویں شب رمضان (۱۳۶۵ھ) اپنی ساری برکات و انوار کے ساتھ آپہنچی، اسکی مہمانی کی کوشش جیسی کچھ اپنے سے بن پڑی کرلی گئی، تقصیرات کے اعتراف اور عفو و مغفرت کی دعاؤں التجاؤں کے ساتھ!

نمازِ تہجد سے فارغ ہو کر حسبِ معمول حضرت والا رح کے ساتھ سحری کھانے کا شرف حاصل رہا، پھر یہ سراپا تقصیر اپنے کمرہ میں آکر مصلّے پر بیٹھ گیا کہ ابھی طلوع فجر میں کچھ دیر باقی تھی اور قدر کے لمحات ابھی حاصل تھے، تلاوت کے لئے کلام پاک کھولا ہی تھا کہ دروازہ کھلنے کی آہٹ کان میں پڑی، آنکھ اٹھا کر دیکھا تو حضرت اقدس تھے، ابھی ابھی تو ان کے دیدار سے آنکھیں مشرف ہوچکی تھیں مگر اس وقت وہ سرتاپا نور ہی نور نظر آرہے تھے،

ع واذا رایت جمالہ طلع الصباح کانما[1]

میں شدت حیرانی سے اپنی جگہ مبہوت ہو رہا، اٹھ بھی نہ سکا، حضرت والا رح خود قریب تر آئے اور ارشاد فرمایا:۔

"کیوں، ارادہ ہے؟"

غلبۂ شوق میں زبان کھل نہ سکی مگر اپنا بال بال "لبیک" کہہ رہا تھا اور مرشد عارف اس رمزِ بے زبانی کو سمجھ رہے تھے ـــــــ قریب تر تشریف لائے، مصلّے پر بالکل میرے رُو برو جلوہ فرما ہوگئے، میں قبلہ رُخ بیٹھا تھا، قبلہ نما اب میرے سامنے تھا،

---

[1] جب میں نے اس کے جمال کو دیکھا تو گویا صبح صادق کا طلوع تھا!

حضرت اقدس نے اپنا دست مبارک بڑھا دیا، میں اپنی آلودگیوں سے شرمسار، حضرت شیخ کی عظمت و مرتبت کے تصور سے دبا جا رہا تھا، ڈرتے جھجکتے بڑی ہمت سے اپنی ارادت کا ہاتھ بڑھا کر حضرت کے دست حق پرست میں دے دیا اور جھک پڑا، پیرِ دست گیر نے اس طفلِ سلوک کی دست گیری فرما کر ارشاد فرمایا کہ ــــــــ "آپ اس ہاتھ کو میرے مرشد اقدس کا دستِ مبارک سمجھئے!" ــــــــ پھر قرآنِ پاک کی چند سورتیں اور آیات تلاوت فرمائیں پھر استغفار کروایا، تلقین کلمۂ توحید ہوئی، ایمان مفصّل کے اجزا کا اقرار کروایا گیا اور عہد واثق لیا گیا کہ اب مرتے دم تک فرائض و واجبات کی پابندی کی جائے گی اور اتباعِ سنّت کی تکمیل کی کوشش اور بدعات و معاصی سے اجتناب قائم رہے گا، اس کے بعد ارشاد ہوا کہ ــــــــ

"میں نے آپ کو چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ اور سہروردیہ سلسلوں میں داخل کر لیا، اللہ تعالیٰ مجھ کو اور آپ کو ہر سلسلہ کے فیوض و برکات سے مالا مال فرمائے"

اب حضرت سیّدی قدس سرہٗ نے اپنا دست مبارک کھینچ لیا، دونوں ہاتھ دعا کے لئے اُٹھائے احقر نے بھی اس کے اتباع کا شرف پایا، حضرت مرشدی رحؒ بہت دیر تک خاموشی سے دعا فرماتے رہے اور احقر بھی دل ہی دل میں "آمین آمین" کہتا رہا،

اس وقت جو کیفیت اس سراپا عیب پر طاری رہی اس کا اظہار الفاظ میں پہلے تو محال ہے اور پھر جس درجہ میں ہو بھی جائے تو بجز اس کے کہ جس پر کبھی ایسی ہی حالت گذری ہو کوئی اور کیا سمجھ سکتا ہے؟ بلکہ عجب نہیں کہ کم فہم کو گمان شاعری اور عبارت آرائی کا گذرے، ــــــــ اس لئے بس اتنا سُن لیجئے کہ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا مادیات کی ساری کثافتیں ہٹ گئی ہیں بندۂ عاجز بارگاہِ رب العزت میں دفعتہً پہنچ گیا ہے اور اپنی اس رسائی پر ششدر و حیران ہے نہ نالہ و شیون، نہ آہ و زاری نہ جوش و خروش، نہ اظہارِ مدعا کا ہوش، ایک حیرت ہے کہ دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے، ؎ حیرت آغاز و انتہا ہے[1]!

---

[1] المعرفة فی ذات اللہ حیرةٌ" (ذوالنون مصریؒ)

یہ اثر تھا ایک راسخ فی التوحید اور صاحبِ نسبت شیخ کی تلقین و توجہ کا! اُس کے القائے نسبت کا! ــــــــ نہ جانے میں اس عالم تحیر میں کب تک کھویا رہتا مگر خود حضرت شیخ ہی نے چونکا دیا کہ "اٹھئے اب نمازِ فجر کی تیاری کیجئے!!"

بشارت اس بیعت کے کچھ عرصہ بعد میرے خسر محترم (مولانا محمد علی مدظلہ) نے ایک خواب دیکھا جو اس بے استحقاق کے حق میں ایک بشارت عظمیٰ ہے خصوصاً جب کہ حضرت مرشدی رح کے تصدیقی کلمات نے اس کی ظنی حیثیت کو یقین کے درجہ تک پہنچا دیا ہے پہلے خواب اور پھر تعبیر ملاحظہ ہو:۔

خواب رات کی آخری ساعتوں میں دیکھا کہ ایک مکان کچّا سُرخ مٹی کا نہایت خوبصورت بنا ہوا ہے، اس مکان میں جب داخل ہوا تو آپ کو سفید صاف لباس میں پایا اور یہ معلوم ہوا کہ یہ مکان آپ ہی کا ہے، آپ نے میرے لئے کھانا منگوایا، کھانا گرم گرم پُر تکلف سینی میں آیا، میں نے عرض کیا کہ حضرت پہلے ان کو کھلادیں جو میرے ہمراہ آپ سے ملنے آئے ہیں، آپ نے فرمایا کہ ان کے لئے بھی آجائے گا، میں نے عرض کیا کہ میرے کھا لینے پر یہ کہیں گے مولوی بہت حریص، خودغرض اور بھوکے ہوتے ہیں، میں تو مولوی نہیں لیکن یہ مجھے یونہی سمجھتے ہیں، میری وجہ سے ناحق مولوی بدنام ہوں گے اس پر آپ بہت ہنسے اور انھیں پہلے کھلا دینے کی اجازت عطا فرمائی۔

تعبیر کچّا مٹی کا مکان عین مذاقِ نبوی ہے، جیسا احادیث سے ثابت ہے سفید لباس "احسن الثیاب للاموات" ہے! کھانا جیسا کہ ترمذی "کتاب الامثال" میں ہے، دعوتِ خیر ہے! جو شخص آپ کے ہمراہ، گو پہلے نہ ہو، مگر علم الٰہی میں مقدر تھا، وہ واقعی آپ سے پہلے اوس کو کھا چکا، وہ مولوی نہیں، مگر اللہ اوس کو دل کا درویش بنائے، آپ سمجھے ہوں گے کہ میرا اشارہ کدھر ہے؟ وہ آپ کا داماد ہے!!

انشاء اللہ یہ سند آخرت میں کام آئے گی اور شیخ کا یہ مہر و کرم یقین ہے کہ اخروی رفاقت

کا ضامن بنا رہے گا ـــــــــ اے میرے پروردگار، تو میرے اس گمانِ غالب کو حقیقت بنا کہ تیرا وعدہ ہے "انا عند عبد ظنی بی" (میں بندہ کے ساتھ اس کے حسب گمانِ معاملہ کرتا ہوں)

عید اور عیدگاہ بیعت کی روئداد دلچسپ و روح پرور تھی کچھ طول کھینچ گئی، سنانی قیام بھوپال کی کچھ اور باتیں بھی ہیں۔

حضرت شیخ کی بابرکت صحبت میں رمضان المبارک کا "دہ پراں" والا آخری دہا ایسا پُرکیف گذرا کہ دنوں کا کچھ ہوش ہی نہ رہا اور اب عید آگئی، اپنے عمر کی پہلی عید جو ماں باپ سے دور اپنے رُوحانی مربّی کے ساتھ منائی جائے گی، مسرّت میں روحانی سرور یقیناً کچھ اور ہی رہے گا۔

خادم نے نمازِ عید کی تیاری کر لی، آقا ابھی اہتمام میں مشغول ہیں، سفید صافہ باندھنے کا معمول ہے مگر آج دو مدنی صافے نکالے گئے ہیں، ایک زیادہ قیمتی اور نیا ہے، دوسرا نسبتاً کم قیمت اور برسوں پُرانا بلکہ کہیں کہیں سے پھٹا ہوا بھی ـــــــــ جو عمدہ تھا وہ صاحبزادہ کو عطا فرمایا اور پرانا اپنے سر پر باندھنے لگے، دیکھنے والا کا گمان یہ تھا کہ ہر باپ پہننے اوڑھنے میں اپنی اولاد کو اپنے نفس پر ترجیح دیتا ہے، حضرت والاؒ نے بھی وہی معاملہ فرمایا ہے، لیکن جب عمامہ باندھ چکے تو خادم کی طرف مُسکرا کر دیکھا اور فرمایا کہ ـــــــــ

> "یہ میرے اُستاذ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا عطیہ ہے اس لئے اس کا حق ہے کہ آج اس کو باندھا جائے اور وہ قیمتی صافہ آپ کے مہاراجہ کشن پرشاد (سابق وزیرِ اعظم حیدرآباد، دکن) کا تحفہ ہے اس لئے سلمان میاں کو دے دیا۔"

نگاہِ فقر کے امتیاز کا معیار اب سمجھ میں آیا اور اس معیار کی محبّت اس عملی درس سے خود بخود پیدا ہو گئی، رحمۃ اللہ علیہ،

غرض ہم تینوں عیدگاہ پہنچے، حضرت والاؒ چونکہ ریاست کے قاضی القضاۃ تھے اس لئے نمازِ عید حضرت ہی کو پڑھانی تھی، حالانکہ حضرت والاؒ امامت سے حتی الوسع گریز ہی فرماتے تھے

کوئی اصرار کرتا تو فرمایا کرتے تھے کہ

"مجھے نماز پڑھنا تو آتا ہے، پڑھانا نہیں آتا"۔

اس کے ظاہری وجوہ یہ تھے کہ حضرت کی آواز بلند نہ تھی اور تنفس کے عارضہ کی وجہ سے کوئی بڑی آیت ایک سانس میں پڑھ بھی نہ سکتے تھے چنانچہ اس عید کی نماز میں بھی یہی ہوا کہ سورۂ فاتحہ اس طرح تلاوت فرمائی کہ اس کی ساتوں آیتوں کو وقف کے ساتھ پڑھا، اس کے بعد "سبح اسم" کی سورۃ اس طرح رُک رُک کر تلاوت فرمائی کہ :-

سبح اسم ربك الاعلى ـــــ الذی خلق فسوی ـــــ والذی قدر فهدی ـــــ والذی اخرج المرعی ـــــ الخ

نماز کے بعد خطبہ اولی پہلے تو عربی میں پڑھا اور پھر اس کا حاصل اردو میں سمجھا کر بیٹھ گئے اور پھر اٹھ کر خطبۂ ثانیہ پڑھا اور دعا فرمائی۔

میری واپسی عید کا دن اور اس کا دوسرا دن بھی گذر گیا، ۲ ر شوال کو بعد مغرب رخت سفر باندھ لیا مگر ذوق و شوق کے ساتھ نہیں بلکہ دل کو مجبور کر کے ع جو مزہ آنے میں ہے کیوں کر کہوں جانے میں ہے! ـــــ وقت قریب آپہنچا، موٹر ڈرائیور شاید موجود نہ تھا، تانگہ آگیا، احقر نے حضرت اقدس سے رخصتی مصافحہ کیا اور اجازت چاہی، حضرت والا پھاٹک کے باہر تشریف لائے اور اپنے سامنے سامان رکھوایا اور سوار ہونے کا حکم دیا، پاس ادب سے قدم اٹھتا نہ تھا مگر "الامر فوق الادب" سوار ہو گیا، تانگہ چل پڑا، میں دیکھتا رہا کہ جب تک تانگہ حد نظر سے نکل نہیں گیا وہ "چشم محبت" برابر اس طرف نظر فرما رہی، رخصتی آداب کی یہ عملی تعلیم اب عمر بھر بھی کیسے بھلائی جاسکے گی!

مکتوب (۳۳)

(یہ عریضہ بھی دوران قیام بھوپال ہی میں لکھا گیا تھا، جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے، مگر

بھوپال کے حالات کے درمیان اس کا نقل کرنا بے جوڑ ہو جاتا اس لئے اب پیش ہے، ویسے جواب بھی اس کا آخری دن ہی ملا تھا)

غ۔ بھوپال

۳۰ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ

حضرتِ اقدس ادام اللہ الطافکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

قرآن مجید کی تلاوت کے وقت یا کسی وعظ وتقریر میں مضامینِ خشیت کا بہت اثر ہوتا ہے، حتیٰ کہ بعض مرتبہ اعصاب میں کمزوری محسوس ہوتی ہے، لیکن مضامین رحمت سے انشراح کا ایسا قوی اثر نہیں ہوتا، بس یہی خیال آتا ہے کہ اپنا حال تو اسکی رحمت کے لائق نہیں، البتہ عقلی طور پر تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا یہ کیفیات دُرست ہیں؟

س۔ بھوپال

۲ شوال المکرم ۱۳۶۵ھ

عزیز سعید رفع اللہ شانکم ورزقکم العرفان، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

مبارک کہ یہ خشیت بنیاد ہے اوس خشیت کی جس کا اثر یہ ہے کہ بندہ گناہوں سے باز رہتا ہے اور جس کے لئے دعا مانگی جاتی ہے، اگر خشیت یہ اثر پیدا نہ کرے تو وہ صرف کیفیت نفسی ہے، جو مطلوب نہیں، ———— آثارِ رحمت کا یہ اثر جس کا نتیجہ رجاء ہے یہ بھی مطلوب ہے کہ الایمان بین الخوف و الرجاء اور وہ آپ کو حاصل ہے گو احساس نہیں، مگر ایسا نہ ہوتا تو خشیت سے افاقہ نہ ہوتا!

(سبحان اللہ کیسا نازک تجربہ فرمایا ہے! حقیقت یہ ہے کہ شیخ کامل ہی سب سے بڑا ماہر نفسیات ہوتا ہے!)

غ۔ مضامین قہر وغضب سے اثر پذیری کا ایک طرف تو یہ عالم ہے اور دوسری طرف عمل کا یہ حال ہے کہ اگر کچھ عرصہ غیر اسلامی ماحول میں رہنے یا دنیوی اعتبار سے بڑے طبقے میں رہنے

کا اتفاق ہوتا ہے تو دل دنیوی دلفریبیوں کی طرف پوری قوت سے کھچنے لگتا ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ عقل کو غالب رکھ کر ایسے موقعوں پر دینی احساس سے یکسر خالی نہیں ہو جاتا مگر کشش تو بلا کی ہوتی ہے، حضرت والا دعا فرمائیں کہ دُنیائے دوں احقر کی نظروں میں ہیچ ہو جائے!

(جواب خوب غور سے پڑھنے اور برت کر دیکھنے کا ہے!!)

س۔ یہی مجاہدہ ہے کہ باوجود دلکشی و دلفریبی کے پھر دل کو روکا جائے، اور دنیاوی جاہ وحشمت کو گو وہ ایک معنی میں اگر بلا سعی مل جائے نعمت ہے، مگر اوس میں دل نہ لگایا جائے، آپ ایسے موقع پر ان کے فانی و زائل ہونے کا تصوّر کر لیا کریں اور سمجھیں کہ ان سب کا جنازہ سامنے رکھا ہے اور ان کے نعیم کا حساب کتاب ہو رہا ہے اور وہ لاجواب ہو رہے ہیں!

غ۔ احقر کی شادی کا مسئلہ درپیش ہے، اس خصوص میں حضرت والا کی نصائح موجب سکینت ہوں گی!

س۔ اللہ تعالیٰ مبارک کریں ـــــــــ دنیا میں کوئی پھول نہیں جس کے ساتھ کانٹے نہ ہوں، عاقل انسان پھول اس طرح چُنتا ہے کہ کانٹوں سے اوس کے ہاتھ پر خراش نہ آئے، خوب دیکھا اور غور کیا کہ شادی کی تمام تکالیف کا ایک ہی حل ہے کہ تحمل و برداشت سے کام لیا جائے اور بیوی کو اپنے مذاق میں رنگ لیں، خدا کرے کہ آپ کی بیوی دیندار ہوں اور امید ایسی ہی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیوی اور والدین کے درمیان اختلاف رائے ہوتا ہے اور مرد دونوں کے بیچ میں پھنس جاتا ہے تو ایسی حالت میں اطاعت تو والدین کی کی جائے، مگر بیوی کے حقوق سے بھی چشم پوشی نہ کی جائے۔

(کیا پُر شفقت، جامع و مانع جواب ہے)

غ۔ بحمد اللہ کہ اب تک احقر کا جیسا کچھ بھی طرز عمل اپنے والدین کے ساتھ ہے، وہ اس سے بہت خوش ہیں، لیکن خود احقر کو اس سے اطمینان نہیں کیونکہ جس محبّت و شفقت سے انہوں

نے تربیت فرمائی اس کے مقابل تو کچھ بھی نہیں ہو پاتا ہے، اللہ تعالیٰ مجھ کم ہمت و بے وسیلہ کی مدد فرمائیں، (ٹھیک یہی حسرت آج بارہ تیرہ برس بعد بھی موجود ہے، اللہ تعالیٰ پوری خدمت کی توفیق عطا فرمائے)

س۔ دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یہ توفیق بخشیں!

غ۔ حضرت والا رح کے جو عنایات و اکرام احقر کے حال پر ہیں اور خصوصاً اس قیام کے دوران میں رہے ہیں ان کے ادائی شکر سے زبان و قلم عاجز ہیں، اس عجز ہی کو سب کچھ تصور فرمایا جائے۔ خدائے تعالیٰ حضرتِ والا رح کو تا دیر علوئے درجات کے ساتھ ہماری رہبری کے لئے بہ عافیت رکھے اور ہم کو استفادہ کی توفیق و ہمت بخشے، آمین ثم آمین!

توجّہ خاص اور دُعا کا طالب

غلام محمدؐ عفی عنہٗ

س۔ میرا کیا ہے، کرم اور حُسن ظن تو آپ کا ہے کہ سینکڑوں میل کی مسافت اور مصارف کی ہر زحمت برداشت کرکے یہاں پہنچے اور مجھے مسرور کیا! ——— دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان امتحانات میں جو یہاں قدم قدم پر پیش ہیں سلامت رکھیں اور مجھے یہاں سے بچا کر لے چلیں (غالباً اس سے مراد اُمراء سے سرکاری و غیر سرکاری نوعیت کے تعلقات ہیں بحمداللہ کہ حضرت والا رح عالمانہ اور درویشانہ رنگ کو اس توازن سے ملا کر اپنی حیاتِ مستعار بسر فرما گئے کہ اس کی نظیر ملنا دشوار ہے!) اور آپ کو اللہ تعالیٰ فلاحِ دارین بخشیں آمین ———

ہیچمداں و ہیچ کار

سُلیمان

مکتوب (۳۴)

غ۔ حیدرآباد شوال ۶۵ھ

سیّدی و مولائی دامت برکاتہم، السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

خیریت حاصل، عافیت مطلوب،

یہاں پہنچ کر ہجوم افکار میں اس سکون کی قدر محسوس ہوتی ہے جو حضرتِ والا رح کی خدمت میں حاصل تھا۔

س۔ بھوپال

۷ شوال ۱۳۶۵ھ

عزیزی و حبیبی زادکم اللہ توفیقاً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمدللہ مع الخیر ہوں اور داعیٔ خیر،

فقیر نے جو گذارش کی تھی کہ شیخ کے پاس جانے کا حاصل کیا ہے اوس کا یقین آپ کو حاصل ہوگیا، وللہ الحمد

(دورانِ قیام جو وسوسہ لاحق ہوا تھا اس کے ازالہ کے بعد حضرت والا رح نے ارشاد فرمایا تھا کہ شیخ کی خدمت میں حاضری سے یکسوئی اور سکون حاصل رہتا ہے اور یہی بڑی دولت ہے!)

ع۔ اپنے اندر تکبّر پاتا ہوں اس لئے ازراہِ کرم

۱۔ تکبّر کے ازالہ کی تدابیر اور اس کا علاج تجویز فرمایا جائے۔

۲۔ تکبّر و غرور اور عزّت نفس و خودداری کا فرق تحریر فرمایا جائے تاکہ اس میں احتیاط ملحوظ رہ سکے۔

س۔ تکبّر کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے کسی کمال کو اپنی نظر میں رکھ کر دوسرے کی تحقیر کی جائے، یا اپنے کسی کمال کو اپنا ذاتی استحقاق سمجھیں اور اگر اپنے کسی کمال کو محض عطیۂ الٰہی اور فضل الٰہی سمجھیں جو بندہ کو اپنے لطف و کرم سے بلا استحقاق عنایت فرمایا گیا ہے تو یہ کبر نہیں!!

—— کبر کی دو قسمیں ہیں، ایک "اختیاری" جو بالقصد ہو یہ بھی بُرا ہے اور اس کے مقتضا پر

عمل کرنا یعنی دوسرے کو اپنے سے حقیر سمجھنا یہ بھی بُرا ہے ــــــــــــــ دوسرا "غیر اختیاری" ہے جو بلا قصد ذہن میں آجائے تو یہ گو خود بُرا نہیں لیکن اوس کے مقتضا پر عمل کرنا بُرا ہے!

عزّتِ نفس و خودداری یہ ہے کہ غیر کے سامنے اپنی کوئی حاجت پیش نہ کرے نہ کسی کے احسان غیر ضروری اٹھانے کی زحمت کرے، بلکہ غیروں سے ستر حاجت کرے!

ع۔ احقر کا اس وقت تک حال یہ ہے کہ اگر کوئی اس کی دینی کمزوری یا نقص کی بناء پر اس کو ٹوکتا یا بُری نظر سے دیکھتا ہے تو اس سے کچھ تکلیف محسوس نہیں ہوتی بلکہ ٹوکنے والا کا ممنون ہوجاتا ہوں، لیکن اگر کوئی محض دنیوی وجاہت کی وجہ سے کسی درجہ میں بھی اظہار تحقیر کرتا ہو تو احقر کے دل میں اس کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی، کیا یہ جذبہ عزّت نفس کا نتیجہ ہے یا غرور کا؟ اور کیا ایک مومن کو اپنی عزّت کی حفاظت ضروری نہیں؟

س۔ یہ دونوں جذبے اس حد تک صحیح ہیں، یہ نہ غرور ہے نہ تقاضائے عزّت نفس بلکہ آپ چونکہ فضائل معنوی کو اصل فضائل سمجھتے ہیں اور فضائل دنیوی کو اہمیت نہیں دیتے اسلیئے یہ اختلاف حال پیدا ہے، اور یہ صحیح ہے مگر اس کا اثر یہ نہ ہو کہ آپ اوس کو حقیر سمجھیں کہ یہ کبر ہے!

(اپنی حالت سے خود اپنے کو آگاہی نہ تھی، شیخ کی نگاہ نے اس کو دکھلا دیا، اسی لئے اس راہ میں شیخ کامل کی رہبری کے بغیر چارہ نہیں، واللہ بالکل سچ فرمایا ؎

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق عمر بگذشت و نہ شد آگاہ عشق)

غ۔ پہلے مالداروں سے دوستی اور اس کے اظہار پر فخر محسوس ہوتا تھا، اب حالت برعکس ہے اب کسی کی دنیوی وجاہت جاذب نظر نہیں!

س۔ بارک اللہ، صحیح کیفیت ہے، پھر بھی تحقیر کا جذبہ نہ ہو! (یہ بار بار کا تنبہ اس وجہ سے ہے کہ کبر و استغنا کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں، ذرا بے احتیاطی ہوئی کہ استغنا کی حد سے نکل کر کبر کی

ہلاکت ہے،)

غ۔ الحمدللہ کہ دُعا کی تاثیر محسوس ہونے لگی ہے لیکن اس وقت تک کا احساس یہ ہے کہ جب کام مایوسی کی نوبت کو پہنچتا ہے تب دعا اثر دکھاتی ہے اور اسباب فلاح مہیّا ہوتے ہیں۔

س۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کیجئے، بے شبہ اضطرار کی حالت کی دُعا ہی اثر رکھتی ہے، ———— اَمَّن یجیب المضطرَّ اذا دعاہ اور دوسری جگہ مِن بعد ما قنطوا۔

غ۔ کسی روز نمازِ تہجد قضا ہوجاتی ہے یا ذکر چھوٹ جاتا ہے تو دن بھر طبیعت اداس رہتی ہے بلکہ اکثر دیکھا کہ بنتا کام بگڑ جاتا ہے یا نا امیدی کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں، اسلئے اب پابندی کی طرف توجہ زیادہ رہتی ہے!

س۔ بارک اللہ، ایمان کی پہچان حدیث میں یہ بھی آئی ہے کہ جس کو اپنے گناہ و خطا سے قلبی تکلیف محسوس رہے، قرآن پاک میں ہے وکرّہ الیھم الکفر والفسوق والعصیان، کفر وفسق وعصیاں سے کراہت ہوتی ہے!

غ۔ کل سے قلب میں انتشار پیدا ہے، کسی کام میں دل نہیں لگتا حضرت والا دعا فرمائیں کہ اتنا سکونِ خاطر میسر آجائے کہ امور دنیوی پورے ہوسکیں!

س۔ یہ کیفیات آتی جاتی رہتی ہیں، یہ کوئی بات نہیں ؎

اگر درویش بر حالے بماندے ‏ ‏ ‏ سر دست از دو عالم بر فشاندے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو ارشاد فرمایا کہ حالتِ ایمانی کی شدید کیفیت ہمیشہ نہیں رہتی!

غ۔ حضرت والا احقر کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کے لئے اور ازالۂ خصائل رذیلہ کے لئے دعا فرمائیں، فقط، احقر غلام محمد

س۔ دل سے دُعا بدرگاہِ الٰہی ہے، والسّلام

ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۳۵)

ع۔ حیدر آباد دکن

ذیقعدہ ۱۳۶۵ھ

سیدی و مولائی مدفیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مزاج اقدس!

اب کی مرتبہ معروضہ پیش کرنے میں بڑی تاخیر ہوگئی حالانکہ تقریباً ایک ہفتہ سے اس کا شدید تقاضا ہے مگر کوئی بات قابلِ عرض نہ ہونے سے اس تقاضا کو دباتا رہا۔۔۔ اب خدمتِ والا میں بجز اس کے کچھ عرض نہیں کہ معمولات پر بحمداللہ پابندی ہے لیکن بعض وجوہ سے قلب ودماغ میں انتشار ہے، احقر کے لئے حضرت والا بطورِ خاص دُعا فرمائیں۔

توجہ کا طالب احقر غلام محمد

س۔ عزیزی وحبیبی رزقکم اللہ تعالیٰ عرفاناً، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

اللہ تعالےٰ آپ کے انتشار کو جمعیت سے بدل دیں۔

خط لکھنے کے لئے مطلب کی ضرورت نہیں، ایک شعر سُنئے ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم کو مطلب ہے تمہارے نام سے[1]

الحمدللہ مع الخیر ہوں، تین ہفتوں کے لئے لکھنؤ اور اعظم گڈھ گیا ہوا تھا، اب آیا ہوں، تھانہ بھون بھی گیا تھا، حضرت والا کی مرقد پُر انوار پر بھی حاضر ہوا، والسّلام

ہیچمداں سیّد سُلیمان ۲۶ ذیقعدہ ۶۵ھ

---

[1] غالبؔ کے شعر میں تھوڑا سا تصرّف ازراہِ تواضع کیا گیا ہے ورنہ مصرعۂ ثانی یوں ہے،

ع ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے!

(مکتوب کے لفظ لفظ سے کیسی شفقت وعنایت ٹپک رہی ہے اور کس قدر تعلقِ خاطر!)

مکتوب (۳۶)

(اب تک جتنے عریضے گذرے اُن سب میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہوگی کہ اس بے علم کو القاب لکھنے کے لئے کبھی الفاظ ہی نہیں ملے۔ خود مجھ کو بارہا اس کی کوفت ہوئی کہ اپنے تعلق قلبی کا اظہار تو کبھی ہونے ہی نہیں پاتا، آج یہ ٹھان لی کہ چاہے گستاخی کیوں نہ ٹھیرے ایک شعر ہی کو بطور القاب کے لکھ دوں تاکہ کچھ تو اپنی محبت کا اظہار ہو،)

غ۔ حیدرآباد دکن

۲۴ ذیقعدہ ۱۳۶۵ھ

سیدی اَنتَ حبیبی وطبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو عاصی[1] پئے دَرماں طلبی

مزاج اقدس!

گذشتہ چھ سات ماہ سے مسلسل مالی نقصان اٹھا رہا ہوں، شاید اس کا باعث سودی قرض ہے جو بعض شدید ضروریات کے تحت لینا پڑا، مگر پہلے اگر سودی قرض لیا بھی گیا تو اس کا یہ اثر محسوس نہیں ہوا تھا، (یہ قرض میں نے راست تو نہیں لیا مگر محض میری خاطر والد صاحب کو لینا پڑا تھا)

س۔ اخی وحبیبی وفقکم اللّٰہ تعالیٰ لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ۔ گھبرائیں نہیں، بے شبہ بندہ کو ہر حال میں اسی پر نظر رکھنی چاہیئے کہ اس کو جو کچھ پیش آتا ہے وہ اسی کے عمل کی پاداش ہے مگر اس پر بھی

---

[1] یہاں شاعر کا تخلص قدسی ہے، تصرّف اپنی ذات کے لئے کیا گیا ہے!

نظر رہے کہ وہ حکیم علی الاطلاق جو کچھ کرتا ہے وہ بندہ ہی کے فائدہ اور منفعت کے لئے ہے اس لحاظ سے یہ مصائب بھی نعمت ہیں کہ ان سے توجہ الی الحق کی توفیق ملتی ہے اور یہ کتنی بڑی دولت ہے۔

سودی قرض بھی باعثِ زوال ہے، مصائب پہلے بھی آتے ہوں گے مگر اس وقت آپ کو بصیرت نہ تھی اس لئے ان کو اور باتوں کی طرف منسوب کرتے ہوں گے اب بصیرت ہونے کے باعث اپنے اعمال پر نظر پڑ رہی ہے، استغفار کیجئے (بات اپنی جگہ پر ہے مگر تسکین کس کس انداز سے فرما دی اور استغفار پر کس خوبی سے مائل کر دیا)۔

غ۔ تقریباً تین مہینے سے احقر کی تنخواہ نہیں ملی ہے اور گو بعد میں پوری مل جائے گی لیکن فی الحال تو پریشانی ہے۔ (گریڈ کے تصفیہ میں تاخیر ہوگئی تھی!)

س۔ بے شبہ اس سے پریشانی ہوگی۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ، ان حالات میں اکثر پڑھا کیجئے، اس سے انشاء اللہ فکر دور ہوگی، (الحمدللہ کہ فکر تو محض عرضِ حال ہی سے کافور ہو جاتی تھی جو حضرت شیخ کی مقبولیت کا کھلا اثر تھا)۔

غ۔ یہ سب الجھنیں خشوع و خضوع میں حارج ہیں، تقریباً ہر وقت قلب و دماغ پر یہی افکار مسلط رہتے ہیں!

س۔ اس میں کوئی حرج نہیں، الجھنیں ہوں تو ہونے دیجئے مگر معمولات میں فرق نہ آنے دیجئے!

غ۔ حضرت والا اس احقر پر بطور خاص توجہ فرمائیں اور اصلاحِ حال کے لئے دعا فرمائیں!

س۔ بوقتِ خاص میں نے دعا کی۔ وہ مجیب الدعوات قبول فرمائے اور آپ کو طمانیت نصیب فرمائے۔

غ۔ جی تو چاہتا ہے کہ ان بکھیڑوں سے آزاد ہو کر فقیرانہ زندگی بسر کی جائے چاہے لوگ متروک الدنیا ہی کیوں نہ کہیں مگر حالت یہ ہے کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن!

ہدایات کا منتظر اور دعا کا طالب احقر

غلام محمد

س۔ فقیروں کی زندگی بھی بکھیڑوں سے اور آفاتِ دینی سے خالی نہیں۔ ہمارے بزرگوں کے مسلک کے خلاف ہے، جب تک پھل پکتے نہیں، کھانے کے قابل نہیں، اسی طرح جب تک توکّل پختہ نہیں ہوتا ترکِ اسبابِ رزق درست نہیں!

(یہ ارشادات کسی سالک کے لوح دماغ سے کبھی بھی محو نہ ہونے چاہئیں!)

والسّلام ہیچداں سیّد سُلیمان

۲۷ ذیقعدہ ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۳۷)

غ۔ حیدر آباد دکن

۹ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ

سیّدی و مولائی دامت برکاتہم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ اقدس!

الحمدللہ حضرت والا کی خاص توجہات کی وجہ سے احقر کی تنخواہ کا مسئلہ حل ہوگیا اور حکم جاری ہوچکا، عیدالاضحیٰ کی تعطیلات کے بعد انشاءاللہ کُل تنخواہ مِل جائے گی!

س۔ بھُوپال

۱۱ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ

عزیز و حبیبی وفقکم اللہ تعالیٰ، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمدللہ مع الخیر ہوں،

الحمدللہ کہ اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم نے آپ کی یکسوئی کا سامان کردیا، مجھے بڑی خوشی ہوئی

(واقعی حضرتِ والا اس خادم کی ہر خوشی سے بے حد مسرور ہوتے تھے)

غ۔ اللہ کے فضل وکرم سے ہر حال میں معمولات پر پابند ہوں اور مزید استقامت کے لئے

حضرت والاؒ کی دعاؤں کا محتاج!

س۔ یہ مزید شکر کی بات ہے، یہ محض اوس کا فضل ہے، دل سے دُعا ہے!

غ۔ جب کوئی پریشانی شدید لاحق ہوتی ہے تو دو باتیں ذہن میں آتی ہیں ایک یہ کہ حضرت والاؒ کو اس کی اطلاع دی جائے تاکہ حضرت والاؒ کو اس سے جو تشویش ہو اور دعا فرمائیں تو اس کے سبب انشاء اللہ یہ بلا دور ہو جائے گی کیوں کہ حق تعالیٰ اپنے نیک بندوں کا ضرور لحاظ فرماتے ہیں ـــــــــ دوسرے یہ کہ ہر بات کی اطلاع کر کے حضرتِ والاؒ کو پریشان کرنا خلاف ادب و محبت ہے، ان دونوں باتوں کو اس طرح ملحوظ رکھتا ہوں کہ جب تک کوئی تکلیف معمولی حد میں رہتی ہے اطلاع نہیں کرتا مگر جب بڑھ جاتی ہے تو فوراً عرض کر دیتا ہوں۔

س۔ آپ کے حُسنِ اعتقاد کو کیا کہوں، وہی مثل ہے

پیرِ ما خس است، اعتقاد ما بس است

اللہ تعالیٰ آپ کی ہر دینی و دنیوی مشکل کو حل فرماتے رہیں۔

غ۔ بارہا کا تجربہ ہے کہ جب عالم پریشانی میں حضرتِ والاؒ کی خدمت میں کوئی عریضہ گذرانا تو اِدھر ڈاک میں خط پڑا اور اُدھر طبیعت پر سکون طاری ہو جاتا ہے خواہ اسباب فوراً فراہم نہ ہوں ـــــــــ بعد کو اسباب بھی فراہم ہو ہی جاتے ہیں، یہ برکت ہے حضرت والاؒ کی، (اور نشانی ہے عند اللہ مقبولیت کی)

س۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل ہے!

غ۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے بلا جد و جہد حضرتِ والاؒ سے متعلق کر کے دین کا صحیح راستہ دکھلایا ورنہ بدعتیوں کے جال میں پھنسنا بعید نہ تھا، حق تعالیٰ کی ان بے طلب عنایات کے ہوتے ہوئے کیا بعید ہے کہ احقر کبھی یہ کہنے کے لائق بھی ہو جائے کہ ؎

مورِ کم مایہ ہوس داشت کہ در کعبہ رسد ‏ ‏ ‏ دست بر پائے سُلیماں زد و ناگاہ رسید

س۔ اللہ تعالیٰ اس تعلق کو میرے اور آپ کے دونوں کے لئے مفید کریں۔ میرا ایک شعر ہے

احباب کے حُسنِ ظن کا ممنون ہوں میں

جو مورِ ضعیف کو سُلیمان سمجھے

غ۔ حدیث شریف لا یومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ الخ سے متعلق اعتباری طور پر کیا یہ خیال صحیح ہے کہ چونکہ شیخ بحیثیت رہبر کے بجائے رسول ہے اس لئے اس کے ساتھ جتنی زیادہ محبت بڑھے گی اتنی ہی زیادہ پختگی امور دینی میں پیدا ہوگی؟[ل]

س۔ قیاس صحیح ہے، بہ ظلِّ محبّتِ رسول، شیخ سے بھی ویسی ہی محبّت رکھنی چاہیئے کہ وہ رہنمائے محبّت رسول واحکامِ رسول ہے، (دریائے معانی کی لڑی صفحہ کاغذ پر اتار کے رکھ دی ہے، سبحان اللہ)

غ۔ قرآن مجید میں جہاں مظاہر قدرت میں تدبُّر و تفکُّر کی دعوت دی گئی ہے وہاں کہیں "آفاق" اور کہیں "انفس" کا ذکر ہے، کیا اس میں کوئی خاص بات پوشیدہ ہے۔ دونوں قسم کی چند آیات کو پیشِ نظر رکھ کر احقر کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اقرار الوہیت کے لئے "آفاق" کو پیش فرمایا گیا ہے اور "مشاہدۂ حق" کے لئے انفس میں فکر کی دعوت دی گئی ہے مثلاً

(۱) افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔

(۲) وفی انفسکم افلا تبصرون۔ دُعا کا طالب، احقر غلام محمّد

س۔ یہ تفسیر میرے دل کو نہیں لگتی، سنریھم آیاتنا فی الافاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق اولم یکفِ بربك انہ علےٰ کل شیءٍ شھید ط (حٰم السجدہ۔ آخر) اس میں دونوں یکجا ہیں!

دِلی دعا ہے۔ ہیچمداں سُلیمان

[ل] خود حضرت والارح کا یہی خیال جب پڑھنے میں آیا (جو آپ کی نظر سے گزشتہ باب میں گذر چکا) تو اس توافقِ مذاق پر دل سے شکر ادا ہوا،

مکتوب (۳۸)

(احقر نے اپنی شادی میں شرکت کا دعوت نامہ حضرت والارحؒ کی خدمت میں ارسال کیا تھا جو پنجشنبہ ۲۶ ذیحجہ ۱۳۶۵ھ کو منعقد ہونے والی تھی، حضرت والارحؒ نے اس کا جواب ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعہ عطا فرمایا جو درج کیا جاتا ہے)

س۔ بھوپال

عزیزی وحبیبی بارک اللہ فیکما وجمع بینکما بالخیر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ دہلی اور سہانپور کے سفر سے کل واپس آیا صوبہ بہار کے مسلمانوں پر جو اُفتاد پڑی[۱] اوس کا حال آپ کو اخبارات سے معلوم ہوا ہوگا میرا گاؤں بحمداللہ محفوظ ہے، مگر ۲۰ گاؤں کے مسلمان پناہ گزیں وہاں جمع ہیں، بھوکے اور ننگے ہیں[۲]، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے!

(اس سے حضرت والارحؒ کے درد دل کا اندازہ ہوتا ہے، مسلمان کی ہر مصیبت پر وہ ایسے ہی مضطرب ہو جاتے تھے خواہ وہ مسلمان دنیا کے کسی خطہ میں ہو) ______

اہلیہ اور بچے سہارنپور سے کل ہی ساتھ آئے!

آپ کے لئے دلی دعا ہے خصوصاً اس حالت میں جب کہ آپ ایک نئی زندگی شروع کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ مبارک فرمائیں اور امن وسکون ومودت وسکینت عطا کریں۔ اس زندگی کی خوشی صرف تحمل وبرداشت کی راہ سے طے ہوتی ہے میں اس تقریب میں شریک نہ ہوسکا مگر نیک دعاؤں کے لئے قرب وبعد یکساں ہیں۔

---

[۱] صوبہ بہار کا پہلا دردناک ہندو مسلم فساد جس میں مسلمان بُری طرح تباہ ہوئے!

[۲] الحمدللہ کہ اس وقت کے حیدرآباد نے ان مظلوموں کے ساتھ دردمندی کا پورا پورا لفظی نہیں بلکہ عملی ثبوت دیا تھا۔

والسلام

سید سلیمان، ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۳۹)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۰ محرم ۱۳۶۶ھ

سیدی ومولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ اقدس!

حضرت والا کے کرم نامہ سے سب کی عافیت معلوم کرکے بڑا اطمینان حاصل ہوا۔

س۔ بھوپال

حبیبی ومخلصی وفقکم اللہ تعالےٰ لما یحب ویرضیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، ایک دو روز سے طبیعت علیل تھی، آج اچھا ہوں، بہار کے درد انگیز اور جاں گداز حالات برابر پہنچ رہے ہیں، اللہ تعالےٰ مسلمانوں پر رحم فرمائے!

غ۔ اس امر کے اظہار سے سخت ندامت ہے کہ شادی کے بعد سے اس وقت تک (کوئی مہینہ سوا مہینہ کی مدت ہوگی) معمولات میں متعدد مرتبہ ہرج واقع ہوتا رہا، کئی مرتبہ نمازِ تہجد بھی قضا ہوگئی، آئندہ کے لئے استقرار دوام معمولات کا عزم کرتا ہے حضرت والا بھی دعا فرمائیں۔

س۔ زندگی کے کسی اہم تغیر کے بعد تعطل ہوجایا کرتا ہے، آپ پر تو بحمد اللہ بہت کم اثر پڑا، ورنہ اس سے بھی زیادہ حالات خراب ہوجاتے ہیں۔ دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ استقامت بخشیں، ــــ (راہِ سلوک میں شیخِ کامل اپنے مرید کو کسی حال میں بھی مایوس نہیں ہونے دیتا، عارف رومی کا ارشاد ہے ؎

کوئے نومیدی مرو امیدہاست ۔۔۔ سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست) ۔۔

غ۔ مذکورہ کیفیت سے احقر کو اپنی بے ہمتی کا پورا احساس ہے، اب احقر کا یہ خیال ہے کہ جو کچھ نیکی کا عمل بن پڑتا ہے وہ سب اللہ ہی کا کرم ہے، وہی ہمت بھی عطا فرماتے ہیں اور عمل بھی کروا دیتے ہیں ـــــــ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے محروم نہ فرمائیں۔

س۔ جس نتیجہ پر آپ پہنچے وہ بالکل صحیح ہے، سب اوسی کا کرم ہے ؎

جان دی دی ہوئی اوسی کی تھی ــــــ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غ۔ باقی حالات لائقِ شکر ہیں، حضرت والا اخروی اور دنیوی فلاح کے لئے دعا فرمائیں۔

احقر غلام محمد

س۔ الحمدللہ، دلی دُعا ہے۔ ہیچمداں

سُلیمان ۱۲ محرم ۱۳۶۶ھ

مکتوب (۴۰)

غ۔ حیدر آباد دکن

حضرت مرشدی و مولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاجِ اقدس!

میری ــــــ بہت سخت علیل ہیں اور ایک ضلع میں رہتی ہیں، اُن کی نازک حالت کی اطلاع پہنچی تو والد صاحب ایسے پریشان ہوگئے کہ دوسرے ہی روز یہاں سے چلے گئے (الحمدللہ کہ میرے والد ماجد مدظلہ العالی حُسن سلوک اور نیکی کے اوصاف سے خوب مالامال ہیں) والد صاحب کی یہ حالت ـــــــ انتہائی بدسلوکی کے باوجود ہے۔ اور احقر کا یہ حال ہے کہ ان کے لئے دُعا کرنے کو تک جی نہیں چاہتا تھا، جبراً اون کی صحت اور خاتمہ بخیر کی دعا کی، اپنی اس حالت پر ندامت بھی ہے اور افسوس بھی کہ دوسرے بھی اگر اپنی مصیبت پر اسی طرح دعائے خیر نہ کریں تو اپنا کیا حشر ہوگا۔

س۔ بھوپال

محبّ صمیم زادکم اللہ توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، بحمد اللہ بخیر وعافیت ہوں اور آپ کی خیر وعافیت کے لئے دعاگو ہوں۔

یہ کیفیات ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں، باوجود اس کیفیت کے اگر اس کیفیت کے مقتضیٰ کو دبا کر اس کے خلاف پر عمل کیا جائے تو بڑا ثواب ہے جیسا کہ آپ نے کیا اور آپ خلافِ اقتضائے نفس کرنے پر ثواب کے مستحق ہوئے کیونکہ آپ نے قرابت کا حق ادا کیا۔

غ۔ نماز و ذکر میں جمعیتِ خاطر نہیں!

س۔ مشغولیت بہ غیر کی وجہ سے یہ حال ہے۔

غ۔ بعض دینی عزائم برابر قائم ہیں لیکن پست ہمتی پا بہ زنجیر بنی ہوئی ہے۔

س۔ آپ سعی متواتر کرتے رہیں، بفضلہ تعالیٰ انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔

غ۔ احقر کی اہلیہ کا عریضہ بھی ملفوف ہے۔

حضرت والا، احقر کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کے لئے بطورِ خاص دعا فرمائیں،

احقر غلام محمد

س۔ جواب الگ جاتا ہے، ان کو اپنا ذاتی نام نہ لکھنا چاہیئے تھا، اہلیہ فلاں لکھنا کافی ہے، (کہاں یہ اہتمام پردہ داری کا اور کہاں دوکاندار مشائخوں کی بے محابانہ عورتوں سے بے پردگی، اور حدودِ شریعت کی پامالی، العیاذ باللہ) آپ کے فلاح دارین کے لئے دل سے دعا ہے۔

ہیچمداں سید سلیمان ۲۷ محرم ۱۳۶۶ھ

مکتوب (۴۱)

غ۔ حیدر آباد دکن

سیّدی و مولائی دام برکاتہ ، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت والا رح کے شفقت آمیز کرم نامہ سے احقر نے اپنی اہلیہ میں عجیب دینی تغیر محسوس کیا اللہ تعالیٰ اس فیض جاریہ سے ہم دونوں کو مستفیض ہونے کی پوری توفیق عطا فرمائے۔

س۔ بھوپال

عزیزی وحبیبی وفقکم اللہ تعالیٰ ، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ خیریت ہے،

یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، دلی دعا ہے کہ پاک پروردگار اس عزیزہ کو استقامت بخشیں۔

غ۔ گذشتہ ہفتہ بھر سے حضرت والا رح کی طرف خاص کشش محسوس ہو رہی ہے اور زیارت کو دل تڑپ رہا ہے۔

س۔ یہ آپ کا جذبۂ محبت ہے، ابھی تامل فرمائیں۔

غ۔ "مرتبۂ احسان" کی اصطلاح "ارواحِ ثلاثہ" (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رح اور اس مسلک کے اکابر کے اقوال واحوال پر مشتمل ایک کتاب ہے اور اس پر حضرت حکیم الاُمّت کے حواشی بھی ہیں) میں کئی جگہ آئی ہے، احقر نے مولانا محمود الغنی صاحب مدظلہٗ سے اس کی وضاحت چاہی تو فرمایا کہ "یہ مرتبہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل تھا یا اب ——— اور مولانا سیّد سلیمان ندوی صاحب جیسے بزرگوں کو حاصل ہو مجھے یہ مرتبہ حاصل نہیں۔ یہ تقوے کے بعد کا مقام ہے" ——— حضرت والا رح سے درخواست ہے کہ اس کی وضاحت فرمائیں!

س۔ "مرتبۂ احسان" اصطلاح حدیث نبوی ﷺ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ عبادت اس طور سے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا دل میں پورا استحضار رہے کہ وہ مجھے دیکھ رہے ہیں یا یہ کہ میں انھیں دیکھ رہا ہوں ——— اللہ تعالیٰ یہ مرتبہ عنایت فرمائے!

غ۔ پہلے عقائد کچھ مبتدعانہ تھے، حضرت والا رح کے تعلق سے ٹھیک ہو گئے، مگر کبھی یہ خیال آتا ہے

کہ ممکن ہے اب بھی سیدھا راستہ نہ ملا ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے بھی خلوص تھا اور اب بھی ہے۔ اسی ڈر سے مخالفِ مکتب خیال کی کتابیں بھی کبھی کبھار دیکھ لیتا ہوں اور ان کا اپنے مسلک سے موازنہ کرتا ہوں، الحمدللہ کہ اپنا ہی مسلک مستحکم اور دوسروں کا بے بنیاد معلوم ہوتا ہے ـــــ صراطِ مستقیم کی دُعا بھی ہر وقت کرتا ہوں، کیا یہ ٹھیک ہے؟

س۔ آپ مطمئن رہیں کہ جس راہ پر آپ ہیں بحمداللہ یہ سنّت کی راہ ہے، قرآن پاک اور تراجم حدیث شریف پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ کون سنّت پر ہے[1]، یہ تذبذب کی راہ ہے اس کو دُور کیجئے۔

غ۔ چونکہ ہر بدعتی خلوص اور دیانت سے عاری نہیں ہوتا، اس لئے خیال یہ ہوتا ہے کہ نادانی سے صدق نیّت کے ساتھ جو بدعات میں مبتلا ہو، اس کو حق تعالےٰ اپنے لُطف سے محروم نہ فرمائیں گے البتہ اس کو اس راہ پر ڈالنے والے عالم یا مشائخ پر گرفت اور سخت گرفت ہوگی، کیا یہ احقر کا خیال درست ہے؟

س۔ اگر کوئی شخص اپنے زعم میں خلوص کے ساتھ کسی کو قتل کردے یا گناہ کر بیٹھے کہ کسی بیوہ کو رزق اس طرح ملے گا تو کیا جائز ہے؟ (یعنی نیّت بھی اسی وقت مؤثر ہے جب کہ اس سے پہلے عمل کی صحت متحقق ہو جائے۔ اسی لئے حدیث شریف "انما الاعمال بنیات" کی تشریح میں "فی الخیرات" کی قید سب محدثین نے تسلیم کی ہے!) ہادی اور مقتدی دونوں گرفتار ہوں گے[2]۔

غ۔ حضرت والا احقر کے لئے فلاحِ دارین کی دعا فرمائیں ـــ

---

[1] یہی حق کا معیار ہے، ورنہ مبتدع لوگوں کی سند کا مدار زیادہ سے زیادہ بزرگوں کی طرف منسوب روایات ہیں جو اصلاً کوئی وزن نہیں رکھتیں، اگر قرآن و حدیث سے مؤید ہیں تو حق ہیں ورنہ غیر اہم اور بعض صورتوں میں قابلِ نکیر تک!!

[2] بنی اسرائیل کے واقعات میں یہی فیصلہ قرآن نے بار بار سُنایا ہے!

تو دستگیر شو اے خضرِ پئے خجستہ کہ من
پیادہ می روم و ہمرہاں سوارانند

توجہ کا طالب، احقر غلام محمدؐ

س۔ دل سے دُعا ہے،
یہ "خضرِ پئے خجستہ" توفیق الٰہی ہے، جس کی دُعا مانگنی چاہیئے۔
بیچمداں سُلیمان ۹، صفر ۱۳۶۵ھ

مکتوب (۴۲)

غ۔ حیدرآباد دکن -

حضرت سیّدی و مولائی مدفیوضکم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'
مزاجِ گرامی!

گذشتہ کرم نامہ سے سرفرازی کے بعد سے احقر بخار میں مبتلا تھا اور پھر خارش نے ستانا شروع کیا، چنانچہ اس وقت شدید تکلیف میں یہ عریضہ گذران رہا ہوں، ان بیماریوں کے سبب سے نمازِ تہجّد اکثر قضا ہو جاتی ہے دوسرے معمولات جاری ہیں،

س۔ بھوپال

حبیبی و مخلصی زادکم اللہ تعالیٰ معرفتہ'
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'۔ الحمد للہ مع الخیر ہوں۔
اللہ تعالےٰ آپ کو شفائے کُلّی عطا فرمائیں۔

کوئی ہرج نہیں، وہ معمول جس کو آپ غیر ارادی مانع کے سبب سے ادا نہ کرسکیں اللہ تعالیٰ انشاءاللہ آپ کو اوس کے ثواب سے محروم نہ رکھیں گے، بشرطیکہ دل میں یہ عزم ہو کہ اگر مانع نہ ہوتا تو انشاءاللہ ضرور ادا کرتا، کیسی اس کی رحمت ہے!

غ۔ حضرت والا کی تشریف آوری کا بے حد انتظار ہے، حضور کب کرم فرمائی کا قصد رکھتے ہیں۔

——(ایک خبر یونہی نیم ثقہ ذرائع سے ملی تھی کہ حضرت والا حیدرآباد تشریف لا رہے ہیں اور بہت جلد!)

س۔ کیا کہوں کہ کن متضاد حالات میں گرفتار ہوں، بس اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں!

غ۔ احقر کی دینی و دنیوی فلاح کے لئے حضرت والا دعا فرمائیں۔

احقر غلام محمد

س۔ دلی دُعا ہے۔ والسّلام

ہیچمداں سُلیمان ۲ ربیع الاوّل ۱۳۶۶ھ

مکتوب (۴۳)

غ۔ حیدرآباد دکن

سیّدی و مولائی مدظلکم العالی، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مزاج اقدس!

احقر اب تقریباً رو بہ صحت ہے اور معمولات پر پابند، حضرت والا سے درخواست ہے کہ استقامت فی الدین اور صحت کلی کے لئے دعا فرمائیں!

س۔ بھوپال

محب صمیم زادکم اللہ تعالیٰ حباً فیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ فقیر کا مزاج بحمداللہ مع الخیر ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب آپ اچھے ہیں، معمولات پر پابند رہنے پر مبارک باد قبول کیجئے، بارک اللہ فیکم، صحت کُلّی کی دل سے دُعا ہے۔

غ۔ احقر خود کو حرصِ دنیا کا شکار پاتا ہے، خیال ہوا کہ مراقبۂ موت وما بعد الموت کروں، اب

حضرت والا کا اذن مطلوب ہے۔

س۔ طلب وسعتِ رزق کا نام دنیا نہیں ہے بلکہ اس کا نام ہے کہ دوسروں کی ملکیت پر قابض ہوجائے اور مایحتاج مل جانے کے بعد بھی نظر دوسروں پر ہو۔

(جواب ختم ہوگیا، مراقبۂ موت سے متعلق حضرت مرشدی رح کا سکوت اب سمجھ میں آتا ہے کہ کس قدر عارفانہ تھا اور اپنی تجویز و تشخیص کس قدر طفلانہ تھی کیونکہ اس سے مجھ میں قنوطیت پیدا ہوجاتی جو مہلک ہے، اسی لئے سالک کو کوئی عمل مباح بلکہ مستحب بھی بلا اجازت شیخ اختیار نہ کرنا چاہیئے)

غ۔ اپنی خستہ حالی سے پریشان ہوکر جی چاہتا ہے کہ کچھ دنوں الگ تھلگ رہوں، حضرت والا رح مدظلہٗ کی آمد کی خبر سُن کر اس کو اپنے لئے باعثِ رحمت سمجھا تھا لیکن حضرت اقدس کے گذشتہ مکتوب سے یہ امید بھی ٹوٹ گئی، اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ حضرت والا رح کو کسی حیلہ بہانہ ہم خادموں کی جمعیتِ خاطر اور دینی ترقی کے لئے یہاں بھیج دے۔

س۔ گھبرائیں نہیں، حضرت والا رحمہ اللہ کے مواعظ و تصانیف کو اپنا رفیق بنائیں۔ بالفعل اوائل مارچ تک کے لئے لکھنؤ اور اعظم گڈھ کا قصد ہے!

غ۔ احقر کی اہلیہ حضرت والا رح کے ارشادات پہ کاربند ہیں اور بعد سلام دعا کی درخواست گذار ہیں، کوئی قابلِ عرض بات نہ ہونے کی وجہ سے خود عریضہ نہیں گذارتا ہے ـــــــ حضرت والا احقر کی فلاح دارین کے لئے دعا فرمائیں۔ فقط

غلام محمد عفی عنہٗ

س۔ عزیزہ وفقہا اللہ تعالےٰ کی پابندی کی خبر سے مسرت ہوتی ہے، اس سے استعدادِ طبعی کا اندازہ ہوتا ہے، اللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

دل سے فقیر دُعا کرتا ہے۔

ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۴۴)

غ۔ حیدرآباد دکن

۲۲ جمادی الاوّل ۱۳۶۶ھ

سیّدی و مولائی دام لطفکم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

۱۔ مزاج مبارک!

۲۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہو رہی ہے لیکن حضرت والا رح سے نیاز حاصل کرنے کو جی بہت تڑپتا ہے، اللہ تعالیٰ کوئی صورت پیدا فرمائیں۔

س۔ بھوپال

۲۶ ج ا ۱۳۶۶ھ

محب مخلص وصمیم زادتوفیقکم

۱۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ، الحمدللہ خیریت ہے،

۲۔ اللہ تعالیٰ کوئی موقع عطا فرمائیں۔

غ۔ حضرت مولانا محمود الغنی صاحب احقر کے حال پر پہلے سے زیادہ کرم فرما ہیں اور اکثر کتابیں (خصوصاً حضرت تھانوی رح کی) از خود عنایت فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ "حسن العزیز" (ملفوظات حکیم الامتؒ جمع فرمودہ خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؒ) کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہو رہی ہے اور ایک کتاب کسی قدیم بزرگ کی "مجالس الابرار" نامی بھی مولانا نے عنایت فرمائی ہے، (مجالس الابرار ایک سو مجالس پر مشتمل ہے اصل کتاب زبان عربی میں ہے اور اس کا صاف وسلیس ترجمہ مولانا حکیم محمد ابراہیم صاحب رانديری نے کیا ہے، کتاب کے مصنّف شافعی مسلک کے کوئی عالم ربّانی ہیں، اپنا نام ظاہر

نہیں فرمایا ہے، تصحیح عقائد اور رد بدعات میں نہایت مدلل و موثر تالیف ہے،)

س۔ بزرگوں کی توجہ کو فال نیک سمجھیں، اللہ تعالیٰ فائدہ بخشیں،

غ۔ اپنے معمولات پر قائم ہوں مگر حالت میں کوئی ترقی نہیں پاتا بلکہ اکثر پستی ہی محسوس ہوتی ہے۔ حضرت والا دعا فرمائیں کہ اللہ اپنے کرم سے احقر کو محروم نہ فرمائے!

س۔ وہ کسی کو محروم نہیں کرتا (کس قدر ہمت افزا تیقن ہے) آپ اپنے عمل کو جاری رکھیں، اور مداومت کریں، پھر اس قسم کے وساوس کی پروا نہ کریں۔

غ۔ آج کل وساوس بہت آتے ہیں اور بعض دفعہ غیر شعوری طور پر ان میں مشغولیت ہو جاتی ہے، البتہ چونک پڑنے پر خیال کو کسی اور جانب لگا دیتا ہوں،

س۔ ایسا ہی کیا کیجئے!

غ۔ لوگوں سے ہم کلامی سے خواہ وہ اپنے ہم رتبہ ہوں یا علماء جی یہ چاہتا ہے کہ کوئی بات زبان سے ایسی نکلے کہ لوگ اس کی تعریف کریں اور اکثر ہو بھی جاتا ہے تو کیا ایسے مواقع پر سکوت اختیار کر لینا چاہیئے۔ دعا خواہ

احقر غلام محمد

س۔ یہ توریا ہے، لوگوں کی تعریف پر نظر رکھنے سے کیا حاصل؟ کیا اس سے قرب الٰہی اور دخول جنت میں کچھ بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ پھر بے حاصل ہے اور اس کی طرف نظر رکھنا اللہ تعالیٰ کی جلالت شان سے بے خبری ہے۔ اب جب ایسا خیال آئے تو خاموش رہیئے، اور استغفار کیجئے۔

دل سے دعا ہے، ہیچمداں سید سلیمان

مکتوب (۴۵)

غ۔ حیدرآباد دکن، ۷، اپریل، ۱۹۴۷ء

سیّدی و سندی و مولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج مبارک!

گذشتہ دو ہفتوں سے پھر شدید خارش میں مبتلا ہوں چونکہ بیماریوں میں معمولات کا نقصان ہوتا ہے اس لئے بیماری سے ہمیشہ پناہ چاہتا ہوں۔

س۔ از بھوپال

محب صمیم و مخلص قدیم زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ خیریت ہے۔

بیماری پر صبر ہو تو اس سے تکفیر سیئات اور رفع درجات حاصل ہوتا ہے اس لئے اس سے پناہ تو نہ مانگئے البتہ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کیجئے! (کیا بصیرت افزا جواب ہے)

غ۔ نقشبندیہ سلسلہ میں لطائف ستہ کا جو ذکر آتا ہے، کیا یہ سب حدیث و قرآن سے ثابت ہیں؟ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ کا ایک ملفوظ نظر سے گذرا جس سے معلوم ہوا کہ ہمارے طریق میں صرف لطیفۂ قلبی پر زور دیا جاتا ہے کیونکہ یہی حدیث سے ثابت ہے!

س۔ حدیث و قرآن سے ثابت نہیں، حدیث و قرآن سے صرف لطیفۂ قلب ثابت ہے قرآن پاک میں "قلب منیب" اور "قلب سلیم" کا ذکر آتا ہے، حدیث میں ہے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے وہ ٹھیک ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا، "اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ" اس لئے حاجی صاحب رحمۃ اللہ کے سلسلہ میں سارا زور قلب کے تزکیہ پر ہے!

غ۔ لطائف جاری ہونے کا منشا بھی سمجھ میں نہ آیا!

س۔ منشا یہی ہے کہ اللہ اللہ کی آواز ہر جگہ سے موہوم ہوتی ہے۔

غ۔ احقر کے لئے استحکام فی الدین اور ترقی ایمان کی دعا فرمائیں۔ فقط

احقر غلام محمد عفی عنہٗ

---

[1] اس لفظ کے استعمال کو حضرت والا رحمۃ اللہ درست نہ سمجھتے تھے، بالمشافہ احقر کو اس سے منع فرما دیا تھا۔

س۔ رسوخ وکمال ایمان کی دعا ہے۔

ؔپھلواری شریف ۔ ۱۴ مئی ۱۹۴۶ء

مکتوب (۴۶)

غ۔ حیدرآباد دکن

جمادی الاوّل

سیّدی ومولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مزاج اقدس!

احقر بفضلہ تعالیٰ بخیریت سے ہے اور معمولات پر پابند!

س۔ از بھوپال

حبیبی وعزیزی ادام اللہ توفیقاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، بحمداللہ کہ فقیر مع الخیر ہے!

مبارک کہ استقامت اس راہ میں سب سے بڑی چیز ہے:

غ۔ احقر کو اس وقت رخصت کا حق بھی حاصل ہے اور اخراجاتِ سفر بھی موجود ہیں، اجازت ہو تو احقر بہ صد شوق حاضر ہوگا، اور یہی اشتیاق اور اصرار میری اہلیہ کا بھی ہے، لیکن اس سلسلہ میں ایک عرض کی بہ صد ادب جسارت کر رہا ہوں، چونکہ احقر کا وہاں کوئی دوست یا شناسا نہیں نیز حضرت پیرانی صاحبہ اب وہاں تشریف رکھتی ہیں، اس لئے حضرتِ والا کے توسط سے کوئی مکان یا کمرہ کرایہ پر مل جائے تو کرم بالائے کرم ہوگا ——— اگر یہ انتظام بہ سہولت ممکن ہے تو احقر آئندہ ماہ حاضری کا قصد رکھتا ہے۔

حضرت والا سے دینی و دنیوی فلاح کے لئے دعا کی درخواست ہے، فقط

جویائے کرم، احقر غلام محمدؐ

س۔ آنے کا شوق مُبارک مگر صورتِ حال یہ ہے کہ جس مکان میں مَیں ہوں اوس میں گنجائش مطلق نہیں اس لئے بالفعل صبر کیجئے اور عزم منسوخ کیجئے، پاس میں کوئی دوسرا مکان بھی نہیں مل سکتا، یہاں غلہ کی بھی دقت ہے[1]، اور موسم گرم ہے شاید کہ آئندہ کوئی مناسب صورت نِکل سکے۔

آپ کے شدّتِ شوق کو دیکھتے ہوئے ہرچند کہ یہ التوا آپ پر شاق ہوگا تاہم بالفعل اسی میں مصلحت سمجھیں، (اللہ اللہ، اپنے خادموں کی یہ دلداری!)

دلی دُعا ہے۔ ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۴۷)

غ۔ حیدرآباد دکن

۳ر شوال ۱۳۶۷ھ

حضرت سیّدی و مولائی ادام اللہ فیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمدللہ حضرت والاؒ کے جواب سے سرفرازی ہوئی اور بصیرت حاصل ہوئی، امید ہے کہ حضرتِ والاؒ مع الخیر ہوں گے!

س۔ بھُوپال

۱۳ر شوال ۶۷ھ

عزیز صمیم رزقکم اللہ تعالیٰ شانہ معرفتہ"

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ الحمدللہ خیریت ہے!

غ۔ آج دفتر جارہا تھا کہ اپنی نظر خلق پر ہونے کا تصوّر پیدا ہوا اور یہ خیال کافی قوت سے اُبھر آیا کہ اگر تیری نظر خلق پر نہیں تو آج جوتا ہاتھ میں لئے ننگے پیر چل ——— عمل میں کچھ ابھی تذبذب تھا کہ معاً دوسرا خیال یہ آیا کہ شرعاً اس کا مامور نہیں کیا گیا، اس

---

[1] یہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد کا زمانہ تھا!

لئے کیوں اس خیال پر عمل کروں، بہرحال خیال اوّل پر عمل نہ ہو سکا، مدعائے عرض یہ ہے
ان دونوں خیالات میں سے کون رحمانی ہے اور کون نفسانی؟ تاکہ آئندہ ایسی حالت میں
نفس کو ذلیل کیا جا سکے۔

س۔ بے شبہ یہ ایک مرض ہے جس کا نام عجب ہے، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے اور اس کا علاج بھی وہی
ہے جو آپ کے ذہن میں آیا، مگر یہ مرض کے آخری درجہ کا علاج ہے، ابھی تو یہ خطرہ کی حد میں ہے
اس کا علاج یہ ہے کہ مخلوق اگر مجھے اچھا سمجھے یا بُرا سمجھے آخرت کا معاملہ تو مخلوق کے سمجھنے پر نہیں
خالق کے سمجھنے پر ہے، معلوم نہیں وہاں کیا حال ہو گا، پھر عُجب کاہے پر!

اسی کے ساتھ اپنے گناہوں اور عیوب کا استحضار کیا جائے کہ مخلوق تو علم غیب سے
محروم ہے وہ ہمارے اچھّے یا بُرے ہونے کا کیا فیصلہ کر سکتی ہے، اوس کو خبر ہی کیا ہے؟
(تشخیص کی نزاکت، تجویز کی حذاقت اور قوتِ اظہار، ہر بات سے حضرت والا رح
کی محققانہ شان عیاں ہے!)

ع۔ عبدالعزیز دباغ قدس سرہٗ کی کتاب "ابریز" مطالعہ میں ہے، چند ہی اوراق پڑھنے سے
قلب میں آخرت اور عالم روحانی کی طرف میلان محسوس ہوا اور اس عالم فانی سے بے رغبتی
محسوس ہونے لگی، احقر کے لئے اس قسم کی کشفی اور ذوقی کتابیں دیکھنا مناسب ہے
یا نہیں؟

س۔ کتاب اچھّی اور مؤثر ہے، پڑھیئے!

ع۔ "تفسیر حقانی" سے متعلق حضرت والا رح کی رائے معلوم ہو تو احقر کے لئے موجب طمانیت
ہوگی، نیز اور مستند اردو تفاسیر کی طرف رہبری فرمائی جائے تو ہدایت کا باعث ہو گا۔

س۔ اس تفسیر میں ذرا عقلیت کا میلان ہے۔ آپ حضرت والا رح کی تفسیر (بیان القرآن) کیا
نہیں دیکھتے؟

(بیان القرآن دیکھتا تو تھا مگر تفسیر حقانی کو اس سے بہتر سمجھتا تھا لیکن جب قرآن فہمی

کا کچھ ذوق پیدا ہو گیا تو اپنے خیال کی غلطی معلوم ہوئی اور بیان القرآن کی عظمت کا اندازہ ہوا)

غ۔ بحمد اللہ رمضان کے روزے پورے ہوئے، قبولیت کے لئے دعا فرمائیں،

س۔ اللہ تعالیٰ میرے اور آپ کے روزے قبول فرمائیں!

غ۔ گذشتہ کچھ عرصہ میں متعدد مرتبہ احقر نے یہ خواب دیکھا کہ قینچی سے اپنے مونچھ اور ناک کے بال تراش رہا ہے، ایک مرتبہ تو بہت بڑی قینچی ہاتھ میں تھی

س۔ اس سے اشارہ اصلاح کی طرف ہے، اصلاح ہو رہی ہے۔

غ۔ عید کی رات کو بعد تہجد خواب دیکھا کہ میری شیروانی، جو حسب معمول گھٹنوں تک ہوتی ہے ٹخنہ کے قریب تک لانبی ہے۔ اس پر میں خود متعجب تھا، اطلاعاً عرض کر دیا۔

س۔ لباس کا بڑا ہونا علم دین کی طرف اشارہ ہے، بشارت ہو، کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں،

غ۔ ذکر خفی کے بجائے پھر جہری کی طرف طبیعت کا میلان ہے مگر اس میں ضعف دماغی کا قوی امکان ہے!

س۔ ذکر جہری میں مستی ہے اس لئے جی چاہتا ہو گا، اپنی طبیعت کا اندازہ کرلیں پھر فیصلہ کریں،

غ۔ احقر کی اُخروی و دینی صلاح و فلاح کے لئے حضرت والا دُعا فرمائیں،

وابستہ دامن احقر غلام محمدؐ

س۔ دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں،

فقیر ہیچمداں سُلیمان ۱۳ شوال ۶۷ھ

مکتوب (۴۸)

غ۔ حیدر آباد دکن

۹ مئی ۴۸ء

حضرت اقدس واعلیٰ مدظلکم العالی، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ مبارک!

تین چار روز سے احقر کو ڈراؤنے خواب دکھائی دے رہے ہیں، کبھی زبردست سانپ دکھائی دیتے ہیں اور کبھی شیر وغیرہ اکثر وہ حملہ کرنا چاہتے ہیں اور احقر کو ڈر بھی ہوتا ہے مگر وہ قریب آکر رہ جاتے ہیں، حملہ نہیں کر پاتے!

س۔ بھوپال

حبیبی وصدیقی رفع اللہ شانکم

الحمدللہ خیریت ہے۔

اگر معدہ کی خرابی سے یہ نہیں تو نفسِ امّارہ شیر اور شیطان، سانپ ہے، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں،

غ۔ تقریباً ایک ہفتہ قبل خواب دیکھا کہ احقر کو معلوم ہوگیا ہے کہ اب موت آنے والی ہے اس کا اظہار احقر نے اپنے والدین وغیرہ سے بھی کر دیا اور نہایت خوش تھا کہ اب اس دنیا سے کوچ کرنا ہے، یہاں تک کہ بعض وصیتیں وغیرہ بھی لکھ کر حوالے کر دیں اور بالکل تیار ہو کر انتظار میں بیٹھا تھا اور فرطِ مسرت سے ایک مرتبہ یہ مصرعہ بھی زبان سے نکلا کہ

ع "قلندر جز دو حرف لاالٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا"

اس کے بعد کچھ سر میں درد شروع ہوا گویا شریان پھٹنے والی ہے مگر یہ صرف طبعی تکلیف تھی اور دل برابر اس کوچ سے مسرور تھا، ایسے میں آنکھ کھل گئی اور یکایک ذہن میں جو بات آئی وہ یہ تھی کہ موت کے وقت اور اس کے بعد اگر کوئی چیز باعثِ تسکین ومسرت ہو سکتی ہے تو صرف وہی عمل ہے جو شریعت کے مطابق اور سنّت کے ماتحت ہو، باقی ہیچ ــــــــ

اس خواب کے بعد ۲۴ گھنٹہ تک دل پر عجیب ہیبت طاری رہی کہ اگر ایسی موت نصیب نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟ کیونکہ اپنی بداعمالیوں کے پیشِ نظر تو اس کی کوئی امید نہیں ــــــــ

حضرت والا، احقر کے لئے فلاحِ دارین کی دعا فرمائیں، فقط احقر غلام محمد

س مبارک کیفیت ہے! ؎ خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ———
موت کی تیاری یہی ہے کہ اعمالِ طاعت میں اضافہ ہو ورنہ (محض ڈر تو) طبعی کمزوری ہے، دل دُعا ہے!

بیچداں سُلیمان ۱۵ مئی ۱۹۴۷ء

مکتوب (۴۹)

غ۔ حیدرآباد دکن

یکم رجب ۱۳۶۶ھ

سیّدی و مولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مزاجِ اقدس!

بحمداللہ معمولات پر کاربند ہوں لیکن خیال میں یکسوئی نہیں رہتی بلکہ سخت انتشار رہتا ہے

س۔ بھوپال

۶ رجب ۱۳۶۶ھ

برادرِ عزیز و مخلص زادکم اللہ تعالیٰ حرصاً علی الدین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمدللہ مع الخیر ہوں۔

یہ شکر کا مقام ہے، یکسوئی عقیدہ کی مطلوب ہے اور وہ آپ کو حاصل ہے یعنی یہ کہ صرف خدائے تعالیٰ کی رضا کے لئے آپ کام کر رہے ہیں، یہی مقصود ہے، باقی یکسوئی خیال جس کا دوسرا نام محو ہوجانا یا انہماک ہے نہ مقصود ہے اور نہ ہر ایک کیلئے محمود (کیا قیمتی ارشادات ہیں، اس کی قدر یا تو "سالکِ مبتلا" جان سکتا ہے یا "سالکِ عارف")

غ۔ مناجاتِ مقبول کے آخر میں جو شجرہ درج ہے، کیا احقر اس کی بھی تلاوت کر لیا کرے؟

س۔ شجرہ کا مطالعہ کرلیا کریں، اوس کو بطورِ وِردِ روزانہ پڑھنے کی ضرورت نہیں، (حرف حرف سے اعتدالِ مسلک نمایاں ہے!)

غ۔ حضرت تھانویؒ کے مواعظ بہ اعتبارِ زبان ایسے ہیں کہ غیر فارسی و عربی داں افراد ان سے پورا استفادہ نہیں کر سکتے، ایسی صورت میں اگر ان کی زبان سلیس کر دی جائے تو شاید نفع زیادہ عام ہو، واللہ اعلم، اگر حضرت والاؒ مناسب تصور فرمائیں تو احقر کسی وعظ کی تسہیل کر کے خدمتِ والاؒ میں پیش کرے گا۔

س۔ کسی وعظ کو عام فہم کر کے مجھے دکھائیں،

غ۔ سُنا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے حضرت والاؒ کو دعوت پہنچی ہے (توسیعی خطبات کے سلسلہ میں) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اس سے قبل بھی ایک ایسا موقع فراہم کیا گیا تھا مگر حضرتِ والاؒ تشریف نہ لاسکے۔ اس کے وجوہ کچھ بھی رہے ہوں، احقر تو اپنی حد تک یہی سمجھتا ہے کہ ے

گرگشش من اثرے داشتے یارِ مسویم گذرے داشتے

س۔ ابھی وقت کی تعیین نہیں معلوم نہیں ہوئی،

یہ سب آپ کی محبّت ہے!

غ۔ احقر کے مزاج میں غصّہ زیادہ ہے، اس کے ازالہ کی تدبیر تجویز فرمادیں!

س۔ یہ تصوّر کریں کہ اللہ تعالیٰ کو ہم پر اس سے زیادہ قدرت ہے پھر بھی وہ حلم و درگذر فرماتا ہے تو ہم کو اس سے زیادہ حلم چاہیئے۔

غ۔ " الفتح الربّانی" (مواعظ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ) کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی، اس کا اثر یہ ہے اپنا عمل ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ منافقت اور ریا تقریباً ہر عمل میں محسوس ہوتی ہے اور اسی وجہ سے انجام کا بڑا خوف ہے، حضرت والاؒ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اخلاص عمل عطا فرمائے، فقط

توجّہ کا طالب، احقر غلام محمّد

س۔ یہ کیفیت بھی اچھی ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بے نیازی کے استحضار سے یہی کیفیت پیدا ہوتی ہے مگر اس سے مایوسی نہ پیدا ہو کہ وہ کفر ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رحمت و مغفرت کا نیک گمان رکھا جائے، (کس قدر جہل مرکب میں مبتلا ہیں وہ لوگ جو اُس مذہب کو جس میں مایوسی کفر ہے قنوطیت افزا سمجھتے ہیں) دل سے دُعا کرتا ہوں،

ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۵۰)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۷ رجب ۱۳۶۶ھ

سیّدی و مرشدی دامت برکاتہم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج اقدس!

مواعظ کی تسہیل کی اجازت پاکر بڑی مسرت ہوئی۔ احقر نے "سلسلۃ الاحیاء" کا ایک وعظ "الدنیا والآخرۃ" منتخب کرلیا ہے، جب اس کا مسودہ حضرت والا کی خدمت میں پیش کروں تو کیا اصل وعظ بھی ساتھ رہے؟

س۔ بھوپال

حبیبی وصدیقی ومخلصی زاد عرفانکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ خیریت ہے،

خدا کرے کہ یہ کام بہ احسن وجوہ انجام پائے ——— یہ آپ کے لئے زادِ آخرت ہو

جی ہاں، اصل اور تسہیل دونوں بھیجدیں!

غ۔ دَوران قیام بھوپال حضرت والا نے غالباً فرمایا تھا کہ کتابوں کی چھپائی پر ناشر کتب سے کوئی رقم لینا (بطور معاوضہ حق اشاعت) درست وجائز نہیں، اس مسئلہ کی توثیق چاہتا ہوں

س۔ قلمی مسودہ کو اگر ناشر کے ہاتھ بیچا جائے تو درست ہے، البتہ حق تصنیف فروخت کرنا حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ (یعنی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ) کے نزدیک درست نہیں، مجھے گو اس میں کچھ شبہ ہے مگر عمل اسی پر ہے، مسئلہ اب تک مجھ پر محقق ہوا نہیں (کیا حزم و احتیاط ہے)

ع۔ اور کوئی بات قابل عرض نہیں بجز اس کے کہ حضرت والا احقر کی دنیوی و اُخروی صلاح و فلاح کے لئے دُعا فرمائیں۔ فقط

احقر غلام محمدؐ

س۔ میری تمام نیک دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، والسّلام ہیچداں سُلیمان
(بس انہی دُعاؤں کے سہارے مغفرت کی امید قائم ہے)

مکتوب (۵۱)

ع۔ حیدرآباد دکن

۳۰ رجب ۱۳۶۶ھ

سیّدی و مولائی دامت برکاتہم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

(۱) مزاجِ اقدس!

(۲) بحمد اللہ معمولات پر پابند ہوں اور وعظ کی تسہیل کا کام بھی حسبِ فرصت انجام دے رہا ہوں، اللہ تعالےٰ مجھ بے طاقت کی مدد فرمائیں!

س۔ بھوپال

۱۸ شعبان ۱۳۶۶ھ

عزیز گرامی اذا قکم اللہ تعالیٰ عرفانہ

(۱) الحمد للہ خیریت ہے، ایک ماہ سے جوشِ چشم ہے، ایک آنکھ اچھی ہوگئی ہے، دوسری

ابھی تک اپنی حالت پر ہے نوشت وخواند سے معذوری ہے، اسی لئے جواب میں تاخیر ہوئی، دُعا کیجئے۔

(۲) بحمداللہ

غ۔ چند روز قبل تقریباً ۲ بجے رات کے حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی رح کو خواب میں ایک مسجد کے اندر دیکھا پھر وہاں سے ایک اور جگہ جہاں حضرت کی دعوت تھی، احقر بھی وہاں پہنچ گیا، حضرت ابھی تشریف نہیں لائے تھے مجھے کھانا کھلا دیا گیا اس کے بعد آنکھ کھُلی ______ مگر پھر جو آنکھ لگی تو دوبارہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کو مسجد ہی میں دیکھا، ہم نے نماز باجماعت ادا کی، اس کے بعد حضرت حاجی صاحب تقریر کے لئے استادہ ہوئے اور خطاب شروع فرمادیا، مضمون اس وقت یاد نہیں۔ لوگ بہت کم تھے، دوران وعظ ہی مٹھائی تقسیم ہوئی، احقر کو بھی ایک پیڑا ملا، اس کے بعد ایک نوجوان نے جو طالب علم معلوم ہوتا تھا سبز رنگ کی صابونیں تقسیم کیں لیکن بعض بعض کو دیں اور کسی کو ایک اور کسی کو دو، احقر کو تین صابونیں دیں جو احقر نے جیب میں رکھ لیں۔ ایسے میں آنکھ پھر کھُل گئی اور میں نماز تہجد کے لئے اُٹھ گیا،

حضرت حاجی صاحب کا صحیح حلیہ معلوم نہیں لیکن خواب میں حضرت رح کو گورا، دُبلا، بلند قامت اور سفید ریش دیکھا، واللہ اعلم،

صابن کا منشا ٹھیک طور پر سمجھ میں نہیں آیا،

س۔ شکر کیجئے کہ آپ نے اپنے سلسلہ کے مورث اعلیٰ کی زیارت کی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس سلسلہ سے مناسبت ہوگئی فحمداللہ تعالےٰ ______ کھانا یعنی رزق اس سلسلہ کے فیوض وبرکات ہیں، صابون تزکیہ وتصفیہ کے سامان وآلات ہیں، (اس تعبیر کو پاکر یہ بات ذہن میں جم گئی ہے کہ اپنے زنگ آلود قلب کو بہت گھِسنا اور صاف کرنا ہے بس اللہ تعالیٰ ہی ہمّت وتوفیق عطا فرمائے، ناظرینِ کرام

بھی اس سراپا عیب کے صفائے باطن کے لئے دعا فرمائیں)

غ۔ جی چاہتا ہے کہ جب اس دنیا سے جانا ہو تو کوئی دنیوی آرزو دل میں موجود نہ رہے اعمال کی تقصیر عیاں مگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو کیا بعید ہے ؎

مجھے مشکل سے مشکل ہے — اُنھیں آساں سے آساں ہے

حضرت والا اس ناکارہ کے حُسنِ خاتمہ کے لئے دعا فرمائیں۔

س۔ بالکل صحیح ہے دعا کیا کیجئے: فاطر السمٰوات والارض انت ولی فی الدنیا والآخرہ توفنی مُسلماً والحقنی بالصّٰلحین،

غ۔ ایک کیفیت ابتداء سے آج تک محسوس ہوتی رہی ہے، مگر عرض کی جسارت آج کر رہا ہوں، وہ یہ کہ بعضے بزرگ کے پاس بیٹھا تو اولیاء اللہ اور ان کے قصص سے دلچسپی پیدا ہوئی، بعضے بزرگ کی صحبت سے دل کا میلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و واقعات سُننے کی طرف زیادہ ہوا، لیکن حضرت والا کی صحبت میں خواہ وہ جسمانی حاضری کے ذریعہ ہو یا بذریعہ خط و کتابت، ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے براست کشش محسوس ہوتی ہے[1] اور اب احقر کی سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہیں کہ بدعتی اور قبر پرست کو توحید کا کچھ مزہ ملتا بھی ہوگا، والسّلام ، توجّہ خاص کا طالب

احقر غلام محمّد

س۔ یہ احوال و کیفیات ہیں اور ان میں سے ہر ایک صحیح اور دُرست ہے، رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے محبّت بھی اللہ ہی کی خاطر ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم وسیلہ ہیں مقصود نہیں ہیں:

---

[1] اس کی وجہ اب یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت مرشدی قدس سرہٗ پر توحید ہی کا خاص غلبہ تھا اور کمال یہ کہ تنزیہہ کے ساتھ تھا، اسی وجہ سے زبان پر کبھی "وحدۃ الوجود" یا "وحدۃ الشہود وغیرہ کے مسائل نہ رہے۔

انی وجهت وجہی للذی فطر السموات والارض حنیفاً وما انا من المشرکین،
حضورؐ کی محبت بھی واجب بلکہ فرض ہے لیکن اوس کی حیثیت وضو کی فرضیت کی ہے
جس کے بغیر نماز درست نہیں، لیکن وضو مقصود نہیں، مقصود نماز ہے۔

اس بات کو زبان سے ظاہر کرنے میں اکثر غلطی کا اندیشہ ہے اس لئے اسکا مذاکرہ
نہ کیا جائے۔ ہیچمداں سُلیمان

(تحقیق واحتیاط اور آداب کا یہ لحاظ کلکِ سُلیمانی کا خاص ونادر وصف ہے!)

مکتوب (۵۲)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۲، رمضان ۱۳۶۶ھ

حضرت سیّدی ومولائی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج اقدس!

حضرت والا آج کل سخت اضطراب رہتا ہے، جو گذر رہی ہے اس کو اپنی عدم استعداد
اور حضرتؒ کے پاس آداب کے مدّنظر صحیح طور پر پیش بھی نہیں کرسکتا، بجز خدمت اقدس
میں حاضری کے علاج کی کوئی اور صورت سمجھ میں نہیں آتی ــــــ حضرت والا
کے دولت کدہ سے متصلہ مسجد کے کمرہ میں امام صاحب کی اجازت سے ٹھیر جاؤں گا،
خورونوش کا انتظام ہوٹل میں ہوجائے گا، یہ اس لئے عرض کیا کہ حضرت کے دولت کدہ
میں گنجائش نہ ہوگی اور اگر اب سفر نہ کرسکا تو پھر حضرت والا کا سفرِ حج شروع ہوگا اس
کے بعد نہ جانے کب زیارت نصیب ہوگی ــــــ ۱۵، اگست ۱۹۴۷ء کے
بعد اگر حالات زیادہ خطرناک ہوگئے تو الگ مشکل ہے۔

س۔ بھوپال۔ ۲۵، رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ

محب من و عزیز قلبی شفاکم اللہ تعالیٰ وعفاعنکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ ، الحمدللہ خیریت ہے ،

عید کے بعد عربی کی کمیٹی دہلی میں ہے اس میں جا رہا ہوں ، انشاءاللہ اخیر اگست تک واپسی ہوگی اور اخیر ستمبر تک روانگی حج کا خیال ہے ،

طالب علمانہ زندگی مسجد کے حجرہ کی اختیار کر سکتے ہوں تو شروع ستمبر میں آجائیں ،

(یہ بات بھی بس امتحاناً ہی تحریر فرمائی گئی ورنہ جب حاضر ہوا تو انہی پچھلے الطاف سے بہرہ مند رہا)

ع . اوپر جو کچھ عرض کیا وہ محض اظہار حال ہے ، حضرت والا کو مجبور کر کے اجازت حاصل کرنا مقصود نہیں ، ہزار بار بھی جواب اگر نفی میں ملتا رہے تو احقر اسی کو مبنی بر مصلحت یقین کرے گا ____ البتہ یہ عاصی بہر صورت خصوصی دعا و توجہات کا محتاج ہے . فقط احقر غلام محمد

س . یہ آپ کی سلامت روی کی دلیل ہے جس سے جی خوش ہوا ،
ہمیشہ دعا ہے ____ ہیچمداں

سید سلیمان ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ

(اس گرامی نامہ کو پا کر سارا کرب و اضطراب ختم ہوگیا ، اب اگر بے چینی تھی تو ماہ ستمبر کے آمد آمد کی ____ جیسے ہی ستمبر کی پہلی تاریخ آئی ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعہ ۳ ستمبر کو اپنی حاضری کی اطلاع بارگاہ سلیمانی میں کر دی اور رخت سفر باندھ لیا)

بھوپال کی دوسری حاضری

(۳ر تا ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۷ء)

بازہوائے چمنم آرزوست　　　جلوۂ سروِ سمنم آرزوست

امتحانِ شوق شوق کو عجیب امتحان درپیش تھا ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہندوستان کے طول وعرض میں مسلمانوں کا جو کشت وخون شروع ہوا تو بھارتی علاقوں میں مسلمان کی نقل وحرکت مشکل ہوگئی اور جُوں جُوں دن گزرتے جاتے تھے ظلم وستم بڑھتا ہی جارہا تھا، ان واقعات کو سُن سُن کر احباب واعزہ التوائے سفر کا مشورہ دے رہے تھے اور ان ہی مشوروں کو سُن کر طبعی خوف کچھ خود پر بھی طاری ہو ہو جاتا تھا مگر شوقِ زیارت اپنی جگہ برابر قائم تھا اور ترکِ سفر کو جی مانتا ہی نہ تھا، آخر اس کشمکش کا ذکر اپنے مخدوم وکرم فرما مولانا محمود الغنی صاحب مدظلہ کی خدمت میں کر دیا، مولانا برہم ہوگئے، فرمانے لگے "کیا آپ حضرت سیّد صاحب کی ذات کو مقصود بنا کر جا رہے ہیں یا حق تعالیٰ کی ذات آپ کا مقصود ہے؟ اگر اللہ کے لئے یہ سفر ہے تو پھر ڈر کس بات کا، اگر مارے جائیں گے تو شہادت نصیب ہوگی" ——— ان کلمات میں کچھ ایسی قوت تھی کہ دل بالکل یکسو ہوگیا اور حق تعالیٰ کی نگہبانی کا استحضار قوی تر ہوگیا

ع　دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است

اسٹیشن پر ستمبر کی ۲ تاریخ آپہنچی، شام کے وقت ضروری اسباب سفر کے ساتھ اسٹیشن پر پہنچا، کہاں وہ پچھلی گھما گھمی کہ کھوے سے کھوا چھلتا اور شور وغل سے کان پھٹے جاتے تھے اور کہاں آج کا بھیانک سنّاٹا، اسٹیشن پر مسافروں کی تعداد پہلے تو بہت ہی کم تھی۔

کوئی پچیس تیس ہوں گے! ان میں بھی صرف دو مسلمان، اور لطف کی بات یہ کہ دونوں علانیہ مسلمان، صورت شکل اور وضع وقطع تک میں تلبس کا ہر نشان مٹائے ہوئے! اس منظر سے دل پر ایک ہیبت سی طاری ہوئی ہی تھی کہ معاً ہمّت وعزیمت اس پر غالب آگئی اور اللہ کا نام لے کر میں ٹرین پر سوار ہوگیا اور دیکھ رہا ہوں کہ وہ برادرِ دینی بھی میرے ہی ڈبہ میں آگئے۔

دورانِ سفر

ٹرین چلی، اسٹیشن گذرتے چلے گئے، رات کے ۹، ۹½ بجے ہوں گے جی چاہا کہ ٹرین کے ڈائننگ کار میں جاکر چائے پی لوں کیوں کہ رات آنکھوں میں کاٹنی تھی وہاں جو پہنچا تو دو مدراسی ہندو بیٹھے چائے پی رہے تھے بڑے ہی متعصب اور سنگدل۔ مجھے آتا دیکھ کر ان میں سے ایک نے طنز آمیز ہنسی کے ساتھ خواہ مخواہ مخاطب کرلیا، "تشریف لائیے مُولی صَاب" (تشریف لائیے مولوی صاحب) میں نے اس کی بات اَن سُنی کردی اور الگ ایک میز پر چائے منگوالی، اُن دونوں نے یہ سمجھ کر میں کوئی "ملّانا" ہوں انگریزی میں خوب دل کھول کر باتیں شروع کردیں کہ کل گرانڈ ٹرنک میں اتنے مسلمان مارڈالے گئے، فلاں گاڑی میں اتنے مسلم بچوں کا سر قلم کردیا گیا اور درمیان درمیان میں اپنے جذبات کا بھی اظہار میری طرف چشم وابرو کے اشارہ سے کرتے جارہے تھے کہ ان کمبختوں کو تو اسی طرح تلوار کے گھاٹ اتارنا چاہیئے ——— میں دل ہی دل میں نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین فرمودہ دُعا پڑھتا رہا کہ اللھم انی اجعلک فی نحورھم واعوذ بک من شرورھم اور الحمدللہ کہ دل میں اس دُعا کی برکت سے ایسی قوت محسوس ہو رہی تھی کہ اگر سو ہندو بھی مل کر حملہ کریں گے تو مجھے ذرّہ برابر نقصان نہ پہنچا سکیں گے کیونکہ میری طرف سے تو اللہ تعالیٰ کی قوت وطاقت مقابل ہوجائے گی ——— میں نے اطمینان سے چائے پی لی اور مسلمانوں کی خونی داستان جتنی مجبوراً سُننی پڑی سُن کر اپنے ڈبہ میں آبیٹھا ——— تاریخ انسانیت میں آزادی کی خوشی میں خون کی ہولی ایسی کم ہی کھیلی گئی ہوگی،

رات کا تین چوتھائی حصہ آنکھوں آنکھوں میں کٹ گیا لیکن پھر نیند غالب آگئی اور قریب تھا کہ سورج نکل آتا، حیرت ہوئی کہ ایک ہندو نے مجھ کو جگایا اور نہایت ترش لہجے میں کہنے لگا کہ

"صبح کی نماز نہیں پڑھو گے سورج نکلنے والا ہے"۔ میں فوراً جاگ اٹھا۔ نمازِ فجر بھی ادا کی اور شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قضا سے بچا لیا ——— واقعی جب حق تعالیٰ چاہیں تو دشمن سے بھی بہی خواہی کے سوا کچھ بن نہیں آسکتا، شیطان بھی نماز پڑھوانے پر مجبور ہو جاتا ہے حالانکہ اس کا اصل کام تو نماز سے باز رکھنا ہے!

رات خیریت سے گذر گئی، دن کی گھڑیاں بھی کٹھن تھیں۔ بے ضرر رہیں، جتنے بھی اسٹیشن آتے رہے مسافروں کی تعداد بہت ہی کم دکھائی دی اور نظر جہاں جہاں ٹھہری سب غیر مسلم چہرے ہی دکھائی دیئے، جھانسی اسٹیشن سے ٹرین جو آگے چلی تو بغیر اسٹیشن یا سگنل کے کسی نشان کے عین جنگل میں رُک گئی، ان دنوں بیشتر یہی ہو رہا تھا کہ عین جنگل میں ٹرین روک لی گئی مسلمانوں کا صفایا کر دیا اور پھر گاڑی آگے کو روانہ ہو گئی، تصور کی آنکھ اس وقت بھی اسی قسم کا منظر قریب پا رہی تھی، میں اور میرے دوسرے ساتھی ایک دوسرے کو تک رہے تھے، کلمہ کا ورد جاری تھا مگر ہراسانی اور وحشت نہ تھی، کوئی دو تین منٹ ٹرین رُکی رہی اور پھر چل پڑی، معلوم ہوا سگنل نہ ملنے سے رُک گئی تھی ——— دل نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے ہمارے وہم و گمان کو باطل کر دکھایا۔

بھوپال اسٹیشن

ہوتے ہواتے ٹرین بھوپال اسٹیشن کے پلیٹ فارم پہ آ لگی، اب بھوپال تو اپنا جانا بوجھا مقام تھا، میں ٹرین سے اُتر فوراً اسٹیشن سے باہر نکل آیا اور ایک تانگہ میں سامان رکھوا ہی رہا تھا کہ حضرت اقدس کا موٹر ڈرائیور بھاگتا ہوا آیا کہ ہم تو آپ کے لئے موٹر لے کر آئے ہیں، چنانچہ تانگہ سے سامان اُتروا کر موٹر میں رکھ دیا گیا اور صاحبزادہ سید سلمان سلمہٗ اللہ کی معیت میں آستانۂ شیخ تک رسائی ہو گئی۔

قیام

حضرت والا نے تحریر تو یوں فرمایا تھا کہ مسجد کے حجرہ میں طالب علمانہ قیام کرنا ہوگا۔ مگر اُن کی شفقت کہاں اس کو گوارا کر سکی، اپنے ہی پاس ٹھہرایا، ساتھ رکھا اور طرح طرح ممنونِ کرم فرماتے رہے ——— اس مرتبہ دو تین ہی دن گذرے ہوں گے کہ بیت شدید

نزلہ میں مبتلا ہو گیا اور کمزوری بے حد محسوس ہونے لگی حضرت والا نے احقر کو حکیم ضیاء الحسن صاحب کے پاس بھیجا جو بھوپال کے شاہی طبیب تھے اور ایک خط بھی ان کے نام لکھا کہ پوری توجہ سے علاج فرمائیں، جب حکیم صاحب سے مل آیا تو خود دریافت فرمانے لگے کہ پرہیز کیا بتایا ہے بلا تکلف بتا دیجئے تاکہ اس کا اہتمام کیا جا سکے. میں اس زحمت دہی سے پانی پانی ہو رہا تھا مگر بات کچھ ایسی آپڑی تھی کہ چھپانا بھی مشکل تھا ـــــــــــ خدا کا فضل ہوا کہ دو ہی تین روز میں طبیعت اعتدال پر آگئی،

مگر اس علالت کی وجہ سے ایک صبعی قلق ہوا کہ صحبت شیخ میں پہنچ کر بھی خاطر خواہ محنت و مجاہدہ سے محرومی ہو رہی ہے، چنانچہ اسی اثر کے ماتحت ایک عریضہ حضرت اقدس کی خدمت میں تحریراً پیش کیا جو درج ذیل ہے:۔

مکتوب (۵۳)

ع۔ سیدی و مولائی عم فیوضکم. السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

احقر کی عام جسمانی حالت کئی برس سے ایسی ہے کہ نہ جسمانی کام زیادہ کر سکتا ہوں، نہ دماغی. اسی لئے باوجود شوق و ذوق کے ذکر و شغل کی زیادہ تاب بھی نہیں پاتا اور حضرت والا سے خاطر خواہ استفادہ سے محروم ہوں. نہ معلوم باطن کی اصلاح کب اور کیسے ہوگی؟

س۔ محب مخلص زادکم اللہ تعالےٰ توفیقاً۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

جسمانی صلاحیت کے مطابق ہی کام کیجئے، یاد ہوگا کہ تعداد بڑھانے میں میں نے سہولت کی قید لگائی تھی اور ایک دفعہ بہت زیادہ بڑھا لینے کا مشورہ نہیں دیا تھا، اب بھی یہی مشورہ ہے ـــــــ اگر ذکر جہری سے مشقت ہوتی ہے تو سری کیجئے جو نقشبندی طریقہ میں رائج ہے یعنی یہ کہ زبان بالکل بند تالو سے لگی ہوئی اور تصوّر کیجئے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز نکل رہی ہے. اس میں تعداد کی قید نہیں، وقت کا معیار ہے یعنی ۱۵ منٹ ۲۰ منٹ آدھ

گھنٹہ، ایک گھنٹہ جیسی فرصت ہو۔

غ۔ سلف صالحین کے واقعات شاہد ہیں کہ ایک دفع انہوں نے دین کا رُخ کیا تو پھر ساری عمر کے لئے دنیوی رغبتیں ہیچ ہوگئیں، آج ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ کیا یہ درست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے دُوری کے متناسب اثرات بھی گھٹتے جا رہے ہیں۔

س۔ ایسے واقعات ممکن ہیں اور ہوتے ہیں مگر ان کا شمار معجزات اور کرامات میں ہے ورنہ کامیابی تو کام ہی سے ہوسکتی ہے، اکثریت کے لحاظ سے تو یہ خیال صحیح ہے کہ عہدِ نبوی ؐ سے بعد کا وقت ہوگیا، مگر ممکن ہے کہ پچھلے افراد میں پہلے افراد کے سے یا بہتر لوگ ہوں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ میری اُمت کی مثال بارش کی ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ اوس کا اوّل زیادہ مفید ہے یا اوس کا آخر، والحمدللہ تعالیٰ بڑی اُمید کی یہ خوش خبری ہے!

غ۔ احقر کے لئے حضرت والا رح دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فضل وکرم فرمائے۔ فقط

احقر غلام محمّد

س۔ دل دعا کرتا ہوں۔ والسّلام

ہیچمداں سُلیمان ۲۰ شوال ۱۳۹۶ھ

اس سفر میں پہلی بار جناب عاصم سے ملنے اور ان کی شرافت ومحبّت سے مسرور ہونے کا موقع ملا، حضرت والا رح نے ازراہِ تعارف مُسکراتے ہوئے فرمایا کہ "عاصم میاں سخت مُسلم لیگی ہیں اور اب یہاں رہنا پسند نہیں کرتے بلکہ پاکستان ہجرت کر رہے ہیں"۔

چنانچہ یہی ہوا کہ وہ ۱۹۴۷ء ہی کے اواخر میں کراچی پہنچ گئے!

حضرت شاہ محمد یعقوب مجدّدی مدظلہٗ

قطب وقت حضرت شاہ ابو احمد بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ نقشبندیہ مجدّدیہ کے ایک ممتاز بزرگ گزرے ہیں اور خود حکیم الامّت رح بھی آپ کے کمالات باطنی کے معترف رہے ہیں شہر میں آپ کی خوش نقادہ مرجع خاص وعام رہی ہے، ہمارے حضرت والا رح کو بھی اس سے خصوصی تعلق

اس بنا پر رہا کہ حضرت کے برادرِ بزرگ شاہ ابوحبیب صاحبؒ اسی خانقاہ کے تربیت یافتہ اور حضرت شاہ ابواحمد قدس سرّہٗ کے خلیفہ تھے ـــــــــ اس خانقاہ کی رونق آجکل حضرت شاہ ابواحمدؒ کے چھوٹے فرزند حضرت شاہ یعقوب مدظلہٗ کی ذات باجمال ہے جو "پیرِ ننھے میّاں صاحب" کے نام سے معروف ہیں، حضرت والاؒ کبھی کبھی پیر صاحب کے پاس بھی چلے جاتے تھے اور خود پیر صاحب بھی کبھی کبھی حضرت والاؒ کے دولتکدہ پر تشریف لاتے تھے۔

احقر کو اب تک ان بزرگ کی زیارت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایک شام حضرت والاؒ نے خود ہی فرمایا کہ "چلئے آپ کو شاہ ابواحمد صاحبؒ کی خانقاہ دکھاؤں"

ہم نماز عصر پڑھ کر چلے مگر جب خانقاہ پہنچے تو ابھی پیر صاحب مسجد سے واپس تشریف نہیں لائے تھے، حضرت والاؒ نے فرمایا کہ یہ حضرات نماز عصر بہت تاخیر کر کے پڑھتے ہیں، چنانچہ مغرب میں شاید آدھ گھنٹہ باقی ہوگا کہ پیر صاحب نماز عصر سے فارغ ہو کر تشریف لائے، ان کی سکینتِ قلبی اور نورِ باطنی کا اثر ان کے چہرہ بشرہ سے نمایاں تھا۔ عمر اس وقت پچاس پچپن کے لگ بھگ ہوگی، حضرتِ والاؒ کو دیکھ کر لپکے اور ادب و احترام سے بٹھایا، احقر کی بابت پوچھا تو حضرت والاؒ نے حسبِ عادت فرمایا کہ "یہ میرے دوست ہیں حیدر آباد دکن سے ملنے آئے ہیں!"

اس کے بعد کچھ دیر دونوں بزرگوں میں قرآن پاک کی آیت

"وللہ یسجد من فی السمٰوات والارض طوعاً وکرھاً وظللھم بالغدو والاٰصال" (رعد) سے متعلق گفتگو رہی اور خود پیر صاحب ہی نے استفساراً یہ ذکر چھیڑا تھا۔ پیر صاحب کا کلام تمامتر ذوقی رنگ کا تھا اور ہمارے حضرتِ والاؒ کی تشریحات سراسر عالمانہ نہج کی تھیں جن سے غالباً ان کے ذوق کی تشفی نہ ہو سکی کیونکہ "ظلال" کا مسئلہ حضرات مجددیہ کا بنیادی مسئلہ ہے اور اسکی توجیہ بھی ان کے ہاں خاص ہے جس پر وحدۃ الشہود کا دار و مدار ہے۔

لہ اس عبارت کو پڑھ کر حضرت پیر صاحب نے احقر کو لکھا کہ ان کے ہاں تو نمازیں اوّل وقت ہی ہوتی ہیں مگر عصر کے بعد چونکہ کچھ دیر درس رہا اس لئے واپسی میں اتنی تاخیر ہو گئی تھی۔

غرض مغرب کی نماز کا وقت قریب آیا تو یہ مجلس خیر برخاست ہوگئی!

سیاسی حالات کی ابتری اور واپسی کی اجازت

حضرت والاؒ کی خدمت میں احقر کو ہر طرح آرام و سکون حاصل تھا اور حیدرآباد کی طرح ریاست بھوپال بھی پُرامن و عافیت تھی مگر ان دو ریاستوں سے باہر ہندوستان کے طول وعرض میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ انتہائی دردانگیز اور وحشت اثر تھا، اور ہر نئے دن کی اطلاع پچھلے دن کی اطلاع سے المناک مل رہی تھی، بھوپال پہنچ کر شاید دو تین ہی روز ہوئے تھے کہ گرینڈ ٹرنک ایکسپریس کے بند ہونے کی اطلاع ملی، اس اطلاع پہ دو دن بھی نہ گذرے ہوں گے کہ دہلی اور بعض دوسرے شہروں کے فسادات نے ایسی شدّت اختیار کرلی کہ "دکن ایئرویز" کی ہوائی سروس بھی بند ہوگئی! ڈاک کے سارے معاملات قدرتاً معطّل ہوگئے۔ ________ اس صورت حال سے مجھ کو بھی بڑی تشویش ہوئی، حالانکہ ادھر میں ایک محفوظ جگہ پر تھا اور اُدھر متعلقین بھی ایک مامون مقام پر!! مگر پریشانی اس بات کی تھی کہ ان حالات میں جب کہ کوئی خط آجا نہیں رہا تھا اور خود میری واپسی کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں نہ جانے والدین کس قدر پریشان ہوں گے اور اس پریشانی میں نہ معلوم کیا اقدام کر بیٹھیں، کہیں ان مخدوش حالات میں ٹرین جاری ہوتے ہی میرے لئے گھر سے نکل نہ پڑیں راستہ تو ہر حالت میں غیر محفوظ رہے گا۔ اسی ذہنی انتشار میں معلوم ہوا کہ "گرینڈ ٹرنک گاڑی پھر چلنے لگی ہے، مگر مسلمان کے لئے سفر نہایت خطرناک ہے، میں نے سوچا کہ بھوپال اسٹیشن پر چل کر دیکھا جائے۔ افواہوں میں مبالغہ بھی ہوتا ہے، اسٹیشن پر پہنچا تو ہُو کا عالم تھا، کچھ دیر میں ٹرین آکر رُکی، یہ "اَپ" ٹرین تھی ہر ڈبّہ میں دو چار مسلح سکھ بیٹھے ہوئے جن کی آنکھوں سے معصوموں کا خون ٹپک رہا تھا مسلمان کا اس ٹرین میں کیا پتہ چلتا کوئی شریف ہندو بھی جہاں تک نظر دوڑ سکی دکھائی نہ دیا، اس منظر کو دیکھ کر میں نے یہ توقطعی فیصلہ کرلیا کہ واپسی کا سفر ٹرین سے نہ ہوگا۔

گھر آکر حضرت والاؒ سے سارے مشاہدات بیان کئے اور عرض کیا کہ حضرت اب جب

ہوائی سروس شروع ہو جائے تو پہلے جہاز سے واپسی کی اجازت مرحمت ہو، حضرت والا رہ نے ازراہِ شفقت فرمایا کہ آپ بھی محفوظ ہیں اور آپ کے متعلقین بھی، تو جلدی کرنے کے بجائے قیام اور طویل کر لیجیے تو کوئی حرج نہیں جب راستہ پُرامن ہو جائے تو چلے جانا۔ ابھی تو مجھ کو بھی کہیں جانا نہیں ہے" ——— مگر جب احقر نے والدین کی طرف سے تشویش ظاہر کی تو مسکراتے ہوئے سعدیؒ کا یہ شعر پڑھ دیا ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق ——— کہ یاراں فراموش کردند عشق

احقر خاموش ہو رہا تو پھر فرمایا کہ ہوائی اڈّے سے معلوم کر لیجیے کہ فضائی سروس کب جاری ہو گی؟

دوسرے دن مکرمی جناب ابوعاصم صاحب کی کوشش سے اتنا تو ہوا کہ مشروط بکنگ (Provisinal Booking) کا یقین حاصل ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ۱۲؍ستمبر کو دہلی سے حیدرآباد فضائی سروس کھل جائے گی۔

یہ تو ہوا مگر اب مسئلہ رقم کی فراہمی کا تھا اس لئے کہ میرے پاس تو ٹرین کے سفر کے لائق ہی روپیہ تھا، ہوائی جہاز کے اخراجات تو کئی گنا زائد تھے۔ آخر حضرت والا رہ ہی سے مجبوراً اس کی درخواست بھی کرنی پڑی جو فوراً "قبول فرمالی گئی۔ اور اسی طرح پہلے جہاز کے امیدواران پروانہ میں مجھ کو بھی داخلہ مل گیا۔

ہوائی اڈّے پر

۱۱؍ستمبر کی صبح کو ہوائی جہاز کے دفتر سے اطلاع مل گئی کہ ۱۲ کی صبح کو ۹ بجے تیار رہنا چاہیے کیونکہ ۱۱ بجے جہاز بھوپال ایروڈروم پر اُتر رہا ہے، البتہ اگر جگہ نہ ملے تو لوٹ جانا ہو گا۔ چنانچہ ۱۲ کی صبح ایرپورٹ کی بس گھر پر آ پہنچی، حضرت اقدس رہ سے بادلِ نخواستہ رخصتی مصافحہ کر لیا گیا، حضرت والا رہ نے دعاؤں سے سرفراز کرتے ہوئے اپنے خادم کو رخصت فرمایا ——— کوئی آدھ گھنٹہ میں بس نے ایرپورٹ پر پہنچا دیا۔

چونکہ پانچ چھ دن کے بعد آج فضائی سروس جاری ہو رہی تھی اس لئے مجھ جیسے کئی امیدوار تھے اور سب جانے کے لئے مضطر و پریشان، کوئی دہلی کی سمت اور کوئی دکن کی جانب مگر

ان سب میں بہت باختہ خاطر نواب صاحب بھوپال کے ایک اے۔ ڈی۔ سی تھے جن کے بچے اور ہمشیرہ دہلی میں تھیں اور ان کی خیر خیریت سے یہ ہفتہ بھر سے لاعلم تھے، وہ اپنی پریشانی کے عالم میں جناح صاحب کو بھی برا بھلا کہہ رہے تھے کہ ایسے بڑے سیاسی کو اپنی ہمسایہ قوم کی نفسیات کا اتنا بھی پتہ نہ تھا کہ وہ اقلیت پر کیا ظلم ڈھائے گی، آخر اس کے تحفظ کی کچھ تو فکر کی ہوتی، یونہی ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کروا دیا، ـــــــ موقع ایسا تھا کہ اور کئی لوگ بڑھ چڑھ کر ان کی تائید کر رہے تھے، میں چپ کھڑا ہوا یہ منظر دیکھ رہا تھا ـــــــ آخر خود اسی دل جلے نے مجھ سے پوچھا کہ مولانا آپ کہاں جائیں گے، آپ کو سیٹ مل گئی؟ میں نے جو صورت تھی بتادی، تو انھوں نے کہا کہ آپ کا جہاز ہم سے پہلے آئے گا، میں آپ کے لئے کوشش کرتا ہوں، بس یہ کہتے ہوئے وہ دفتر میں گئے۔ عہدہ دار سے جھگڑنے لگے کہ ان مولانا صاحب کو تو سیٹ دینی ہی ہوگی، یہ وقت ضابطہ کا نہیں، ہر چند وہ عہدہ دار کہہ رہا تھا کہ جب تک جہاز یہاں پہنچ نہ لے ہم وعدہ نہیں کر سکتے، مگر یہ اس سے قطعی وعدہ لینے پر مُصر ہو گئے، خدا کا کرنا یہ ہوا کہ یہ گفتگو ایک فوجی سپاہی نے سن لی جو وہاں تعینات تھا، اُس نے مداخلت کی اور کہا کہ میں دیکھ لوں گا کہ مولانا کو سیٹ کیسے نہیں ملتی، آپ مطمئن رہیئے، میں الطاف خداوندی پر حیران کہ میں تو خاموش مگر غیب سے ایسے ایسے مویّدین کھڑے کر دیے گئے ہیں ـــــــ

بالآخر جہاز آ گیا اور متعلقہ عہدہ دار نے سُنا دیا کہ جہاز پورا بھرا ہوا ہے کوئی سیٹ خالی نہیں، فوجی پٹھان کو یہ سُن کر غصہ آیا، اُس نے کہا سیٹ کیسے خالی نہیں، میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں، چنانچہ اس نے جا کر دیکھا تو ۴ بچے تھے جو چار نشستوں پر قابض تھے۔ اس نے عہدہ دار سے کہا کہ ان کا نصف ٹکٹ ہوتا ہے، ان چار کو دو سیٹ پر بٹھا کر دو مسافر اور لو ورنہ آج جہاز یہاں سے نہیں اُڑے گا، عہدہ دار اس منطق اور دھمکی سے متاثر ہوا، اس نے ایک سیٹ خالی کرادی اور مجھ کو بٹھلا دیا، فوجی صاحب نے شکریہ ادا کرنے سے پیشتر خود ہی مجھ کو وداعی سلام کیا اور تسلی دلائی کہ اب آپ آرام سے تشریف لے جائیں ـــــــ دل نے کہا کہ وہ اے۔ ڈی۔ سی ہو یا

فوجی سپاہی یہ سب حضرت شیخ رح کی دُعائے مقبول کی صورتیں ہیں !

یہ میرا پہلا فضائی سفر تھا جو تین گھنٹہ میں ختم ہوگیا اور شام کی چائے پر تو میں گھر میں موجود تھا اور سب کے لئے مسرت و استعجاب کا موجب بنا ہوا۔

مکتوب (۵۴)

غ۔ حیدرآباد دکن

حضرت مرشدی و مولائی مدظلکم العالی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

بحمداللہ کل ڈیڑھ بجے بھوپال سے روانہ ہو کر تقریباً ۵ بجے بخیریت گھر پہنچ گیا، تفصیلات سفر علیحدہ کاغذ پر پیش ہیں (حضرت والا رح نے فرمایا تھا کہ ہوائی جہاز کے سفر کی تفصیل لکھ بھیجوں)

س۔ بھوپال

عزیزی و محبی و مخلصی زادکم اللہ تعالےٰ حرصاً علی الدین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،۔ آپ کے بخیریت پہنچنے کی خبر سے خوشی ہوئی۔ تفصیلات سفر دلچسپ اور عبرت آموز تھیں (اب تک حضرت اقدس رح نے بھی ہوائی جہاز پر سفر نہیں فرمایا تھا، البتہ اب اس کی ضرورت درپیش تھی)

غ۔ دورانِ قیام حضرت والا رح کے جو عنایات و الطاف احقر کے حال پر رہے اس پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنے اور حضرت والا رح کی عمر و درجات اور فیوض و برکات میں ترقی کی دُعا کرنے کے سوا احقر کے بس میں اور کچھ نہیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں،

س۔ یہ سب آپ کی محبت کے کرشمے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہم دونوں (یہ ہم دونوں کا لفظ میرے لئے طغرائے سعادت ہے!) کو اخلاص کے ساتھ الحب فی اللہ تعالےٰ کا مرتبہ عنایت فرمائیں،

(دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا ہی ہوگا کیونکہ خدا کے فضل و کرم سے حضرت والا رح کے آخر حیات تک اخلاص و محبت کی افزونی ہی متیقن رہی، والحمدللہ علیٰ ذالک)

غ۔ جناب سید ابو عاصم صاحب کی ہمدردیوں کا بے حد مشکور ہوں اور سلمان میاں سلمہٗ کی محبت وعنایت کا ممنون! سب کی خدمت میں سلام عرض ہے ،

س۔ یہ دونوں عزیز بھی آپ کے عزیز ہیں (کس مستحکم رشتہ میں حضرت والا رح ہم کو باندھ گئے، دُعا بھی رہے گی اور کوشش بھی کہ یہ حبل متین ثابت رہے) ان دونوں کی طرف سے سلام قبول کیجئے ،

غ۔ تریسٹھ روپیہ ذریعۂ منی آرڈر پیش ہیں تین روپیہ نا ئد ہیں ، دو سلیم صاحب (حضرت والا رح کے خادم خاص) کے لئے ہیں اور ایک علی حسن صاحب (حضرت والا رح کے دیندار باورچی) کے لئے ______ یہ حقیر تو بارگاہِ سلیمانی کے ہر ہر فرد کا بے حد مشکور ہے ۔

س۔ رُوپے کُل مل گئے اور حسب ہدایت (ذرا شانِ تواضع ملاحظہ ہو ، اس فنائیت کا پرتو بھی ہم ناکاروں پر پڑ جائے تو بڑی کامرانی ہے) تقسیم کر دیے گئے باقی قرض میں مجرا کئے گئے ـــــ استطاعت کی حالت میں قرض کا جلد ادا کر دینا بھی ثواب کی بات ہے اگر اس نیت سے کریں (جملہ کا آخر جزو نہایت قیمتی ہے ، ہم شب و روز اکثر اچھے کام کر کے بھی ثواب سے محض اس لئے محروم رہتے ہیں کہ رضائے حق یا اتباع حکم الٰہی کی نیت اس سے متعلق نہیں ہوتی ، حالانکہ نیت ہی پر اجر کا مدار ہے)

غ۔ منی آرڈر وصول ہونے پر اس عریضہ کا جواب مرحمت فرمایا جائے تو بہتر ہے ، احقر اور اس کی اہلیہ کے لئے توفیق عمل صالح اور ازدیاد ایمان کی دعا کی درخواست ہے ۔

کمترین غلام محمد عفی عنہٗ

س۔ اسی لئے انتظار کیا ،

دلی دعا ہے ______ ہیچمداں سُلیمان ۴ ر ذیقعدہ ۱۳۶۲ھ

ایک صاحب امداداللہ ہیں جو مجھے کبھی کبھی خط لکھتے ہیں ان کا پتہ میرے پاس نہیں ، اگر آپ ان کو جانتے ہوں اور یہ کر سکتے ہوں تو یا تو ان کے پتہ سے مطلع کر دیں ، کسی دفتر

میں دو نوکر ہو گئے ہیں. یا ان کو یہ خبر کر دیں کہ جو مسئلہ اونہوں نے پوچھا تھا وہ دوبارہ مجھے لکھ کر بھیجیں، مجھے شبہ ہوتا ہے کہ میں نے اون کے جواب میں غلطی کی ہے ، والسّلام

ہیچمداں سُلیمان

(ایک فقہی مسئلہ تھا اور جواب حضرت نے عطا توصحیح فرمایا تھا مگر اشتباہ کی بنا پر اتنی احتیاط فرمائی، اہل تقویٰ وخشیت ایسے ہوتے ہیں! حکیم امداد اللہ صاحب (حال مقیم کراچی) میرے لڑکپن کے ہم جماعت اور دوست عزیز ہیں، اس لئے حضرت کے ارشاد کی تعمیل میں کوئی دقت نہ ہوئی!)

مکتوب (۵۵)

"نامۂ عاصم بنام آثم"

(ذیل کا مکتوب جناب سید ابو عاصم صاحب کا تحریر فرمودہ ہے، اس سے اس وقت کے حالات کی درد انگیزی اور حضرت والا رح کے سفر حرمین سے مجبوری کا حال معلوم ہوگا۔ اس خط کے لئے خود حضرت رحمۃ اللہ کے قلم سے بھی ایک نوٹ ہے!)

دار القضا بھوپال

۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء

معظمی و مکرمی زاد الطافکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! کل عنایت نامہ نے عزت بخشی، محبّت اور لُطف صحبت کی یاد تازہ ہوگئی۔ اس کمترین کی ذات کے ساتھ جس محبّت کا اظہار آپ نے فرمایا ہے اس کو اپنی خوش بختی، آپ کا کرم اور اللہ کی عنایت سمجھتا ہوں، نیکوں کی محبّت شاید نجات کا ذریعہ بن جائے۔

چچا جان قبلہ اب تک زیارتِ حرم پاک کے لئے تشریف نہ لے جا سکے، راستہ ہنوز پُرخطر اور غیر محفوظ ہے اور کراچی سب لوگوں کا پہنچنا دشوار بلکہ ناممکن ہے، کل جہاز انگلستان بھی کراچی سے چھوٹ چکا۔ جناب والدہ صاحبہ محترمہ (یعنی ہماری پیرانی صاحبہ مدظلہا) ابھی تک سہارن پور ہی میں تشریف فرما ہیں، سید حسین صاحب بھی وہیں ہیں اور وہاں سے نکلنے کے لئے پریشان ہیں لیکن کوئی صورت ممکن نہیں رہی ہے، بس سمجھئے کہ وہاں لوگ گھرے ہوئے ہیں سہارن پور کا قرب وجوار، دیہات وقصبات آتشکدہ بنے ہوئے ہیں جس کی لپٹیں سہارن پور تک آتی ہیں، ہر وقت فساد کا خطرہ ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب تک شہر محفوظ ہے، دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو محفوظ رکھیں اور اُن کو طاقت، غلبہ اور نصرت عنایت فرمائیں تاکہ وہ اپنے فرائضِ منصبی پھر ادا کر سکیں۔

شمعونہ سلمہا (صاحب مکتوب کی صاحبزادی جن کی عمر اس وقت ڈیڑھ ایک برس ہوگی) بھی آپ کو یاد کرتی ہیں ——— "مولی چھاب بیٹھی ہیں" وغیرہ کے الفاظ سے ——— آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہیں۔ میری اہلیہ بھی آپ کی خدمت میں اور آپ کے "محل مبارک" میں سلام عرض کرتی ہیں۔ میری طرف سے بھی "محلِ مبارک[1]" میں سلامِ نیاز عرض ہو (یہ سب کلمات ذرّہ نوازی ہیں)

سلیم اور علی حسن صاحبان کو بھی آپ کا سلام پہنچا دیا، دونوں نے وعلیکم السلام کہا ہے اور آپ کی محبت وعنایت کا شکریہ ادا کیا ہے۔

حضرت میں بیرسٹر نہیں ہوں، ایک معمولی سا وکیل ہوں اور وہ بھی آج کل نہیں، دوسری گذارش یہ ہے کہ میرے لئے جوابی لفافہ کی ضرورت نہیں، (اس جملہ سے صاحب مکتوب کی شگفتہ مزاجی ظاہر ہے۔) ——— اپنے گناہوں پر نادم ——— عاصم ———

---

[1] یہ حیدر آباد کا خاص محاورہ ہے جو "اہلیہ محترمہ" سے بھی زیادہ اظہارِ ادب کے موقع پر مستعمل تھا۔ مکرمی عاصم صاحب نے اس کو از راہِ لطف استعمال فرمایا ہے اسی لئے اس کو واوین سے ممیز کر دیا ہے۔

(اب حضرت اقدس کی ذیلی تحریر ملاحظہ ہو، کس قدر حسرت اثر ہے)

س۔ عزیز مکرّم دام توفیقکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

افسوس کہ بالآخر سفرِ حج سے محرومی رہی، سہارن پور کی آمد و رفت قطعاً ممکن نہیں، اور کراچی تک سفر محال، والسّلام

؛ ہیچمداں سیّد سلیمان ۲۳ ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ

مکتوب (۵۶)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۶ اکتوبر ۴۷ء

حضرت سیّدی ومولائی مدظلہم العالی، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاجِ اقدس!

محترمی مولوی[1] ابوعاصم صاحب کا جوابی خط جس پر حضرت والا نے بھی ازراہِ شفقت خطاب فرمایا ہے صادر ہوا، یہاں ہزاروں کی تعداد میں باہر سے مسلمان چلے آرہے ہیں، پرسوں سے شہر سہارن پور کے فسادات اور صوبۂ بہار کی دہشت ناک صورت حال کی اطلاعیں مل رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فضل فرمائے اور حضرت والا کو سکونِ خاطر حاصل ہو۔

س۔ بھوپال

۵ ذیحجہ ۱۳۶۶ھ

محبّی ومخلصی وحبیبی اذاقکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ، الحمدللہ تعالیٰ مع الخیر ہوں، آنکھوں میں افاقہ ہے۔ (آنکھوں

---

[1] حیدرآباد کے محاورہ میں "مولوی" کا لفظ محض کلمۂ احترام کے طور پر استعمال ہوتا تھا، مولویت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

میں پانی آرہا تھا)

جی ہاں! سہارنپور سے خطوط کبھی کبھی آجاتے ہیں، ورنہ ڈاک اور تار سب بند ہیں، اللہ تعالیٰ فضل فرمائیں۔

غ۔ التکشف (مصنفہ حضرت مولانا تھانویؒ) میں "تنزلاتِ ستہ" سے متعلق جو بحث ہے اس کو یہاں ایک عالم سے (مُراد استاذِ مکرم مولانا محمد صابر صاحب مدظلہ، سابق پروفیسر دینیات اورنگ آباد کالج) جو حضرت مولانا حافظ بشارت کریم صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت وخلافت رکھتے ہیں، احقر نے سمجھا اور اس خیال سے کہ حضرت والاؒ عازمِ حج ہوچکے ہیں اس سلسلہ میں مشورہ حضرت مولانا محمود الغنی صاحب سے کرلیا تھا۔ ان عالم کا مشورہ ہے کہ احقر ان سے " لوائحِ جامی" پڑھ اور سمجھ لے، حضرت والاؒ کے حکم کا منتظر ہوں،

س۔ تنزلات ستہ وغیرہ کے مسائل علم کے لئے آپ سمجھ لیں تو اچھا ہے ورنہ درحقیقت وہ فلسفہ یا علم کلام کے مسائل ہیں، سلوک کے لئے وہ ضروری نہیں ———— لوائح جامی بھی پڑھ لیں اور سمجھ لیں۔

غ۔ حضرت تھانویؒ نے مذکورۂ صدر مسئلہ کے سلسلہ میں تحریر فرمایا ہے،

"وھذہ المسئلۃ مسئلۃ واحدۃ من الفن فی بادی النظر۔ لکن بعد الامعان جمیع الفن فیہ مستتر" بنا بریں کیا یہ صحیح ہے کہ اس مسئلہ کو محض عقلاً بھی سمجھ لینے سے عبادات میں خشوع وخضوع اور حضوریٔ قلب میسر آتا ہے کیونکہ اس میں عبد ومعبود کا تعلق معلوم ہوجاتا ہے۔

س۔ ممکن ہے کسی کو اس راہ سے بھی مل جائے ورنہ ہمارے سلسلہ میں دوائر اور لطائف اور تنزلات وغیرہ کے مسائل معمول بہا نہیں ہیں۔

غ۔ بحمداللہ معمولات پر پابندی ہے، ذکر سری کر رہا ہوں، قیام توجہ کے لئے تسبیح بھی نہ لینا

ہوں ۔اس میں حرج تو نہیں!

س۔ الحمدللہ وبارک اللہ

ذکر سری میں زبان کو حرکت نہیں ہوتی صرف قلب سے تصوّر میں ذکر ہوتا ہے اسلئے اوس کے لئے قلب کی توجہ اور بیداری کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، تسبیح سے اس توجہ میں کمی آجاتی ہے (بلاشبہ یہی بات صحیح ہے) کیونکہ توجہ تسبیح کے دانوں اور مقدار پر ہوجاتی ہے مگر آپ کو اگر اسی میں آسانی ہے تو کیجئے، مقصود ذکر سے ہے!

ع۔ ذکر سری کی وجہ سے دماغ پر بار نہیں ہوتا اس کے باوجود اضافہ مقدار کی طرف قلبی میلان نہ ہونے سے بہت رنج ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے محروم نہ فرمائے!

س۔ کچھ حرج نہیں، مقصود کمیّت نہیں، کیفیت ہے (یہ تنبیہ بڑی اہم، اکثر محض کمیّت ہی پر نظر جاتی ہے اور بعض مرتبہ اس سے یا تو عجب پیدا ہوتا ہے یا اس کے ثمرات نہ پاکر مایوسی یا گلہ شکوہ پیدا ہوجاتا ہے، اگر کیفیت پر نظر ہو تو ہمیشہ اپنی کوتاہی کا احساس بیدار رہے اور نفع بڑھتا چلا جائے)

ع۔ احقر کی اہلیہ کا حافظہ کمزور ہے، دَوا جاری ہے، کوئی دعا یا ورد بھی اس سلسلہ میں ہدایت فرمایا جائے تو زیادہ تقویت ہو۔

س۔ حافظہ کی قوّت کے لئے دوا کیجئے اور یہ تسبیح بھی پڑھ لیں فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ،

ع۔ احقر اور اس کی اہلیہ کے لئے ایمان راسخ اور استحکام عمل صالح کی دُعا کی درخواست ہے

فقط احقر غلام محمّد

س۔ دل سے دُعا کرتا ہوں،

آپ کی ایک سادہ کاپی یہاں چھوٹ گئی تھی، اس سے پہلے خط میں جو ضائع گیا اوس کی نسبت ہدایت پوچھی تھی جواب کا انتظار کرکے سلمان میاں نے اوس پر تصرّف کرلیا

اب آپ اونہیں معاف کردیں اور ہبہ کردیں یا اون سے قیمت قبول کرلیں۔ والسّلام

ہیچمداں سُلیمان

(معاملات میں یہ حزم و احتیاط مسلک اشرفیہ کا طغرائے امتیاز ہے، اور لوگ اس کو داخل تصوّف ہی نہیں سمجھتے، الّا ماشاء اللہ)

مکتوب (۵۷)

غ۔ حیدرآباد دکن

۹ر ذیحجہ ۱۳۶۶ھ

سیّدی و مولائی مدظلکم العالی۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ذکر سِرّی میں تسبیح رکھنے سے متعلق حضرت اقدس نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بالکل بجا ہے، واقعی توجہ تسبیح کی طرف ہی رہتی ہے مگر حضرت والا کی تنبیہہ سے پہلے اس کا احساس نہ تھا، ایسی ہی صورتوں میں شیخ کامل سے تعلق کی ضرورت کا احساس قوی ہوتا ہے ــــــ رسوخ ایمان کے لئے دُعا کی درخواست ہے،

س۔ از بھوپال

محبّی و عزیزی و مخلصی زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اللہ تعالیٰ مزید ترقی بخشیں ــــــ دل سے دُعا ہے۔

غ۔ میری کاپی سلمان میاں سلمہٗ نے استعمال فرمالی، انھیں اس کا اختیار حاصل تھا، تکمیل ضابطہ کے لئے احقر اب اس کو اُن کے حق میں ہبہ کرچکا،

س۔ انہوں نے دینے سے پہلے قبول کرلی۔

غ۔ دورانِ قیام احقر نے دیکھا تھا کہ حضرت والا کی آنکھوں میں بار بار رطوبت آجاتی ہے،

یہ اطریفل کشنیزی سے زائل نہ ہوگی احقر ایک دوا ارسالِ خدمت کر رہا ہے ناشتہ سے گھنٹہ بھر قبل نیم گرم دودھ کے ساتھ استعمال فرمائیں۔ (مقدار خوراک ۶ تا ۹ ماشہ ہے) پھر سوتے وقت اطریفل اسطوخودوس، ماشہ ایک گھونٹ ٹھنڈے پانی کے ساتھ استعمال فرمائیں، انشاء اللہ سب شکایات رفع ہوں گی ——— مرسلہ خدمت دوا کا نسخہ یہ ہے:۔

پوستِ ہلیلہ زرد، پوست بلیلہ، آملہ منقی، خشخاش ہر ایک تین تولہ، اسطوخودوس ایک تولہ، کشنیز مقشر دو تولہ، مغز بادام پانچ تولہ، مغز کدو، مغز تخم تربوز، مغز تخم خربزہ، مغز تخم خیارین، مغز نارجیل ہر ایک چھ تولہ، ورق نقرہ پچاس عدد، شہد خالص ایک سیر، مقدار خوراک ۶ تا ۹ ماشہ، اطریفل اسطوخودوس وہیں آسانی سے مل جائے گی اس لئے پیش نہیں کی گئی،

حضرتِ والا سے فلاح دارین کے دُعا کی درخواست ہے۔

س۔ دَوا مل گئی اور استعمال بھی شروع کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نافع کریں اور آپ کو زحمت کی جزائے خیر دیں، حکیم ضیاء الحسن صاحب نے نسخہ کو دیکھ کر پسند کیا۔ دُعا کرتا ہوں، سب کی طرف سے سلام قبول کریں۔

ہیچمداں سُلیمان ۲۰ ذیحجہ ۱۳۶۶ھ

مکتوب (۵۸)

غ۔ حیدرآباد دکن

۵ نومبر ۱۹۴۷ء

حضرت اقدس واعلیٰ مدفیوضکم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ مزاج اقدس!

۱- چند دنوں سے احقر کا عجیب حال ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ راستہ چلتے چلتے گڑھے میں گر پڑا، شب و روز دماغ میں ایسے بُرے خیالات کی یورش رہتی ہے کہ ان کے اظہار کو بھی قلم گوارا نہیں کرتی، اس کی وجہ کچھ معلوم نہیں!

س۔ از بھوپال

۹ نومبر ۱۹۶۲ء

عزیزی و حبیبی وعدلتی زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے آنکھوں کی سُرخی میں کمی ہے۔ علاج جاری ہے۔ آپ کا معجون بھی کھا رہا ہوں،

۲۔ یا تو آپ کے معدہ کا فعل خراب ہے یا دماغی ضعف ہے، غور کیجئے کہ کوئی خاص ایسی بے اعتدالی تو نہیں ہو رہی ہے جس سے ضعف پیدا ہو، اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، تو محض وہم ہے،

ع۔ گو حضرت والا رحمہ کے ارشاد کے مطابق اپنے نقائص پر نظر رکھنے کی سعی کرتا ہوں لیکن پھر بھی دوسروں کے دینی نقائص پر نظر بہت جاتی ہے اور بالخصوص اہلِ علم حضرات کی بے عملیوں پر کہ علم کے باوجود یہ عملاً دین کی جانب متوجہ نہیں ہوتے، ہر چند یہ خیال کرتا ہوں کہ نہ میں محتسب نہ اس فکر سے کچھ حاصل پھر بھی یہ بدنظری نہیں جاتی۔ اس سے نجات کی کوئی صورت تجویز فرمائی جائے تو بڑا کرم ہو۔

دُعا کا طالب، احقر غلام محمّد

س۔ خیر اگر بطور خطرہ کے ذہن میں خود بخود آجائے تو حرج نہیں، مگر اوس کے مطابق عمل نہ کریں۔ میر کا ایک مصرعہ حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی موقع پر لکھا ہے،

ع تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

قرآن پاک میں ہے علیکم انفسکم لا یضرکم من ضلّ اذا اھتدیتم اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے،

ہیچمداں سُلیمان

(یہ امتیاز خاص حضرت والا کا تھا کہ وہ حکماء وصوفیاء کے اقوال کی جگہ قرآن پاک ہی سے استناد فرماتے تھے۔)

مکتوب (۵۹)

(اب جو مکتوب درج ہو رہا ہے وہ حضرت علامہ کی سیاسی وایمانی بصیرت کا یکساں آئینہ دار ہے اور اس میں درس یہ ملتا ہے کہ حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھتے ہوئے پرکارِ فکر کو اصولِ دین کے مرکز سے کبھی ہٹنے نہ دینا چاہیئے ورنہ عمل کا جو دائرہ بھی بنے گا غلط ہو گا جب جب اُصول کو نظر انداز کیا گیا خواہ قصداً یا سہواً، تو پھر حرمانی و پشیمانی ہی کا منھ دیکھنا پڑا۔ ——

نظام حیدر آباد دکن میر عثمان علی خاں کا مسلکِ اہلِ سنّت والجماعت سے شیعیت کیطرف گریز دراصل وہ نقطہ تھا جہاں سے حیدر آباد کی نکبت شروع ہوئی مگر لیڈروں کی نظر میں (بجز ایک دیدہ ور قاید نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے جو کبھی ادھر سے غافل نہ رہے) یہ بات محض انفرادی حیثیت کی تھی اور ناقابل التفات بھی! نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نظامِ دکن کی دوطرفہ روش سے بالکل بے خبر رہے اور اُن کا خلوص اور اُن کی جرأت وطاقت ان کے کچھ کام نہ آسکی، خود ناکام ہوئے، مسلمانوں کو خوار کر دیا اور کافروں کے حوصلے بڑھا دیئے، اناللہ)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۰ر نومبر ۱۹۴۷ء

سیدی ومولائی دامت برکاتہم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ مزاجِ اقدس!

۲۔ حیدر آباد کا مستقبل قریب نازک تر دکھائی دے رہا ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں

حسب ذیل امور میں رہبری مطلوب ہے :۔

ا۔ مجلس اتحاد المسلمین (جس کا موقف حضرت والا رح پر آشکار ہے) کے حکم پر جنگ کرنا جہاد کی تعریف میں داخل ہوگا یا نہیں ؟

ب۔ اگر ایسا نہ ہو تو بہ صورت دیگر جان اور عزت و مال کی حفاظت کی خاطر مجبوراً مقابلہ کرنا ہی پڑے اور اس میں کوئی مارا جائے تو کیا اس کو شہادت کا مرتبہ ملے گا ؟

س۔ بھوپال

۲۳ نومبر ۱۹۴۷ء

اعزی واحبی اعزک اللہ تعالیٰ واحبک

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ الحمدللہ خیریت ہے !

۲۔ اس نزاکت احوال کا دفعیہ اور علاج کیا آپ کے اختیار میں ہے، اگر نہیں تو پھر یہ اضطراب قلبی و ایمانی کیوں ؟ اضطراب طبعی میں حرج نہیں، اس کا علاج واستعینو بالصبر والصلوٰۃ ہے، حیدر آباد کو اپنے دو برس کی غلطی کا خمیازہ بھگتنا ہے، رسمی دینداری اور اشاعت رسوم و بدعات اور پھر تشیّع کے ساتھ تو معموری ممکن نہیں[1]۔ اللہ تعالیٰ استغفار کی توفیق دیں (مُراد والئ ریاست کو)

ا۔ مجلس کا حال معلوم ہے،

ب۔ اپنے جان و مال کی حفاظت میں مارا جانا بے شبہ شہادت ہے۔

ع۔ احقر فی نفسہٖ حضرت اسمٰعیل شہید رح کی زندگی ہی کو ٹھیک ٹھیک اتباع سنت کی حامل سمجھتا ہے کیونکہ یہاں تسبیح وسجادہ اور شمشیر و سناں کی جامعیت پائی جاتی ہے اور خود احقر کی تمنا بھی یہی جامعیت پیدا کرنے کی ہے لیکن فن سپہ گری سے اس وقت تک قطعاً عاری اور طبعاً جرأت جہاد کی کمی محسوس کرتا ہوں، حضرت والا رح دعا فرمائیں،

---

[1] بات کس قدر صاف وصریح اور نتائج کا: گرستہ یقین بیرایہ میں ہے، سچ کہا جس کسی نے کہا ہے تلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید!

س۔ صحیح ہے مگر حضرت اسمٰعیل کہاں ہیں؟ بہرحال کوشش ہر ایک کو چاہیئے!

غ۔ موجودہ صورت میں اگر کافروں اور مسلمانوں میں جنگ چھڑ جائے اور کوئی مسلمان اس سے کنارہ کشی کرکے بچ رہے تو کیا وہ عنداللہ مسئول ہوگا؟

(جواب خوب غور سے سننے اور پھر اس پر غور و فکر کرنے سے تعلق رکھتا ہے خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو دینی سیاست کے نام پر جلد مغالطہ میں آجاتے ہیں)

س۔ اگر آپ کے خیال میں یہ جنگ ایمان اور کفر کی ہو! مگر موجودہ سیاست میں اہواء و اغراض نے دین کا جامہ پہن لیا ہے۔ ڈوب کر دیکھئے، لیکن بہرحال مسلمانوں کے فوز و فلاح کی کوشش ہاتھ پاؤں اور قلب کی ہمت اور دعا سے کیجئے۔ (سبحان اللہ عدل کے رشتہ میں حقائق کے موتی کس خوبی سے پرودئے ہیں)

غ۔ گذشتہ مکتوب میں حضرت والاؒ نے بُرے خیالات سے متعلق اصلاح معدہ کی طرف متوجہ فرمایا تھا، یہ رائے بالکل صائب نکلی، اب بحمداللہ وہ کیفیت نہیں ہے۔

س۔ الحمدللہ ـــــ گاہ باشد کہ کودک ناداں

(فنائیت کا عالم دیکھ لیا کہ ادنیٰ کمال کی نسبت بھی اپنی طرف گوارا نہ ہوسکی، بلکہ اس کا شبہ تک کس خوبی سے مٹا ڈالا)

غ۔ حضرت والاؒ احقر اور اس کی اہلیہ کے لئے سلامتی ایمان اور حسن انجام کے لئے دعا فرمائیں، فقط احقر غلام محمد

س۔ دونوں کے لئے دعائے خیر ہے۔ والسّلام سیّد سلیمان

مکتوب (۶۰)

غ۔ حیدرآباد دکن

۱۰ دسمبر ۱۹۴۷ء

حضرت سیدی و مولائی دام فیوضکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

۱۔ مزاجِ اقدس!

۲۔ بحمداللہ احقر معمولات پر پابند اور استقامتِ مزید کے لئے حضرت سے دُعا کا جویاں ہے۔

س۔ بھُوپال

۱۳؍ دسمبر ۱۹۴۷ء

محب مخلص رفع اللہ احوالکم۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ الحمدللہ اچھا ہوں۔ آنکھ کی سُرخی اب برائے نام ہے۔ آپ کی مُرسلہ دوا کھا کر ختم کردی ہے۔

۲۔ مُبارک، اللہ تعالیٰ استقامت مزید بخشیں،

غ۔ حضرت والا کے سابقہ کرم نامہ نے کامل تشفّی بخشی حضرت اقدس کے بتائے ہوئے علاج "قیام صلوٰۃ وزکوٰۃ" کے تحت احقر نے بعض اہل محلّہ بزرگوں کو لے کر مولانا الیاس رحمہ اللہ کے طرز پر محلّہ میں تبلیغی کام کا آغاز کیا ہے، بحمداللہ مصلیوں کی تعداد کافی بڑھ رہی ہے حضرت والا استقامت کی دعا فرمائیں ــــــــــ اس کام میں تین بزرگ بطور خاص ہاتھ بٹا رہے ہیں، دو حضرت تھانویؒ سے تعلق بعیت رکھتے ہیں اور ایک صاحب گو کسی کے مُرید نہیں لیکن بڑے متقی ہیں۔

س۔ ضرورت اسی کی ہے کہ سیاست سے بے پروا ہو کر دین کی خدمت میں مصروف ہوا جائے، اخلاص کے ساتھ اس کام کو جاری رکھیں اور کبھی اس میں اپنے اندر استکبار اور دوسروں کے باب میں استحقار نہ آنے دیں، اگر ایسا احساس ہونے لگے تو چند دن کام چھوڑ دیا جائے (حضرت والا کے منتسبین کے لئے یہ ارشاد ایک مشعلِ ہدایت ہے لہٰذا وہ اسی روشنی میں چلیں)

غ۔ مذکورہ کام میں تفہیم و تقریر کے لئے احقر ہی کو مجبور کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ احقر کا رجحان تو تبشیر سے زیادہ تنذیر کی طرف مائل ہے مگر فی زمانہ کس پہلو کو غالب رکھنا اولیٰ ہے؟

س۔ کچھ حرج نہیں، مگر اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ کے سوا کوئی دوسرا مقصد پیشِ نظر نہ ہو (تصحیح نیت ہر کارِ خیر کی جان ہے اور حضرات صوفیا سے زیادہ اس کی نزاکت کو پہچاننے والا کوئی نہیں)

تبشیر اور انذار کا کلیہ قاعدہ کوئی نہیں، اشخاص زیر دعوت کے حالات پر منحصر ہے، بہر حال "تبشیر" کو ترجیح[1] ہے، (یہ ایجاز سلیمانی کا اعجاز ہے کہ ایک دفتر کو تین جملوں میں سمیٹ کر رکھ دیا اور کس حُسنِ اعتدال سے!)

غ۔ حضرتِ والا رح کی نصیحت[2] کے بموجب احقر نے "طبِ یونانی" کی طرف توجہ کی لیکن اس کی باضابطہ تعلیم کا انتظام نہ ہو سکا، (طبیہ کالج کے اوقات ایسے نہ تھے کہ دفتری مصروفیت کے باوجود اس میں شرکت کی جا سکتی) اور اب امتحان دینے کی صورت نہ نکل سکی، اس لئے اب "ہومیو پیتھی" کی طرف توجہ کی گئی ہے، اس کی تعلیم اور رجسٹریشن کی صورت نکل آئی ہے اور یہ جدوجہد جاری ہے ـــــــ اس کے بعد عربی و دینی تعلیم کا آغاز ہوگا، حصولِ علمِ دین کی بڑی تمنا ہے، حضرت والا رح دعا فرمائیں۔

س۔ اصول پہلے کسی فن کے سیکھ لئے جائیں پھر طریقۂ علاج جو چاہے اختیار کیا جائے ـــــــ انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ آپ کی یہ تمنا پوری کریں،

غ۔ اپنی حد تک اصلاح عمل کی کوشش کرتا ہوں لیکن اپنے اندر دنیوی امور مثلاً

---

[1] حضرت علامہ رح کا رسالہ "بُشریٰ" اسلام اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے تبشیری پہلو پر قابلِ دید ہے!

[2] حضرت والا رح نے احقر کا ذوق و رجحان دیکھ کر کئی برس پہلے فرمایا تھا کہ پہلے علم طب باضابطہ سیکھ لیا جائے اور اس کے بعد علم دین کی طرف مستقلاً توجہ کی جائے!

مال و دولت وغیرہ کی رغبت بہت شدید پاتا ہوں، خصائل رذیلہ سے پاکی بہت کٹھن معلوم ہوتی ہے، بس اللہ تعالیٰ ہی فضل فرمائے اور اس کے لئے کچھ دشوار نہیں،

س۔ جن پہلوؤں سے ناقص پاتے ہوں اون کے ازالہ کی کوشش کریں، اس کے لئے "انفاسِ عیسیٰ" کا مطالعہ مفید ہے ——— رذائل کا مادہ تو زائل مشکل سے ہوتا ہے مگر اون کے مقتضیٰ پر عمل نہ کرنے کی توفیق مل جاتی ہے اور یہی مطلوب ہے،

غ۔ میری اہلیہ خدمتِ اقدس میں سلام عرض کرتی ہیں اور دُعا کی طالب ہیں، والسلام

دُعا خواہ ، احقر غلام محمدؐ

س۔ میری طرف سے سلام اور دعا پہنچا دیں۔

ہیچمداں سید سلیمان

مکتوب (۶۱)

غ۔ حیدر آباد دکن

۵ جنوری ۱۹۴۸ء

حضرت سیّدی و مولائی مدفیوضکم ، السلام علیکم و رحمۃ اللہ

۱۔ مزاجِ اقدس!

۲۔ بحمداللہ حضرت والا کی دُعاؤں کی برکت سے معمولات پر پابند ہوں،

س۔ بھوپال

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء

عزیزی و حبیبی ادام اللہ توفیقکم ، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمدللہ مع الخیر ہوں، میں تقریباً دو برس کے بعد ایک عزیز کی تقریب میں پٹنہ گیا تھا اور تین ہفتوں کے بعد واپس آیا، اسی لئے تاخیر ہوئی،

۲۔ مبارک کہ استقامت بڑی نعمت ہے، قُلِ اللهُ ثُمَّ اسْتَقِمْ ـــــ (صوفیاء کے مقولہ "الاستقامت فوق الکرامۃ" کی قرآنی اصل بتادی ہے)

غ۔ کسی کی مدد کرتے وقت ذہن میں یہی خیال رہتا ہے کہ آج ہم کسی کی مدد کریں گے تو کل ہمارے آڑے وقت بھی کوئی کام آئے گا، اس خیال سے اجر میں کمی ہوتی ہوگی، اس کا کیا علاج ہے؟

س۔ جی ہاں، یہ تصوّر صحیح نہیں، سوائے رضائے الٰہی کے کوئی دوسرا اعتقادی تصوّر نہو، اس کے حصول کی صورت یہ ہے کہ پہلے زبان سے اوس عمل کے کرتے وقت اس نیّت کو دہرائیں، چندبار کے بعد محض نیت (قلبی) کرلیں ـــــــــ انشاء اللہ تعالیٰ تھوڑی مشق سے یہ بات پیدا ہوجائے گی۔

غ۔ احقر نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک مختصر سی سوانح (بعنوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم) لکھنے کی سعادت پائی ہے، ایک نسخہ حضرت والا کی نذر ہے، اللہ تعالیٰ اس سعیٔ حقیر کو مشکور فرمائیں ـــــــ حضرت والا سے فلاح دارین کے لئے دُعا کی درخواست ہے، فقط احقر غلام محمدؐ

س۔ کتاب ملی، سرسری طور سے دیکھی، اللہ تعالےٰ برکت دیں، بچوں کی دلچسپی اسی سے ظاہر ہے کہ میری بچیوں نے بڑے تقاضے سے اس کو مجھے واپس کیا، والسّلام

ہیچمداں سیّد سُلیمان

(کیا انداز دل نوازی ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً)

مکتوب (۶۲)

(یہ مکتوب انشاء اللہ ان حضرات کی کامل تشفّی کا باعث ہوگا جن کے ذہن میں یہ شُبہ

ـــــــــــــــــــــــــــــ

لے شائع کردہ نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن (حال بلاسس اسٹریٹ کراچی)

ہے کہ طریق تصوف اور صوفیائے کرام میں جمود و تعطل ہے حرکت و گرمی نہیں)

غ۔ حیدرآباد دکن

۲۷ جنوری ۱۹۴۸ء

حضرت سیدی و مولائی ادام اللہ ظلال برکاتکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

۱۔ مزاج اقدس!

۲۔ ایک شبہ بڑی قوت سے ذہن میں یہ آرہا ہے کہ گذشتہ صدی میں اگر ہندوستانیوں پر (بوجہ عدم تکمیل شرائط) جہاد فرض نہ تھا تو کم از کم اس کے اسباب کی فراہمی تو بہرحال واجب تھی، لیکن ہندوستان کے اکابر صوفیا میں سے کسی نے اس جانب توجہ نہیں فرمائی اور نہ اپنے منتسبین میں یہ جذبہ پیدا کیا، کیا قیامت میں مثل اور واجبات کے اس ترک کی بازپرس نہ ہوگی؟ اگر ہوگی تو ایک ایسا گروہ جو "از بلائے خویش رستہ واز بند خویش جستہ"[1] ہوتا ہے، اس سے کیوں منحرف رہا؟ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس گروہ کو انفرادی اصلاح میں غلو رہا ہے واللہ اعلم ـــــــ حضرات اسمٰعیل شہید، مجدد الف ثانی ـــ اور نظام الدین اولیاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی زندگیوں میں تو اپنے اپنے وقت و حالات کے لحاظ سے یہ جد و جہد ملتی ہے پھر گذشتہ صدی کے صوفیائے کرام کیوں اس سے دور رہے؟ اور صحیح راہ کون سی ہے؟

س۔ بھوپال

حبیبی و محبی ادام اللہ توفیقکم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ

۱۔ الحمدللہ خیریت ہے۔

---

[1] "صوفی" کی تعریف میں یہ جملہ شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے لکھا ہے، ملاحظہ ہو، "مکتوبات سی صدی"

۲۔ پہلے تو یہ سمجھیں کہ جہاد اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے سعی وکوشش بالنفس والمال کا نام ہے، وہ کسی بادشاہ کی سلطنت کے قیام کے لئے نہیں، جس کو آج کل سمجھا جاتا ہے قومی حکومت وسلطنت جس کا تصوّر آج کل ہے وہ بھی اعلاء کلمۃ اللہ سے دُور ہے، پھر اکابر صوفیہ جس وقت ہوئے ہیں اوس زمانہ میں کسی نہ کسی معنی میں مسلمانوں کی سلطنتیں قائم تھیں، اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو خدا کی حکومت کے مطابق بنانے میں کوششیں کیں،

ہندوستان کی گذشتہ صدی کے کارناموں کے لئے آپ "علماء کا شاندار ماضی" کتاب محمدّ میاں مُرادآبادی کی پڑھیں، یہ سب حضرات مجاہد تھے، خود حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب مجاہدین میں تھے اور خلفاے مولانا اسمٰعیل شہید کے کارنامے بھی پڑھیں جن کو مسعود عالم ندوی نے لکھا ہے،

ع۔ صحیح راہ یہ ہے کہ دل میں جہاد کی تمنّا رہنی چاہیئے اور وقت پر اوس کا ظہور ہو! عذاب قبر و بعد از حشر سے بہت ہیبت ہوتی ہے کیونکہ اپنی زندگی پر جب نظر پڑتی ہے تو ذریعہ معاش کلیتہً جائز وحلال ہے، نہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک کا کوئی عمل ٹھیک ٹھیک مطابق سنّت وخالص ہے، پھر بچاؤ کی کیا صورت ہوگی؟

س۔ بے شبہ ہیبت کی چیز ہے، اس لئے عذاب قبر سے نجات کی دعا مانگنی چاہیئے لیکن مایوسی کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ رحمت الٰہی سے مایوسی کفر ہے، بچاؤ رحمت الٰہی سے اور اعمال بد سے پرہیز سے ہوگا،

(آخری جملہ تو دریا بہ کوزہ کا مصداق اور جواب کی جان ہے، اس میں یہ بھی تنبیہ ہوگیا کہ بچاؤ کو محض اعمال پر منحصر سمجھنا غلط اور صریحاً غلط ہے کیونکہ عصمت مآب صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ میں بھی محض اللہ کی رحمت سے بخشا جاؤں گا، ساتھ ہی یہ بھی جتا دیا گیا کہ بدعملی سے پرہیز کے بغیر رحمتِ الٰہی پر بھروسہ دراصل خود فریبی بلکہ حق تعالیٰ کی شان میں گستاخی ہے اس لئے اپنے امکان بھر اصلاح عمل سے غفلت بھی ہرگز نہ ہونی

چاہیئے یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ،
اور پورے جملہ کا حاصل یہ بھی نکل آیا کہ مسلمان کو "جامع اضداد"[1] ہونا چاہیئے کہ امید و خوف کو ملا کر لے چلے، اسی کو زبان نبوت نے فرمایا "الایمان بین الخوف والرجاء"

غ۔ احقر تو جہاں کا وہیں ہے بلکہ ترقی معکوس ہی کا گمان ہوتا ہے،

س۔ ترقی ہر وقت ہوتی ہے، بشرطیکہ کام میں مصروف رہا جائے لیکن اس ترقی کا احساس نہیں ہوتا جیسے بچہ ہر وقت بڑھتا رہتا ہے مگر خود بچہ کو اس کا احساس نہیں ہوتا،

غ۔ احقر کی اہلیہ عرض پرداز ہے کہ کوئی بات قابلِ عرض معلوم نہیں ہوتی اس لئے عریضہ نہیں گذرانا، دُعا کی درخواست ہے، احقر کے لئے بھی حضرت والا فلاح دارین کی دعا فرمائیں

فقط احقر غلام محمد

س۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہرحال کوئی امر باعثِ شکایت نہیں، اسی پر اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے (جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حسبِ وعدہ "لئن شکرتم لازیدنکم" حالت میں ترقی ہوگی)

دُعا کرتا ہوں، والسّلام سیّد سلیمان ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء

مکتوب (۶۳)

غ۔ حیدرآباد دکن

۱۵ر فروری ۱۹۴۸ء

حضرت سیّدی و مولائی ادام اللہ فیوضکم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

۱۔ مزاجِ اقدس!

---

[1] صوفیائے کرام کا قول ہے کہ محقق جامع اضداد ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اضداد صوری کو جمع کر دیتا ہے اضدادِ حقیقہ مراد نہیں! (مولانا تھانوی ؒ)

۲۔ ایک عرصہ ہوا کہ حضرت نے حیدرآباد کا رُخ نہیں فرمایا، حضرت والا رح اب تک کسی نہ کسی کام ہی کے سلسلہ میں تشریف لاتے رہے اور اب غالباً کوئی ایسی صورت پائی نہیں جاتی لیکن یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کبھی خدام کے خیال سے بھی تشریف ارزانی ہو تو ہم سب کی بڑی سرفرازی ہوگی، حضرت والا رح کے سوا کوئی اور بزرگ نظر نہیں آتے جن کی خدمت میں پہنچ کر دل کو تسکین میسر آئے ـــــــــــ حضرت والا رح کی یاد ستاتی ہے اور ایک بے چینی رہتی ہے،

۳۔ احقر اور اس کی اہلیہ کے لئے فلاحِ دارین کی دعا فرمائیں، فقط

احقر غلام محمد

س۔ بھوپال

۲۱ فروری ۱۹۴۸ء

محبّی و مخلصی رفع اللہ درجاتکم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۔ الحمد للہ بعافیت ہوں،

۲۔ ہاں بھائی، حیدرآباد نہ آسکا، بات یہ ہے کہ حیدرآباد "مرکزِ آمال" ہے اوس کے ہر وارد پر "طمع" کا گمان ہوتا ہے اس لئے کسی بہانہ کے بغیر جانے پر دل کو آمادگی نہیں، پھر آجکل سفر کی جو صورتِ سقر ہے وہ بھی مانع ہے اور یہاں کا تعلق بھی، یہاں کی رخصت وغیرہ کے قواعد کے سبب مانع بنا، جی چاہتا ہے کہ جو رخصت بچائی جاسکے اوس کو سفر حج کے لئے جمع کیا جائے،

میں کہاں سے بزرگ آیا، یہ حُسن لیلیٰ نہیں چشم مجنوں کا کرشمہ ہے،

۳۔ آپ دونوں کے لئے دل سے دعا کرتا ہوں، والسّلام

ہیچمداں
سیّد سُلیمان

(اللہ اللہ، قلبِ سُلیمانی کس شفقت سے معمور تھا اور فنائیت و استغناء اس میں کس خوبی سے جمع تھی۔ میرے لئے یہی کیا کم خوش بختی ہے کہ میں نے ایسی ہستی کو دیکھا اور اس کا دامن تھام لیا۔ ورنہ کہاں وہ سُلیمان ذیشان اور کہاں یہ مورِ ناتواں)

مکتوب (۶۴)

غ۔ حیدرآباد دکن

حضرت سیدی و مولائی دام فیوضکم، السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

۱۔ مزاجِ اقدس!

۲۔ گذشتہ کرم نامہ سے حضرت والاؒ کی اس احقر ناکارہ پر شفقت و توجہ کا اندازہ ہوتا ہے، ان کرم ارزانیوں کو دیکھ کر خیال یہی ہوتا ہے کہ دریائے فیض رواں ہے لیکن یہ اپنے دل کی زمین کی خرابی ہے کہ سرسبزی و شادابی نمایاں نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ اس دریائے فیض سے سیراب فرمائے،

س۔ بھُوپال

عزیزی و محبّی و مخلصی رفع اللہ احوالکم

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ

۱۔ الحمدللہ تعالیٰ مع الخیر ہوں،

۲۔ آپ کے اندر یہ سعادت مندی اور سلامت طبعی اس قابل ہے کہ آپ اس عطیہ پہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔

غ۔ ویسے تو حضرت والاؒ سے خط و کتابت کی برکت کے آثار اپنی اہلیہ میں پہلے بھی دیکھے ہیں لیکن پرسوں اس کا ایک اور مشاہدہ ہوا، اہلیہ کو دیکھا کہ رو رہی ہیں اور ضبط کرنے پر قابو نہیں ہے وجہ پوچھی تو کچھ نہ بتایا، گمان یہی ہوا کہ شاید والدہ مرحومہ کی یاد آگئی ہے، مگر جب آنسو ذرا

تھمے تو کہنے لگیں کہ نہ معلوم کیا بات ہے کہ حضرت مولانا کی یاد آج کل بہت بے چین کر دیتی ہے اور خدمت اقدس میں حاضری کے لئے دل تڑپ جاتا ہے،

یہ بھی حضرت اقدس ہی کی نظر کیمیا اثر کا کرشمہ ہے کہ احقر کی اہلیہ نماز تہجد بھی پڑھ رہی ہیں اور اس کا اظہار حضرت والا تک سے کرنا نہیں چاہتیں!

س۔ یہ اول کی اہلیت وسعادت مندی کے آثار ہیں ——— مرشد سے محبت کے یہ آثار طبعی ہیں، محبت طبعی کے بجائے محبت عقلی چاہیے جس کا نتیجہ اطاعت اور مشوروں پر عمل ہے!

اس پر بھی اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کیجئے کہ آپ کو ایسی رفیقۂ حیات ملی جس کو آپ سے اتحادِ مذاق ہے کہ اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوتا تو آپ کو کیسی کوفت ہوتی،

غ۔ حضرت والا سے التجا ہے کہ احقر کے رسوخِ ایمان کے لئے بطور خاص دعا فرمائیں

فقط احقر غلام محمد

س۔ دل سے آپ کے لئے درگاہِ باری تعالیٰ میں دعا ہے، فقیر ہیچمداں

انہ سمیع قریب مجیب سلیمان ۱۵۔ج ا ۱۳۶۷ھ

(عبارت دُعا سے گُر کی بات یہ بھی معلوم ہوگئی کہ دُعا کرتے وقت دل میں قبولیت دُعا کا کامل یقین ہونا چاہیئے ——— کریم ازل کے آگے ہاتھ پھیلا کر اس کے کرم سے بے یقینی واقعی ایک کھلی معصیت ہے گو فقیہ کی آنکھ اس کو دیکھ نہ سکے)،

مکتوب (۶۵)

(ایک شخصی مسئلہ میں جس کا مسلمانوں کی دینی یا دنیوی نفع سے کوئی تعلق نہ تھا قوم پرست اور لیگی افراد میں فتویٰ بازی شروع ہوگئی اور اس کو خواہ مخواہ دینی اہمیت دے دی گئی۔ راقم بھی عام لیگیوں کی طرح تردید میں نرمی کو غیرتِ ایمانی کے منافی سمجھتا رہا، حضرت والا سے پوچھا تو ارشاد ہوا کہ دونوں فریق افراط وتفریط کا شکار ہیں اور نفس مسئلہ میں سکوت اُولیٰ

ہے، مگر اختلاف سیاسی کے جذبہ میں اس محققانہ رائے کی قدر نہ ہو سکی، اور پورے آدب کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کو بہ زعم خود نہایت "مدلّل" انداز میں حضرت شیخ رح کی خدمت میں پیش کر دیا ـــــــ یہ عنداللہ شیخ رحمۃ اللہ کی مقبولیت کا کرشمہ تھا کہ وہ عریضہ ابھی خدمتِ اقدس میں پہنچا بھی نہ ہوگا کہ خود اپنے ہی ذہن نے اپنے دلائل کے جال کو تار تار کر دیا اور اپنی بد مذاقی پر خود اپنا ہی دل نفریں کرنے لگا، خدمت شیخ میں گستاخی کا احساس لازمی طور پر اُبھر آیا، اسی عالم میں غلبۂ نوم سے آنکھیں جو بند ہوئیں تو کہنا چاہیئے کہ آنکھیں اور بھی کھُل گئیں ـــــــ ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ کی کامل حمایت میں احقر کی تفہیم فرما رہے ہیں ـــــ ان سارے واقعات سے سخت ندامت ہوئی، فوراً مجرمانہ اعتراف کے ساتھ ایک طویل معافی نامہ بارگاہِ سلیمانی میں ارسال کر دیا، اس کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا گیا ہے وہ دورِ حاضر کے ہر غیر معتدل دماغ کے لئے نسخۂ اکسیر ہے، ساری غیر ضروری مراسلت کو حذف کر کے اس کو اسی افادہ کی غرض سے یہاں درج کیا جا رہا ہے،

اس والانامہ کے ہر لفظ سے حضرت اقدس کی وسیع النظری اور فراخدلی تحمل اور درگذر، اپنے چھوٹوں کی دلداری اور اُن سے حُسنِ ظن بالکل نمایاں ہے، ملاحظہ ہو:)

بھوپال

۴ شعبان ۱۳۶۷ھ

عزیزی وحبیبی زادکم اللہ تعالیٰ غیرۃ فی الایمان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ جس کو گستاخی سمجھے وہ میرے خیال میں سیاسی بحران ہے، جس ماحول میں آپ ہیں اوس میں اس قسم کے بحرانی جذبات وخیالات کا پیدا ہونا عین مقتضائے طبع ہے، اس لئے آپ کے وساوس کا خیال مجھے ذرا بھی نہیں ہوا، سمجھتا ہوں کہ آپکی طبیعت

زود اثر ہے، کبھی سیاسیات کا جوش طبیعت پر غالب آجاتا ہے، موجودہ سیاسیات کا اثر نازک طبائع پر ایسا ہی پڑتا ہے، ان تمام ذہنی شورشوں کا علاج یہ ہے کہ پیش آمدہ امور غیر اختیاری ہیں، پھر ہماری فکر اور غم کا حاصل؟ ـــــــ جس اُمت کی تاریخ میں وفات رسولؐ، شہادت فاروقؓ وعثمانؓ، جنگِ جمل، جنگ صفین، فتنۂ حجاج، فتنۂ یزید اور شہادت حسینؓ جیسے واقعات پیدا ہوئے ہوں اوس کے ہاتھ سے موجودہ سیاسیات کا ہیجان صبر کا دامن کیوں چھڑادے اور اللہ تعالیٰ کے حاکم وحکیم بیک وقت ہونے کے اعتقاد سے کیوں تغافل ہو؟

اس تفصیل کا منشا، یہ ہے کہ ہنگامی جوش وخروش یا سردی ومایوسی سے مومن نہ گرم ہو اور نہ نرم ہو، اپنے کام میں یکساں لگا رہے۔

خطرات کے علاج دو ہیں، اللہ تعالےٰ کے حکیم اور حاکم ہونے کا استحضار اور دوسرے، ہنگامی اور دوامی امور میں فرق کا احساس،

میں بمبئی اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے جلسہ میں گیا تھا، اتفاق سے اونھیں دنوں جمعیتہ العلماء کا جلسہ بھی تھا اور مولانا مناظر صاحب وغیرہ سے ملاقات ہوئی تھی میں نے اون کی رفاقت میں کچھ کام بھی کیا،

آپ کے لئے دل سے دعا ہے، والسّلام

فقیر ہیچمداں سُلیمان

۴ رشعبان ۱۳۶۴ھ

مکتوب (٦٦)

(گذشتہ مکتوب تو معذرت نامہ کے جواب میں آیا تھا، اس سے پہلے والے عریضہ کے جواب میں والا نامہ سے سرفرازی ہوئی جس سے اجتماعیات میں حضرت والاؒ کا

مسلک واضح ہوجاتا ہے،

۱۹۴۶ء-۴۷ ہی کی بات ہے کہ بعض رسائل میں یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ علامہ ندوی کانگریس کی تائید میں ہیں یا لیگ کی؟ اور ہر ایک اپنی تائید میں کچھ نہ کچھ لکھ رہا تھا، بالآخر حضرت والاؒ نے اس سلسلہ میں دو چار سطریں نہایت جامع و مانع معارف میں تحریر فرمائیں جن کو محترم مدیر صدق مدظلہ نے صدق میں نقل کرتے ہوئے یہ آیت شہادت بھی خوب ہی تحریر فرمادی تھی کہ "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا"

مگر ذیل میں جو مکتوب درج کیا جا رہا ہے اس سے حضرت والاؒ کے اجتماعی مسلک کی وسعت اور مشرب کی پاکیزگی بالکل ہی بے غبار نظر آتی ہے، سچ یہ ہے کہ ایسی عظیم شخصیتیں کبھی جماعتی قیود کو گوارا ہی نہیں کر سکتیں!

بھوپال

محبی و عزیزی رفعکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، الحمدللہ خیریت ہے،

آپ جس مقام پر ہیں وہ اوس مقام سے جہاں عام مسلمان ہیں سراسر مختلف ہے،

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی طپیدنِ دلِ مرغان رشتہ بر پارا

میں نے سیاسیات کے خارزار سے مدت ہوئی کہ اپنا دامن چھڑا لیا، اب جو کچھ ہے وہ مسلمانوں کی دینی و علمی و تعلیمی خدمات کی بجاآوری کا شوق ہے[1]، ان کے علاوہ دیگر امور سے قطعاً عزلت نشین اور مسلمانوں کی صلاح و فلاح کی دعا دل سے کرتا ہوں،

اس سے زیادہ کیا لکھوں، جذبات کے جوش میں بہنے سے کام نہ چلے گا،

میں ان تمام نزاعات (اختلافاتِ لیگ و کانگریس وغیرہ) سے عملاً کنارہ کش

---

[1] اس جملہ کو وہ حضرات ذرا غور سے پڑھیں جن کا خیال یہ ہے کہ تصوف کے تعلق نے حضرت علامہؒ کی علمی سرگرمیوں کو سرد کر دیا تھا!

ہوں اور دل میں مسلمانوں کی خیر و فلاح کے خیال کے سوا کچھ اور نہیں رکھتا اور اسی کا داعی ہوں اور اپنے اختیار کی حد تک اسی کا ساعی، مجھے سیاسیات کا ہیرنہ سمجھئے اور حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے مسلک کو اوس مضمون سے سمجھئے جو مولوی عبدالباری صاحب (ندوی مدظلہٗ) کا معارف میں شائع ہوا ہے[لہ]،

خدا کرے کہ آپ دین کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر موجودہ شورشوں کی طرف اتنی نہ کریں جو ادھر سے تغافل ہوجائے۔ دین ثابت و قائم چیز ہے اور سیاست متبدل و متغیر،

ہنگامی چیزوں کو اہمیت نہ دیں اور امور دوامی میں مصروف رہیں، آپ کے لئے صدقِ دل سے دعا کرتا ہوں، والسلام

ہیچمداں سلیمان

مکتوب (۶۷)

غ۔ حیدرآباد دکن

۳۰ شعبان ۱۳۶۷ھ

حضرت سیدی و مرشدی و مولائی ادام اللہ فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

۱۔ مزاج والا

۲۔ کل سے رمضان المبارک شروع ہیں، حضرت والا رح کی صحبت فیض درجت کا خیال

لہ اب تو مولانا مدظلہٗ کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں "جامع المجددین" "تجدید تعلیم و تبلیغ" "تجدید تصوّف و سلوک" اور "تجدید معاشیات" جن سے ہر مسئلہ میں مسلکِ اشرفیہ کی بخوبی وضاحت ہوجاتی ہے!

ستانے لگا ہے، پرسوں "بہجت النفوس" (مولفہٗ محدثِ کبیر حافظ ابو محمد عبداللہ بن ابی جمرۃ الازدی، اُندلسیؒ) کا مطالعہ کر رہا تھا، بیٹھے بیٹھے غنودگی سی محسوس ہوئی اور آنکھ جھپکی ہی تھی کہ خود کو بھوپال میں حضرت والاؒ کی خدمت اقدس میں حاضر پایا ــــــــ اس سے تشنگی اور بھی بڑھ گئی ؎

عید گاہِ ما غریباں کوئے تو　　　انبساطِ عید دیدن روئے تو

حضرت والاؒ دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس کوتاہ عمل کو حضرتِ اقدس سے والہانہ محبّت عطا فرما کر حصولِ مرضیات الہیہ کا جذبہ وافر عطا فرمائیں ــــــــ یہ درخواست اس تجربہ کی بنا پر کی گئی ہے کہ جن دنوں حضرت والاؒ کی محبّت کا غلبہ رہتا ہے، اُن دنوں دنیا سے استغنیٰ اور عبادت واطاعت الہٰی کا شوق بھی غالب رہتا ہے اور جہاں اُس میں کمی ہوئی، یہ کیفیت بھی جاتی رہتی ہے!

س۔ بھوپال

۱۳ رمضان المبارک ۱۳۶۷ھ

عزیزی ومحبّی زادکم اللہ تعالیٰ علماً وعملاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ　　　الحمدللہ تعالیٰ خیریت ہے،

یہ رویا، محبّت کے آثار ہیں، دُعا ہے کہ اس محبّت فی اللہ سے فریقین کو فائدہ پہنچے، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی معرفت عطا فرمائیں، اکثر آپ کے لئے دُعا کرتا ہوں (اس بے مایہ کا سارا سرمایہ یہی بے لوث دُعائیں ہیں جن کی قبولیت کے یقین سے دل سرشار ہے والحمد علیٰ ذٰلک)

غ۔ موجودہ غیر یقینی حالات نظم ونسق کے پیشِ نظر نہ معلوم کس وقت ذرائع رسل ورسائل منقطع ہوجائیں، اگر خدانخواستہ ایسا ہوا کہ حضرت والاؒ سے درخواست ہے

لہ ترجمہ از مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہٗ

کہ اس خادم حقیر کو نہ بھول جائیں اور ہمیشہ دُعا سے سرفراز فرماتے رہیں خصوصاً حرمین شریفین کی حاضری میں اس نامۂ سیاہ کے لئے ضرور دعا فرمائیں،

ننگ بارگاہ ، احقر غلام محمد

س۔ انشاء اللہ دعا کروں گا، فقیر ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۶۸)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۳، اپریل ۱۹۴۸ء

حضرت مرشدنا و مولانا دامت فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

۱۔ مزاجِ اقدس!

۲۔ جن لوگوں سے طبیعت ملتی نہیں، ان کی طرف رغبت بھی نہیں ہوتی اور اُن سے اس طرح کُھل کر ملا نہیں جا سکتا جیسے ہم مذاق لوگوں سے اس کی وجہ سے بعض لوگ احقر کو مغرور سمجھتے ——— کہیں واقعی یہ غرور تو نہیں؟ حضرت والا رہبری فرمائیں۔

س۔ بھوپال

۲۷، اپریل ۱۹۴۸ء

محب صمیم زادکم اللہ توفیقاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ الحمد للہ بخیر ہوں،

اگر دینی مصلحت ہو یا مداراۃ (مقصود ہو) تو دل پر جبر کر کے ملئے!

غ۔ احقر کو گلستاں اور بوستاں سے خاص دلچسپی ہے، آج کل اہلیہ کو پڑھا رہا ہوں اور دینی

ذوق میں اس سے کافی تقویت پاتا ہوں،

س۔ بڑے تجربہ کی کتابیں ہیں اور بابرکت ہیں،

غ۔ پرسوں اہلیہ نے خواب میں دیکھا کہ ان کے سر کے بال سب سفید ہو گئے ہیں،

س۔ شاید کہ اولاد کی بشارت ہو، وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا[1]،

غ۔ روزمرہ کے چھوٹے بڑے، مخفی اور عیاں گناہوں سے بچنے کی کوئی تدبیر تحریر فرمائیں تو بڑا کرم ہوگا،

س۔ عزم وارادہ کرکے اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر جان کر بچیئے اور استغفار کیجیے،

غ۔ اب یہ عالم ہے کہ کسی بزرگ سے ملاقات ہوتی ہے تو توجہ تمام تر حضرت والا ہی کی طرف رہتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ فوراً حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں،

حضرت والا میری دینی و دنیوی صلاح وفلاح کے لئے دعا فرمائیں، فقط

نیاز کیش غلام محمد

س۔ آپ کی محبت وحُسن ظن کے سبب سے ہے، اللہ تعالیٰ اس سے مفید نتیجہ بخشیں، دلی دعا ہے ؛ ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۶۹)

غ۔ حیدرآباد دکن

حضرت سیدی ومولائی دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاجِ اقدس!

عرض خدمت یہ ہے کہ موت کے تصوّر سے بعض دفعہ تو بڑی ہیبت طاری ہوتی ہے کہ یہ بڑا سخت مرحلہ ہے اور بعض مرتبہ اپنی ساری کوتاہ عملیوں کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ نہ صرف بآسانی بلکہ خوشی خوشی جانا نصیب ہوگا،

---

[1] دریافت کرنے پر استقرار حمل کا علم ہوا، اہل فن کو اس حُسنِ تعبیر پر وجد آکر رہے گا کہ علامہ محمد ابن سیرینؒ کے ذوق وکمال کی تجدید ہوگئی!

حضرت والا سے دُعا کی درخواست ہے کہ خاتمہ آخر الذکر حالت پر نصیب ہو جائے،

س۔ بھوپال

عزیز قلبی وفقکم اللہ تعالیٰ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ — الحمد للہ خیریت ہے،

دونوں کیفیتیں درست ہیں، ایک خوف ہے اور دوسری رجاء اور ایمان دونوں کے بیچ میں ہے، عین خوف کی حالت میں رجاء ہو اور رجاء کی حالت میں خوف ہو،

غ۔ تقریر کرنے کے بعد بہت دیر تک اُسی مضمون سے متعلق ذہن میں خیالات آتے رہتے ہیں اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ یہ بات بھی بیان کر دینی چاہیئے تھی اور اس انداز سے اس کا ذکر ہونا چاہیئے تھا ـــــــــ اس کا علاج تجویز فرمادیں،

س۔ اس کا علاج تو ایک قبل از وقت کا ہے اور ایک بعد از وقت کا ـــــــــ قبل از وقت تو یہ ہے کہ آپ عنوانات کاغذ پر لکھ لیں اون کو دیکھ دیکھ کر تقریر کریں، اور بعد از وقت یہ ہے کہ یہ تصوّر کریں کہ جو اللہ تعالےٰ نے مجھ سے ظاہر کرایا وہی موافقِ حکمت تھا، افسوس بیکار ہے،

غ۔ حضرت والا احقر کے لئے حفظِ دین کے ساتھ وسعت رزق کی بھی دُعا فرمائیں، کیونکہ احقر کو خرچ پر قابو نہیں اور بغیر آمدنی بڑھے سکون نہ مل سکے گا بشرطیکہ ضروریات یہی رہیں واللہ اعلم، احقر غلام محمّد

س۔ آپ کے لئے حفظِ دین کے ساتھ وسعتِ رزق کی دُعا ہے لیکن آمدنی بڑھ جانے سے خرچ بھی بالطبع بڑھے گا یہ روزانہ کا مشاہدہ ہے، اس لئے طمانیت قناعت میں ہے۔

ہیچمداں

سُلیمان

۵ ذیقعدہ ۱۳۶۷ھ

مکتوب (۷۰)

(ستمبر ۱۹۴۸ء کو حیدر آباد کی دو سو سالہ سلطنت جو دراصل دورِ مغلیہ کی آخری نشانی تھی وہ بھی سیاسی نقطۂ نظر سے قائدین مجلس اتحاد المسلمین کی غیر محتاط روش اور نظام دکن کی خفیہ سازش کی وجہ سے بھارتی آئین شکن اور استبداد پسند ہاتھوں کے ذریعہ مٹ گئی،

فراست سلیمانی اس انجام اور اس کی اصل علّت کو آغاز ہی میں دیکھ چکی تھی (جیسا کہ مکتوب نمبر (۵۹) مورخہ نومبر ۴۷ء سے ظاہر ہے) اور اس پر خود راقم کو بھی یقین پیدا ہو چلا تھا پھر بھی جو المیہ آنکھوں نے دیکھا اس سے کائنات دل تہ و بالا ہو گئی، نہ معلوم غلبۂ رنج والم میں اپنی خیریت کی اطلاع دیتے ہوئے خدمت شیخ میں کیا یاس انگیز باتیں لکھ دی تھیں، بہرحال اس کا جواب جو کارڈ کی صورت میں آیا اس سے یاس دور ہو گئی اور یہ بات گویا مشاہد ہو گئی کہ ایک مسلمان کا مشن اور مقصدِ حیات ان تکوینی حوادث سے مجروح نہیں ہو سکتا!! ع نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانہ سے!

آپ بھی اس درس سے مستفید ہوئیے، یہ ہر جگہ ملنے والا درس نہیں کیونکہ ایسی گہری نظر اور سنجیدہ فکر کبھی بھی عام نہیں رہی ہے)

س۔ بھوپال، یکم ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ

۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

عزیز مکرم حیاکم اللہ تعالیٰ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کا کارڈ عین حالت انتظار میں ملا جس سے آپ کی خیریت معلوم ہوئی، اس وقت آپ میرے پچھلے خطوں کو جو آپ کے پاس ہوں تو دوبارہ پڑھیں، مکی زندگی سے پہلے مدنی زندگی بہ مشکل کامیاب ہو سکتی ہے اور پچھلے فرسودہ نظامِ زندگی کی بنیاد پر تجدید کی دیواریں کھڑی نہیں ہو سکتی ہیں،

خود مسلمان بننا، دوسرے مسلمانوں کو مسلمان بننے کی دعوت دینا وقت کی اہم پکار ہے اور اس فرض کو نفرت کے بجائے محبت کے جذبہ سے انجام دینا سب سے اہم ہے، جس کے سامنے آپ دعوت پیش کرتے ہیں اوس پر شفقت اور اوس سے محبت دعوت کا محرک ہو تب ہی وہ کامیاب ہوسکتی ہیں، جیساکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ہے اور قرآن کریم میں بھی اوس کی شہادت ہے، لاتحزن اور لایحزنک قولھم اور ولاتک فی ضیق مما یمکرون اور عزیزٌ علیہ ما عَنِتُّمْ وغیرہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ منشائے دعوت شفقت بر کفار تھی کہ داعی اور مدعو نہ ملیں گے اور ایک کو دوسرے سے دلی لگاؤ پیدا نہ ہوگا تو ایک دل سے دوسرے دل کی طرف تاثیر منتقل نہیں ہوسکتی،

الحمدللہ اچھا ہوں، والسلام سید سلیمان

مکتوب (۱۷)

(عزت وشوکت کو کھو کر جو آزادی کا لازمہ ہیں، دفعتہً رسوائی اور ذلت کو انگیز کر لینا، خواہ اس کے اسباب کچھ ہی ہوں، کس قدر دشوار ہے اس کا احساس لٹی ہوئی قوم کے حساس افراد ہی کرسکتے ہیں، حضرت والا رح کے ارشادات سے یہ تو ہوا کہ مایوسی رفع ہوگئی مگر بدلے ہوئے ماحول پر طبیعت نہ راضی ہوسکتی تھی نہ اس کو ہونا چاہیئے تھا، ترک حیدرآباد کا خیال زور پکڑتا چلا گیا اور مناسب یہی معلوم ہوا کہ حب وطن چھوڑنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ حرمین شریفین کو اپنا مستقر بنایا جائے، اسی خیال کے ماتحت ذیل کی مراسلت کی گئی تھی)

غ۔ حیدرآباد دکن

۳۱ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

حضرت سیدی ومطاعی دامت فیوضہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج مبارک !

والانامہ ہدایت و رہبری کا موجب بنا، ریاست حیدر آباد میں جو کچھ ہوا ہو رہا ہے یا آئندہ امکانات ہیں اس کی تفصیل غیر ضروری ہے، اس کو اور مقامات کے حالات پر قیاس فرمایا جا سکتا ہے، ایسی صورت میں احقر کے ذہن میں ایک خیال پختہ ہوتا جا رہا ہے ــــــ والد صاحب کی مدتِ ملازمت ختم ہو چکی، اب ایک سالہ توسیع میں ہیں جو نہ معلوم کب ختم کر دی جائے گی خود احقر کی ملازمت بھی باوجود مستقل ہونے کے غیر یقینی ہی، ان حالات میں یہاں معاشی تنگی اٹھانا اور ہر آن خطرہ میں رہنا بے کار معلوم ہوتا ہے، خیال یہ ہے کہ والد صاحب پنشن لے لیں اور ہم سب مکہ معظمہ کی سکونت اختیار کر لیں۔ وہاں اگر کچھ معاشی تنگی ہو گی بھی تو اوس کی تشفی کے لئے خود اس مقام کی برکت کافی ہے، والد صاحب بھی اس خیال کے مخالف نہیں، احقر کو بار بار خیال آتا ہے کہ شاید اسی بہانہ ہماری قسمت جاگ جائے اور اس ارضِ پاک کا قیام میسر آجائے[1] ــــــ حضرت والا رح کی رہبری مطلوب ہے کہ یہی میرے لئے سب کچھ ہے !

س۔ بھوپال

۹ محرم ۱۳۶۸ھ

عزیزی وحبیبی ادام اللہ توفیقکم وحفظکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔ الحمد للہ خیریت ہے،

ایک بات آپ سمجھ لیں، ملی ہوئی روزی کو بلا عذرِ شرعی کسی حال میں اوس وقت

---

[1] اور اب اس خیال کی گستاخی سے توبہ کرتا ہوں کہ جس مقام مقدس کی عظمت اور اس سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آرام و سکون کو خیر باد کہہ کر اوس کے قرب کو مطلوب بنایا جائے اوس کو محض مجبورانہ منتقلی کے لئے پسند کر لیا تھا ــــــ شاید اسی وجہ سے یہ تمنائے خام پوری نہ ہو سکی، اللہ تعالیٰ سچی ہجرت کی توفیق عطا فرمائے !

تک چھوڑنا نہ چاہیئے جب تک دوسری صورت متعین نہ ہوجائے، ممکن ہے آپ کا موجودہ اضطراب آپ کے گذشتہ نظریہ کی ناکامی کے باعث ہو، ہر جگہ یہی حال ہے،

؎ زمین سخت ہے آسماں دور ہے

جہ میں کی ہجرت بے شبہ موجب برکات ہے، اگر تکالیفِ سفر اور روزی کی تنگی اور توکّل کی وجہ سے دل تنگی کا اندیشہ نہ ہو تو مُبارک ہے، مگر وہاں کا ماحول بھی قلب کے اطمینان کا باعث نہ ہوگا اگر قلب کا لگاؤ ماحول سے، خواہ وہ سیاسی ہو یا کسی اور نوع کا ہو، قائم رہا ——— اس کو اچھی طرح سمجھ لیں!

اب اپنے نفس کے حالات پر غور کیجئے،

غ۔ ذرائع معیشت کی غیر یقینی کے مدّ نظر گھر ہی پر ہومیوپیتھک دواخانہ کا بورڈ لگا دیا، سو برکت کے لئے حضرت دُعا فرمائیں!

س۔ اچھا ہے، اللہ تعالیٰ برکت دیں۔

غ۔ بھُوپال کی حاضری کو جی چاہتا ہے، ہجرت کی اجازت مل جائے تو پہلے بھوپال حاضرِ خدمت ہوں گا،

س۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

غ۔ حضرت والا کی ہدایات پر کاربند ہوں اور دُعائے خیر کا طالب،

احقر غلام محمد

س۔ بارک اللہ فی اعمالکم، فقیر ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۷۲)

غ۔ حیدرآباد

ذوالمجد والکرم حضرت مرشدنا و مولانا دام فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ اقدس!

ہجرت سے متعلق مکرر غور کیا بجز اس حقیر کے دوسروں کے عزائم مستحکم نظر نہیں آتے،
اشتیاقِ ہجرت اور ماحول کی ناسازگاری کے باعث ذہنی کشمکش ہے، اللہ تعالےٰ اپنے فضل
سے محروم نہ فرمائیں،

س۔ بھوپال

محبِ صمیم زادکم اللہ تعالیٰ معرفتہٗ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ   الحمدللہ خیریت ہے،

ہجرت وہ شخص کرے جو سفر کی ہر تکلیف کو بآسانی انگیز کرسکے اور اسی میں راحت
سمجھے، جو راضی بہ رضا ہو اور اپنی تجویز کو دخل نہ دے وہ انشاء اللہ پریشان خاطر نہ ہوگا۔[1]

غ۔ ذکر سرّی روزانہ ۔۔۔ گھنٹہ کا معمول ہے،

س۔ بہت بہتر

غ۔ حق تعالیٰ کی ذات تو ورا، الورا ہے پھر ذکر کے وقت ذات کا تصوّر کس طرح کیا جائے
یہ دقّت آج ہی محسوس ہوئی،

س۔ تصوّرِ ذات کا نہیں ہوتا، اوس کی صفات کا ہوتا ہے، اللہ تعالےٰ کے اسمائے حسنیٰ کا
تصوّر کیجئے، نورانیت کا تصوّر بھی اوس کی صفت ہی کا تصوّر ہے،

غ۔ مسئلہ سماع پر گفتگو کرتے ہوتے شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رح نے اپنے ایک مکتوب
میں تحریر فرمایا ہے:۔

" روایت کردہ شدہ است از انس رض کہ گفت نزدیکِ رسول ص بودم کہ مہتر جبریل ع در

---

[1] یہ مقام تفویض ہے، اسی مقام پر پہنچ کر انسان " لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون" کا جامِ حیات
نوش کرتا ہے! ہمارے حضرت دالا رح الحمدللہ اس نشۂ بے خمار سے سرشار تھے!

رسید پس گفت یارسول اللہ بشارت مرترا کہ درویشانِ اُمت تو در آیند در بہشت پیش از اغنیا بپانصد سال و آں نیم روز بود، پس حضرت رسالتؐ بریں بشارت خوش گشت و گفت درمیان کسے ہست کہ شعرے بخواند، مردے بدوی گفت، ہست یا رسول اللہ، گفتؐ ہات ہات، آنگاہ وے ایں بیت بخواند ؎ قد لسعت حیة الھوی کبدی الخ پس رسول اللہ تواجد کرد و جملہ صحابہ رضوان اللہ تواجد کردند تا ردائے مبارک از دوش مبارک بیفتاد پس چوں فارغ شدند ہر کسے بجائے خویش قرار گرفتند معاویہ بن ابی سفیان گفت چہ نیکو بازی شماست یارسول اللہ؟ فرمودند یامعاویہ لیس بکریم من لم یھتز عند سماع ذکر الحبیبؐ پس ردائے او علیہ الصلوٰۃ والسّلام قسمت کردند و بہ حاضراں بہ چہار صد پرکالہ"۔ (مکتوب ۱۳۱ ۹۳ ۔"مکتوبات سی صدی") از راہِ کرم رہبری فرمائی جائے کہ کیا یہ روایت صحیح ہے؟

س۔ مسئلہ سماع بلا مزامیر اپنی جگہ پر ہے مگر اس پر اس روایت سے استدلال صحیح نہیں، اس روایت پر اوّل جز یعنی اغنیاء سے فقراء کا پانچسو برس پہلے بہشت میں داخل ہونا، احادیث میں مذکور ہے، مگر اس کے بعد کا حصہ کسی حدیث میں نہیں ہے، یہ صوفیہ کی تصنیف میں ہوگا مگر وہ سنداً ثابت نہیں۔

ع۔ احقر کا احساس یہ ہے کہ اس کا قلب حجابات سے ڈھکا ہوا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیونکر اُٹھیں!

س۔ یہ سمجھنا کہ قلب حجابات سے ڈھکا ہوا ہے خود معرفت ہے، بہرحال اس وسوسہ کا ازالہ (کہ یہ حجابات کس طرح اٹھیں گے) کثرتِ ذکر مع الحضور سے ہوگا۔

ع۔ یہاں سندھ کے ایک بزرگ حضرت حسن شاہ صاحب آئے ہوئے ہیں، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور نسباً و مسلکاً مجددی ہیں، (۸۰) سال سے اونچی عمر ہوگی، دو تین بار ان سے نیاز حاصل ہوا، بدعات سے سخت نفور ہیں، احقر سے فرمایا کہ الحمدللہ آپ

مولانا اشرف علی صاحب کے سلسلے سے متعلق ہیں،

س۔ میں واقف نہیں تاہم ؎ تمتع زہر گوشۂ یافتم، پر عمل کیجئے، مگر تعلیم کا تعلق صرف شیخ سے رکھنا چاہیئے،

غ۔ حضرت والا احقر اور اس کی اہلیہ کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کے لئے دُعا فرمائیں،

والسّلام احقر غلام محمد

س۔ دونوں کے لئے دُعائے خیر ہے فقیر ہیچمداں سید سلیمان

مکتوب (۷۳)

غ۔ حیدر آباد دکن

۱۴ر دسمبر ۱۹۴۸ء

حضرت سیّدی و مولائی عم فیوضکم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاجِ اقدس!

والا نامہ شرف صدور لایا جس میں حضرت والا نے ہدایت فرمائی ہے کہ اصلاح کا تعلق صرف ایک سے ہونا چاہیئے، اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ احقر تو اس نقطۂ نظر سے کسی اور بزرگ کی طرف نظر ہی نہیں کر سکتا بلکہ حکم ہو تو کسی اور سے ملاقات بھی ترک کر دوں'

س۔ محبِّ عزیز حفظکم اللہ تعالیٰ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ الحمد للہ تعالیٰ مع الخیر ہوں،

میں نے تنبیہاً لکھ دیا تھا، کچھ اور مقصد نہ تھا،

غ۔ ذکر سری کی فضیلت حدیث سے ثابت ہے پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ محض اس مصلحت سے کہ ذکرِ جہری میں کم از کم زبان مشغول رہتی ہے، جہری ذکر کو کیوں ترجیح دیتے ہیں؟

س۔ ذکر جہری اور سری دونوں مشروع ہیں، اب جس کو جس سے مناسبت ہو جہری کے معنی یہ ہیں کہ جس کی آواز اپنے کانوں کو سنائی دے، جس کو قرآن پاک میں "دون الجھر من القول[1]" کہا گیا ہے ـــــــ اس کی تفسیر میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر جہراً اور حضرت ابوبکرؓ سراً تہجد پڑھتے تھے تو حضرت عمرؓ کو فرمایا گیا کہ ذرا آہستہ پڑھو اور حضرت ابوبکرؓ کو کہا گیا کہ ذرا زور سے پڑھو،

غ۔ ذکر سے اصل مقصود قلب کو مشغول رکھنا ہے یا محض زبان کو، یا دونوں کو؟

س۔ ذکر سے اصل مقصود تو مذکور یعنی "اللہ" کا استحضار ہے، یہ نہ ہو تو "ذکر" کا یہ بھی نہ ہو تو ذاکر یعنی "قلب" کا ـــــــ جہر میں یہ فائدہ ہے کہ اگر یہ تینوں نہوں تو بھی ذکر لسانی کے برکات تو حاصل ہوں گے!

غ۔ اضلاع میں جو کچھ ہوا ہوا، اب کافروں نے شہر میں بھی لوٹ اور غارتگری اور اغواء شروع کر دیا ہے، اس سے قلب مشوش رہتا ہے، کیا ترکِ مقام کیا جائے یا ان حالات پر صبر کر لیا جائے، حضرت والا یہاں کے مسلمانوں کے لئے دعا فرمائیں،

س۔ میری رائے میں صبر و شکر[2] کے ساتھ اپنے مقام پر قیام مفید ہے، اور یہ دعا پڑھی جائے، ربنا اغفر لنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین،

غ۔ حضرت والا، کیا یہ ابتلائی دور ہے یا عذاب ہے؟

س۔ عذاب مطلق نہیں، مسلمانوں کے پچھلے جرائم کی پاداش میں تنبیہی سزا ہے کہ: لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔

(کس قدر صاف اور یقینی جواب ہے اور اسی جواب میں مصائب کا علاج بھی آگیا کہ

---

[1] واذکر ربك فی نفسك تضرعا وخیفةً ودون الجھر من القول (اعراف)

[2] شکر اس بات کا کہ اب تک حفاظت رہی ـــــــ گو شکوہ خلاف تفویض ہے!

اگر مسلمانوں نے دین کی طرف پوری طرح رجوع کر لیا تو رحمتِ الٰہی سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں)

غ۔ احقر ہر جمعہ اپنی مسجد میں (۲۰) منٹ کی جو تقریر کیا کرتا ہے اور جس کا نقطۂ مرکزی صرف دین ہے کیا اس پُرفتن دَور میں بھی جاری رکھے یا یہ وہ وقت ہے جب تلواروں کو کند کر کے گوشہ میں بیٹھ رہنا افضل ہے؟

س۔ ۲۰ منٹ والی خالص دینی تقریر جاری رکھئے، سیاسیات سے کامل پرہیز، (بحمداللہ ہجرت پاکستان تک یہ سلسلہ بلا مزاحمت جاری رہا، یہ سب برکت تھی توجہات شیخ قدس سرہٗ کی)

غ۔ بحمداللہ معمولات پر پابند اور دُعا و توجہ کا محتاج ہوں، والسّلام،

خادم غلام محمد

س۔ الحمدللہ، اللہ تعالےٰ مزید استقامت بخشیں، فقیر ہیچمداں

سیّد سُلیمان

مکتوب (۷۴)

غ۔ حیدر آباد دکن

۳۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء

سیّدی و مولائی دامت برکاتہم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج اقدس!

والانامہ پاکر ترکِ وطن کا ارادہ ختم کر دیا اور اب ایک ہمّت پیدا ہو گئی ہے،

س۔ بھوپال

محبِّ صمیم و عزیز حمیم زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ الحمدللہ تعالیٰ مع الخیر ہوں

بہت اچھا کیا، اللہ تعالیٰ فضل فرمائے؟

غ۔ گرامی نامہ سے سرفرازی کے بعد والی رات احقر نے خواب میں دیکھا کہ ایک بڑا حوض ہے، جس کا پانی غیر شفّاف ہے اور اُس کے اندر سوروں کی طرح بڑے بڑے دریائی جانور بکثرت ہیں، احقر کے جی میں آئی کہ اس میں تیرے لیکن درندوں کے گزند سے پہلے تو ہمت نہ ہوئی لیکن بعد میں جب حوض کے اندر پھاند پڑا تو بڑی تیزی سے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک تیرنے لگا اور جس طرف نکل جاتا درندے بھاگ جاتے تھے، اس کے بعد احقر نے اپنے والد ماجد اور بعض اور رشتہ داروں کو بھی اسی طرح بلا تکلّف تیرتے دیکھا، تعبیر ذہن میں یہ آئی کہ شاید اس کُفرستان میں دشمنوں کے گزند سے جانی حفاظت رہے گی، واللہ اعلم،

س۔ یہ تعبیر مناسب معلوم ہوتی ہے، (چنانچہ بحمداللہ حفاظت ہی رہی)

غ۔ مولوی مسعود عالم صاحب ندوی کی کتاب "محمدؐ بن عبدالوہاب نجدی" مطالعہ میں آئی، اثر یہ مرتّب ہوا کہ گو محمد بن عبدالوہاب مرحوم سے قدرے غلو ہوا ہے لیکن جیسا مرحوم کو مطعون کیا جاتا ہے، وہ شاید غلط اور عنداللہ قابلِ مواخذہ ہے، رہبری کا طالب

س۔ آپ صحیح سمجھے،

غ۔ ہم سب کی حفاظتِ دینی و دنیوی کے لئے حضرت والا دعا فرمائیں، والسّلام

احقر غلام محمدؐ

س۔ بہ دل دُعا کرتا ہوں

فقیر ہیچمداں و ہیچ کارہ

سُلیمان ۳ ربیع الاول ۱۳۶۸ھ

مکتوب (۷۵)

غ۔ حیدرآباد دکن

۱۷؍جنوری ۱۹۴۹ء

سیدی و مطاعی دامت فیوضہم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاجِ اقدس!

اس گنہگار کا حال بُرا ہے، سارے ہی رذائل میں غلطیدہ ہوں اور پریشان حال۔

(۱) حسد گھر کر گیا ہے، مگر جب کسی پر حسد محسوس ہوتا ہے تو اس کی عزّت و ثروت میں مزید ترقی کے لئے دُعا کرتا ہوں، حضرتِ والا کوئی اور بہتر علاج تجویز فرمائیں،

(۲) اپنی بڑائی کی تمنّا بھی رہتی ہے،

(۳) لذیذ غذاؤں کی طرف رغبت بہت زیادہ ہے اور نہ ملنے پر تکلیف ہوتی ہے گو ضبط کرلیتا ہوں، حضرت والا کے خدام میں ایک ایسا کمینہ و بدحال بھی ہے، حضرت والا اس کے اصلاح کی تدبیر بھی فرمائیں اور دُعائے خیر سے بھی سرفراز فرمائیں،

(۴) ویسے معمولات پر بحمد اللہ پابندی ہے،

بندۂ عاصی

غلام محمد عفی عنہٗ

س۔ بھوپال

۱۸؍ ربیع الاوّل ۱۳۶۸ھ

محبّ عزیز حسّن اللہ تعالیٰ اخلاقکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ خیریت ہے،

(۱) حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کا اس باب میں ایک قول ہے اوس کو نقل کرتا ہوں:۔

"حسد کی ایک تو کیفیتِ نفسانیہ ہے جس میں انسان معذور ہے، ایک اوس کے مقتضیٰ پر عمل ہے اس میں انسان ماذور (گنہگار) ہے، اور ایک مخالفت ہے اوس مقتضیٰ کی، اس میں انسان ماجور ہے ــــــــــ یعنی حسد کے غلبہ سے کسی کی مذمّت کا تقاضا ہو تو اوس کی مدح کرو، اوس سے اعراض کو دل چاہے

تو اوس سے ملو، اوس کی تعظیم کرو، ابتداء بالسلام کرو"۔

غرض نفسِ کیفیتِ حسد پر مواخذہ نہیں، اوس کے مقتضیٰ پر عمل کرنے پر مواخذہ ہے، حدیث میں ہے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو۔[1] حسد سے غیبت، عداوت کذب گوئی، افترا پردازی، بہت سی برائیاں پیدا ہوتی ہیں، آپ یہ تصور کیا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہیں، اگر مجھے کم اوسے زیادہ ملا تو اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی،

(۲) اس کا علاج اپنی بُرائیوں پر نظر ہے،

(۳) اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ انہماک نہ چاہیئے،

مکان میں صفائی کے لئے جب جھاڑو دی جاتی ہے تو ہر قسم کا گرد وغبار اور میل کچیل سامنے آتا ہے، اس سے مایوس نہ ہوں، (کس قدر عارفانہ اور امید پرور، یہ آخری جملہ ہے، شیخ کامل کا یہی کمال ہوتا ہے کہ وہ سالک کو کسی مرحلہ پر مایوس ہونے نہیں دیتا اور جہاں یاس چھاجاتی ہے وہیں سے امید کی شعاع چمکا دیتا ہے،)

(۴) بارک اللہ تعالیٰ ، والسّلام سیّد سلیمان

مکتوب (۷۶)

(حضرت والاؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے دو برس ہو چلے تھے، دل بے چین رہتا تھا حاضری کے لئے اجازت چاہی تھی، اوس کے جواب میں ذیل کا والا نامہ آیا:)

س۔ بھوپال

۲۱ر فروری ۱۹۴۹ء

عزیزم محترم ادام اللہ توفیقکم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

---

[1] عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب

چند روز کی دیر بوجہ مشاغل ہوئی، معاف کیجئے،

آپ بشوق آسکتے ہیں، مگر جلد آئیں، ایک ہفتہ عشرہ کی نیت کریں، آپ کی اہلیہ عزیزہ کے لئے دل تو یہی چاہتا ہے کہ اجازت دے دوں مگر اس وقت حالات اس کے سازگار نہیں[1] اس لئے وہ ابھی قصد نہ کریں، آنے کی تاریخ لکھ دیں، والسلام

سید سلیمان

---

[1] مُراد اس سے سفر کی تکالیف ہیں!

بھوپال کی آخری حاضری

(۳ر مارچ تا ۱۶ر مارچ ۱۹۴۹ء)

عیدگاہِ ماغریباں کوئے تو　　　انبساطِ عید دیدن روئے تو

اجازت کا پروانہ تو مل ہی چکا تھا، حسب ارشاد خدمتِ سلیمانی میں اپنی حاضری کی تاریخ لکھ کر ۳ر مارچ ۱۹۴۹ء کو مشتاقانہ بھوپال پہنچ گیا، ہمیشہ کی طرح اب بھی قیام و طعام کی ساری آسائشوں کے لئے حضرت شیخ ہی کا منت پذیر رہا بلکہ اس مرتبہ الطاف اور بھی زیادہ رہے،

کودکِ ناداں

جب حضرت اقدسؒ کی خدمت میں پہنچا تو حضرت والارحؒ نزلہ کی تکالیف میں مبتلا تھے، یونانی علاج جاری تھا، احقر کو بیماری کی تفصیل سنائی اور نسخہ بھی دکھلایا، احقر نے عرض کیا کہ حضرت اس نوبت پر جوارش جالینوس مناسب نہیں، ابھی تو نزلہ کو بہانے کی ضرورت ہے، اس جوارش سے احتباس ہوگا اور تکلیف بڑھ جائے گی، حضرت والاؒ نے مسکراتے ہوئے ازراہِ محبت و شفقت فرمایا "یہ نسخہ ایک طبیب حاذق کا تجویز کردہ ہے، اور اعتماد ہمیشہ طبیب حاذق کی رائے پر کرنا چاہیئے اس لئے ہم آپ کی بات نہیں مانیں گے"

میں خاموش ہو رہا۔

دوا جاری رہی دو روز بعد سر کا درد ناقابلِ برداشت ہوگیا، مجھے ساتھ لے کر ایک اور طبیب کے پاس تشریف لے گئے، اُن سے کیفیت بھی بیان کی اور نسخہ بھی دکھلایا، انھوں نے فرمایا کہ جوارش جالینوس سے احتباس پیدا ہوگیا ہے چنانچہ ایک جوشاندہ تجویز کردیا، جس کے پینے سے نزلہ کھل گیا اور سکون میسّر آیا ـــــــــــ حضرت والارحؒ نے احقر کے ابتدائی مشورے کا ذکر کرتے ہوئے ازراہِ لطف فرمایا۔

"گاہ باشد کہ کودکِ ناداں"[1] حضرت والاؒ کے یہ محبت افزا کلمات ۔ آہ کہ اب ایک یادگار ہی بن کر رہ گئے!

ذرّہ نوازی

اس مرتبہ کی حاضری میں حضرت پیرانی صاحبہ مدظلہا بھی بھوپال میں تشریف فرما تھیں، پھر حیرت کی کیا بات ہے اگر اس خادم حقیر پر کرم بھی دو چند ہو گئے ہوں چنانچہ دورانِ قیام برابر اس دوہرے لطف کا احساس قلب کو ہوتا رہا مگر ایک روز تو اس احساس پر مہر تصدیق لگ گئی اور حُسن ظن یقین بن کر شرمندۂ احسان کر گیا ــــــــــ

ایک روز حضرت سیدیؒ مسکراتے ہوئے فرمانے لگے :

"گھر میں سے کہہ رہی تھیں کہ یوں تو بحمداللہ ہمارے ہاں مہمانوں کا سلسلہ رہتا ہی ہے مگر غلام محمد صاحب کے آنے سے اور ہی مسرت محسوس ہوتی ہے تو میں نے کہا بھئی اور لوگ تو اپنی غرض سے آتے ہیں یا ہماری خاطر سے اور یہ تو اللہ کے لئے آئے ہیں"!

کیا پاس و لحاظ ہے ایک سراپا عیب کی نیت و خلوص کا ــــــــــ حضرت والاؒ کا طریق تربیت ہمیشہ یہی دیکھا کہ شاباشیاں دے دے کر ہمت بڑھاتے رہتے تھے، اور بقول ایک دست گرفتہ کے یہی طریقہ دورِ حاضر میں مؤثر و مفید بھی ہے!

حضرت حاجی محمد شفیع بجنوریؒ سے شرفِ نیاز

یہ حضرت اقدس رحمہ اللہ تعالےٰ کی بےنفسی اور احقر کے حال پر شفقت کا نتیجہ تھا کہ خود ہی مختلف بزرگوں کی خدمت میں مجھ کو لے جاتے اور میرے لئے دُعا کرواتے تھے، ایک روز شام کے وقت باہر جانے کی تیاری فرما رہے تھے، مجھ سے فرمایا کہ ایک جگہ شادی کی دعوت ہے مگر نکاح مسجد میں ہے اس لئے اگر آپ بھی ساتھ چلئے تو کچھ حرج

---

[1] گاہ باشد کہ کودکے ناداں ۔۔۔ بہ غلط بر ہدف زند تیرے
گہ بود کز حکیم روشن رائے ۔۔۔ بر نیاید دُرست تدبیرے
(سعدیؒ)

نہیں، وہاں ایک بزرگ سے ملاقات ہو جائے گی، میں فوراً تیار ہو گیا اور حضرت والا رحمہ کے ساتھ چلا، پیدل تشریف لے چلے فرمایا کہ "اسی موتی مسجد میں تقریب نکاح ہے اور یہ لوگ حضرت حاجی محمد شفیع بجنوری کے معتقد ہیں، حاجی صاحب بھی تشریف لائیں گے" ــــــــ میں نے عرض کیا کہ حضرت کیا یہ وہی بزرگ ہیں جو شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی رحمہ کے مرید اور مولانا تھانوی رحمہ کے شاگرد ہیں اور جن کے متعلق حضرت تھانوی رحمہ نے فرمایا ہے کہ بڑے صاحبِ کشف اور مستجاب الدعوات ہیں، حضرت والا رحمہ نے فرمایا کہ "جی ہاں وہی" ــــــــ دل باغ باغ ہو گیا کہ ایک ایسے بزرگ کی بھی زیارت نصیب ہو گی، چار پانچ منٹ میں ہم مسجد پہنچ گئے، صحن مسجد میں کچھ لوگ جمع تھے، کمان کی دیوار سے ٹیک لگائے حضرت حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری رحمہ تشریف فرما تھے، سفید ریش، ضعیف العمر مگر جسم کے گداز، چہرہ کشادہ پُر نور، ہنستا کھکھلاتا ہوا، حضرت والا رحمہ پر جو نظر پڑی تو ہنستے ہوئے اٹھنے کی کوشش فرما رہے تھے کہ حضرت والا رحمہ کے اصرار پر بیٹھ گئے، ضعف اور موٹاپے کی وجہ سے دو آدمیوں کے سہارے سے کھڑے ہو سکتے تھے، مگر سُنا ہے کہ نماز میں جب ایک بار حضرت کو کھڑا کر دیا جاتا تو پھر سارے ارکان بلا تکلف ادا فرماتے تھے، یہ اُنکی کرامت تھی.

حضرت والا رحمہ کے پہنچتے ہی حاجی صاحب رحمہ نے حضرت سیدی سے خطبۂ نکاح پڑھنے کی فرمائش کی حضرت والا رحمہ نے نکاح پڑھا دیا چھوارے تقسیم کر دیے گئے اور محفل نکاح نہایت سادگی سے برخاست ہو گئی، اپنی آنکھوں نے پہلی مرتبہ ایک دینی تقریب میں اس اسلامی سادگی کا یہ نظارہ دیکھا،

محفل برخاست ہوئی تو حضرت والا رحمہ نے حضرت حاجی صاحب سے فرمایا کہ گھر قریب ہی ہے حضرت تشریف لے چلیں تو مسرت ہو گی یا یہ فرمایا کہ برکت ہو گی، غرض حضرت حاجی صاحب نے دعوت قبول فرمالی اور پیدل ہی گھر تک تشریف لے آئے ــــــــ حضرت والا رحمہ نے خود اپنے لئے اپنے اہل و عیال اور اس ننگِ خدام کے لئے حاجی صاحب رحمہ سے دُعا کی درخواست کی اور حضرت موصوف نے ہاتھ اٹھا کر سب کے لئے دیر تک دُعا فرمائی، پھر اپنے شیخ قدس سرہٗ

(شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ) کے بھولے پن کے واقعاتؔ اور اُن کی بعض کرامات سُناتے رہے، یہ بھی فرمایا کہ "جب مولانا تھانویؒ شاہ مرادآبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو "میں لڑکا تھا حضرت شاہ صاحب نے مجھ کو مولانا کے حوالے فرمایا کہ یہ نالائق ہے اس کو پڑھاؤ لکھاؤ چنانچہ میں نے کانپور میں مولانا سے تعلیم حاصل کی"

دیکھنے کی چیز یہ تھی کہ جب جب حضرت حاجی صاحب اپنے شیخ عالی مقام کا ذکر فرماتے تھے تو مسرّت وانبساط سے اُن کے چہرہ پر خون دوڑجاتا تھا اور کمر سیدھی ہوجاتی تھی، جوشِ محبّت کے اثر سے شیخ شباب نظر آنے لگتے تھے، غرض جب ۱۵، ۲۰ منٹ بیٹھ کر حاجی صاحب رخصت ہوگئے تو حضرت والارحؒ نے احقر سے مخاطب ہوکر فرمایا کیوں ہے نہ وہی بات ؎

چڑھی ہو کچھ ایسی کہ تیور تو دیکھو	جواں آج پیرِ مغاں ہو رہا ہے
دمکتا ہے چہرہ، چمکتی ہیں آنکھیں	بڑھاپے میں بھی جانِ جاں ہو رہا ہے

حضرت حاجی صاحب زیارتِ حرمین کے بڑے دلدادہ تھے، والہانہ شوق کے ساتھ ۲۲، ۲۳ مرتبہ حج سے مشرف رہے اور بالآخر ۱۹۵۱ء میں بعد فراغ حج مکہ معظمہ ہی میں اپنی جانِ مشتاق محبوب ازل کے نذر کردی،

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

واپسی تیرہ دن حضرت شیخ رحؒ کے الطاف وعنایات اور علمی وروحانی فیوض وبرکات سے مالامال ہوکر آخر خواہی نخواہی واپسی پر طبیعت کو مجبور کرنا پڑا،

اس مرتبہ کی حاضری اور واپسی دونوں ہی گذشتہ حاضریوں سے الگ نوعیت کی تھیں حاضر ہونے کا ضمنی مقصد یہ بھی تھا کہ حضرت والارحؒ کو اپنے تفصیلی احوال سُناکر ترکِ وطن اور ہجرت پاکستان کی اجازت حاصل کی جائے، چنانچہ جب یہ تفصیلی معروضات گوش گذار کردیے گئے تو...

ؔ حالانکہ خود ان سے بھی زیادہ بھولے تھے، بعض بھولے پن کے لطائف تو خود مولانا تھانویؒ نے بھی بیان فرمائے ہیں!

حضرتِ والا رحؒ نے چند ہدایات کے ساتھ ترکِ وطن کی اجازت مرحمت فرمادی مگر اس انداز شفقانہ سے کہ اس مفارقت کو مجبوراً گوارا فرما رہے تھے ———— اس اجازت سے دل پر ایک حسرت آمیز سکوت طاری ہوگیا، ذہنی شورش تو مٹ گئی کہ اب دار الکفر سے نجات حاصل ہوگی مگر حضرت شیخ کی مستقل مفارقت کے تصوّر نے دل کو بجھا دیا اور اس مرتبہ رخصت ہوتے ہوئے آئندہ ملاقات کی کوئی اُمید دل میں موجود نہ تھی، حضرت والا رحؒ خود بھی کچھ زیادہ ہی متاثر تھے۔

بہرکیف محبت شیخ کی دولت لئے حضرت والا رحؒ سے ۱۶ مارچ ۱۹۴۹ء کو رخصت ہوکر دوسرے دن اپنے وطن میں بیگانہ وار آ پہنچا،

مکتوب (۷۷)

ع۔ حیدر آباد دکن

سیدی و مرشدی و مولائی ادام اللہ فیوضکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

کل ایک عریضہ محترمی سلمان میاں سلمہ کی خدمت میں گذران چکا ہوں، پہنچا ہوگا، خط لکھنے میں تاخیر نسخہ کی وجہ سے ہوئی، ابھی حکیم صاحب (مخدومی حکیم مقصود جنگ بہادر) نے ایک نسخہ لکھ دیا ہے جو منسلک مرسل ہے، دو نسخے اور ہیں دونوں کو تیار کروانا ہوگا، اگر وہاں ان کا اہتمام ممکن نہ ہو تو حکم ملنے پر احقر ان کو تیار کروا کے خدمتِ والا میں پیش کر دے گا۔

(بعض مقوی دماغ و اعصاب نسخے حضرتِ والا رحؒ کے لئے لکھ بھیجے تھے)

س۔ بھوپال

حبیبی الاعزّ اصلح اللہ احوالکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

کل کا خط بھی آج ہی ساتھ پہنچا۔ آپ کے بخیریت پہنچنے کا انتظار تھا، الحمد للہ خیریت معلوم ہوئی، نسخے پہنچے، یہاں عطاروں سے دریافت کروں گا مگر پہلے یہ تو معلوم ہو کہ مرض کیا ہے؟ اور ان نسخوں میں کیا کیا رعایتیں ہیں؟

غ۔ حضرتِ والا اپنی صحت سے متعلق قدرے تفصیل سے مطلع فرمائیں تو باعثِ تسکین ہوگا،

س۔ الحمدللہ اچھا ہوں، زکام ختم ہوچکا، صرف گلے کی کھانسی قدرے ہے، حرارت نہیں ہے، بھوک لگتی ہے، جوشاندہ بعد تغیر اب بھی استعمال میں ہے،

غ۔ اس مرتبہ تو حضرت والا کی شفقتوں نے عجیب ہی کیفیت پیدا کردی، نماز میں، ذکر میں، چلتے پھرتے ہر وقت دھیان اُدھر ہی رہتا ہے اور تصورِ شیخ بندھا رہتا ہے، جی چاہتا ہے کہ پھر خدمت فیض میں جا پہنچوں،

س۔ جو کچھ ہوا اور ہوتا ہے وہ سب حق تعالیٰ کا فیض ہے، بندہ مامور ہے، یہ اقتضائے محبت ہے، وہ محبت جس کی تقلیل کی شکایت آپ کو پیدا ہوگئی تھی، (جیساکہ گزشتہ کسی عریضہ میں لکھا تھا)

غ۔ حضرت والا دعائے خیر سے سرفراز فرمائیں، والسّلام، احقر غلام محمّد

س۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی اہلیہ کو فلاح دارین بخشیں، والدۂ سلمان دُعائے خیر کہتی ہیں والسّلام، فقیر ہیچمداں سیّد سُلیمان

(اس جُملہ نے غرقِ ندامت کردیا کہ میں تو خدمتِ علیہ مدظلّہا میں سلام عرض کرنا بھُول ہی گیا تھا)،

مکتوب (۷۸)

غ۔ حیدرآباد دکن

۲۵، مارچ ۴۹ء

حضرت سیّدی و مرشدی و مولائی دام فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ　　　　مزاج اقدس!

والا نامہ باعثِ تسکین ہوا، اللہ تعالیٰ حضرت والا کو تادیر بہ ازدیادِ فیوض سلامت رکھے!

س ۔ بھوپال

۳۰ مارچ ۱۹۴۹ء

مخلصی و عزیزی وحبیبی رفع اللہ احوالکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' الحمدللہ خیریت ہے،

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حُسنِ خاتمہ نصیب فرمائے،

غ ۔ نسخوں سے متعلق مخدومی حکیم صاحب نے فرمایا ہے کہ وہ خود حضرتِ والارحؒ کی خدمت میں خط لکھیں گے،

س ۔ حکیم صاحب کا والا نامہ ابھی نہیں آیا ہے، آجائے گا اب انھیں زحمت نہ دیں،

غ ۔ یہاں حضرت مولانا تھانویؒ کے ایک مرید مولوی عبدالرحیم صاحب ہیں جن کے احوال بہت اچھے ہیں، مولانا محمود الغنی صاحب تو موصوف کے متعلق فرمایا کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے اچھے احوال حضرت تھانویؒ تک سے چھپائے اس لئے ان کو خلافت نہ ملی[1] ورنہ وہ ہر طرح خلافت کے اہل تھے ـــــــــــ یہ بزرگ (۷۰)، (۷۵) کے سن میں ہیں، اور حضرت والارحؒ کے قیام حیدرآباد کے دوران مکہ مسجد میں اور مولانا فضل اللہ صاحب (حال صدر شعبۂ اسلامیات جامعہ عثمانیہ) کے گھر پر حضرت سے نیاز حاصل کرچکے ہیں، اب حضرت والارحؒ کی خدمت میں عریضۂ احوال پیش کرنا چاہتے ہیں، احقر نے پتہ لکھوادیا ہے یہ چند کلمات تعارفاً عرض کردیے ہیں،

مولوی عبدالرحیم صاحب احقر سے فرماتے تھے کہ حضرت والارحؒ کا مقام جمع الجمع[2] کا ہے،

---

[1] اس کے باوجود حضرت تھانویؒ نے اپنے بعض حیدرآبادی مریدوں کو لکھا تھا کہ تصوف کے کسی مسئلہ میں خلجان ہو تو منشی عبدالرحیم صاحبؒ سے حل کرلینا،

[2] صاحبِ مقام "جمع الجمع" واجب تعالیٰ کو واجب اور ممکن کو ممکن جانتا اور دیکھتا ہے مگر ممکن کو واجب کے کمالات وتجلیات کا آئینہ سمجھتا ہے اور جو کچھ جانتا ہے وہ واجب الوجود سے جانتا ہے یہی عبدیت کاملہ ہے'

س۔ اگراُن کا والانامہ آیا تو مناسب جواب عرض کیا جائے گا۔ (چنانچہ عریضہ بھی گیا اور اس کا جواب ایسا آیا کہ پھر حضرت والا کی رحلت تک عرض و مشورہ کا یہ تعلق مستحکم رہا۔)

بزرگوں کا حُسنِ ظن اس بے استحقاق کے ساتھ میرے لئے نعمت بھی ہے اور ابتلا بھی اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں۔ (یہ ہے عملی تفسیر اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ کی)

غ۔ احقر کی اہلیہ حضرت والا اور علیہ پیرانی صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہیں اور دُعا کی خواستگار ہیں۔

احقر غلام محمد

س۔ عزیزہ موصوفہ کے لئے دُعائے خیر ہے، والدہ سلمان کی طرف سے بھی دعاء و سلام۔

فقیر ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۷۹)

غ۔ حیدر آباد دکن

۲۲ اپریل ۴۹ء

حضرت سیّدی و مرشدی و مولائی دامت برکاتہم

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

مزاج اقدس!

عرض یہ ہے کہ آج سے دو ڈھائی برس پہلے جب احقر بزرگانِ دین کی مزامات پر بغرض زیارت حاضر ہوتا تو ایک خاص کشش و جاذبیت اور کبھی کیف و سرور محسوس کرتا تھا[1]،

---

[1] یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت سے ابتدائی تعلق کے زمانہ میں جبکہ ابھی ٹوٹی پھوٹی اتباعِ سنّت کا کوئی اہتمام بھی نہ تھا ایک بزرگ کی مزار پر تخلیہ میں آنکھیں بند کئے قرأتِ فاتحہ کر رہا تھا جب "اہدنا الصراط المستقیم" پر پہنچا تو مزار سے آواز کے ساتھ دُعائیہ کلمات کان میں پڑے، چونکہ بات نئی تھی، گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو مکرر وہی کلمات مزار کے ٹھیک سرہانے کی طرف سے نکلتے ہوئے سُنائی دیئے۔ میں جیسے تیسے سورۂ فاتحہ پڑھ گھبرا کر وہاں سے نکل آیا چند ہی روز بعد بھوپال حاضری ہوئی تو حضرت سیّدیؒ سے یہ واقعہ بالمشافہ عرض کیا، مُسکراتے ہوئے فرمانے لگے کہ "اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی" ناقص العقیدہ لوگ انہی واقعات سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ سلامتی کی راہ بس یہی ہے کہ نگاہ قرآن و سنّت کی رہبری سے ہٹنے نہ پائے!

لیکن اب یہ بات جاتی رہی اور تکلف سے بھی لگاؤ محسوس نہیں ہوتا، اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید قلب کی حالت اب اور تاریک ہوگئی ہے، حالانکہ بزرگانِ سلف سے حسن عقیدت میں کوئی فرق نہیں ہے، معلوم نہیں میرا گمان درست بھی ہے یا اس کی وجہ کچھ اور ہے!

س۔ بھوپال

صدیق صمیم زادکم اللہ تعالیٰ حباً، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے،

قبور و مزاراتِ صالحین سے استفادۂ فیض گو ممنوع نہیں لیکن ماثور و مسنون بھی نہیں، تاہم یہ استفادہ و استفاضہ بھی مفید و مستفید کی مناسبت پر موقوف ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بحمد اللہ تعالیٰ آپ سُنّت سے اب قریب ہوگئے ہیں، یہ خوشی کا مقام ہے نہ کہ رنج کا۔

غ۔ احقر بار بار اس قسم کے خواب دیکھتا ہے کہ کبھی موچھیں اور کبھی سر کے بال موافقِ شرع کٹوا رہا ہے، تعبیر سمجھ میں نہیں آتی،

س۔ تعبیر سُنّت کی موافقت کی طرف ترغیب و بشارت ہے، یہ اصلاح کی تمثیل ہے،

غ۔ احقر پاکستان کی تیاری میں ہے، حضرت والا دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ خیر فرمائے!

س۔ دعا تو بے شبہ ہے مگر لگی ہوئی روزی سے اعراض کے خیال سے ڈر لگتا ہے اللہ تعالےٰ وہی کریں جس میں آپ کے لئے خیر ہو،

غ۔ بعض دفعہ جائز امور میں بھی جب نفس کو زیادہ لذت ملتی ہے تو مواخذہ کا ڈر ہوتا ہے یہ وسوسہ ہے یا حقیقت؟

س۔ مباحات میں غلو سے بھی فیوض کم ہو جاتے ہیں!

غ۔ احقر کو جب کسی وقت دنیا میں زیادہ انہماک محسوس ہوتا ہے تو مراقبۂ موت و بعد الموت کے ذریعہ اصلاح کر لیتا ہے، اس سے خشیت اور دنیا سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے — کیا یہ طریقہ احقر کے مناسب حال اور درست ہے؟ فقط

خادم غلام محمد

س۔ ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی چاہیئے،

بندہ ہیچمداں سُلیمان

مکتوب (۸۰)

غ۔ حیدرآباد دکن

۱۳ر مئی ۱۹۴۹ء

حضرت سیّدی و مرشدی و مولائی دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ مزاجِ اقدس!

گزشتہ دنوں ترکِ وطن کی مصروفیات کے باعث کوئی عریضہ نہ گذران سکا، ۲۲ر مئی کو روانگی کا قصد ہے، حضرتِ والا سے درخواست ہے اس آشفتہ حال کیلئے دعا فرمائیں!

س۔ دیسنہ ضلع پٹنہ

عزیزی وحبیبی حقق اللہ آمالکم واصلح اعمالکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ الحمدللہ خیریت ہے،

ایک ماہ ۱۸ یوم کی رخصت پر وطن آیا ہوں، آپ اس اثنا میں پاکستان کو روانہ ہورہے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے!

غ۔ وہاں پہنچ کر ذریعہ معاش کیا ہوگا اس کا قطعی تصفیہ یہاں نہیں کرسکتا، خیال یہ ہے کہ جب وطن چھوٹ ہی رہا ہے تو جہاں بھی معاشی فراخی اور صحبت صالح میسّر آئے وہیں قیام کیا جائے، حضرت والا سے رہبری کا طالب ہوں،

س۔ مجھے بھی آپ کے ترکِ وطن بلا اسباب سے تردد ہے، میری مخلصانہ دُعا آپ کی رفیق ہے وہاں پہنچ کر حقیقت حال کا انکشاف ہوگا، بے کانٹے کا پھول کہاں ملے گا، بُرائیاں ہر جگہ ہیں، اچھی صحبت ہر جگہ عنقا ہے،

غ۔ بھوپال کے بدلے ہوئے حالات (یعنی انضمامِ ریاست) کے تحت حضرت والارح کا وہاں قیام کب تک رہے گا۔

س۔ ابھی تک فیصلہ نہیں،

غ۔ احقر کی دنیوی و دینی صلاح و ترقی کے لئے حضرتِ والارح دُعا فرمائیں، والسّلام

خادم غلام محمدؐ

س۔ دل وجان سے دُعا کرتا ہوں،

خدا جانے آپ کو یہ خط کیوں کر ملے گا، والسّلام

سیّد سلیمان، ۲۲ مئی ۱۹۴۹ء

(یہ والانامہ حیدر آباد ہو کر کراچی پہنچا)

مکتوب (۸۱)

(جون ۱۹۴۹ء کو راقم تنہا کراچی پہنچ گیا، دوسرے ہی دن خیریت کا ایک خط اپنے گھر اور ایک حضرت اقدس رح کی خدمت میں لکھ دیا تھا، پھر اس کے چند روز بعد ذیل کا احوال نامہ ارسال کیا گیا تھا)

غ۔ کراچی

۳ر رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ

میرے مرشد و رہبر و آقا ادام اللہ برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ مزاجِ اقدس!

کراچی آکر ایک کارڈ خدمت والارح میں گذرانا تھا، جواب سے محرومی ہے، نہ معلوم حضرت بھوپال میں تشریف فرما ہیں یا کہیں اور؟

س۔ بھوپال، ۴ر جولائی ۱۹۴۹ء

۶ر رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ

محب مخلص وعزیز صمیم رزقکم اللہ تعالیٰ السعادۃ فی الدنیا والآخرہ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

کراچی کا کارڈ ملا، وطن میں ایک ماہ قیام کے بعد بھوپال واپس آیا، شوال کے آخر میں پھر حج کا قصد کر رہا ہوں، اللہ تعالےٰ انجام فرمائیں۔

غ۔ معمولات پر بحمد اللہ پابندی ہے، عبادات میں زیادہ کیف وسرور محسوس ہو رہا ہے، اکثر رجوع کی کیفیت رہتی ہے، غالباً تنہائی کی وجہ سے، واللہ اعلم،

س۔ مبارک کہ معمولات پر پابندی سفر میں نصیب ہو رہی ہے، سبب کچھ ہو، نتیجہ اچھا ہے!

غ۔ اب تک بعض مرتبہ تذبذب رہتا ہے کہ ترکِ وطن بہتر ہوا یا قیام بہتر تھا، مگر جب بھی قیامِ وطن کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے خلاف عالم رویا میں اشارات پاتا ہوں مثلاً ایک مرتبہ دیکھا کہ کافر احقر کے والد ماجد مدظلہٗ کو بُت کے سامنے ناریل پھوڑنے پر مجبور کر رہے ہیں اور احقر بھی باوجود اندرونی کراہیت کے دست بستہ کھڑا ہے یا مثلاً ایک بار دیکھا کہ کافر میرے گھر میں گھس آئے اور درپئے عصمت ہیں، اس طرح کا تین چار بار معاملہ ہوا،

س۔ اب تذبذب سے کوئی فائدہ نہیں اذا عزمت فتوکل علی اللہ' رویا ہر قسم کے ہوتے ہیں بہرحال آپ جو کچھ فیصلہ کر چکے اوس پر جمے رہیئے اور تذبذب کو دل سے نکال دیجئے۔

غ۔ احقر کے غیاب میں حضرت اقدس کا کرم نامہ حیدرآباد پہنچا اور وہاں سے یہاں بھجوایا گیا، یہاں کے حالات سے متعلق حضرت والا کے ارشادات حرفاً حرفاً درست ہیں، بے پردگی اور اس سے متعلقہ خرابیاں عام ہیں، یہ چیز باعثِ اذیت ہے!

س۔ سوا دعا کے اور کیا کیا جائے ــــــ اگر ایک جگہ ہندویت کا غلبہ ہے تو دوسری جگہ افرنجیت کا، خالص اسلام کہاں ہے؟ بہرحال اپنے اور اپنے اہل وعیال کی حد تک کوشش اصلاح کی جائے، جماعت کی اصلاح اختیار سے باہر ہے مگر اپنی اصلاح پر

تو اختیار ہے !

غ۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب و مولانا حاجی محمد عثمان خاں صاحب مدظلہم سے نیاز حاصل رہتا ہے، موخر الذکر بزرگ کے پاس دل زیادہ لگتا ہے ــــــــ لیکن بہرصورت حضرت اقدس سے دُوری کا خیال تڑپا دیتا ہے اور دل یہی کہتا ہے کہ

ع بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری !

س۔ بزرگوں کی صحبت موجب برکت ہے، ع تمتع زہر گوشۂ یافتم

غ۔ حضرت والا احقر کے لئے بطورِ خاص دعا فرمائیں تو انشاء اللہ فلاحِ دارین حاصل رہے گی !

س۔ آپ کے لئے دل سے دُعا کرتا ہوں،

غ۔ گھر سے ہندوستانی ٹکٹ منگوالئے تھے، اس لئے جوابی لفافہ رکھ دیا ہے، انشاء اللہ آئندہ بھی یہی صورت رہے گی، دُعا خواہ

احقر غلام محمدؐ

س۔ اس کی فکر نہ کریں، سیّد سُلیمان

مکتوب (۸۲)

غ۔ کراچی

۱۸ رمضان المبارک ۶۸ ۱۳ھ

سیّدی و مرشدی و مولائی ادام اللہ فیوضکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ مزاجِ اقدس !

گرامی نامہ باعثِ تشفی کامل ہوا، اللہ تعالیٰ ہم گم کردہ راہوں کی ہدایت کے لئے حضرت والا کو تادیر بہ ازدیاد فیوض وبرکات سلامت رکھے،

س۔ بھوپال، ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ

عزیز مخلص سیّر اللہ تعالیٰ عُسرکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ الحمدللہ خیریت ہے ،

الحمدللہ کہ عاجز قاصر کے مشورے آپ کے لئے مفید ہوئے ،

غ۔ ملازمت کے اسلسلہ میں ایک رہبری یہ مطلوب ہے کہ کراچی کے قیام کو ضروری تصوّر کیا جائے یا جہاں کہیں بھی جانا پڑے گوارا کرلیا جائے ؟

س۔ کراچی کے قیام پر اصرار غیر ضروری ہے ، کیا عجب کہ آپ کے ذریعہ سے دوسرے مقامات تک ہدایت خیر پہنچے اور اس کا نفع بھی کچھ کم نہیں ، (اللہ تعالیٰ احقر کو حضرت اقدس رح کے اس حُسنِ ظن کا اہل بنائے !)

غ۔ احقر کو کشادگی رزق یا دفع بلا وغیرہ کے اوراد و وظائف سے کچھ بھی لگاؤ نہیں ، البتہ دُعا میں کم و بیش دل لگ جاتا ہے ، یہ حالت خدانخواستہ محرومی کی تو نہیں ہے ؟

س۔ ان امور کے لئے عمل یعنی اوراد و وظائف سے دلچسپی نہ ہونا دل کی سلامتی اور فہم کی استقامت کی دلیل ہے ، مگر دراصل ان کو عمل سمجھ کر کرنے سے یہ کیفیت ہوتی ہے اگر ان کو بھی دعا ہی سمجھا جائے تو یہ کیفیت جاتی رہے گی مثلاً کوئی کشائش رزق کے لئے یہ بتائے کہ یَارَزَّاقُ ، یَا وَهَّابُ ، یَا بَاسِطُ ، پڑھا کرو تو یہ تینوں اللہ تعالیٰ کے نام ہیں ، ان ناموں کو نسبت رزق اور وسعت و کشائش سے ہے تو گویا یہ اپنے رزق کی وسعت کی دُعا ہے اللہ تعالیٰ کو اوس نام سے پکار کر جس نام کو ہماری دُعا سے مناسبت ہے ! جیسے کوئی فقیر کسی دروازہ پر کھڑا ہو کر یہ کہے ، اے سخی داتا ، اے سخی داتا تو یہ بھی ایک درخواست ہے اور اس خاص نام سے پکارنا اس لئے ہے کہ اس نام کے آثار کا اوس کے فعل سے ظہور ہو ،

(سبحان اللہ کیا حق تحقیق ادا فرمایا ہے اور کیسی عقدہ کشائی فرمائی ہے !)

غ۔ مسئلہ کشمیر کے خطرات کی وجہ سے جی یہ چاہتا ہے کہ والدین اور اہلیہ کو جلد یہاں بلوالوں

حضرت کی کیا رائے ہے؟

س۔ جو پنشن آپ کے والد کو مل رہی ہے وہ تو بند نہ ہوگی؟ تو بلوا لینا طمانیت قلب کے لئے شاید مفید ہو،

غ۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا رح کے عزم حج کو پورا فرمائے، کیا حضرت والا رح کراچی ہو کر تشریف لے جائیں گے؟

حضرت پیرانی صاحبہ کی خدمت میں مؤدبانہ سلام عرض ہے اور دُعا کی درخواست ہے

محترمی سلمان میاں سلمہٗ اللہ کی خدمت میں بھی سلام عرض ہے، فقط

خادم حقیر غلام محمدؐ

س۔ راستہ کی تعیین تو ہمارے ہاتھ میں نہیں، جہاز کا جو راستہ ہو، وسطِ شوال تک قصد ہے سب کی طرف سے سلام قبول کیجئے، والدہ سلمان آپ کو خاص طور سے مدح کے ساتھ یاد کرتی ہیں، بندۂ بیچداں سُلیمان

(حضرت پیرانی صاحبہ کے یہ الطاف اب تک اس خادم کے شاملِ حال ہیں، والحمد للہ علےٰ ذلک)

مکتوب (۸۳)

غ۔ کراچی

۲؍شوال ۱۳۶۸ھ

ذو المجد والکرم حضرت مرشدنا و مولانا مدظلکم العالی

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' مزاجِ اقدس!

اب طبیعت کا میلان ذکر نفی اثبات کی طرف ہے، اس سلسلہ میں حکم درکار ہے،

س۔ بھوپال

حبیبِ صادق وفقکم اللہ تعالیٰ لما یحب ویرضیٰ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، الحمدللہ تعالیٰ خیریت ہے،

ذکر نفی و اثبات کی اجازت میں کوئی حرج نہیں مگر جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ ذکر مفرد کس حد تک موثر ہوا، ایسا نہ ہو کہ ایک سبق چھوڑ کر دوسرا سبق پڑھنے میں پہلا بھول جائیں، اکثر ایسا ہوتا ہے اس لئے متنبہ کرنا ضروری تھا،

(ہر سالک طریق اس انتباہ کو سُن رکھے!)

غ۔ احقر کی اہلیہ بحمداللہ پنجوقتہ نماز و تلاوت قرآنِ پاک کے علاوہ تہجد کی بھی پابند ہیں، اور مُناجات مقبول کی ایک منزل بھی روزانہ پڑھ لیتی ہیں، ان کی بڑی تمنّا ہے کہ حضرتِ اقدس داخل ارادت فرمالیں، انھوں نے حضرتِ والاؒ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کرکے احقر سے بھی خواہش کی ہے کہ ان کی اس آرزو کو خدمت گرامی میں پیش کر دے، چنانچہ عرض کردیا، آگے حضرت کی جو مرضی ہو،

ع رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

س۔ آپ کی اہلیہ کا خط اس مطلب کا آیا تھا، میں نے اونھیں لکھا تھا کہ پہلے آپ شیخؒ کے احکام کے مطابق شرع کی پابندی کا وعدہ کریں، چنانچہ اون کا وعدہ آگیا ہے، اب بیعت کے بعض شرائط سے اون کو مطلع کرتا ہوں۔

غ۔ حضرتِ والاؒ کی توجہ شامل حال رہی تو وہ احقر کے لئے دینی لحاظ سے ایک بہتر رفیقِ حیات ثابت ہوسکیں گی،

س۔ انشاءاللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا،

غ۔ مولانا احتشام الحق صاحب سے پتہ چلا کہ حضرت والاؒ مدظلہٗ کی خدمت میں ہماری حکومت کی طرف سے مراسلہ بھیجا جاچکا ہے۔ (بورڈ تعلیمات اسلامی کی صدارت کے لئے) احقر کے گمان میں بعد فراغ حج ہی حضرت والاؒ یہاں تشریف لاسکیں گے۔

اے خوشا وقت کہ آئی و بصد ناز آئی

س۔ آنا تو مشکل نہیں، نباہنا مشکل ہے۔ (فراست سُلیمانی نے جن مشکلات کا اندازہ لگا لیا تھا وہ سب تجربہ میں من وعن صحیح نکلیں)

غ۔ (۱) یہ بندۂ محبّت ہر چند عمل سے عاری ہے لیکن اُس والہانہ تعلق کی بناء پر جو اس کو حضرتِ اقدس سے حاصل ہے، ملتجی ہے کہ جب حضرت والا؂ یہاں تشریف لائیں تو اس ناکارہ کو خادم خاص بنائے رکھیں اور دینی و دنیوی ہر قسم کی خدمت کا موقع عطا فرمائیں،

(۲) کیا عرض کروں، کبھی تو جی یہ چاہتا ہے کہ احقر ہو اور حضرتِ والا؂ ہوں، خادم بھی ایک اور مخدوم بھی ایک!!

س۔ (۱) آپ کی یہ خواہش آپ کی سچّی محبّت کا نتیجہ ہے،

(۲) جی ہاں یہ بھی محبّت کا ایک اقتضا ہے، خدا کرے اس محبّت سے اوس کے معائب جیسے حسد و رشک و بدگمانی سے دُوری رہے،

؏ عشق است و ہزار بدگمانی

غ۔ غالباً حضرت والا؂ کے دورانِ سفر حج احقر کو عرض معروض کا موقع نہ مل سکے اس لئے استدعا ہے کہ اُس سرزمینِ پاک پر اس بندۂ ناپاک کے لئے بطورِ خاص دُعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ "مرتبۂ احسان" سے سرفراز فرمائیں!

س۔ سفرِ حج میں حجاز کا پتہ یہ ہوگا، مکۂ معظمہ، محلۂ شامیہ، بذریعہ مہتمم صاحب، رباط بھوپال، انشاءاللہ تعالیٰ اپنے سارے محبّین کے لئے دُعا کروں گا۔

غ۔ حضرت والا؂ کے ارشاد کی بناء پر ایک ہنگامی ملازمت قبول کرلی ہے، شاید اس دوران میں کوئی مستقل صورت بھی نکل آئے، دعا کا طالب ہوں۔

ننگِ بارگاہ احقر غلام محمّد

س۔ اچھّا کیا بے کاری سے بیگاری بھلی،

اللہ تعالیٰ آپ کے لئے مستقل روزگار جلد پیدا کرے، والسّلام

بندۂ ہیچمداں سُلیمان

۱۱رشوال ۱۳۶۸ھ

مکتوب (۸۴)

(ذیل کا مکتوب حضرت والارح کی زیارتِ حرمین سے واپسی کے بعد کا ہے)

غ۔ کراچی

۳۱ر دسمبر ۴۹ء

سیّدی و مرشدی و مولائی دامت فیوضہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ مزاجِ اقدس!

س۔ بھُوپال

عزیز قلبی ادام اللہ سعدکم، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمدللہ خیریت ہے،

میں جہاز پر واپسی میں علیل ہوگیا، اسی حالت میں بمبئی پہنچا، احباب نے بغرض علاج و استراحت بمبئی میں روک لیا، جہاز ۲۸ر دسمبر کو بمبئی پہنچا تھا، میں بخار اُترنے پر ۸ر جنوری کو یہاں پہنچا، بخار نہیں ہے، کھانسی ہے، اور ضعف و نقاہت بہت ہے مگر آہستہ آہستہ قوّت عود کر رہی ہے، بحمداللہ تعالیٰ۔

غ۔ دو عریضے مکہ معظمہ و مدینۂ منورہ کے پتہ پر گذرانے تھے اور اُن سے مقصود محض حصول دُعا تھا، اُمید کہ ضرور اس سے سرفرازی رہی ہوگی۔

س۔ آپ کے دونوں خط عرب میں ملے، مگر وہاں کچھ ایسی حالت رہی کہ قلم پکڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا، اس لئے جواب نہ دے سکا، مگر بحمداللہ آپ کے لئے خصوصاً اور جُملہ احباب

و محبین کے لئے عموماً دعائیں کیں، اللہ تعالےٰ قبول فرمائیں،

غ۔ یہاں کی کَل تو پہلے ہی سے بگڑی ہوئی تھی، مولانا عثمانی رح کی رحلت سے حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہوگئی ہے، اور تو اور خود اپنے اکابر (مراد منتسبین حضرت حکیم الامتؒ) میں عدم اتحاد اور اس کے نتائج کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور رنج بھی، سب کا یہی خیال ہے کہ یہ خلفشار اگر مٹ سکتا ہے تو حضرت اقدس ہی کی موجودگی سے ورنہ صورت حال نہ جانے کس نوبت تک پہنچ جائے ـــــــــ نہ معلوم حضرت والا رح کی مصلحت کس پہلو میں ہے اس خادم اور دیگر عقیدت کیشوں کے دلی جذبات تو یہی ہیں کہ جس قدر جلد تشریف آوری ہو مناسب ہے ـــــــــ البتہ بعض مرتبہ احقر کو یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ کہیں ہماری دعوت حضرت والا کیلئے زحمت نہ بن جائے، (چنانچہ یہی ہوا، کتنی عقیدتوں کی بنیاد محض ذاتی مفادات پر نکلی اور جب وہ پورے نہ ہوسکے تو وہی عقیدتیں مخالفتوں میں بدل گئیں، کچھ کھلی کچھ خفیہ، اناللہ)

س۔ حالت یہ ہے کہ ہر دو جگہ میرے وجود کے لئے احباب مُصر ہیں اپنی حالت یہ ہے کہ عدم صحت اور ضعفِ قویٰ سے بھی اور طبیعت کے اقتضاء سے بھی اختلاف و منازعت سے دل گھبراتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ آئندہ کیا ہوگا، سُنا ہوگا کہ میرے گاؤں میں ۲ا مکانات کی ضبطی کے احکام آئے ہیں جن میں ایک عاصم میاں بھی ہیں، خدا جانتا ہے کہ آگے کیا صورت حال ہو۔

غ۔ حضرت کیا عرض کروں حق تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کرنا محال ہے کہ اوّل تو اُس نے سلسلۂ اشرفیہ میں منسلک فرمایا اور پھر حضرت والا رح جیسی ہستی کی غلامی سے سرفراز کیا، جتنی جتنی آنکھیں کھُلتی جاتی ہیں، یہی یقین بڑھتا جاتا ہے کہ

ع خوبی کہ تو داری صنما در دگرے نیست

س۔ میری نسبت جس حُسنِ ظن کا آپ نے اظہار کیا ہے خدا کرے کہ وہ آپ کی کامیابی اور

ترقی کا ذریعہ ہو، (کیا عارفانہ بات فرمادی ہے)

غ۔ احقر کی اہلیہ یہاں آچکیں، سلام عرض کرتی ہیں اور دعائے خیر کی طالب ہیں والدین ابھی وہیں ہیں اور آنے کی فکر میں ہیں، حضرتِ والا دُعا فرمائیں کہ ان کی راہ کی رکاوٹیں جلد ہٹ جائیں،

س۔ اپنی اہلیہ کو سلام کہیئے، اون کی صحت و ترقی کے لئے دُعا کی گئی، آپ کے والدین کے لئے دُعا کی جاتی ہے، رب العزّت قبول فرمائیں،

غ۔ محترمی جناب ابوعاصم صاحب کے گھر ہر طرح خیریت ہے،
احقر اور اوس کی اہلیہ کی جانب سے مخدومہ و مکرمہ پیرانی صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض ہے اور دُعا کی درخواست پیش ہے، مخدومی مولوی سلمان میاں سلمہٗ کی خدمت میں بھی سلام عرض ہے، والسّلام ننگِ خدام

احقر غلام محمّد

س۔ سُنا ہے کہ اہلیۂ ابوعاصم کا علاج آپ نے بھی کیا،
والدۂ سلمان کی طرف سے دونوں صاحب سلام قبول کریں، والسّلام
سیّد سُلیمان ۱۸ر جنوری ۱۹۵۰ء

مکتوب (۸۵)

غ۔ کراچی

۱۱ر فروری ۱۹۵۰ء

بگرامی خدمت سیّدی و مرشدی دامت فیوضکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آجکل معمولات یہ ہیں: ذکر بارہ تسبیح، ذکر مفرد سرّی، تہجّد، اشراق، اوابین، تلاوت قرآن

پاک اور مناجاتِ مقبول،

س۔ عزیزی وحبیبی ومخلصی یسراللہ لکم العسر، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ
یہ معمولات کافی ہیں، کسی معمول کو نہ کرنا یعنی اپنے معمول میں داخل نہ کرنا اتنا بڑا نہیں ہر جتنا اوس کو اپنا معمول مان کر اوس سے غفلت کرنا،

غ۔ کبھی کبھی طبیعت گھبراجاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ کوئی ایک نگاہِ پُرفسوں، ڈال کر رجوع الی اللہ کی کیفیت کو دائم کردے اور علائقِ نفس سے نجات ہوجائے،

س۔ آپ نے تو وہی بات کہہ دی ؎

صنمارہِ قلندر رہنما تو ارنمائی
کہ درازو دو رہینم رہ ورسم پارسائی

یہ تو اللہ تعالیٰ کے جذب وفضل پر موقوف ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جب دنیا کے سارے کام آپ اسباب وعلل کے تحت میں کرتے ہیں تو غریب دین ہی کو اون سے خارج کیوں کیجئے، (کیسی حکیمانہ بات ہے اور نفس کا چور کس طرح پکڑ لیا ہے!)

غ۔ حضوریٔ قلب سے اب تک محرومی ہے؟

س۔ حضوریٔ قلب کی حقیقت آپ کیا سمجھتے ہیں؟

غ۔ آج کل احقر اپنی بساط سے زائد ایک کام کر رہا ہے یعنی "اشرف السوانح" کی تلخیص ہو رہی ہر اور جناب مفتی محمد شفیع صاحب قبلہ نے احقر کے خاکہ اور طرز کو پسند فرمالیا ہے اور تکمیل پر بھی نظر فرمائیں گے، حضرت اقدس کی رائے اور حکم احقر کے لئے موجب طمانیت ہوگا، ارشاد عالی ہو تو یہ کام جاری رکھوں ورنہ بند کردوں۔

س۔ کام اچھا ہے، حضرت مفتی صاحب کے زیر ہدایت انجام دیجئے!

غ۔ بعض مرتبہ عجیب حال رہتا ہے کہ نماز میں تو وہ یکسوئی ورجوع کی کیفیت نہیں رہتی لیکن اس کے بعد ذہن وقلب تمام تر متوجہ بحق محسوس ہوتا ہے، شاید یہ ایک دھوکا ہے کیونکہ اگر

یہ کیفیت واقعتاً رجوع کی ہے تو نماز میں کیوں نہیں رہتی حالانکہ نماز میں تو زیادہ قرب حاصل رہتا ہے،

س۔ نماز میں اعمال مختلف ہوتے ہیں جس سے وہ یکسوئی جس کو آپ یکسوئی سمجھتے ہیں نہیں ہوتی کیا خدمت گار خدمات کے انجام دینے میں مالک کی محبت کی یکسوئی کا تصوّر کرتا ہے ؟ مگر یہ خدمت خود ہی محبت کی دلیل ہے اور اطاعت کی فافہم ——— نماز سے فراغت کی حالت میں یکسوئی مستمر ہو کر محسوس ہوتی ہے، مگر یہ کوئی چیز نہیں،

(کیا شانِ تحقیق ہے، شیخ محقق اس کو کہتے ہیں، ع نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند!)

غ۔ مولوی احتشام الحق صاحب غالباً دوشنبہ تک عازم مشرقی پاکستان ہیں اور جاتے ہوئے یا واپسی میں حضرت والا سے نیاز حاصل کریں گے،

س۔ خدا کرے اون سے ملاقات ہو سکے،

غ۔ حضرت والا کی طرف سے افاضہ میں کوئی کمی نہیں مگر احقر میں قوتِ استفاضہ بھی تو ہو بس حضرت والا ہی سے درخواست ہے کہ یہ دُعا فرمائیں کہ صلاحیت استفاضہ بڑھے اور حضرتِ والا کا رنگ پیدا ہو جائے،

س۔ آپ کے لئے ہر وقت دُعا ہے،

خود بچّہ کو یہ نظر نہیں آتا کہ وہ ہر روز کتنا بڑھا، تاہم یہ شوقِ ترقی مبارک ہو،

غ۔ محترم عاصم صاحب کے گھر خیریت ہے، مخدومہ و محترمہ پیرانی صاحبہ کی خدمت میں سلام و درخواست دُعا پیش ہے، فقط ننگ خدام

احقر غلام محمّد

س۔ اون کے لئے دل بے چین رہتا ہے کیوں کر اون کے پاس پہنچوں، والدہ سلمان کی طرف سے سلام و دعا قبول کیجئے، والسّلام

ہیچمداں سُلیمان
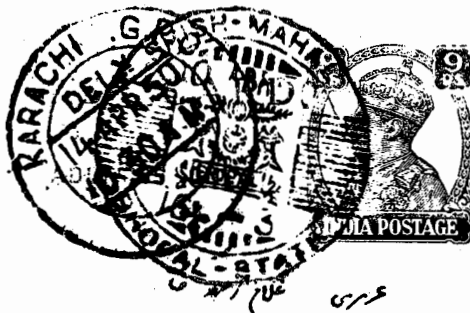
مکتوب (۸۷)

(جون ۱۹۵۰ء کو حضرت والاؒ کراچی تشریف لائے اور جس حیثیت سے تشریف لائے اس کا ذکر اس کتاب کے پہلے حصہ میں آچکا، غرض اب جتنے بھی مکتوبات آئیں گے وہ بالمشافہ پیش کردہ ہیں، کیونکہ احوال بہ طور تحریراً ہی پیش کئے جاتے رہے!)

غ۔ کراچی

۱۵ جون ۱۹۵۰ء

بخدمت فیضدرجت حضرت سیّدی و مولائی دامت برکاتہم

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی زیارت کی تمنا ایک عرصہ سے تھی، اشرف السوانح کی تلخیص کے دوران میں یہ تمنا برآئی اور دوبار حضرت کی زیارت کا شرف ملا، تفصیل درج ذیل ہے:۔

پہلا خواب:

کھانے کی دعوت ہے حضرت تھانویؒ تشریف لانے والے ہیں، دستر خوان چُنا ہوا ہے، پندرہ بیس مریدین و معتقدین حلقہ بیضوی میں بیٹھے ہوئے ہیں، درمیان میں ایک بڑی کرسی حکیم الامتؒ کے لئے ہے اور اسی سے متصل احقر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اس کی تلخیص کردہ سوانح ہے جو ابھی ناتمام ہے، خیال یہ ہے کہ خود صاحب سوانحؒ کو دکھادوں گا حضرت ابھی تشریف نہیں لائے تھے کہ لوگ کھانے لگ گئے احقر نے بھی دو تین نوالے لئے پھر رفع حاجت کے لئے اٹھ گیا، اس میں دیر ہوگئی خیال آیا کہ نماز میں تاخیر ہو رہی ہے، تیز تیز مسجد آیا لیکن جماعت ہو چکی تھی، حکیم الامت سنتیں پڑھ رہے تھے، کچھ فاصلہ پر بائیں جانب..... صاحب (خلیفہؒ مولانا تھانویؒ) بھی

سُنتیں پڑھ رہے تھے ۔ احقر چونکہ سامنے سے آ رہا تھا اس لئے دونوں کے درمیان سے گذر کر مولانا تھانوی کے سیدھے ہاتھ کی طرف نماز میں مشغول ہو گیا .... صاحب نے نماز ختم کر کے زور زور سے گفتگو شروع کی اور بار بار کہتے جاتے تھے "میں نے کہا" ـــــــ حکیم الامّت نے سلام پھیر کر فرمایا " یہ تو خلافِ تحقیق ہے ، سید صاحب نے اس کے (ایک عربی لفظ جس کے معنی زیر و زبر کے فرق سے بدل جاتے ہیں) معنی یہ بتائے ہیں" ـــــــ یہ فرما کر حکیم الامّت تشریف لے گئے ، احقر کی نماز ابھی ختم نہ ہوئی تھی ، ذہنی کشمکش شروع ہوئی کہ نماز پوری کروں یا حضرت سے جا ملوں اور یہ شعر ذہن میں آ رہا تھا

اے قوم بہ حج رفتہ کجا یئد کجا یئد   معشوق من اینجاست بیائید بیائید

غرض نماز جلدی سے ختم کر کے لپکا مگر حضرت کو پا نہ سکا اور آنکھ کھل گئی۔

س۔ کراچی

یکم رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ

عزیزی و حبیبی زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

یہ دونوں خواب مبارک ہیں ، (دوسرا خواب ابھی نقل ہوگا)

کھانا خوانِ ہدایت ہے جس سے آپ بھی زلہ ربا ہوئے ـــــــ پاخانہ دنیاوی کاروبار ہیں ، اَنا ، کی تکرار سے کبر کا شائبہ ظاہر ہوتا ہے ، اس کی طرف ایما ہوا

ع۔ خواب (۲)

یکم مئی ۵۰ء کی شب کو دوبارہ خواب دیکھا کہ میرے استاذ مولانا محمد صابر صاحب میرے گھر پر تشریف لائے اور اطلاع دی کہ " حضرت (مولانا تھانوی) تم کو یاد فرما رہے ہیں ۔" میں نے خوش خوش لباس بدل کر سفید کرتا و پاجامہ پہن لیا اور قریب ہی کوٹھے پر جہاں حضرت قیام فرما تھے جا پہنچا ، حضرت کو دیکھا کہ سفید کرتے اور پاجامے اور پنج گوشہ

ٹوپی میں ملبوس ہیں، ضعیف العمر لیکن توانا و تندرست، طویل قامت اور مائل بہ فربہی سُرخ وسفید، ریش مبارک سفید، آنکھیں نشیلی بارعب مگر جاذبِ قلب اور آنکھوں میں سُرخ ڈورے پڑے ہوئے ——— احقر کو دیکھ کر متبسم ہوئے اور اندر آنے کا اذن فرمایا، احقر جاکر پاس ہی بیٹھ گیا، حضرت بہت بشاش تھے، مُسکرائے چلے جاتے تھے اور جب احقر کو مخاطب فرماتے تو "بیٹا" کہہ کر مخاطب فرماتے تھے سارے ارشادات میں صرف اتنا یاد ہے کہ فرمایا "بیٹا! میں تمہیں ایسے ایسے کُشتے بناؤں گا" ——— احقر کے دل میں خیال آرہا ہے کہ لوگوں نے خواہ مخواہ حضرت کو سخت مشہور کر رکھا ہے حالانکہ اس قدر شفیق ہیں۔ جب آنکھ کھُلی تو "کُشتہ" کے لفظ پر حکیم الامّت کا وہ ملفوظ یاد آیا کہ "لوگ تو تنور کے پاس بٹھاتے ہیں اور میں تو کُشتہ کھِلاتا ہوں کہ کشمیر کی سردی بھی کچھ اثر نہ کرسکے"۔ واللہ اعلم،

احقر غلام محمّد

س۔ حضرت والا رح کا یہی نقشہ تھا، مُسکرانا اور یہ طرزِ خطاب محبّت کی علامت ہے اور رضا کی۔

یہ تاویل (کُشتہ سے متعلق) صحیح ہے۔ والسّلام ، ہیچمدان سُلیمان

مکتوب (۸۸)

"کُحلُ الابصار"

(یہ مکتوب انشاء اللہ اہلِ نفسیات اور سالکینِ طریق دونوں ہی کیلئے بصیرت افروز اور یقین پرور ثابت ہوگا)

ع۔ کراچی

۲۴ر جون ۱۹۵۰ء

سیّدی و مرشدی و مولائیٰ دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

احقر کا عجیب حال ہے، جہاں تک ذکر وفکر یا حق تعالیٰ کی تجلیات کو محسوس کرنے کا تعلق ہے، یہ سب باتیں اور وارد شدہ کیفیات سب "تصوّری" و ذہنی معلوم ہوتی ہیں، جیسے کوئی اپنے آپ کو ہپنٹائز (Self - hepnotized) کرے تو جس نہج کا تصوّر باندھے گا، اسی قسم کی کیفیات وارد ہوں گی۔ گویا یہ معلوم ہو رہا ہے کہ انوار و تجلّیات الٰہی یا اس قسم کی اور باتیں محض اپنے تصوّر کی پیدا کردہ ہیں حقیقت میں ان کا وجود نہیں یا پھر جو موجود حقیقتیں ہیں ان کا دیدار نہیں ہوتا، ورنہ اگر یہ چیزیں حقیقی ہوتیں تو بلا تصوّر کے محض اوامر الٰہیہ کی پابندی اور نواہی سے اجتناب پر ان کے ظہور کا ادراک ہونا چاہیئے تھا اس کے لئے خاص طور پر تصوّر باندھنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوتی ہے؟ جب عرصہ تک ایک ہی تصوّر قائم رکھا جائے گا تو اس سے ایک احساس کا پیدا ہونا امر فطری ہے اور اس میں تمام تر انحصار تصوّر کی اچھائی یا بُرائی پر ہے، ایسی صورت میں شئے متصوّرہ کو اصل اور حقیقت کیسے کہا جائے؟

"نتواں نہفتن درد از طبیباں" کے اُصول پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ بالا خلجان پیش کرنے کی جسارت کی گئی ہے، حق تعالیٰ اس سراپا خطا کے لئے راہِ صواب کھول دے اور خیر مقدر فرمائے، والسّلام

ننگِ خدام   غلام محمدّ عفی عنہ'

س۔ کراچی

عزیزی وحبیبی رزقکم اللہ تعالیٰ علماً وعرفاناً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یہ شبہ بالکل صحیح ہے اسی لئے یہ انوار و تجلّیات جن کو عام طور پر انوار و تجلّیات کا نام دیا جاتا ہے وہ نفسانی افکار ہیں اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے اسی عمل نفسیاتی

کے ذریعہ بعض علمائے نفسیات بیماری کا ازالہ اور صحت کا حصول کرتے ہیں اور اسی نفسیاتی اُصول سے صوفیہ امراض باطنی کا علاج کرتے ہیں اور حق تعالیٰ سے رابطہ پیدا کرتے ہیں اب جس طرح پہلے یہ طے کیا جاچکا ہے کہ صحت اچھی چیز ہے اور بیماری بُری چیز ہے اور بیماری کو دُور اور صحت کا حصول اس تدبیر نفسیاتی سے کیا جاتا ہے اور اس میں کامیابی ہوتی ہے اسی طرح مشاہدہ واستحضارِ ربّانی کی کیفیت جس کے حصول کا مطلوب ہونا الگ دلیل سے ثابت ہے اوس کے حصول کیلئے یہ نفسیاتی طریق کار اختیار کیا جاتا ہے اور اس میں کامیابی ہوتی ہے ۔ اس طریق میں عموماً جو مشاہدات ہوتے ہیں وہ ذہنی ہی افکار ہوتے ہیں جیسا کہ امام نقشبند (خواجہ بہاؤ الدین نقشبند قدس سرہٗ) کا یہ فقرہ اس پر دلالت کرتا ہے "آنچہ دیدہ شود و دانستہ شود ہمہ غیر خدا است۔"

بحمد اللہ کہ یہ حقیقت آپ پر ظاہر ہو گئی، غرض اصلاً یہ مشاہدات و تصوّرات مطلوب نہیں یہ تو بطور تدبیر ہیں اصل اون کے نتائج ہیں یعنی صحت! والسّلام

ہیچمداں سُلیمان

(یہ جواب باصواب حضرت والا رح جیسی جامع حکمت و معرفت ہستی ہی کی زبان و قلم سے ادا ہو سکتا ہے، ہر کسی شیخِ طریقت سے یہ عقدہ کشائی ممکن نہیں،

ع کاینچناں علم از بیانے دیگر است)

مکتوب (۸۹)

(جولائی ۱۹۵۰ء میں راقم الحروف اپنے والدین کو لانے کے لئے حیدرآباد دکن گیا ہوا تھا، ذیل کا مکتوب اُسی سفر سے متعلق ہے)

غ۔ حیدرآباد

پیر۔ ۱۰ر جولائی ۵۰ء

بخدمت فیضدرجت حضرت سیدی و مولائی مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

(۱) بحمداللہ آج صبح ۹ بجے یہاں بخیر وعافیت پہنچا، اب تو یہ جگہ بالکل پرائی معلوم ہوتی ہے۔

(۲) حضرت اقدس کی خدمت میں حاضری بالعموم ۳ تا ۶ بجے شام رہتی تھی، ہفتہ کو جہاز پر ٹھیک تین بجے حضرت والا کی یاد آئی اور اس یاد کے ساتھ ہی حق تعالیٰ سے رجوع اور حضوریٔ قلب کی دولت ملی، کثرتِ استغفار ودرودِ شریف میں ایک حظ حاصل رہا، جب اس کیفیت میں کمی ہوئی تو پھر حضرتِ والا کا خیال آیا۔

(۳) اس حالت سے یہ بات مشاہد ہوئی کہ حُبِ شیخ حُبِ الٰہی کا ذریعہ ہے اور بذاتِ خود قائم رہنے والی چیز نہیں بلکہ یادِ الٰہی کی بہترین موصل ہے اور اسی حد میں مقصود ومطلوب بھی، واللہ تعالیٰ اعلم، حضرت والا رہبری فرمائیں،

س۔ عزیز مکرم زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۱) الحمد للہ تعالیٰ کہ آپ بخیریت پہنچ گئے،

(۲) یہ کیفیت مبارک ہے، اللہ تعالیٰ اس کو میرے اور آپ کے دونوں کے لئے وجہِ ازدیادِ برکات بنائے،

(۳) جی ہاں اسی طرح جس طرح کسی بڑے کام کی تکمیل میں معمولی سا آلہ بھی کام دے جاتا ہے۔

غ۔ پھر حضرت اقدسؒ کے لئے اپنی زبان گندہ اور دل شرمندہ سے بے حد دعائیں نکلیں جنکا حاصل یہ تھا کہ حق تعالیٰ حضرت والا کو قطب الاقطاب بنائے اور ہندوستان وپاکستان کے مسلمانوں کو خصوصاً بیش از بیش توفیق رجوع عطا فرمائے،

س۔ فقیر سب دوستوں کی دعا کا محتاج ہے، لیکن اس آپ کی دُعا سے زیادہ اس دُعا کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں اور مجھے اپنا بنائیں،

غ۔ اسی دن کی منفصلہ شب (یعنی شب یکشنبہ) کو احقر نے جہاز ہی پر ایک خواب دیکھا جس

میں گویا احقر کی تشفی فرمائی گئی کہ حضرت شیخ کا مقام ایسا ہی خاص ہے، ــــــــ
دیکھا کہ ایک مسجد میں بڑا اجتماع ہے اور وہاں شیخ الشیوخ حضرت مولانا تھانویؒ کی تقریر
ہے، حضرت مولانا رحمہ اللہ نے یہ آیت شریف تلاوت فرمائی وَمَا محمدٌ اِلَّا رسول الخ
اور پھر اس پر مختصر وعظ فرمایا، اس کے بعد جب مجمع جا چکا تو حضرت حکیم الامت کے بیشتر خلفاء
اور کچھ عوام حضرت کے گرد حلقہ کر کے بیٹھ گئے، حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ "اب تو
مضامین بھی مشکل ہی سے ذہن میں آتے ہیں" پھر متبسم ہو کر فرمانے لگے "ہم نے اتنا بانٹا
اتنا بانٹا اور لوگوں نے اتنا لیا کہ ہم خود خالی رہ گئے" ــــــــ پھر آں مخدوم مدظلہٗ
کی طرف رُخ کر کے فرمایا "آئیے حضرت سیّد صاحب آپ کی روحانیت سے کچھ مدد لوں"
خود دو زانو بیٹھ گئے اور آں محترم بھی تعمیل ارشاد میں قریب دو زانو اس طرح بیٹھ گئے کہ
دونوں بزرگوں کے گھٹنے باہم مس کر رہے تھے (حدیث جبرئیل والا سماں یاد آ گیا) ــــــــ
حضرت تھانویؒ مراقب ہوئے اور پھر فرمایا "ہاں جو مضمون آپ کے پاس ہے وہ بالکل
میرے مطابق ہے" (گو ظاہرہ کوئی گفتگو نہیں ہوئی) پھر ارشاد ہوا "یہ روحانیت ہے سیّد
صاحب کی بات ہی اور ہے"۔

اس کے بعد محفل برخاست ہونے لگی تو حضرت تھانویؒ اور سارے خلفاء کھڑے
ہو گئے، حضرت تھانوی رہ نے .. .. .. صاحب (ایک خلیفہ) کی طرف اشارہ کر کے فرمایا
کہ "علم انہوں نے سیکھا ہے، فتویٰ پوچھنا ہو تو ان سے پوچھو لیکن روحانیت اور چیز ہے
اس کے لئے حاجی محمد حسن صاحب (امرتسری ثم لاہوری مدظلہٗ)، حاجی حقداد خاں صاحب
(لکھنوی رحمہ اللہ) اور حاجی سید سلیمان صاحب (مُراد سیّدی رحمہ اللہ) سے پوچھو، دو
ایک اور نام بھی لئے جو یاد نہ رہے ــــــــ اس کے بعد حضرت حکیم الامّت نے سب
حضرات کو آں مخدوم سے مصافحہ کرنے کا اشارہ فرمایا اور سب نے مصافحہ کیا،

احقر نے بعد برخاست محفل فرطِ محبّت و شوق سے آں مخدوم کے دستِ مُبارک

کو خوب چوما اور محظوظ ہوا، اس رویا سے حسب ذیل امور صاف نظر آتے :۔

(i) حضرت والا مدظلہٗ کا اور خلفاء میں خصوصی مقام

(ii) حضرت والا رح کے علوم باطنی کا ٹھیک ٹھیک حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی آرزو کے مطابق ہونا،

(iii) حضرت والا رح کی طرف رجوعات کا زیادہ ہونا اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی آرزو کے مُطابق ہونا، واللہ تعالیٰ اعلم،

س۔ یہ رویا بشارت ہے، اس سے زیادہ نہیں، فقیر تو اپنے کو حضرت والا رح رحمہ اللہ تعالےٰ کے حلقہ میں صف نِعال کے قابل بھی نہیں سمجھتا اور نہ میرے احباب اس سے زیادہ مجھے سمجھیں، مجھے اپنے اندر کوئی بات بھی معلوم نہیں ہوتی، سراپا نقص اور مجموعۂ عیوب، (تا آخر حیات حضرت والا رح اپنے کو ایسا ہی سمجھا کئے، فرماتے تھے "بھئی میں تو نقلی خلیفہ ہوں اصلی خلفاء تو اور ہیں" کہنے کو تو کوئی اور بھی یہی بات کہہ دے گا لیکن حضرت والا رح جس حالت میں ڈوب کر یہ بات فرماتے تھے وہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھبرا کر اپنی برأت کا اظہار فرما رہے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ اس انکار پر مخاطب یقین کرلے)

غ۔ بحمداللہ کہ سفر میں کوئی نماز قضا نہیں ہوئی،

س۔ مُبارک،

غ۔ حضرت والا رح کراچی میں کب تک قیام فرما ہیں، خدا کرے کہ قلب مبارک وہاں کے قیام پر جم جائے، ہمارے حکیم صاحب (نواب مقصود جنگ) اور سب لوگ اسی کو انفع سمجھتے ہیں، آگے اللہ تعالیٰ کو جو منظور ہو۔

س۔ اس باب میں ہنوز انشراح نہیں، حق تعالیٰ جو واقع فرمادیں اوسی پر راضی ہوں حکیم صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہہ دیجئے،

ع۔ خادم کے لئے بطورِ خاص صلاح و فلاح دارین کی دُعا فرمائیں،

ننگِ خدام غلام محمدؐ

س۔ بدل دُعائے خیر کرتا ہوں، والسّلام ۳۰؍رمضان ۱۳۶۹ھ

مکتوب (۹۰)

(اب کراچی ہی میں پیش کئے ہوئے احوال نامے اور ان کے جوابات آرہے ہیں،)

ع۔ پنجشنبہ، ۲۴؍اگست ۱۹۵۰ء

حضرت سیدی و مرشدی و مولائی دامت فیوضہم، السّلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

(ایک خواب لکھا تھا جو اسی جمعرات کی رات دیکھا تھا، اس خواب کا حضرت اقدس اور اس ناکارہ کے درمیان راز رہنا ہی مناسب ہے البتہ تعبیر سُن لیجئے!)

س۔ عزیزی و محبّی و مخلصی زادکم اللہ تعالیٰ معرفۃً

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

تعبیر ذہن میں یہی آتی ہے کہ شدّتِ تعلق اور شدّتِ تاثیر سے عبارت ہے!

ع۔ حق تعالیٰ کے احکام کا پاس اور اس کے رسول سے محبت اس درجہ میں تو بحمداللہ پاتا ہوں بلکہ خود حضرت والا سے بھی اس درجہ کی محبّت ہے کہ حضرت کے حکم پر مال اور عزّت وجاہ کی قربانی سے تو انشاء اللہ قطعاً دریغ نہ ہوگا لیکن اگر جہاد لاحق ہو تو اس میں پہلے درجہ میں اہلیہ کا خیال، پھر خود اپنی جان کا خیال بھی آتا ہے اور غالباً امکان یہ ہے کہ اس میں تامل اور تاویل سے کام لوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ جان اور اہل و عیال کے اس تعلق کو کیوں کر مضمحل کردوں، حضرت والا کوئی تدبیر بتلائیں تو انشاء اللہ عمل کی سعی کروں گا،

وابستۂ دامن احقر غلام محمدؐ

س۔ حاصل یہ ہے کہ جان دینے کا موقع آئے تو اہل وعیال اور محبت جان کا خیال آئے گا تو خیال آنا کوئی بُری چیز نہیں لیکن اگر جہاد عین کا وقت بالفرض کبھی آئے تو آپ کیا انشاءاللہ تعالیٰ معمولی مومن بھی پیچھے نہ ہٹے گا، اس وقت سکون کی حالت میں اس پر غور کر رہے ہیں لیکن قیام بالسیف کی ناگزیر حالت میں حالت دوسری ہوجاتی ہے اُس وقت کا اِس وقت پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، اور پھر اس حالت پر افسوس آنا خود بھی ایک نعمت ہے!

والسّلام

مکتوب (۹۱)

غ۔ حضرت سیّدی ومولائی ومطاعی دامت فیوضکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

معمولات پر بحمداللہ پابند ہوں لیکن ان میں ترقی نہیں ہوسکی ہے،

س۔ عزیزی ومحبّی ومخلصی زادکم اللہ تعالیٰ علماً وعملاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

معمولات میں ترقی یہی ہے کہ اس میں تنزل نہ ہو، کسی کو اگر چھت پر چڑھنا ہو تو چھت پر چڑھنے کے بعد ترقی یہی ہے کہ اوس کو بلا ضرورت نیچے نہ اُترنا پڑے،

غ۔ یہ غالباً حضرت کے قرب اور حضرت کے ملفوظات سے تمتع کا نتیجہ ہے کہ ایک عرصہ سے کوئی بات (اصلاح حال سے متعلق) قابلِ عرض محسوس نہیں ہوئی،

والسّلام ننگِ خدام

احقر غلام محمد

س۔ اس کے متعلق زبانی گفتگو ہوچکی، والسّلام (جو ارشاد فرمایا تھا اس کا حاصل یہ تھا کہ اس

میں شکایت کی کیا بات ہے"

مکتوب (۹۲)

ع۔ ۲؍ستمبر ۵۰ء

بخدمت فیضدرجت سیّدی مرشدی و مولائی دامت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

احقر اپنے اندر دینی مسابقت کا جذبہ پاتا ہے اور جی یہ چاہتا ہے کہ حضرات اہل اللہ کی نگاہ میں عموماً اور حضرت والا مدظلہ کی نگاہ میں خصوصی مقام حاصل ہو جائے اس میں کھٹک یہ ہے کہ حدیث شریف میں تو آتا ہے کہ "اللھم اجعلنی فی عینی صغیراً و فی اعین الناس کبیراً" اس میں 'فی عینی صغیراً' کی شرط ایسی ہے کہ اس میں "مسابقت" پائی نہیں جاتی بلکہ "مسابقت" کے جذبہ کی جڑ کٹ جاتی ہے یعنی بس یہ حسرت ہی حسرت کے درجہ میں رہے، اپنی بڑائی کا علم ہونے ہی نہ پائے، ——— حالانکہ تحدث بالنعمۃ کے طور پر اپنی بہتری کا احساس بھی غالباً درست ہی ہے حضرت والا حقیقت الامر سے آگاہ فرمائیں، والسلام

احقر غلام محمد

س۔ محبی و مخلصی زادکم اللہ تعالیٰ درجۃً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مسابقت الی الخیر جس میں غیر کی تحقیر اور اپنی بزرگی کا خیال نہ ہو بہتر ہے، ———

و سابقوا الی مغفرۃ اور و فی ذلك فلیتنافس المتنافسون،

لیکن بجائے اہل اللہ کی نظر اور شیخ کی نظر میں مقام کے حصول کے، اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں قبول کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے کہ یہ بھی غیر اللہ ہیں، والسلام

سید سلیمان

مکتوب (۹۳)

"قُوتُ القلوب"

ع۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۰ء

حضرت اقدس سیدی و مرشدی و مولائی دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ'

جن اعمال کو اصطلاح شرعیہ میں نیک اعمال کہا جاتا ہے اُن پر جس حد تک پابندی ہوجاتی ہے وہ بھی بس ایک ڈھکوسلا معلوم ہوتا ہے، احقر کو اپنے اعمال نیک بھی سراب معلوم ہوتے ہیں، کسی کارِ خیر میں یہ تشفی نہیں کہ یہ خالصتاً لوجہ اللہ ہوا ہے، ہر عمل کی تہ میں نفس دخیل نظر آتا ہے ــــــــــ نہ معلوم کب تک میری عمر یونہی رائیگاں جائے گی،

س۔ عزیزی و محبّی و مخلصی زادکم اللہ تعالیٰ معرفتہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ'

اگر آپ کو اپنے اعمال حسنہ کے متعلق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سراب ہیں تو ایسا سمجھنا اس بنا پر ہے کہ آپ کو ان میں چمک دمک اور لطف اور تڑپ نہیں محسوس ہوتی جو نتیجہ ہے محبّت طبعی اور محبّت عقلی میں فرق نہ کرنے کا، محبّت طبعی بہیمی چیز ہے جس کے آثارِ ظاہرہ حیوانات تک میں محسوس ہوتے ہیں لیکن محبت عقلی میں کمالِ سادگی ہوتی ہے اور اس کا منشاء صرف طلب رضائے دوست اور اوس کے حکم کی تعمیل ہے،

اس لئے آپ کے دل میں یہ وسوسہ نہ آئے کہ یہ کچھ نہیں ہے، ہاں یہ نتیجہ اس طرح ظاہر ہو کہ دوست کی رضا اور قبول معلوم نہیں کہ حاصل ہوا یا نہیں تو یہ صحیح ہے اور اس سے ہمیشہ ترساں و لرزاں رہنا چاہیئے کہ یہ اثرِ خشیتِ الٰہی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ

اس کا دوسرا رُخ بھی سامنے رہے اور وہ رجاء کا رُخ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم سے امید یہی رکھنی چاہیئے کہ انشاء اللہ تعالیٰ وہ قبول ہی فرمائے جائیں گے، ایمان ان ہی دونوں کیفیتوں کے درمیان ہے جیسا کہ اس حدیث کا منشاء ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کو اوس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا، کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا آپ کو بھی نہیں؟ فرمایا مجھے بھی نہیں لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانک لیں۔

اس کیفیت کو "ہیبت" کہتے ہیں۔

ع۔ حضرت والا رح نے ایک مرتبہ تحریر فرمایا تھا اور ویسے زبانی بھی ارشاد فرمایا ہے کہ قلب و دماغ (قرآنی اصطلاح میں) دراصل دو شئے نہیں بلکہ قلب کا مفہوم دل و دماغ دونوں کو شامل ہے، اس پر ایک اشکال فہم ناقص میں وارد ہوتا ہے جس کی تشفی مقصود ہے ——— طبی نقطۂ نظر سے قلب اور دماغ دو مختلف مراکز جذبات ہیں، جیسے مباشرت ہی کے سلسلہ میں اطباء نے لکھا ہے کہ جو مباشرت نتیجہ ہو ذہنی تحریک کا اس میں گو مادہ کم خارج ہوتا ہے مگر ضعف زیادہ لاحق ہوتا ہے برخلاف اس کے جو مباشرت نتیجہ ہو قلبی تحریک کا اس میں گو مادہ زیادہ خارج ہوتا ہے لیکن اس سے انشراح میسر آتا ہے ——— یہ بات تجربۃً بھی محسوس ہوتی ہے، ایسی صورت میں دل و دماغ کے فرق کو کیسے مٹایا جا سکتا ہے اور جو امور عقلاً ادا ہو جائیں ان کو ان امور کی طرح کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے جو قلبی جذبہ کے ماتحت ظہور میں آئیں، اوّل الذکر نہایت درجہ سطحی و ناقص اور ثانی الذکر اصلی و کامل ہوں گے حضرت والا رح رہبری فرمائیں اور احقر کے قلب کی اصلاح کے لئے دعا فرمائیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پُر درد قلب اطہر سے کوئی ادنیٰ ترین مناسبت تو پیدا ہو جائے، والسّلام

ناکارہ احقر غلام محمدؐ

س۔ فہم کا قصور ہے، یہاں ذہنی کے معنی ہوس ذہنی کے اور قلبی کے معنی تقاضائے قوّت

منویہ کے ہیں، اس کو دل اور دماغ کی بحث سے تعلق نہیں،

دل اور دماغ سے مقصود صرف ایک ہی چیز ہے یعنی وہ عضوِ رئیس جو ہمارے ارادوں کا مرکز ہیں جس کی طرف ان حدیثوں میں اشارہ ہے انما الاعمال بالنیات اور الا ان فی الجسد لمغضۃً اذا صلحت صلح الجسد کلہ الخ الا وھی القلب

کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وشمائل میں اس عامیانہ تصوّف کے جذبات کہیں نظر آتے ہیں؟ قلب میں خشیت الٰہی اور محبت الٰہی کے دوگونہ جذبات کا ظہور ہو اور جوارح سے ہمیشہ احکام الٰہی کی تعمیل اوس کی رضا کی خاطر ہو، اس کے لئے دل سے دُعا کرتا ہوں، والسّلام،

(کراچی کے دوران قیام جو عریضے پیش کئے گئے ان کے جواب کے ختم پر حضرت والا رحمہ نے کبھی دستخط ثبت فرمائے ہیں اور کبھی نہیں بھی!)

مکتوب (۹۴)

ع۔ ۲ر اکتوبر ۱۹۵۰ء

سیّدی ومرشدی ومولائی دامت برکاتکم وفیوضکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

معمولات پر بحمداللہ پابند ہوں، اس سلسلہ میں کوئی بات قابلِ عرض نہیں، البتہ استقامت وازدیادِ عمل کی دعا کا خواہاں ہوں۔

حبیب مخلص وعزیز خالص زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

س۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اللہ تعالیٰ استقامت وازدیادِ حسن عمل عنایت فرمائیں، (اس کے بعد حضرت والا رحمہ کی ترتیبِ سوانح کا معروضہ اور اس کا جواب ہے جو دیباچہ تحدیثِ نعمت میں نقل ہو چکا،

اس لئے مکرر اس کی نقل غیر ضروری ہے)

غ۔ کچھ عرصہ سے کم راتیں ایسی گذرتی ہیں کہ عالم رویا میں حضرت والا کی دیر دیر تک زیارت اور ملفوظات و نصائح سے استفادہ کی سعادت حاصل نہیں رہتی، اس سے یہ تو بہر طور اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت اقدس کو اپنے خدام سے کس قدر تعلق خاطر ہے، (یہ حالت مہینوں قائم رہی اور اس طرح کہ رات میں اگر کئی بار آنکھ کھلتی اور پھر لگتی تو پھر بھی حضرت والا کی زیارت و صحبت سے فیض یابی رہتی)

س۔ یہ سب آپ کی محبت کے کرشمے ہیں،

غ۔ یہ بھی حضرت والا کی غلامی کا صدقہ ہے کہ اس ناکارہ کو دیکھ دیکھ کر گھر کے لوگوں میں دین کی طرف عملی اقدام کی ترغیب بڑھ رہی ہے، الحمدللہ کہ بلا کہے والدہ ماجدہ نماز تہجد کی پابند ہوگئیں، احقر کے چھوٹے بھائی میں بھی تقریباً سال بھر سے جو دینی تغیر پیدا ہے اس کی بھی احقر کو امید نہ تھی، یہ سب حضرت اقدس کا فیض ہے، حضرت سے درخواست ہے کہ ہم سب کے لئے استقامت دین کی دعا فرمائیں۔

ننگ خدام احقر غلام محمدؐ

س۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی زندگی کو آپ کے اہلِ بیت کے لئے اور زیادہ موجبِ برکت بنائے، واجعلنا لِلمتقین اماماً۔

دل سے دعا کرتا ہوں، والسّلام،

مکتوب (۹۵)

غ۔ ۵ جنوری ۱۹۵۱ء

مخدومی وسیدی ومطاعی ادام اللہ ظلکم والطافکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ———— ایک عرصہ سے اپنے حالِ بدحال میں

کوئی تغیر نہیں، البتہ کام میں لگا ہوا ہوں،

س۔ محبِ صمیم وصدیق قویم ادام اللہ توفیقکم لما یحب ویرضیٰ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، حال میں تغیر نہ ہونا بھی نعمت ہے کہ بحمداللہ زیادتی نہیں ہوئی تو کمی بھی نہیں ہوئی، جب انسان اپنی استعداد کے مطابق ایک مناسب قد و قامت تک پہنچ جاتا ہے تو محسوس کمال یعنی قامت میں زیادتی موقوف ہو جاتی ہے مگر غیر محسوس کمال معنوی قائم رہتا ہے گو احساس نہ ہو،

غ۔ البتہ صرف ایک بات ہے کہ حضرت اقدس کی محبت کو اپنے دل میں روز افزوں پاتا ہوں اور اسی کا سہارا لے کر بیٹھا ہوں، یہ دعا بہت دل لگا کر کرتا ہوں کہ "توفنی مُسلماً والحقنی بالصالحین" اور اس وقت حضرت والارحمہ کا تصور خصوصی ہوتا ہے

س۔ اللہ تعالیٰ یہ حال فریقین کے لئے مبارک کریں،

غ۔ پرسوں حضرت والارحمہ کی محفل میں حاضر تھا کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے اور میں محوِ نظارۂ جمال تھا کہ خود بخود ذہن میں چند اشعار آئے، پھر جب گھر آیا اور خود پر نظر گئی تو اور کچھ اشعار ہو گئے، اس طرح ایک نظم گویا اقبال مرحوم کے اس مصرعہ کا مصداق بن گئی، ـــــــ

ع چشم بروئے او کشا باز بہ خویشتن نگر!

چونکہ یہ محض آمد تھی اور شاعری مقصود نہیں، اس لئے جی چاہا کہ اس کو اپنے مخدوم و مطاع کی خدمت میں پیش کروں، اس لئے پیش ہے، گستاخی معاف فرمائی جائے:۔

توجہ سے خالی نہیں ان کی باتیں ‌ ‌ ‌ یہ باتیں نہیں، ہیں یہ اُلفت کی گھاتیں

سکوت ان کا ایسا کہ تقریر قرباں ‌ ‌ ‌ یہ ہیں قلبِ گویا کی خاموش باتیں

نہیں اُن کا دستور یونہی کہیں کچھ ‌ ‌ ‌ ہیں سب واردातیں جو ہیں اُنکی باتیں

نہ تقریر کوئی اثر کر سکے پھر ‌ ‌ ‌ جو سُن لے کوئی اس سخنور کی باتیں

زبانِ قلم سے، زبانِ عمل سے ‌ ‌ ‌ بیاں ہو رہی ہیں محمدؐ کی باتیں

نئے اور پرانے شفایاب ہیں سب ۔۔۔ ہیں تریاق واکسیر سب اُن کی باتیں
جلالِ کلیمی ، جمالِ مسیحی ۔۔۔ جمع ہوگئیں اُن میں کیا کیا نہ باتیں
مجھے ہم نشینو! نہیں خوف پرسش ۔۔۔ کہ نوکِ زباں ہیں پھاب اُنکی باتیں
یہ اُن کے کرم کی ہے معجز نمائی ۔۔۔ وگرنہ کہاں میں، کہاں ایسی باتیں
میں سو کر بھی دیدار سے ہوں مشرف ۔۔۔ گزرتی ہیں صد شکر اب ایسی راتیں
مجھے داغ اپنے نظر آرہے ہیں ۔۔۔ منور سراپا ہیں سب ان کی باتیں
بہت پرہنر تھا، مگر اُن کے صدقے ۔۔۔ اب اس نفس نے کھائی ہیں کتنی ماتیں
عجب کیا جو ہیں محو سب سُننے والے ۔۔۔ زباں ہے مری اور ہیں اُن کی باتیں

عطا ہو مجھے کچھ تو جذب دروں سے
رہیں گی یہ کب تک یونہی باتیں باتیں

ننگِ بارگاہ احقر غلام محمّد

س۔ یہ محبت کا کرشمہ ہے کہ لیلیٰ را بچشمِ مجنوں می بینند،

اس نظم کا ہر شعر اچھا ہے اور صاف ہے مگر فنی اعتبار سے بلا قافیہ ہے، "باتیں" یا قافیہ ہے یا ردیف، بظاہر قافیہ معلوم ہوتا ہے، پھر ایک ہی قافیہ کا بار بار لانا عیب ہے،

والسّلام

مکتوب (۹۶)

"اَلبُشریٰ"

(اس عریضہ کے پیش کرنے کے دوسرے روز خدمت شیخ میں حاضری ہوئی، جب خادم کے آمد کی اطلاع پہنچی تو حضرت اقدس دیوان خانہ میں برآمد ہوئے، سفید کپڑوں پر صندلی رنگ کی شال زیب تن کئے ہوئے، ہاتھ میں احقر کا احوال نامہ، آنکھیں چار ہوتے ہی

چہرۂ انور پر تبسّم کی لہریں دوڑ گئیں اور "اللہ" کا لفظ زبان فیض سے اس قدر پُر اثر ہو کر نکلا کہ سننے والے کے دل میں اُتر گیا، ایک کیفیت انبساط طاری ہو گئی ______

اس لُطفِ خاص سے جوابی مکتوب میرے حوالے فرمایا گیا، ____ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ رہ کی اس مسرّت کو میرے لئے وجہ سعادت و کامرانی بنائے،)

ع۔ کراچی، چہار شنبہ

۷، فروری ۱۹۵۱ء

بخدمت فیضدرجت والا مرتبت سیّدی و مولائی دامت فیوضہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ،

رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف پایا ____ دیکھا کہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب گاہ پر بغرض زیارت حاضر ہوں جیسے ہی دروازہ کے قریب پہنچا تو درود شریف پڑھنا شروع کیا دُور ہی سے قبرِ اطہر پر نظر پڑی، دیکھا کہ اُوپر سے کھُلی ہے اور حضور اکرمؐ آرام فرما ہیں، درود شریف پڑھتا ہوا دوسرے دروازہ میں داخل ہوا جو قبرِ اطہر سے متصل واقع تھا، یہاں پہنچتے ہی سردارِ دو عالمؐ نے آنکھیں کھول کر احقر کو لطفِ نظر بخشا اور فرقِ مبارک کو بلند فرما کر قریب تر آنے کا اشارہ فرمایا، احقر بڑھ کر فوراً سینۂ مُبارک سے لپٹ گیا اور دہنِ مبارک کو دیر تک چُومتا رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح لپٹائے رکھا، پھر نہایت شفقت و محبّت اور قدرے رِقت کے ساتھ کچھ نصیحت فرمائی، الفاظ یاد نہ رہے لیکن گمان غالب یہ ہے کہ استقامتِ عمل کی تاکید فرمائی، اس کے بعد احقر رخصت ہو گیا،

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قد مبارک اور جسم اطہر حضرت والا رہ مدظلہٗ کی طرح چہرۂ انور پُر گوشت اور سرخ و سفید، ریش مبارک حضرت مدظلہٗ ہی کی طرح ترشی ہوئی مگر اتنی گھنی نہ تھی، آنکھیں بڑی بڑی پُر نور اور پُر شفقت تھیں، صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً۔

خواب ہی میں احقر نے یہ بھی دیکھا کہ یادداشت کے لئے اس رویا کو نقل کر رہا ہے کہ ایسے میں آنکھ کھل گئی، ۳ بجے رات کا وقت تھا، نماز تہجد و معمولات سے فارغ ہو کر (۱۰۱) مرتبہ درود ابراہیمی پڑھا اور استقامتِ دین اور حُسنِ خاتمہ کی دعا کی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، حضرت والارح سے بھی اسی دُعا کی درخواست ہے!

س۔ محبِّ مخلص وصدیق عزیز زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک بڑی نعمت سے سرفراز فرمایا اور ہر نعمت کی قدر واجب ہے تاکہ مزید عطا ہو اور کوئی مرتکب عدم شکر ہو تو نہ صرف سلب نعمت کا خوف ہے بلکہ ابتلاء کا بھی، اس نعمت کی قدر یہ ہے کہ معمولات میں درود شریف کی ایک تعداد بھی داخل کریں جس کو بہ آسانی پورا کرسکیں اگر ہر روز نہ ہو سکے تو جمعہ کو تو ضرور اہتمام کیجئے، خواہ معمولات میں کمی ہو جائے[1]۔

دوسرا اہتمام یہ ہے کہ اب اس سینہ کو بُرائیوں سے پاک اور اس منہ کو ہر خلافِ شرع قول (غیبت و کذب وغیرہ) سے محفوظ رکھئے[2]۔

---

[1] بحمداللہ درود شریف کی ایک معین مقدار روزانہ کے معمولات میں اور ایک زائد معین مقدار جمعہ کو معمولات میں داخل ہے، دوام کے لئے بندۂ عاجز ہر بہی خواہ سے دُعا کا ملتجی ہے۔ حضرت والارح سے درود شریف کا صیغہ دریافت کیا تو دو صیغوں میں سے ایک کے انتخاب کے لئے ارشاد ہوا، چنانچہ احقر نے وہ درود شریف اپنے لئے پسند کیا جو بقول حضرتِ اقدسؒ کے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا کشفاً حاصل کردہ ہے، یعنی حضرت شاہ صاحبؒ نے بین النوم والیقظہ دیکھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہیں اور یہ درود شریف تلاوت کر رہے ہیں:۔

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ نَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ"

[2] اپنے ضعف ہمت کے پیشِ نظر اس ضمن میں بھی ہر دینی بھائی سے صدق دل کے ساتھ دُعا کا ملتجی ہوں۔

ع۔ اس رویاء کا اثر مسرت کا وفور نہ ہوا بلکہ اعمال کی ذمہ داری کے احساس نے حیرت کے درجہ تک فکرمند بنادیا کہ کیونکر حضورؐ کے نقشِ قدم پر استقامت سے چلا جائے،

س۔ یہ بڑا احساس ہے اور یہ بھی نعمت ہے جس کا شکر واجب ہے،

ع۔ جی یہ چاہ رہا تھا کہ اب آنکھ، کان اور زبان کو بند کرلوں تاکہ عینی، سماعی اور لسانی گناہ سرزد نہ ہونے پائیں،

س۔ جی چاہنا تو تمنا کے معنوں میں ہے، یہ معتبر و مفید نہیں، بلکہ ضرورت ہمت کی ہے،

غ۔ اپنی کوتاہ ہمتی کی وجہ سے حیرانی ہے کہ کس طرح خود کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام بنائے رکھوں؟

س۔ علاج صرف دعا اور ہمت ہے، پست ہمتی تو دین و دنیا میں کہیں کارآمد نہیں،

ع۔ اس رویا سے قبل، غالباً دو تین ہفتے ہوئے ہوں گے، جمعہ کا دن تھا، راستہ چلتے ہوئے درود شریف پڑھ رہا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور ہی سے ایک خاص حظ و سرور محسوس ہوا اور فوراً ذہن میں ایک شعر موزوں ہوگیا ؎

خیالش کہ کردہ دل و جاں معطر　　　چہ پرسی ز لطفِ وصالِ محمدؐ

س۔ یہ احوال میں سے ہے، محمود ہے،

غ۔ اس کے ساتھ ہی حضرت والا مدظلہ کا خیال آیا کہ جو کچھ حاصل ہے وہ سب اسی ہستی کے طفیل اور واسطہ سے ہے، اس پر دل سے دعا نکلی اور شعر میں موزوں ہوگئی ؎

فزوں باد یارب کرم بر سلیمان　　　کہ گفت است با ما ز حالِ محمدؐ

پھر ایک شعر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں اور بن گیا (یہ سب مشکل سے ۴، ۵ منٹ میں ہوا) ؎

ہمہ نکتہ دان عروج اند اما　　　نزول است اصلِ کمالِ محمدؐ

اس عرض کی جرأت اب تک نہ ہوئی تھی، مگر اس وقت اظہار جذبات اطلاعاً ہوسکا،

س۔ یہ آثارِ محبت میں سے ہے اللّٰھم انّی اسئالك حبك وحب من یحبك میری نسبت اسی حد تک ہے جس حد تک ایک متوسط کو ایک دوست کا خط دوسرے دوست تک پہنچانے کی ہے۔ ——— (کیا وجد آفریں جواب ہے اور کس قدر معرفت سے لبریز!)

غ۔ حضرت والا مجھ ناکارہ کے لئے اتباع سنّت پر استقامت کی دعا فرمائیں۔ فقط

ننگِ خدام، احقر غلام محمّد

س۔ میری دعا ہے کہ اتباعِ سُنّت کی مزید توفیق ہو۔ والسّلام

مکتوب (۹۷)

غ۔ کراچی، ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ

شمس الہدایت والدین سیّدی وسیّد المسلمین دامت فیوضہم وبرکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اس رمضان المبارک میں احقر کا یہ حال ہے کہ اپنی ہمّت وعزیمت بالکل مسلوب محسوس ہوتی ہے اور صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ محض توفیقِ الٰہی سے جو کچھ طاعت ہو جاتی ہے ہو جاتی ہے، ہر نماز پر شکر ادا کرتا ہوں، تلاوت قرآنِ پاک ومناجات مقبول اور تکمیل معمولات پر ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے پورا کروا دیا ورنہ اپنی ہمّت کی بنا پر تو ممکن ہی نہ تھا، اپنی ہمّت کے بھروسے پر یہ تک یقین نہیں رہتا کہ نماز باجماعت ادا کرلوں گا لیکن جب ادا ہو جاتی ہے تو طبیعت میں خوشی محسوس ہوتی ہے اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مسجد تک لے گئے اور واپس لے آئے، سب انہی کا کرم ہے، یہ کیفیت مسلسل قائم ہے اور بے ساختہ یہ شعر ذہن میں آتا ہے اور اس کی حقیقت محسوس ہوتی ہے کہ ؎

کار زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت راتہمتے برآہوئے چیں بستہ اند

اپنی اس حالت سے متعلق یقین نہ تھا کہ محمود ہے یا غیر محمود کیونکہ کبھی گمان یہ بھی ہوتا تھا کہ شاید طبیعت کے اضمحلال کا اثر ہو لیکن رات حضرت والا مد فیوضہٗ نے جامع مسجد میں جو ارشاد فرمایا اس سے بات سمجھ میں آگئی اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا، اللہ تعالےٰ قبول فرمائے، حضرت اقدس سے بھی دعائے خیر کا طالب ہوں،

س۔ اخلصِ عزیزاں واحبِّ دوستاں زادکم اللہ تعالیٰ عرفاناً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

یہ حال مبارک ہے، اور یہ اس سفر[1] کی انتہا ہے، بحمد اللہ کہ یہاں تک رسائی میسر آئی،

بارک اللہ فیکم،

غ۔ حضرت والا مرتبت کی زبانِ فیض اثر سے ایک رات بعد نماز تراویح جب یہ مصرعہ ادا ہوا، ع عالم بجز وش لا الٰہ الّا ہو است ______

تو یہ کیفیت طاری ہو گئی کہ سارا عالم اور جو کچھ اس میں ہے سب مجازات واضافیات ہیں جن کی نہ کوئی حقیقتِ ذاتی ہے نہ ان میں کوئی قیام وبقا ہے، کل شیٔ ھالکٌ الا وجہہ حضرت والا سے تصحیح فہم کا طالب ہوں،

س۔ یہ کیفیت بھی مُبارک ہے،

غ۔ کل بعد نماز عصر احقر کے والد ماجد مد ظلہٗ محلہ کی مسجد میں معتکف ہو گئے، آج عصر کے بعد ملاقات ہوئی تو گریہ طاری تھا، فرماتے تھے کہ کل جیسے ہی مسجد میں آ بیٹھا، عجیب حالت طاری ہو گئی اور ایک شعر جو برسوں پہلے کبھی یاد تھا زبان پر جاری ہو گیا ؎

بر در آمد بندۂ بگریختہ ــــ آبروئے خود بہ عصیاں ریختہ

---

[1] یعنی سیر الی اللہ! چنانچہ خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ کا ارشاد ہے:۔ "پرسیدہ بودند کہ مطلوب را نہایت نیست پس میباید کہ طلب طالب را ہم انتہا نباشد پس منتہی گفتن بچہ معنے باشد؟ برانند کہ منتہی کسے ست کہ بابتداء مطلوب برسد و سیر الی اللہ را قطع نمودہ داخل سیر فی اللہ گردد وبعد ازاں در انتہائے مراتب ست باعتبار کمالات محبوب بعضہا فوق بعض!" ______ (مکتوب، ۱۳۸، دفتر سوم، مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ)

احقر کو حضرتِ اقدس کے فیضِ صحبت کے صدقہ میں جو تھوڑی سی فہم حاصل ہے، اُس کی بناء پر احقر نے اس کیفیت پر مبارک باد پیش کی کہ یہ کیفیت محمود ہے اور موقع کے عین مناسب ہے اور گو یہ مقصود نہیں مگر جب یہ کیفیت طاری ہے اس کی رعایت بھی ملحوظ رہنی چاہیئے کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور بقول ہمارے حضرت والاؒ مدفیوضہ، کے یہ کیفیات اللہ میاں کے مہمان ہیں جن کی میزبانی کا حق بھی ادا کرنا ضروری ہے ؎

تصوّر میں کیا کیا عنایت ہے اون کی   میرے گھر میں آئے ہیں مہمان ہو کر

(حضرت سیّدیؒ)

اس بارے میں حضرت والا کا جو ارشاد ہو، والد صاحب تک پہنچا دوں گا۔

ننگِ خدام   احقر غلام محمّد

س۔ آپ کے والد صاحب کی یہ حالت بھی محمود ہے، جو کچھ آپ اون سے کہہ چکے وہ صحیح ہے، اب اس سے زیادہ اس باب میں اون سے کچھ نہ کہیئے تاکہ اس حالت کی رفعت پر شکر کے بجائے عُجب نہ پیدا ہو کہ سب ضائع ہو جائے۔ والسّلام۔

مکتوب (۹۸)

غ۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۱ء

ذی الحجہ ۷۰ھ

حضرت سیّدی و مولائی و مطاعی دامت فیوضہم و برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گذشتہ ڈیڑھ مہینے میں بعض مرتبہ یکایک یہ حالت ہو جاتی ہے کہ خود متحیّر ہو جاتا ہوں کہ اللہ میاں کو آخر کیسے پاؤں؟ کہاں پاؤں؟ میں ایک بندۂ گندہ اس کی بارگاہِ اقدس

میں کیسے پہنچوں؟ ــــــــ نہ پہنچ سکوں تو حرمانی ہے اور جو پہنچنا چاہوں تو وہ بات کس طرح پیدا کروں؟ یہ کیفیت تحیر کبھی ۱۵ منٹ، آدھ گھنٹہ کے لئے طاری ہو جاتی ہے اور کبھی گھنٹوں طاری رہتی ہے، اور حضرت والا کے راولپنڈی اور مری کے سفر کے دوران میں تو کئی کئی دنوں تک طاری رہی یوں محسوس ہوتا ہے گویا ٹھٹھر کر رہ گیا ہوں نہ آگے بڑھ سکتا ہوں نہ پیچھے ہٹ سکتا ہوں، حرکت کی تاب ہی جاتی رہی حالانکہ ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ہے کہ آگے بڑھنا ضروری ہے،

س۔ اعزالاخوان زادکم اللہ تعالیٰ معرفتہ، السّلام علیکم ورحمۃ اللہ،

یہ تحیر خود ایک منزل ہے جس سے بہرحال گذرنا پڑتا ہے اور اس سوال کا پیدا ہونا خود دلیل طلب ہے، اللہ تعالےٰ کے پانے کے معنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے سوا کچھ اور نہیں،

بندہ پر رضائے الٰہی کی طلب اور اوس کے لئے سعی و محنت فرض ہے لیکن اوس کا حصول بندہ کے اختیار میں نہیں اس لئے وہ اس کا مکلّف نہیں، حضرت مہاجر مکّی (حاجی امداد اللہ صاحب) رحمہ اللہ کی زبان میں اوس کا ڈھونڈنا شرط ہے، اوس کا پانا شرط نہیں ہے، فرمایا ؎

ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار آپ ہے　　　پر تجھ کو چاہیئے کہ تگا پو لگی رہے

احکامِ الٰہی کی طاعت اور عبادت کئے جائیے یہی آپ کا فرض ہے، اس کی فکر نہ کیجئے کہ قبول ہوئی یا نہیں ہوئی گو حضرت مہاجر مکّی رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق جب ایک وقت کی نماز کے بعد دوسرے وقت کی نماز کی توفیق عطا ہوتی ہے تو پہلے وقت کی نماز کی یہ قبولیت کی علامت ہے اور یہی منشا والذین اھتدوا زادھم ھدی کا ہو سکتا ہے ــــــــ پھر آپ کو تحیر کیوں ہو،

غ۔ یہ بھی احساس ہے کہ گویا چلتے چلتے رُک گیا ہوں، واللہ تعالیٰ اعلم،

س۔ جب تک عصیاں سرزد نہ ہو رک جانے کے کوئی معنی نہیں، ہر روز کا عمل انشاء اللہ تعالیٰ زیادت ہی کا باعث ہوگا،

غ۔ ویسے تو محترمی و معظمی ڈاکٹر عبدالحئی صاحب مدظلہٗ بھی ہمیشہ ہی حضرت والا رح کی مدح فرماتے رہتے ہیں اور احقر کو مختلف پیرایوں سے سمجھاتے رہتے ہیں کہ حضرت اقدس مدظلہٗ کی قدر پہچانے اور بیش از بیش استفادہ کی کوشش کرے مگر پیوستہ اتوار کو جب حضرت والا رح حیدر آباد سندھ تشریف لے گئے تھے تو حضرت مولانا محمود الغنی صاحب مدظلہٗ غریب خانہ پر تشریف لائے اور نہایت مؤثر انداز میں فرمایا کہ:

" غلام محمد صاحب! بجلی کی روشنی لے کر ڈھونڈو گے تو پھر ایسی ہستی (حضرت والا رح کا نام نامی لیا تھا) نہیں ملے گی شکوک باطنی کے جواب دینے والے بہت ہیں مگر ایسا محقق کوئی نہیں، بہت غنیمت جانو اور خود پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل سمجھو کہ ایسی ہستی سے تعلق حاصل ہے، کراچی میں لوگوں نے مولانا کی قدر نہیں پہچانی اور کیا پہچانیں گے، مگر تم بہ پابندی خدمت میں حاضر رہو اور وقت کو غنیمت سمجھو، حضرت والا رح رحمۃ اللہ علیہ (حکیم الامت مولانا تھانوی رح) کے بعد اب یہی سب کچھ ہیں۔"

اس نصیحت کا بے حد اثر ہوا، حق تعالیٰ کا دل سے شکر ادا کیا اور یہ بھی دُعا کی کہ حق تعالیٰ اس ناکارہ کو توفیق استفادہ بخشیں اور وہ ظرف عطا فرمائیں جو حضرت والا رح کے فیوض کا متحمل ہو، حضرت والا رح سے بھی دُعا کی درخواست ہے،

خاک پائے سُلیمانی

احقر غلام محمد

س۔ بزرگوں کے یہ مشفقانہ فقرے اون کی محبت کے مظاہر ہیں ورنہ من آنم کہ من دانم، اپنے سے آپ ان بزرگوں کی بشارت اور ان حوصلہ افزا فقروں سے شرم آتی ہے، بحمد اللہ طرفین میں محبت ہے اور اسی سے اُمیدِ کامیابی ہے،

(یہ سند محبت احقر کے لئے ساری اسناد سے زیادہ موقر اور انشاءاللہ سب سے بہتر زادِ آخرت ہے)
دل سے دُعا کرتا ہوں۔ والسلام

الفقیر الی اللہ تعالیٰ، سُلیمان

۹ ذیحجہ ۱۳۷۰ھ

مکتوب (۹۹)

غ۔ کراچی

۳۰ اکتوبر ۱۹۵۱ء

بخدمت فیض درجت حضرت سیدی و مولائی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

معمولات پر بحمداللہ پابند ہوں، مزید استقامت کے لئے دعا کا طالب ہوں،

س۔ حبیب مخلص آتاکم تقواکم ورفع احوالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مبارک ہو، استقامت فوق کرامت ہے اور اللہ تعالیٰ مزید عنایت فرمائیں،

غ۔ کیفیت واحوال سے متعلق بربنائے تجربہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس وقت جو بھی طاری رہے، اس کو عین مقتضائے حکمت سمجھا جائے اور اپنی طرف سے تبدیلیٔ حال کی کوشش بھی مُضر ہے، بجز اس صورت کے کہ یہ انقلاب حال اپنی کسی کوتاہی یا گناہ کی وجہ سے ہو، ——— اصلاحِ خیال کے لئے حضرت والا کی خدمت میں عرض کیا ہے،

س۔ صحیح ہے، اور اللہ تعالیٰ مزید فہم دین عنایت فرمائیں،

غ۔ رات نمازِ فجر سے کچھ پہلے احقر نے خواب میں دیکھا کہ ایک بڑے کمرہ میں کچھ لوگ شربت پی رہے ہیں اور اسی سے متصلہ ایک چھوٹے کمرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ حضرت والا مدفیوضہ

اپنے دستِ مبارک سے برف کے ٹکڑے توڑ رہے ہیں کہ اس کو شربت کے گلاسوں میں ڈال کر باہر بھجوائیں، احقر نے ہاتھ بٹانے کی خواہش ظاہر کی تو کمرہ کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ فرمایا جہاں چائے کی پیالیاں رکھی تھیں، احقر نے پیالیاں اٹھائیں اور قریب ہی ایک سماور میں گرم چائے تیار تھی اس میں سے پیالیاں بھر بھر کر لوگوں کو پلانے لگا، (احقر نے پہلے اس کو چکھا پھر دوسروں کو پلانا شروع کیا، چائے بہت عمدہ مگر تیز و تلخ تھی!) ان پینے والوں میں احقر کے دو احباب بھی تھے جن میں سے ایک نے تو پی لی اور دوسرے نے کوئی بے جا حرکت کی تو حضرت والا رح نے ڈانٹ کر ان کو کمرہ سے نکال دیا اور وہ محروم رہے،

آنکھ کھلنے پر طبیعت میں انشراح تھا اور خیال یہ آیا کہ حضرت مدفیوضہٗ کے ہاں دونوں ہی شرابیں ملتی ہیں" کان مزاجہا کافوراً" اور" کان مزاجہا زنجبیلا"[۱]

س۔ خواب کی حیثیت، جیساکہ آپ جانتے ہیں بشارت ہے،

حضرت والا رح اکثر یہ پڑھا کرتے تھے جیساکہ ملفوظات و مواعظ میں ہے، ع

کہ آنچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است

یہ مصرعہ آپ کے دونوں سوالوں کا جواب ہے، والحمدللہ تعالیٰ،

غ۔ عجیب تربات یہ ہوئی کہ احقر جب نماز فجر کے لئے مسجد پہنچا تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور امام صاحب کی زبان سے پہلی آیت جو کان میں پڑی وہ یہی تھی کہ" ان الابرار یشربون من کاس کان مزاجہا کافوراً"

س۔ نعم الاتفاق۔

---

[۱] حضرت سیدی رحمۃ اللہ کا ذاتی لون نقشبندی ہی تھا، جوش و خروش کی بجائے سکون و وقار ہی کو ہمیشہ پسند فرماتے ہیں،

[۲] اس سلسلہ میں حضرت مولانا تھانوی رح کا وعظ" المعرق والرحیق للمغروق والحریق" ملاحظہ ہو، نہایت مؤثر بھی ہے اور الوانِ چشتیہ و نقشبندیہ کی حقیقت بھی اس میں خوب سمجھائی گئی ہے،

غ۔ حضرت اقدس اس بے عمل کے لئے توفیق نیک اور استقامتِ دین کی دُعا فرمائیں،

وابستۂ دامن

احقر غلام محمدؐ

س۔ دل سے بدرگاہِ قاضی الحاجات دُعا ہے،

الفقیر الی اللہ تعالیٰ

سیّد سُلیمان، ۲۸ محرم ۱۳۷۱ھ

مکتوب (۱۰۰)

(حضرت اقدس رحمہ اللہ کمیشن کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے لاہور تشریف لے گئے تھے، تبدیلی آب وہوا کے خیال سے دو تین ہفتہ قیام میں توسیع فرمادی تھی، اب جو عریضہ پیش کیا جارہا ہے وہ لاہور ہی کے پتہ پر لکھا گیا تھا)

غ۔ کراچی

۸ اپریل ۵۲ء

بخدمت فیضدرجت مخدومی، مطاعی ومولائی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج اقدس!

اس ناکارہ کا عجیب حال ہے، رہ رہ کر داعیاتِ معصیت اُبھر آتے ہیں اور ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ[1] ـــــــــ یہی نہیں بلکہ ایمانیات میں تک خدشات لاحق ہوتے ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ یقینیات بھی بس اوہام ہی ہیں اپنے ہی ذہن کے

---

[1] سالک کی نظر اس نعمت سے چُوک جاتی ہے کہ شدت تقاضہ کے ساتھ قوتِ تحمل بھی کتنی بڑھ رہی ہے ورنہ چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ تقاضہ سے مغلوب ہوجاتا مگر ایسا نہیں ہوتا، اس لئے حضرت سیدیؒ نے فرمایا کہ یہ داعیات محسوس ومتخیل ہوتے ہیں!! ففہم۔

پیدا کردہ ہیں ـــــــ البتہ کبھی کبھی یقین کی یہ کیفیت حاصل ہے کہ گویا اب اس میں کوئی شبہ پیدا نہ ہو گا حضرت والا جیسی باکمال ہستی کی خدمت میں اتنے عرصہ تک رہنے کے باوجود اپنا یہ حال دیکھ کر اپنی نالائقی کا یقین ہوتا ہے اور مستقبل سے مایوسی پیدا ہوتی ہے،

حضرت! کسی صورت اس کشاکش سے نکال کر ساحلِ یقین تک پہنچا دیجئے بحق راسخ ہو جائے اور حقانیت کے آثار پیدا ہو جائیں، یہ کام حضرت والا ہی کے ہاتھوں ہو جائے تو ہو جائے ورنہ پھر بظاہر کوئی اُمید نہیں ؎

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا　　　　که عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا

س۔ محبّی وصدیقی اذاقہ اللہ تعالیٰ عرفانہ واناز لہ برہانہ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ　　　　الحمد للہ تعالیٰ خیریت ہے،

داعیات معصیت کا اُبھرنا بُرا نہیں، انسان سے معصیت کی قوت مسلوب نہیں ہوتی، اگر مسلوب ہو جائے تو مجاہدہ کہاں رہے جس کا حاصل مخالفتِ ہوائے نفس ہے، البتہ قوت مضمحل ہو جاتی ہے اور یہی اضمحلال غایت طریق ہے،

ان داعیات کے اُبھرنے سے غم ہونا سالک کو اوس کے مومن ہونے کی دلیل ہے، اگر خدانخواستہ ان سے انشراح ہو تو بے شبہ وہ کفر کی نشانی ہے، اس لئے آپ کو جو داعیات وتنبیہات محسوس ومتخیل ہوتے ہیں وہ وسوسۂ شیطانی ہیں، جب ایسا وسوسہ پیدا ہو وسوسہ کی طرف سے ترک التفات اور اعراض کر کے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجایئے، جو اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کا ماحصل ہے اور یہ دُعا پڑھیئے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ، یا حدیث کی یہ دعا پڑھیئے:

يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ،

مغیبات کا ایمان مطلوب ہے، باقی طمانیت تو یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال "کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی" خلاف ایمان نہیں، اسی لئے جب سوال ہوا، "اَوَلَمْ تُؤْمِنْ" تو جواب میں فرمایا "بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ" یہ طمانیتِ معائنہ ہر ایک کو کہاں میسر ہے اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبِّیْ،

غ۔ حضرت والارح کے ہاں ہر طرح خیریت ہے، میری اہلیہ مع نومولودہ کے مع الخیر ہے، صحت مزید کے لئے دُعا کی درخواست ہے،

س۔ یہاں بھی خیریت ہے، آپ کے یہاں کی خیریت کے لئے دل لگا ہوا تھا، اللہ تعالےٰ خیریت سے رکھے، (کیا شفقت وکرم ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً)

غ۔ معلوم ہوا تھا کہ واپسی میں کافی دن لگیں گے اس لئے بلا انتظار اپنا حال زار پیش کر دیا،

والسّلام ، ننگِ خدام ، احقر غلام محمّد

س۔ میں ۱۳ر تک یہاں ہوں، ۱۴ر ۱۵ر کو لائل پور، ۱۸ر ۱۹ر ۲۰ر کو راولپنڈی پھر ۲۱ر ۲۲ر کو لاہور میں کیشن ہے یہاں سے ۲۲ر کی شب کو روانگی کا قصد ہے، والسّلام

الفقیر الی اللہ تعالیٰ ، سُلیمان

مکتوب (۱۰۱)

اب جو عریضہ اور اس کا جوابی مکتوب درج کیا جا رہا ہے اس پر مراسلت ختم ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ دس سالہ نیازمندی کو یہ آخری سندِ محبت دائم اور تعلقِ مستحکم کی مل گئی، یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا حضرت والارح کو کشفاً یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس تحریر کے بعد اب اظہار کرم کا موقع نہ ملے گا اس لئے "آن وعدۂ پیشینش تا روز پسیں باشد" والا تیقن عطا فرما دیا، یہ اُن کے لُطف وکرم کی انتہا اور اس حقیر کے لئے توشۂ آخرت ہے، مکاتیب کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے ایک بات یہ بھی صاف نظر آئے گی کہ احقر

عرض نیاز میں ہمیشہ چُست رہا حتیٰ کہ بعض مرتبہ ایک ہی مہینہ میں کئی کئی عریضے پیش کر دیئے مگر اب جو مکتوب درج کیا جا رہا ہے وہ تقریباً ایک سال چار ماہ کے بعد لکھا گیا ہے، اس طویل مدّت میں کوئی عریضہ پیش نہیں کیا گیا، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ حضرت والاؒ کے فیضِ صحبت کا اثر یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ گو ذہن میں اشکالات کبھی کبھی آ ہی جاتے تھے مگر جہاں ان خدشات کو خدمتِ اقدسؒ میں پیش کرنے کی نیت سے قلم اُٹھایا کہ ان کے نہایت تشفی بخش جوابات خود بخود ذہن میں آجاتے تھے اور وہ اشکالات کافور ہو جاتے تھے، ایک مرتبہ اس ڈر سے کہ کہیں حضرت والاؒ کو (احوال نہ پیش کرنے کی وجہ سے) تغافل کا گمان نہ ہو میں نے یہی حال زبانی عرض کر دیا اور معافی کی درخواست بھی پیش کی تو ارشاد فرمایا کہ

"بھئی یہ تو خوشی اور شکر کی بات ہے یا شکایت و معافی کی، اللہ تبارک و تعالیٰ کا اس پر شکر ادا کیجئے، آخر سلسلۂ مراسلت کب تک!"

فالحمد للہ علیٰ ذلک

مندرجہ ذیل عریضہ کی پیش کشی کا باعث یہ ہوا کہ احقر اپنے اعزّا سے ملنے کی غرض سے جولائی ۱۹۵۳ء میں حیدرآباد دکن گیا اور حضرت والاؒ سے ایک مہینہ کی رُخصت چاہی تھی مگر بعض وجوہ سے قیام ایک مہینہ اور طویل ہو گیا، بعض خانگی الجھنوں اور مجبوریاتِ سفر کی وجہ سے کچھ معمولات کی بے ربطی اور کچھ اپنے تساہل کی وجہ سے قلبی کیفیات میں کمی محسوس ہونے لگی اور ساتھ ہی یہ احساس بھی بڑھا کہ شاید حضرت والاؒ کی توجہ احقر کے حال پر کچھ کم ہو گئی ہے، حالانکہ جب کراچی واپس پہنچا تو اس وہم باطل پر ایسی شرمندگی اور حضرت شیخؒ کی طرف اس سوئے ظن سے ایسی ندامت ہوئی کہ بیان سے باہر ہے، حضرت والاؒ کی خدمت میں حاضر ہونے والے احباب نے سُنایا کہ "کوئی دن خالی نہ جاتا تھا کہ حضرت والاؒ آپ کا تذکرہ نہ فرماتے تھے" اور واپسی کا انتظار تو اس درجہ تھا کہ ایک روز احقر کے چھوٹے بھائی سے ارشاد فرمایا کہ "ایک مہینہ کے لئے کہہ کر گئے تھے، اب تو دو مہینہ ہونے کو آئے آخر آپ کے

بھائی صاحب کب آئیں گے؟ ــــــــ" غرض حقیقت تو یہ تھی لیکن اپنے عیار نفس نے ظنِ باطل یہ پیدا کر دیا تھا کہ توجہات شیخ شاید کم ہوگئی ہیں، میں نے حسب عادت جو کھٹک پیدا ہو گئی تھی من وعن حضرت کی خدمت میں پیش کر دی،

عریضہ یہ ہے :-

"خاتم المکاتیب"

ع۔ حیدرآباد دکن

۲۴ر اگست ۱۹۵۳ء

بخدمت فیضدرجت حضرت سیدی و مطاعی دامت فیوضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے مزاج والا بخیر ہوگا،

احقر بخیریت ہے مگر سکون قلبی سے محروم، اس مرتبہ یہ عجیب بات ہے کہ ہمیشہ ایک بے اطمینانی سی دل پر طاری رہتی ہے،

ہمیشہ کے برخلاف اس مرتبہ اس بات پر بھی حیرت ہے اور رنج بھی کہ "دستِ شیخ از غائباں کوتاہ نیست" والی بات "محسوس" نہیں ہو رہی ہے، گو عقلاً حضرت والا کی توجہات کا یقین رکھتا ہوں، حضرت والا اس عاجز اور طفلِ طریقت کے حال پر خصوصی توجہ فرمائیں اور دعا سے سرفراز رکھیں،

اور حالات لائق شکر ہیں،

محترمہ پیرانی صاحبہ کی خدمت میں اور سلمان میاں سلمہٗ اور ابو عاصم صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے، فقط

خادم حقیر

غلام محمد

س۔ کراچی

محبِ بااختصاص زادکم اللہ تعالی معرفتہٗ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے جانے کے بعد میں باقاعدہ بیمار ہوگیا اور ڈاکٹروں کا تختۂ مشق بنا، سات روز کے بعد بخار اُترا مگر ضعف اتنا ہوگیا کہ بخار اُترے ایک مہینہ ہوگیا مگر ابھی تک پوری قوت عود نہیں کی مگر بحمداللہ ترقی ہورہی ہے،

آپ کے ساتھ معاملہ حاضر وغائب میں یکساں ہے، آپ کے خانگی تفکرات کے باعث ایسا محسوس ہوتا ہوگا (کہ توجہ ملتفت نہیں)

میاں نقی (احقر کے برادرِ خورد) آپ کی جانشینی کر رہے ہیں، اکثر شام کو آتے ہیں۔

قربانی میں عہ فی حصہ پڑا تھا، نقی نے سب ادا کر دیئے، والسّلام

الفقیر الی اللہ سید سلیمان

کلمۂ آخر

سفر حیدرآباد سے جب واپس آیا تو حضرت والاؒ فریش ہی تھے مگر دو چار ہی روز میں طبیعت نے آخری بار سنبھالا لیا، اب اس کو میرا سوئے ظن سمجھئے یا حضرت اقدسؒ کے شوقِ سفر آخرت کا انعکاسی اثر کہ بار بار دل میں یہ بات کھٹک جاتی تھی کہ اب یہ شمع فروزاں بھی ہم پروانوں کو جلد ہی محرومِ ضیا کر جائے گی، بار بار وہ شعر جو خود حضرت والاؒ نے اپنے شیخ عالی مقام کے مرض الموت میں حسرت بھرے دل سے کہا تھا اپنی زبان پر آجاتا تھا ؎

اے میکشو یہ دُردِ تہ جام بھی پیو ۔۔۔ ترسو گے پھر یہ جام پلایا نہ جائے گا

اُدھر چشمۂ فیض سے مہجوری کا خیال اور اِدھر اپنی ناکارگی پر نظر کر کے عجب پریشانی ہونے لگی کہ اب کیا ہوگا، آخر ایک روز تنہائی میں عرض کر دیا کہ حضرت میں تو یونہی رہ گیا!

مبتسم ہو کر فوراً عارف شیرازؒ کا یہ مصرعہ موزوں فرما دیا، ع

گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

یہ حضرتؒ کی زبان فیض کا اثر تھا کہ فوراً جواب کی تفصیلات ذہن میں آگئیں اور ایک گونہ تسکین بھی میسر آئی، پھر بھی اشارہ اشارہ تھا، تفصیلات تو اپنے ہی ذہن کی تخلیق تھیں، جی چاہتا کہ صاف صاف تشفی بخش جواب مل جائے، چنانچہ تین چار روز بعد پھر اسی محرومی کا اظہار کیا کہ حضرت میں تو کچھ بھی نہ سُدھر سکا،

اس پر ارشاد فرمایا کہ:۔

"مجھ کو جو کچھ دینا تھا دے چکا، میں نے اپنا کام کر دیا، بس اب آپ اپنے کام میں لگے رہیے اور جس وقت اور جو کچھ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے عطا ہو اس پر قانع وشاکر رہیئے"

یہ تھا آخری ارشاد یا آخری وصیت جو اس وابستۂ دامن کو کی گئی، ——————

میرا دل مطمئن ہے کہ حضرت اقدسؒ نے میری خیرخواہی اور میری تربیتِ روحانی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، تدبیریں بھی کیں، دُعائیں بھی فرمائیں، غرض وہ کچھ کیا جو ایک شفیق اور کامل ومکمل شیخ اپنے مُرید کے ساتھ کر سکتا تھا (جزاہ اللہ عنی احسن الجزا) آگے اپنی قابلیت واستعداد تو بہرحال تقدیری ہی ہے!

تصدیقی ارشاد

چنانچہ اسی سال (۱۹۵۶ء) کے جولائی اگست میں پھر حیدرآباد دکن جانا ہوا تو حضرت محترم مولانا سید عبداللہ صاحب مجدّدی مدفیوضہ کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی، حضرت مرشدی قدس سرہٗ کا ذکر آیا تو مولانا مدظلہٗ نے ارشاد فرمایا کہ حضرتؒ نے آپ کو کیا وصیت فرمائی؟ راقم آثم نے حضرت سیّدی کا آخری ارشاد نقل کر دیا تو بے حد متاثر ہوئے اور قوّت واثر کے ساتھ ارشاد فرمایا:

"بے شک یہ ارشاد فرمایا، راہِ سلوک میں شیخ بھی اپنے مُرید کی بس ایک حد تک ہی دستگیری کر سکتا ہے، پھر وہ بھی حق تعالیٰ کے آگے مجبورِ محض ہے!"

یہ تصدیقی ارشاد اس لئے سُنا دیا کہ کسی کو مجھ سراپا عیب کے احوال پر نظر کر کے حضرت مرشدی رحمہ اللہ تعالےٰ کے کمالِ تربیت میں شُبہ نہ ہو جائے کہ اگر وہ کامل تھے تو ان کا پروردۂ آغوش سراپا نفس کیسے رہ گیا!

توثیقی بشارت

حضرت والاؒ کی شانِ تربیت کی توثیقی بشارت حضرتؒ کے وصال کے کافی عرصہ بعد ایک اور بھی ملی، ـــــ ایک رات عالم رویا میں اس بے استحقاق کو سُلطان الاولیاء حضرت نظام الدین دہلوی قدس سرہٗ کی زیارت نصیب ہوئی، اس حقیر نے بڑی لجاجت سے عرض کی کہ "حضرتؒ میرے لئے دُعا فرمایئے" ـــــ جواب میں سُلطان الاولیاء نے بالکل حضرت مرشدیؒ ہی کی انداز میں مُسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا ـــــ "آخر کس بات کی؟" ـــــ ادب سے عرض رسا ہوا۔ "اس بات کی نسبت مع اللہ حاصل ہو جائے!" ـــــ کمالِ لُطف کے ساتھ تشفی فرمائی گئی کہ :-

"جو چیز ملنے کی تھی وہ تو مل چکی، باقی اور چھوٹی موٹی چیزیں ہیں وہ بھی اپنے وقت پر مل جائیں گی!"

حضرت سلطان الاولیاء کے اس ارشاد پر معاً حضرت مرشدی رحمہ اللہ کا قول یاد آ گیا کہ :

"مجھ کو تو جو کچھ دینا تھا دے چکا"

فللّٰہ الحمد! اب دُعا ہے اور محبوب دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مقبول میں کہ :

اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنِيْ إِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَّلَا تَنْزِعْ مِنِّيْ صَالِحَ مَآ أَعْطَيْتَنِيْ اَللّٰهُمَّ اٰتِنِيْ أَفْضَلَ مَا تُؤْتِيْ عِبَادَكَ الصّٰلِحِيْنَ،	اے اللہ! مجھ کو پل بھر کے لئے بھی سپردِ نفس نہ فرما اور نہ چھین وہ نعمت جو تو نے مجھ کو عطا فرمائی ہے، اے اللہ! مجھ کو وہ دے جو سب سے بڑھ کر چیز تو اپنے نیک بندوں کو دیتا ہو۔

اٰمِیْن بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ ط

ضمیمہ

چند اکابرِ عصر کے تاثرات

مولانا دریا بادیؒ

مولانا عبدالباری ندویؒ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی

شاہ معین الدین احمد ندویؒ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

پروفیسر سید عبدالرشید فاضل

نواب مقصود جنگ بہادر

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ۔ محرکِ تالیفِ تذکرہ

دریاباد ضلع بارہ بنکی

۲۹ ستمبر ۱۹۶۰ء

عزیزم مکرم   وعلیکم السّلام

کتاب کی تالیف و تکمیل پر سب سے پہلے دلی و مخلصانہ مبارک باد پیش کرتا ہوں. رشک کی آمیزش کے ساتھ ——— بعض حصّے بہت ہی خوب ہیں اور متعدد حصّے ایسے ہیں جن سے میں واقعی مستفید ہوا یعنی ذہن اپنی اصلاح حال کی جانب منتقل ہوا[1] ۔ اور یہ خاص الخاص برکت نسبتِ اشرفیہ کی ہے، یہ بات میں نے اپنے تجربہ میں کسی دوسرے بزرگ کے ہاں نہیں پائی تھی،

سیّد صاحبؒ کے ارتحال کا منظر تو موثر و دردانگیز ہونا ہی تھا، باقی اور بھی دو ایک موقعوں پر آنکھ میں آنسو آ آگئے مثلاً جہاں سیّد صاحب آخری بار اپنے مرشد سے رخصت ہوتے ہیں، اسی طرح صفحہ ۴، پر آپ کا پہلا حاشیہ[2] بڑے کام کا ہے بات بڑی گہری لکھ دی ہے !

باب نہم کے ساتھ باب ششم و ہفتم کا کہنا ہی کیا ہے ،سلوکِ سلیمانی کہنا چاہیئے کہ پورا ہی آگیا اور یہ ایک بڑا کام ہوگیا ۔ فجزاکم اللہ خیرالجزاء ۔

کتاب سے بحیثیت مجموعی طبعاً خوشی ہوئی کہ سیرت سلیمانی کے لئے آں عزیز کا انتخاب جو اس خاکسار نے شروع ہی میں کیا تھا وہ بے جا یا غلط ثابت نہ ہوا ۔

دادِ تحسین کا حصہ ہوچکا، گو اسے بہت کچھ بڑھایا اور پھیلایا بھی جا سکتا ہے لیکن آپ

---

[1] جملہ کو خط کشیدہ خود مولانا نے کیا ہے ۔

[2] جو یہ ہے " فرزند کا تعلقِ عقیدت پدرِ بزرگوار کے کمالِ تقدس کی دلیل ہے کیونکہ اس سے وہ فطری بے تکلفی تک مغلوب ہوگئی ہے جو اولاد اور باپ کے درمیان ہوتی ہے اور جو محبّت کے باوجود عقیدت کو قبول نہیں کرتی "۔

جیسے سلیم الطبع، مجھ جیسے عیب بیں اور نکتہ چین کے قلم سے یقیناً منتظر و متوقع تنقید کے ہوں گے، اس لئے جلد ہی سے اس حصّہ پر بھی پہنچتا ہوں.......

(یہاں سے چند صفحات میں مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے طبع جدید میں بہ حد قبول فائدہ اٹھالیا گیا ہے ـــــــ پورا مکتوب مع حواشی راقم کی مرتبہ "رقعاتِ ماجدی[1]" میں ملاحظہ فرمائیں)

والسّلام

دُعاگو و دعــاخواہ

عبدالماجد

---

[1] شائع کردہ ڈاکٹر عرفان الکریم انصاری، ادارۂ نشر المعارف ۱۱۔ ہیمانی سینٹر، بوتل گلی، شاہراہ لیاقت کراچی

حضرت اقدس مولانا عبدالباری ندویؒ

ہارڈنگ روڈ۔ لکھنؤ

۱۷ر ربیع الاوّل ۸۰ھ

۱۰ر ستمبر ۶۰ء

محب جاں نواز   وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

تذکرۂ سلیمان نے دل ونظر دونوں کو نوازا۔ بستر پر پڑا تھا اور ہوں، مگر پڑے ہی پڑے دو تین دن میں جب تک اس کا بہت حصّہ اِدھر اُدھر سے پڑھ نہ لیا معمولی اخبار تک پڑھنا گراں رہا۔ ماشاءاللہ وبارک اللہ۔ آپ کے قلم سے اللہ تعالیٰ نے حضرت مرحوم کا وہ حق ادا کرایا جو ان کی عقیدت ومحبت کے بڑے سے بڑے دعویداروں سے متوقع نہیں،

شاہ صاحب[۱] کو میں نے لکھا تھا کہ سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب زندگی کا آخری باب ہی ان کی پوری زندگی کا جوہر ہے، ان کی سوانح زندگی میں اس کا پورا حق ادا ہونا ضروری ہے۔ اس سے پہلے کہاں تو یہ تحریر فرمایا تھا کہ مسودہ مجھ کو اور ماجد میاں کو دکھلائے بغیر شائع نہ ہوگا کہاں پھر ناقابلِ خطاب ہی ٹھیر گیا۔

بہرحال یہ سعادت آپ ہی کے حصّہ کی تھی، دوسرا کیسے چھین لیتا، اللہ تعالیٰ ہر طرح اس سعی کو مقبول ومشکور فرمائے۔

البتہ قلم نے "صحافتی" بھڑوں کے چھتہ کو دو ایک جگہ چھیڑ دیا ہے خدا خیر کرے[۲]! فاران والے مضمون[۳] کو بھی ذرا ہلکا کر دینے کی مصلحت تھی، خصوصاً آپ کے لئے۔ باقی یہ رسوا تو رسوا ہے ہی۔

والسّلام ، عبدالباری

---

[۱] شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم مدیر معارف ، [۲] بحمد للہ خیریت ہی رہی!

[۳] مولانا کا مضمون شائع شدہ ماہنامہ "فاران" (کراچی) بابتہ دسمبر ۱۹۵۵ء۔

محققِ عصر ڈاکٹر محمد حمید اللہ زاد فیضہٗ

4 - Rue de Tournon

Paris F. 75006

۲۸ ربیع الغوث[1] ۱۳۸۰ھ

جناب مولانا غلام محمد صاحب مؤلف "تذکرۂ سلیمان"

محترمی۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا پتہ معلوم نہ ہونے سے مجلسِ علمی (کراچی) کے توسط سے یہ عریضۂ شکر گزرانتا ہوں کتاب ملی اور اس غریقِ عصیان کو کشتیٔ نجات محسوس ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر گزار ہوں اور آپ کا بھی۔ اور آپ سے طالبِ دعا ہوں کہ میری حالت درست ہو اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کا اہل و باعث بن سکوں،

صفحہ ۲۴۴ پر حاشیہ میں اس گنہگار کا جو ذکر، ذکرِ پاکاں میں آیا ہے، اس کے متعلق کچھ تفصیل شاید آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی۔

ممدوح مرحوم و مغفور اس ناچیز سے اسی طرح ملتے تھے جو ان کی عادت تھی، یعنی ملنے والے کو خیال ہوتا کہ وہ اسے بہت چاہتے ہیں۔ خیر تو ایک مرتبہ (غالباً) حیدر آباد میں ملاقات ہوئی تو یکے بعد دیگرے دو متبادل چیزوں کا ارشاد خود ہو کر فرمایا تھا، پہلی چیز ٹھیک یاد نہیں بہرحال وہ غالباً یہ تھی کہ فرنگیوں کے سیرتِ نبویہ پر اعتراضات کا جواب لکھوں، میں نے عرض کیا، ان معلومات معترضانہ کا مسلمانوں میں پھیلنا خطرناک ہے، میرا جواب ضروری نہیں کہ تسلی بخش ہو مگر اعتراض کا زہر تو پھیل ہی جائے گا۔ اس پر فرمانے لگے اچھا تو ایک نئی سیرتِ نبویہ لکھ دو۔ میں

---

[1] ربیع الثانی۔ "الغوث" کی جدّت ڈاکٹر صاحب کی حضرت غوث الاعظم جیلانی قدس سرہٗ سے غایتِ محبت کی وجہ سے ہو سکتی ہے مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اکثر بدعات کی ابتداء محبت کے غلو ہی سے ہوئی ہے،

نے عرض کیا، سیرت شبلی اور رحمت عالم (مؤلفہ آں ممدوح) کی موجودگی میں نہ مطول کی اور نہ مختصر کی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ فرمایا نہیں وہ اور رنگ کی چیز ہے، آپ اور طرح سے لکھیں اور میں بتاؤں گا کہ کس طرح لکھیں۔ افسوس ہے کہ اس آخری چیز کی تفصیل پوچھے بغیر عرض کیا، کام اتنا بڑا ہے کہ اس کی ہمت نہیں۔ اس پر نیم ظریفانہ اور نیم تلخ انداز میں فرمایا، آپ تو کچھ بھی نہیں کرنا چاہتے، نہ یہ نہ وہ ـــــ بات آئی گئی ہوگئی لیکن شاید ممدوح کی توجہ اور کرامت تھی کہ غیر محسوس طور پر یہ کام انجام پاتا رہا چنانچہ سیرت نبویہ کے مختلف پہلوؤں پر وقتاً فوقتاً میرے مقالے چھپتے رہے اور ان کے جو دو مجموعے اُردو میں چھپے ہیں وہ واقعی ایک نئی وضع کی کافی جامع کتاب سیرت بن گئے ہیں، ابھی وہ مکمل نہیں ہیں، خاص کر خاتم النبیینؐ کی روحانی تعلیم، اگر خدا نے مجھے اس کی فہم عطا فرمائی اور یہ کام بھی اس گنہگار سے لینا چاہا تو ـــــــــــ

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

واللہ المستعان والیہ المتاب۔

جب میں کراچی سے بلاد الخبائث واپس ہونے والا تھا تو آخری ملاقاتوں میں سے ایک میں فرمایا، نہ جاؤ، یہیں رہو کہ ایک نئے دار المصنفین کی تجویز ہے جس میں آپ سے کام لینا ہے، میں نے عرض کیا، اس ادارے میں دو ہی طرح کے کام ہیں ایک انتظامی دوسرے تالیفی غالباً انتظام میں میری ضرورت نہ ہوگی (قطع کلام کر کے فرمایا، نہیں اس کا سوال نہیں) رہا تالیفی اس کے لئے میرے قیام کی ضرورت نہیں، ڈاک سے ہر خدمت پر حاضر ہوں، اس پر خاموش ہوگئے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر سلامت با فیض رکھے، معلوم نہیں مولانا محمد علی وغیرہ کس حال میں ہیں، سب کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے،

نیازمند:

محمد حمید اللہ

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی زاد فضلہٗ

سابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ، سندھ یونیورسٹی واسلام آباد یونیورسٹی

سندھ یونیورسٹی

حیدرآباد

۱۶ ستمبر سنہ ۶۱ء

مکرمی ومحترمی ۔ تسلیم

پچھلے ہفتہ راولپنڈی سے واپسی پر آپ کا گرانقدر تحفہ "حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات" کا وصول ہوا، یاد فرمائی اور اس عنایت کے لئے بیحد شکر گذار ہوں۔ سلمان صاحب سے جو اب یہاں یونیورسٹی کے اساتذہ کے زمرہ میں شامل ہو گئے ہیں آپکا رہائشی پتہ حاصل کرکے اطلاع بھجوا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو مل جائے گی۔

آپ نے جس خلوص اور جاں فشانی سے حضرت علامہ مرحوم کا تذکرہ تحریر فرمایا ہے اس کیلئے میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ میں نے اسے پورے ایک دن اور ایک رات میں ختم کیا ہے۔ حضرتؒ سے جو عقیدت مجھے تھی، اس سے سوائے خود ان کے بہت کم دوسرے لوگ واقف تھے۔ جب کبھی وہ حیدرآباد تشریف لاتے تو مولانا مناظرؒ اور مولوی عبدالباری صاحبؒ کے ساتھ ازراہِ شفقت کبھی غریب خانہ پر تشریف لاتے اور اکثر میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا،

پاکستان جب مستقل قیام کرنے کا لوگوں نے اصرار کیا تو مجھ سے بھی مشورہ فرمایا تھا، بہرحال آپ کو خط لکھنے بیٹھا تو یہ چند باتیں اضطراری طور پر ذہن میں آگئیں، اُمید کہ آپ خیریت سے ہوں گے،

مخلص

رضی الدین

مولانا شاہ معین الدّین احمد ندوی مرحوم

سابق مدیر معارف

دار المصنفین

اعظم گڈھ

مکرمی! اسلام علیکم

آپ کا خط اور حیات سُلیمانی کے نسخے پہنچے ہشغولیت کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی، حضرت سیدصاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جلوے اتنے گوناگوں ہیں کہ ایک شخص کے لئے ان کا سمیٹنا بہت مشکل ہے۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

گلچیں جمال توز داماں گلہ دارد

جو رُخ آپ کے لکھنے کا تھا، وہ آپ نے لکھ دیا اور ماشاء اللہ اس کا پورا حق ادا کر دیا مگر بعض واقعات جو قیام اعظم گڈھ کے زمانہ کے ہیں صحیح نہیں ہیں، آپ نے محض سماع پر اعتماد کر کے لکھ دیا، ریویو میں اس کی نشاندہی کر دی جائے گی۔

عالم رویا میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا اور جو بشارت عظمیٰ آپ کو ملی ہے اس پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ بہتوں کو یہ درجہ ساری عمر کے مجاہدہ کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا، آپ کو ابتداہی میں مل گیا۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

امید ہے کہ دعوات صالحہ میں اس گنہگار کو بھی یاد رکھا کریںگے،

عاصی پُرمعاصی

معین الدین

۱۵ ستمبر ۶۶ء

جنابِ سید صباح الدین عبد الرحمٰن

حال مدیر معارف

دار المصنفین

اعظم گڈھ

برادرم　　　　　السلام علیکم

تذکرۂ سلیمانؔ کی پہلی کاپی یہاں پہنچی تو ایک ہی نشست میں اس کو شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ پھر آپ نے میرے نام سے جو نسخہ بھیجا تو اس کو غور سے پڑھا اور لطف کے ساتھ لذت بھی حاصل کی۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے علیحدہ سے ایک نسخہ بھیجکر اپنا ممنون کیا۔

آپ نے اپنی تیز گامی سے ہم لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا اور ایک ضخیم جلد تیار کر کے ایک نادر تحفہ سب کے ہاتھ میں پیش کر دیا۔ اس برق رفتاری پر رشک آیا لیکن آپ کو جو غیر معمولی لگاؤ اور تعلق خاطر رہا۔ اس لحاظ سے یہ کوئی تعجب انگیز بھی نہیں۔

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جلوۂ ہزار رنگ کو سمیٹنا تو آسان کام نہیں، لیکن آپ نے جس جلوہ کو سمیٹا ہے وہ آپ کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی، اس رُخ کو پیش کرنے میں آپ کا قلم نہ صرف رواں، دواں اور رقصاں رہا ہے بلکہ اس میں رنگینیاں بھی ہیں اور رعنائیاں بھی، اس لئے امید ہے کہ دوسرے حلقوں میں بھی یہ تذکرہ ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔

آپ نے جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی کا کام بہت کچھ ہلکا کر دیا، گو ان کا طرز و انداز جدا ہوگا، لیکن پھر بھی اس کتاب سے ان کو بڑی مدد ملے گی۔

آج کل خالی اوقات میں یہی تذکرہ پڑھتا ہوں اور آپ یاد آتے ہیں ——

ع　یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا،

لیکن اگر اجازت دیں تو یہ بھی عرض کردوں کہ آپ وہاں بیٹھ کر بہت سی باتوں کو پوری وضاحت کے ساتھ لکھ سکتے تھے لیکن معلوم نہیں اس پر آپ نے کیوں پردہ ڈال دیا ـــــــــ حضرت سیّد صاحبؒ کے سینہ میں نہ معلوم کتنی باتیں مدفون رہیں. آپ ہی کی کتاب سے معلوم ہوا کہ جو باتیں دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ میں ظاہر نہ کرسکے تھے وہ کراچی میں مختلف صحبتوں میں کرتے رہے اور وہ بھی میرا خیال ہے کہ کچھ احوال کے تحت کہہ گئے ہوں گے ورنہ ان کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔

آخر میں پھر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے سبقت کرکے نہ صرف ہم لوگوں کا کام ہلکا کردیا بلکہ ایک ایسا کام انجام دیا جو ہر لحاظ سے قابلِ تعریف اور قابلِ داد ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دیں۔ والسّلام

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم

صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ذکاء اللہ روڈ

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

۱۲ ستمبر ۱۹۶۰ء

محترمی۔ سلام مسنون

کتاب (تذکرۂ سلیمان) موصول ہوئی۔ آپ کا احسان مند ہوں۔ اہل قلم کی سپاس گذاری کا یہ بڑا مستحسن طریقہ ہے۔ جس محبت اور خوش اسلوبی سے آپ نے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔ وہ مغفور کے بے شمار عقیدت مندوں نیز علم دوست طبقہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جائیگا انشاء اللہ تعالیٰ۔ خدا آپ کو اجرِ عظیم دے۔

اللہ کے اجرِ عظیم کا ایک اسلوب وہ بھی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کر دیا ہے یعنی وہ اپنے نیک بندے کی طرف سے لوگوں میں اچھے خیالات پیدا کر دیتا ہے۔

اُمید ہے کہ آپ مسرور و بخیر ہوں گے،

مخلص:

رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید (چشتی)

سابق صدر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی

لال ٹیکری ۸۴۷

۲۹ ستمبر ۶۰ء

برادرِ گرامی قدر،   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ عالی!

دلی شکریہ تذکرۂ سلیمانؒ کی محفل لطیف میں اس خاکسار کو آپ نے اس خلوص سے یاد فرمایا۔ ع، ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے ——————
کتاب کو اشتیاق سے ادھر اُدھر سے دیکھتا رہا۔ سلیمان کی دلنواز شخصیت کے کئی پہلو اس میں آگئے ہیں۔ جزاکم اللہ عنا خیر الجزاء۔

مولانائے مرحوم کے شمائل کا حصہ پڑھ کر کیسی یادیں تازہ ہوگئیں، وہ صورت، وہ عمائۂ زیبا آنکھوں میں تصویر سی پھر گئی، وہ صورت اور سیرت اور سیرت نگاری بھوٹلے[1] نہیں بھولتی۔ خصوصاً اس زمانہ میں جو میلاد مبارک اور مجالس سیرت کا مبارک زمانہ ہے۔ آجکل مجالسِ سیرت میں شرکت کرنی پڑتی ہے تو خطبات مدراس بھی اکثر مطالعہ میں رہتی ہے اور مولانا کی یاد بے ساختہ آجاتی ہے، دعائے رفعتِ درجات نکلتی ہے۔ جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء

میں آخر میں پھر آپ کا قلبی شکریہ ادا کرتا ہوں اور دُعائے خیر کرتا ہوں۔

پُرسان احوال کو سلام مسنون و پیام خیریت۔

رشید

---

[1] 'بھلائے' ہونا چاہیئے تھا، یقیناً سہوِ قلم ہے۔

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں (مجددی) زاد فیضہٗ
سابق صدر شعبۂ اُردو سندھ یونیورسٹی کراچی

حیدرآباد سندھ

۲۴ر ستمبر ۱۹۶۰ء

۷۸۶

حامداً و مصلیاً

جناب محترم و مکرم دام مجدکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کتاب آپ نے ارسال فرمائی، بہت ممنون ہوں، جزاکم اللہ ماشاء اللہ آپ نے حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کی ایک عمدہ یادگار ہم سب کے لئے مہیا فرمائی ہے۔ اللہ پاک آپ کے درجات میں بیش از بیش ترقی عطا فرمائے اور اجرِ عظیم سے بہرہ مند فرمائے آمین!

سلمان صاحب یہیں میرے پاس تشریف فرما ہیں، ان کا سلام مسنون قبول فرمائیں۔ والسّلام

احقر

غلام مصطفےٰ خاں

پروفیسر سیّد عبدالرشید فاضل

سابق صدر شعبۂ فارسی اُردو کالج، کراچی

باسمہٖ تعالیٰ

۵۰۵ پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی

۲۴ مئی ۱۹۸۱ء

مکرمی و محترمی مولوی غلام محمدؐ صاحب!

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ‘

"تذکرۂ سلیمانؒ" کو واپس کرنے کی غرض سے حاضر ہوا تھا۔ تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں مولوی صاحب! میں تذکرے کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ اس کتاب میں جہاں سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دینی، علمی اور اخلاقی کمالات کے ساتھ چلتے پھرتے اور بولتے نظر آتے ہیں وہاں آپ کی ہمہ جہتی صلاحیتیں بھی اپنی پوری شان کے ساتھ نظر آرہی ہیں، اور ایک مصنف کا یہ بہت بڑا کمال ہے۔ یقین کیجئے مجھے ان گراں قدر صلاحیتوں کا مشاہدہ پہلی بار اس کتاب کا مطالعہ سے ہوا ہے۔ پھر صلاحیتیں بھی اس درجہ متنوع کہ شعر و سخن کا مذاق ہے تو بڑا پاکیزہ نثر نگاری کا انداز ہے تو نہایت شگفتہ سُلجھا ہوا اور دل نشین۔ اور شریعت و طریقت کی رمز آشنائی ہے تو ع

"بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق"

کی نزاکتوں کا پورا پورا لحاظ رکھے ہوئے۔

یہ کتاب اردو زبان کے علمی و ادبی سرمائے میں نہایت قیمتی اضافہ ہے، اس میں علم و حکمت کے نکتے بھی ہیں، شعر و ادب کے چٹخارے بھی ہیں اور تصوّف کے اعتبار سے تو اس کتاب کو ایک تربیتی نصاب کہنا چاہیئے۔ اس تصوّف کا جو عین اسلام ہے۔ میں شروع ہی سے

تصوّف کا طالب علم رہا ہوں اور اس معاملے میں ؏ "تمتع زہر گوشۂ یافتم" پر عمل کیا ہے چنانچہ اس کتاب سے بھی میں نے بہت کچھ نئی باتیں سیکھی ہیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

میری رائے میں اگر خط و کتابت کو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو افادی حیثیت سے بہت اچھا ہو۔ کہ یہ خطوط دینی و علمی جواہر کا ایک انمول خزانہ ہیں۔ مگر ساتھ ہی اس بات کا افسوس ہوا کہ جس کتاب کو بار بار طبع ہو کر زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچنا چاہیئے تھا وہ نایاب ہے۔ خدارا اس کی اشاعت ثانی کی طرف خصوصی توجہ فرمایئے۔

ایک صاحب نے فرمایا کہ ایسی نادر کتاب کو واپس کر کے[1] آپ اپنی بے ذوقی کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ "ظہیر فاریابی نے تو اپنے دیوان کے بارے میں محض ڈینگ ماری تھی۔ یہ کتاب واقعی ایسی ہے کہ ؏ "در کعبہ بدزدا گر بیابی"۔ میں نے عرض کیا، بھائی! اگر میں اجتماعی مفاد پر اپنے ذاتی انفرادی مفاد کو ترجیح دینے والا ہوتا تو یقیناً اس کتاب کو واپس نہیں کرتا مگر یہ کتاب تو اس قابل ہے کہ گردش میں رہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کریں۔

اُمید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص،

عبدالرشید

---

[1] محترم پروفیسر صاحب تذکرہ کا نسخہ عاریۃً مجھ سے لے گئے تھے، کیونکہ یہ بازار میں نایاب ہو چکا تھا،

مخدومی حکیم مقصود جنگ بہادر مرحوم

طبیب شاہی و ناظم طبابت حکومت آصفیہ حیدرآباد دکن،

حیدرآباد دکن

۷ ستمبر ۶۰ء

عزیزم سلّمہٗ

اسلام علیکم

آپ کی روانہ کردہ کتاب "تذکرۂ سلیمان" مجھے ملی۔ میں اسے پڑھ کر بہت خوش ہوا مولانا مرحوم کے میرے ساتھ تعلقات بہت مخلصانہ تھے، آپ نے جو کچھ لکھا ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ واقعی وہ ایسے ہی تھے، اس قسم کی کتاب پڑھنے سے ایمان زیادہ ہوتا ہے۔ میرا شکریہ قبول فرمایئے۔

میرے مرض کی حالت بدستور ہے، خدا شفاء دینے والا ہے، آپ کے والدین کی خدمت میں سلام۔ عزیزہ رقیہ[1] سلمہا کو دعا، بچوں کو پیار۔ یہاں سب بخیریت ہیں۔ فقط

مقصود علی خاں[2]

---

[1] مکتوب نگار کی نواسی اور مکتوب الیہ کی رفیقۂ حیات،

[2] سقوط حیدرآباد کے بعد سے "مقصود جنگ" کے بجائے صرف نام لکھنے لگے تھے،

اِشاریہ

مرتبہ

لطیف اللہ

اُستاد ادبیاتِ اُردو

گورنمنٹ کالج ناظم آباد۔ کراچی

اشاریہ

آیات قرآنی

احادیث

(جاری ہے)

الف

⁂ ⁂ ⁂